www.Paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول
مدیرہ
انجم انصار
معاون
آمنہ حماد

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے	مدیرہ	15

سلسلے وار ناول

عکس	عمیرہ احمد	18
زندگی	ناہید سلطانہ اختر	148

مکمل ناول

تشنگی کا سفر	یاسمین نشاط اختر	62
موسم گل حیران ہے	صائمہ اکرم	232

ناولٹ

کوئی شہر ایسا بساؤ من میں	نگہت سیما	106

افسانے

جیا کی امی	نوشین ناز اختر	55
اپنے بیگانے	سعدیہ رئیس	99
ایکس اسٹوڈنٹ	تابندہ جبیں	141
سچ تو یہ ہے	قرۃ العین رائے	185
سراپا سحر	لبنیٰ عروج	199
دُرِ نایاب	سکینہ فرخ	211
کاش	عروسہ عالم	225

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ	16
بہنوں کی محفل	مدیرہ	279
پاکیزہ ڈائری	عظمیٰ آفاق سعید	291
جلترنگ	انجم انصار	294
میرا انتخاب	آمنہ حماد	299
سندیسے	پاکیزہ بہنیں	302
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی	304
خوش ذائقہ	پاکیزہ بہنیں	306
روحانی مشورے	ادارہ	308
ہومیو کلینک		310

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل : ماریہ .... میک اپ : روز بیوٹی پارلر .... فوٹوگرافر: موسیٰ رضا
جلد 40 • شمارہ 04 • جولائی 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

www.Paksociety.com
www.Paksociety.com

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال بتائیں کیا

مگر ہم آپ کو بتائیں گے اور خوب بتائیں گے۔

جی ہاں...... ماہنامہ سرگزشت کراچی کا ایک اور معرکتہ الآرا خاص نمبر

عشقِ ناکام نمبر

عشق......جس میں مہر بھی ہے اور قہر بھی، وصل بھی ہے اور فراق بھی...... عشق، انسان سے کیا کچھ نہیں کراتا انہوں نے بھی اپنی شہرت و ناموری کو داؤ پر لگا دیا۔

بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

مشہور و معروف ہستیوں، تاریخ ساز افراد کے ناکام عشق کی داستانیں......دل پر اثر کرنے والی سچ بیانیاں، ایسی دلچسپ سچی کہانیاں جو آپ کو چونکا دیں گی۔

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ
محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

www.Paksociety.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

آج کی دنیا میں کوئی بھی فرد دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے دوسروں کے ساتھ رہنا، کام کرنا اور تعلقات رکھنا ناگزیر ہیں۔

زندگی کی سب سے بڑی خوب صورتی دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنا اور خوشگوار زندگی بسر کرنا ہے۔

وہ لمحات جو بغیر کسی ٹینشن کے بسر ہوں وہ طمانیت بخش اور خوب صورت کہلائے جاتے ہیں اور زندگی کو خوب صورت اور سہل بنانے میں 75 فیصد آپ کی اپنی کاوشیں شامل ہوتی ہیں اگر آپ کو یہ فن نہیں آتا تو آپ کی ساری فہم و دانش اور اہلیت بھی زندگی کو حقیقی مسرتوں سے ہم کنار نہیں کرسکتی۔ لوگوں کے درمیان مل جل کر رہنا، ہر ایک سے محبت اور خلوص کے رشتے استوار رکھنا اور ہر ماحول میں ہم آہنگ ہوجانا، وہ فن ہے جو زندگی کو انمول خوشیاں عطا کرتا ہے۔ اور یہ صلاحیت ان تمام علوم سے زیادہ قیمتی ہے جو آپ درس گاہوں سے حاصل کرتے ہیں۔ بلاشبہ غلطی کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ جرم تو یہ ہے کہ غلطیوں کی تلافی نہ کی جائے۔ ان سے سبق نہ حاصل کیا جائے اور ان سے حاصل تجربے کی روشنی میں وہ راستہ اختیار نہ کیا جائے جس میں دوبارہ اسی غلطی کے ہونے کا امکان نہ رہے۔

ہمیں صرف یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غلطیاں مردے نہیں کرتے، زندہ لوگ، جدو جہد کرنے والے لوگ اور ترقی کی راہیں تلاش کرنے والے لوگ غلطیاں کرتے ہیں، ان کی اصلاح کرکے آگے بڑھنے کی راہ ہموار کرتے ہیں مگر یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ وہ ڈھٹائی اور جھوٹ سخت نقصان دہ ہوتا ہے، جہاں غلطی کو غلطی نہ سمجھا جائے اور نہ مانا جائے۔ آپ کا شمار کن لوگوں میں ہے۔ خود ہی اندازہ کیجیے۔

مدیرہ
انجم انصار

www.Paksociety.com

اے ایمان والو انصاف پر قائم رہنے والے اور اللہ (کی خوشنودی) کے لیے (امر حق کی) گواہی دینے والے بن جاؤ اور اگر (اس گواہی کا کوئی برا اثر) تمہاری جانوں پر یا (تمہارے) ماں باپ اور رشتے داروں پر (واقع ہو تب بھی اس کو نہ چھپاؤ اور چاہے) وہ مالدار ہو یا فقیر تو اللہ ان پر (تم سے) زیادہ مہربان ہے لہٰذا تم انصاف کرنے میں (اپنی نفسانی) خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور اگر تم پیچ سے بات کرو گے یا (گواہی دینے سے) اعراض کرو گے تو بے شک (سمجھ لو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے (۱۳۵) اے ایمان والو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے نازل کی (ان سب پر) ایمان لاؤ اور جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں اور روز آخرت کا منکر ہوا تو بے شک وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہو گیا (۱۳۶) بے شک جو لوگ ایمان لائے (اور) پھر کافر ہو گئے (اور) پھر ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے (اور) پھر کفر میں (خوب) بڑھ گئے اللہ انہیں ہر گز نہ بخشے گا اور نہ انہیں راہ (ہدایت) پر لائے گا (۱۳۷) منافقوں کو (یہ) خوش خبری سنا دو کہ ان کے لیے درد دینے والا عذاب (تیار) ہے (۱۳۸) وہ لوگ (ایسے ہیں) جو ایمان داروں کو چھوڑ کے کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں پس کیا یہ ان کے پاس (جانے آنے میں اپنی) عزت چاہتے ہیں (تو سمجھ رکھیں کہ) بے شک سب عزت اللہ (ہی) کی (ملک) ہے (اس کے سوا کون ہے جو کسی کو عزت دے سکے) (۱۳۹)

(سورۂ نسا آیت نمبر ۱۳۵ تا ۱۳۹)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ

4۔ الرائے:

1۔ محمد ﷺ

آج بھی وہ لاکھوں کروڑوں بچے اس مقدس و مقبول ترین نام "محمدؐ" کی مختلف صورتوں سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ جو دین اسلام میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہی دین اسلام جسے حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ کے اس فرزند عظیم نے قائم کرنا اور ساری دنیا میں پھیلانا تھا۔

(آر۔ وی۔ سی۔ باڈلے۔ الرسول)

(R.V.C Bodley-The Messenger)

2۔ محمد ﷺ (تعریف کیے گئے اسراہے گئے)

1۔ محمد ﷺ کے دین اور ان کی تعلیمات کو کن الفاظ میں سراہا جا سکتا ہے۔ حقیقی انقلاب جو ذہن بدل دے، دل بدل دے اس کی تعریف کیسے ممکن ہے۔

(ای۔ بلائیڈن)

(E.Blyden-Christianity,Islam and the Negro Race,1969)

2۔ محمد ﷺ وہ ہستی، جن کے شایان شان احترام کے لیے دنیا کی کسی زبان میں الفاظ مل ہی نہیں سکتے۔ آپ ﷺ انسانیت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ بہترین شہری، بندۂ دلنواز، اعلیٰ درجہ کا لیڈر، صاحب فکر، اول درجے کا خطیب، صاحب کردار، زبردست کمانڈر، بہترین ساتھی، عظیم فرزند، بے مثال بیٹا اور باپ، صف اول کا قانون ساز، دلوں کا فاتح، دماغوں کا حکمران پھر بھی خود کو صرف بشر کہتا ہے۔

(تھامس کارلائل۔ Thomas Carlyle)

("On Heroes, Hero worship and the Heroic in History")

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماالنبی ﷺ سے اقتباس!

www.Paksociety.com
www.Paksociety.com

عکس

قسط 12

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکا دینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکا دینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اِک رابطہ مسلسل ہے اِک فاصلہ مسلسل ہے

www.Paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ تزئین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لو میرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے...... جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر...... نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے۔ جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے، ایبک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن آئزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ چڑیا ایبک کے رویے سے بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ایبک کو نظر انداز کرنے تو ایبک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ چند ساتھیوں نے اسے شہد کی دلدل کا ٹائٹل دے دیا تھا۔ اتنے عرصے بعد شیر دل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا، باربی ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔ گاؤں میں جب سب کو خیر دین کی نوکری ختم ہونے کا پتا چلتا ہے تو ان کے رویے بدل جاتے ہیں۔ چڑیا کے اسکول کا نتیجہ جب خیر دین دیکھتا ہے تو سوچ میں پڑ جاتا ہے، باربی ڈول اپنی ممی کو بتاتی ہے کہ پاپا نے اسکول آکر سسٹر ایگنس سے چڑیا کو اسکول سے نکالنے کا کہا ہے۔ فاطمہ ایبک کو ڈیبٹ کے لیے اسٹیج پر جاتا دیکھ کر نروس ہو جاتی ہے۔ باربی ڈول اسکول سے جانے سے پہلے ایک بار چڑیا سے ملنا اور اس کو اپنے جانے کے بارے میں بتانا چاہتی ہے لیکن مل نہیں پاتی، خیر دین گاؤں سے جانے کا اور زمین بیچنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے بھائی زمین اپنے نام کرا لیتے ہیں۔ خیر دین شہر واپس آتا ہے تو چڑیا کو واپس اسکول میں داخل کراتا ہے خیر دین نے ڈاکٹر فرح کے شوہر کو فون کیا تو پتا چلا کہ فرح کی ڈیتھ ہو گئی ہے لیکن عابد چیڑیا کی فیس دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ شیر دل پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا تو شہر بانو نے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ شیر دل ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ آیا تھا۔ وہ پہلا سرکاری گھر تھا جو شہر بانو کو خوش کر گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر میونسپلٹی کے اہلکار خیر دین کی ریڑھی کا سامان پھینک دیتے ہیں اور اسے اس علاقے میں ریڑھی لگانے سے منع کر دیتے ہیں۔ باربی ڈول اسکول کے آخری دن چڑیا سے ملنے اپنی ممی کے ساتھ جاتی ہے۔ شیر دل اور عکس لاہور میٹنگ اٹینڈ کرنے جاتے ہیں، مثال اور شہر بانو بھی شیر دل کے ساتھ تھیں وہ دونوں اگلی رات کی فلائٹ سے امریکا جانے والی تھیں۔ خیر دین حلیمہ کی دوبارہ شادی کر دیتا ہے اور وہ کویت چلی جاتی ہے۔ خیر دین سسٹر ایگنس کو سچائی بتا کر چڑیا کا ایڈمیشن دوبارہ کرا دیتا ہے۔ جواد کو پولیس نشے کی حالت میں پکڑتی ہے اور وہ عکس سے اپنا رشتہ ظاہر کرتا ہے۔ نیوز چینل پر یہ خبر بار بار آتی ہے۔ شیر دل اپنے تعلقات استعمال کر کے اس خبر کو رکوا دیتا ہے۔ ایبک، فاطمہ سے ملتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ شاید پہلے بھی اس سے ملا ہے لیکن کہاں اور کب یہ یاد نہیں۔ فاطمہ، ایبک سے باقاعدہ طور پر رشتہ بھیجنے کے لیے کہتی ہے۔ ایبک بتاتا ہے کہ اس کی منگنی اس کی کزن سے ہوئی ہے، وہ اسے ختم کرنے کی کوشش میں ہے۔ خیر دین نے گاؤں جا کر اپنے خاندان پر جعلسازی کے ذریعے زمین ہتھیانے کی ایف آئی آر درج کرائی۔ خیر دین کے خاندان نے ایف آئی آر کے جواب میں ایک مقامی ایم پی اے کی مدد لی جس کے حلقے میں وہ ووٹر تھے۔ خیر دین کو حوالات سے نکلوانے کے بعد چڑیا اور وہ گاؤں میں نہیں رکے۔ ایبک فاطمہ سے کہتا ہے کہ اس کی ممی اس سے ملنا چاہتی ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ ایبک کی والدہ اسے کہتی ہیں کہ وہ اپنی دوستی پہلے کی طرح رکھے فاطمہ کی روم میٹ خانزہ اسے بتاتی ہے کہ اس کی طرح ایبک کے بھائی ایزد نے بھی اس کی بہن سے اسی طرح فائدہ اٹھایا تھا۔ 26 سال بعد اس شیشے کو وہی دیکھ کر ایبک رک گیا تھا۔ شیر دل حیران تھا کہ وہ عکس مراد علی کو پہچان نہیں پایا۔ عکس اسی گھر میں آ گئی تھی لیکن وہ یہاں چڑیا بن کر رہنا چاہتی تھی عکس مراد بن کر رہنا چاہتی تھی۔ اس نے بغیر بتائے خیر دین کو بھی بلوا لیا تھا۔ چڑیا کے طفیل خیر دین کی زندگی فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے یہ بھی ان ہی سے ایک تھا۔ عکس خیر دین کی زمین واپس لینے کے لیے کیس کرتی ہے۔ خیر دین پس و پیش سے کام لیتا ہے لیکن عکس اپنا حق چھوڑنا نہیں چاہتی۔ عکس، شہباز پر کیس کرتی ہے تو شیر دل اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ منزہ، شہر بانو کو فون کر کے کہتی ہیں کہ وہ شیر دل کو سمجھائے کہ وہ عکس کو کیس کرنے سے منع کرے۔

(اب آگے پڑھیں)

اس آئینے میں شہر بانو نے عکس اور طغرل کی پشت دیکھی تھی...... پھر اپنا چہرہ...... گاڑی کے کھلے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس گھر میں یہ تیسری چیز تھی جس نے شہر بانو کے دل پر ضرب لگائی تھی۔ اس آئینے میں اس نے پہلی بار اپنا جو عکس دیکھا تھا وہ جیسے بھنور کی طرح لوٹ کر اس کے پاس آیا تھا...... وہ پہلا عکس جس میں وہ تھی، مثال تھی اور شیر دل تھا...... ایک خاندان تھا۔ خوشی تھی، مستقبل تھا اور اب جو عکس ابھرا تھا اس میں صرف شکست خوردگی تھی اور ماضی ہی ماضی تھا...... مثال اب بھی ساتھ تھی۔ شیر دل ساتھ نہیں تھا۔

''زندگی ہمارے ساتھ یہ سب کیوں کرتی ہے؟'' اس نے عجیب سی تھکن کے ساتھ سوچا تھا۔

گاڑی پورچ میں رکتے ہی اس کے دروازہ کھولنے سے بھی پہلے اس نے عکس اور طغرل کو برآمدے سے نکل کر پورچ میں اپنے استقبال کے لیے بڑھتے دیکھا۔ دروازہ ڈرائیور نے کھولا تھا۔ گاڑی سے نکل کر اس نے پہلی نظر اس عورت پر ڈالی جس عورت سے زیادہ اس نے زندگی میں کسی عورت سے نفرت نہیں کی تھی۔ وہ ان دونوں مردوں کو اس کی زندگی سے نکال دینے کا باعث بنی تھی جن کے گرد شہر بانو کی زندگی گھومتی تھی...... اس کی واحد حریف، واحد رقیب...... ایک عجیب سی جھجک اور خاموشی نے چند لمحوں کے لیے ان دونوں کو اپنی گرفت میں لیا تھا...... لیکن صرف چند لمحوں کے لیے پھر عکس آگے بڑھ آئی تھی۔

شہر بانو نے اس کی طرف مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ہمیشہ کی طرح محتاط انداز میں۔ عکس نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے اس کو گلے لگایا تھا...... کیا ہزیمت تھی جو شہر بانو نے محسوس کی تھی اور کیا ذلت تھی جو اسے اپنے اس حریف کے پاس لے آئی تھی جس کی وہ شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

''سفر ٹھیک سے گزرا؟'' اس ملائم آواز نے اس سے پوچھا تھا۔ کانٹوں پر کیا جانے والا سفر ٹھیک سے کیسے گزر سکتا تھا؟ شہر بانو جواباً اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔

''ہاں۔'' اس نے اپنے جواب کو وہیں چھوڑتے ہوئے نظریں ملائے اور عکس کے چہرے کو دیکھے بغیر کہا۔ وہ اس سے الگ ہو گئی تھی۔ شہر بانو نے جیسے عجیب سا سکون محسوس کیا۔ عکس مراد علی اب مثال کی طرف بڑھی تھی۔ شہر بانو نے اس کے چہرے پر بھی وہی اضطراب اور الجھن دیکھی جو اس نے چند لمحے پہلے خود محسوس کی تھی۔ اس نے بے اختیار اس سے نظریں ہٹا لیں۔ کیا عجیب حسد تھا جو اس نے اس عورت کو اپنی اولاد کی طرف بڑھتے دیکھ کر محسوس کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے وہ چلا کر اسے روک دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کو مت چھوئے...... جو شیر دل کے بعد اس کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا۔

''السلام علیکم۔'' طغرل کی آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا تھا، وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ شکست خوردگی اور حسد نے شہر بانو کو چند لمحوں کے لیے کچھ عجیب سے انداز میں دیمک زدہ کیا تھا...... حسد، رنج، تکلیف، شکست...... بس اگر کچھ نہیں تھا جو شہر بانو نے محسوس نہیں کیا تھا تو وہ پچھتاوا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر اس کی بیٹی کو مشفقانہ انداز میں لپٹائے چومتی ہوئی اس عورت نے شہر بانو سے اس آئینے میں پہلی بار شہر بانو کو دکھائی دینے والے خوش و خرم خاندان کے عکس کو اس سے چھین کر اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا...... اور وہ آج اس گھر میں ''اپنے خاندان'' کے ساتھ کھڑی تھی جہاں شہر بانو اپنی زندگی کے چیتھڑے اور دھجیاں سمیٹے ''پناہ'' کے لیے آئی تھی...... بدترین دشمن کی چھت کے نیچے پناہ...... زندگی ہمارے ساتھ کیا کرتی ہے!

☆☆☆

زندگی میں پہلی بار شیر دل اسے روتے دیکھ رہا تھا...... بچوں کی طرح روتے ہوئے...... حواس باختہ، خوف زدہ، کسی انہونی سے دہشت زدہ، آنے والے کسی برے لمحے سے آسیب زدہ...... پتھر سے بھربھری مٹی بنتے ہوئے...... اور اتنے سالوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا۔ وہ اس عکس مراد علی سے پہلی بار متعارف ہوا تھا اور اسے خوشی نہیں ہوئی تھی عجیب تکلیف پہنچی تھی۔

خیر دین دل کے دورے کے بعد تشویشناک حالت میں ICU میں تھا۔ رات کے پچھلے پہر جگا کر دی جانے والی یہ

www.Paksociety.com

خبر عکس کو چڑیا بنا گئی تھی...... خیر دین اس کی زندگی کا محور تھا اور عکس کے لیے فوری طور پر یہ تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ اس کی زندگی کا وہ محور ختم ہوسکتا تھا۔ ختم ہو جاتا تو وہ کیا کرتی۔ اس کی زندگی میں خیر دین کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ شیر دل سے محبت تھی رشتہ نہیں تھا۔ جواد سے رشتہ تھا محبت نہیں تھی...... صرف خیر دین سے رشتہ اور محبت دونوں تھے۔ صرف وہ تھا جس نے اپنے وجود کو ہمیشہ اس کے لیے چھتری بنائے رکھا تھا اور اس چھتری کے بغیر کھڑے ہونے کا تصور بھی عکس کے لیے سوہانِ روح تھا۔

''انکل ICU میں ہیں لیکن ٹھیک ہیں۔'' شیر دل نے بہت گول مول انداز میں اسے تسلی دی تھی۔ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے پاکستان میں اپنے پی اے کے ذریعے ہاسپٹل کی management سے رابطہ کرکے بات کی تھی۔ خیر دین کی حالت نازک تھی۔ لیکن وہ زندہ تھا اور جب تک وہ زندہ تھا وہ عکس کو دلاسا دے سکتا تھا۔ وہ اس کے بیڈ روم میں پڑی کرسی پر بیٹھی اس کی فون کالز کے دوران بھی اسی طرح ہچکیوں اور سسکیوں سے روتی رہی تھی۔ پتا نہیں اسے یہ خوف کیوں تھا کہ اس سے جھوٹ بولا جارہا تھا۔ وہ پاکستان جائے گی تو خیر دین اسے زندہ نہیں ملے گا۔ شیر دل کی فون کالز اور ہاسپٹل انتظامیہ کے ساتھ ہونے والی اس کی بات چیت کے باوجود۔

''سیٹ کروادوں تمہاری؟'' شیر دل نے اسے خیر دین کی حالت کے بارے میں بتانے کے بعد اس سے بڑی نرم آواز میں پوچھا۔ اس نے کچھ بھی کہنے کے بجائے اسی طرح سر جھکائے ٹشو سے اپنی سرخ ناک رگڑتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ اس کا ماؤف ذہن اب آہستہ آہستہ اس شاک سے باہر آرہا تھا جو آدھی رات کو وہ فون کال سن کر اسے لگا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود انٹرکام فون کی بیل پر ہی جاگی تھی اور چند لمحوں کے لیے اسے لگا جیسے وہ wake up call کے لیے کیا جانے والا فون تھا جو ہر روز صبح پانچ بجے اسے دی جاتی تھی لیکن پھر کال ریسیو کرتے ہی اس ریذیڈنس کی reception پر نائٹ ڈیوٹی کرنے والے نے اس کو اس کال کے بارے میں انفارم کرتے ہوئے اس کے پی اے سے اس کا رابطہ کروایا تھا جس نے بے حد گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں کسی تمہید کے بغیر اسے خیر دین کے بارے میں اطلاع دی تھی اور وہ چکرا گئی تھی۔ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا اس نے پی اے سے کیا پوچھا اور کیا کہا تھا۔ وہ بس شاک کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر شیر دل کے پاس آگئی تھی جس کا کمرا اس کے کمرے سے تین کمروں کے فاصلے پر تھا۔ اس تکلیف اور سراسیمگی میں بھی اسے شیر دل ہی کا خیال کیوں آیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی اور وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے لیے کیا کرے گا؟ کیا کرسکتا تھا؟

ہم زندگی میں ہمیشہ بہادر رہ تو سکتے ہیں دکھ نہیں سکتے...... آزمائشیں ہمیں توڑتی ہیں...... بار بار...... حوصلہ ہمیں جوڑتا ہے...... بار بار...... لیکن شکست وریخت کا یہ عمل چھپائے رکھنے کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی کسی ''اپنے'' کے سامنے ہمیں موم کا کردیتا ہے۔ عکس مراد علی کی زندگی میں وہ ''اپنا'' بس ایک ہی شخص تھا...... ایک شیر دل...... اعتراف، اظہار اور اعلان کے بغیر بھی۔

دس گھنٹوں کے بعد ایک غیر ملکی ائرلائن کی Indirect flight میں اس کو سیٹ مل گئی تھی۔ اس سیٹ کے لیے شیر دل نے کیا پاپڑ بیلے تھے اسے اندازہ تھا۔ یہ کام اس کے ہاتھ میں ہوتا تو کبھی نہیں ہوسکتا تھا مگر شیر دل کے لیے یہ مشکل تھا ناممکن نہیں۔

''پاکستان میں تمہارے اور کون سے relatives ہیں جن کو انفارم کرنا ضروری ہے تاکہ وہ تمہارے پہنچنے سے پہلے تمہارے نانا کے پاس ہوں'' شیر دل نے اس کی امی کو کال کرکے اطلاع دینے سے پہلے اس سے پوچھا تھا۔

''کوئی بھی نہیں ہے۔'' اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ حیران ہوا۔

''کوئی بھی نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے تمہارے ماموں چچا وغیرہ۔'' اسے شاید یقین نہیں آیا تھا کہ ''کسی'' کا ''کوئی'' بھی نہیں ہوسکتا۔

''میری امی اکلوتی اولاد ہیں میرے نانا کی۔ کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔ نانا کے کچھ رشتے دار گاؤں میں ہیں لیکن میں انہیں انفارم کرنا نہیں چاہتی فی الحال...... بس کافی ہے کہ امی کویت سے آجائیں۔'' وہ تھکی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

شیر دل اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اپنے نانا کے بہت قریب تھی اس کا اندازہ اسے اتنے سالوں میں اس کے چڑیا ہونے کی اصلیت نہ پتا ہونے کے باوجود تھا لیکن یہ اندازہ اسے کبھی نہیں تھا کہ وہ اپنے اردگرد خونی رشتوں کے قحط کا بھی شکار تھی اور شاید نانا سے اس کی اتنی closeness کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

''کسی نہ کسی کو تو ہاسپٹل ہونا چاہیے تمہاری فیملی میں سے...... تمہارے پاکستان پہنچتے ہوئے بھی ایک دن گزر جائے گا...... تمہاری امی سے بات نہیں ہوئی ابھی...... ہوسکتا ہے وہ جلدی ٹکٹ کا انتظام کرکے واپس آسکیں لیکن بہت جلدی بھی ہو تو بھی دس بارہ گھنٹے سے پہلے نہیں ہوسکتا یہ۔'' شیر دل جیسے اس سے بات کرتے ہوئے اپنے ذہن میں ان تمام ممکنہ طریقوں کو بھی consider رہا تھا جن کے ذریعے وہ اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا اور اس کا ذہن جس حل پر آکے رکا تھا وہ اسے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا لیکن چاہتے ہوئے بھی جھٹک نہیں سکا۔

''جواد کو انفارم کردو...... وہ وہاں آجائے تو بہتر ہے۔'' شیر دل نے اپنے فون پر عکس کی والدہ کا نمبر ملاتے ہوئے کہا اور وہ پہلا موقع تھا جب عکس کو جواد یاد آیا۔ وہ کئی دنوں سے رابطے میں نہیں تھے۔ اس واقعے کے بعد ایک عجیب سی خلیج آگئی تھی ان کے رشتے میں۔

''زندگی میں کبھی بھی جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔'' خیر دین نے جواد کے خلاف بننے والے پولیس کیس کے بارے میں جاننے پر اس سے کہا تھا جب وہ شدید غصے اور رنجیدگی میں اس رشتے کو ختم کردینا چاہتی تھی۔

''اس معاملے کو ختم ہونے دو...... جواد کی بات سنو کہ وہ اس معاملے کے بارے میں کیا کہتا ہے اور پھر کوئی فیصلہ کرو۔'' خیر دین نے اپنی مایوسی اور پریشانی کو چھپاتے ہوئے اس کی رنجیدگی اور اضطراب کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس کی تکلیف اور مایوسی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ شادی سے چند ہفتے پہلے ہونے والے اس واقعے نے اسے شدید ذہنی اذیت تو پہنچائی ہی تھی لیکن جواد پر اس کے اعتماد کو بری طرح ٹھیس بھی پہنچائی تھی۔

''وہ کیا کہے گا نانا......؟ سچ تو کبھی نہیں بولے گا...... کوئی نہ کوئی بہانہ کوئی نہ کوئی جھوٹ ہی بولے گا اس ساری سچویشن کی وضاحت کے لیے۔''

''پھر بھی موقع دو اسے وضاحت دینے کے لیے۔ جھوٹ بولے تو بھی سنو۔'' وہ عجیب سی تکلیف میں ہنس پڑی تھی۔

''جھوٹ بولے تو بھی سنو...... عجیب logic ہے نانا۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ خیر دین کو عجیب تکلیف ہوئی تھی اس کی بات پر...... وہ ڈھائی سال سے جواد سے مل رہی تھی...... اس کے لیے پسندیدگی رکھتی تھی۔ جواد نے جب اسے پرپوز کیا تھا تو عکس نے امریکا سے فون کرکے اسے بڑی خوشی کے عالم میں بتایا تھا۔ وہ جواد کو اس کے دوست کی حیثیت سے جانتا تھا۔ امریکا جانے کے بعد سے مسلسل اس سے اس کا ذکر سنتا آرہا تھا لیکن اس نئی حیثیت سے وہ اس سے پہلی بار متعارف ہوا تھا۔ جواد کی فیملی اس کی عدم موجودگی میں ہی خیر دین اور حلیمہ سے اس کے رشتے کے حوالے سے ملنے آئی تھی۔ ان کی سماجی حیثیت خیر دین کے خاندان سے کہیں بہتر تھی اور خیر دین کو خوشی ہوئی تھی کہ وہ ایک اچھے خاندان کا حصہ بنے گی لیکن اس نے عکس کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کی گفتگو میں ان کے اپنے خاندان کے لیے بہت تکبر تھا...... وہ تکبر خیر دین کو ہر بار دکھتا اور چبھتا تھا۔ وہ عکس کے ریفرنس سے نہ آئے ہوتے تو خیر دین پہلی ملاقات کے بعد ہی ان سے معذرت کرلیتا لیکن وہ عکس کے حوالے سے آئے تھے جس کی جواد کے بارے میں رائے بہت اچھی تھی۔

''ابا اب وہ اتنے بڑے خاندان سے ہیں تو تھوڑا بہت تو غرور ہوتا ہی ہے انسان کو اپنے خاندان پر۔ اب اگر ہم ہر رشتے کو اتنی باریک بینی سے دیکھ دیکھ کر چھان پھٹک کرنے لگے تو پھر تو کہاں کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملے گا...... ویسے بھی شادی کی عمر نکلی جارہی ہے اس کی...... آپ کو تو فکر ہی نہیں ہے۔'' حلیمہ نے خیر دین کے اعتراضات پر اس سے کہا تھا۔

''اگر ایسی بری فطرت کے لوگ ہوتے تو اپنے بیٹے کے کہنے پر بھی ہمارے جیسے خاندان میں رشتے کی بات کرنے نہ آتے۔'' حلیمہ بالکل مطمئن تھی بلکہ بے حد خوش تھی عکس کے لیے ایسے خاندان سے رشتہ آنے پر۔ اس سے پہلے اس کے لیے جتنے بھی رشتے آتے رہے تھے ان میں سے کوئی بھی اتنے بڑے خاندان سے نہیں تھا۔ حلیمہ ایک عام ماں تھی جس کے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ اس کی بیٹی اتنی لائق تھی لیکن اب اس کے لیے زیادہ مسرت کی بات یہ تھی کہ ایک اتنا بڑا خاندان اس

www.paksociety.com

کی بیٹی کو اپنا حصہ بنانا چاہتا تھا۔

خیر دین نے حلیمہ سے بحث یا سوال جواب نہیں کیے تھے۔ حلیمہ سے اس مسئلے پر بات چیت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اس مسئلے کو بھی عکس سے ہی ڈسکس کرنا چاہتا تھا اور اس نے یہی کیا تھا۔ کوئی حتمی فیصلہ اس نے جواد سے ملاقات ہونے تک کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔

جواد سے پہلی ملاقات میں وہ خیر دین کو اچھا لگا تھا۔ عکس اس کی جس شائستگی اور تہذیب کی بات کرتی تھی وہ خیر دین کو بھی دکھی تھی۔ وہ کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ کافی تھا کہ عکس کی جواد کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ باقی چیزیں اس کے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔

''شیر دل کیا کہتا ہے جواد کے بارے میں؟'' خیر دین نے جواد سے ہونے والی پہلی ملاقات کے بعد عکس سے پوچھا تھا۔ وہ اس سوال پر حیران نہیں ہوئی تھی۔ خیر دین کو شیر دل کی رائے پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا اور اس اعتماد کی وجہ پچھلے سالوں میں ان تمام مردوں کے حوالے سے دیا جانے والا اس کا بے حد درست اور اتنا ہی خطرناک بیک گراؤنڈ چیک تھا جس نے ہر بار عکس اور خیر دین کو کسی شرمندگی سے دوچار ہونے والی صورتِ حال سے بچایا تھا۔

''شیر دل ابھی نہیں ملا اس سے؟'' خیر دین نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ خیر دین سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ دونوں پچھلے کچھ عرصے سے رابطے میں نہیں تھے اور اس کی وجہ شیر دل کا غنی حمید کے حوالے سے کیا جانے والا وہ سوشل ورک تھا جس کی وجہ سے وہ غنی حمید کے اپنے آپ میں بے حد انٹرسٹڈ ہونے کے باوجود اس کے ساتھ چاہتے ہوئے بھی دوستی کے علاوہ کوئی اور رشتہ نہیں بنا سکی تھی اور خیر دین ایک بار پھر شیر دل سے اسی سوشل ورک کا خواہش مند تھا۔

''تم غنی حمید کو چھوڑ نہیں سکتیں؟'' اکیڈمی میں STP کی ٹریننگ کے دوران دوستی ہو جانے کے بعد یہ شیر دل کی طرف سے آنے والا پہلا مطالبہ تھا۔

''نہیں۔'' عکس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ جس رفتار سے گیند serve کر کے اس کے کورٹ میں پھینکی گئی تھی۔ اسی رفتار سے اسے return کر کے واپس شیر دل کے کورٹ میں پھینک دی گئی تھی۔

''کیوں؟'' شیر دل نے تڑاک سے پوچھا۔

''کیوں چھوڑوں؟'' کھٹاک سے جواب آیا۔

وہ اس وقت ٹریننگ کے دوران ہونے والی ملٹری attachment کے دوران ویک اینڈ پر اس سے ملنے آیا ہوا تھا۔ وہ دونوں دو قریبی کنٹونمنٹس میں ہی attached تھے اور شیر دل اس ویک اینڈ پر اسے وہاں سے لاہور لے جانے کے لیے اپنی دو دن پہلے ملنے والی نئی ہونڈا اکارڈ پر پک کرنے آیا تھا اور لاہور جاتے ہوئے شام کے وقت ان کے درمیان غنی حمید کے حوالے سے بحث چھڑ گئی تھی۔

''وہ پکا womanizer ہے۔'' شیر دل نے اس سے کہا۔ GT road پر سیدھا جانے کے بجائے اس نے ہمیشہ کی طرح ایک نئی بائی روڈ پر ٹرن لے لیا۔ عکس نے اس کی بات سنتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اپنی بائیں کلائی میں پہنی ہوئی اسپورٹس واچ میں سمت چیک کی۔ وہ جہاں سے چلے تھے وہ شمال تھا اور انہیں جہاں جانا تھا وہ مغرب تھا اور ایک شیر دل نے جو حالیہ موڑ مڑا تھا وہ مشرق کی سمت میں تھا تو لاہور جاتے ہوئے وہ سیدھا شمال سے مغرب کی طرف جانے کے بجائے شمال سے مشرق، مشرق سے جنوب اور جنوب سے پھر مغرب تک پہنچتے ...... سورج ان سے پہلے مغرب میں پہنچ جایا کرتا تھا کیونکہ وہ عکس مراد علی کو کسی گاڑی میں بٹھا کر اس کی منزل پر پہنچانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوتا تھا۔ وہ اب اس سفر میں ہونے والے ممکنہ اضافی کلومیٹرز کو منٹوں میں calculate کر کے ممکنہ وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش میں مصروف تھی جو انہیں لاہور پہنچنے میں لگنا تھا۔ اس نے شیر دل کے ساتھ ویک اینڈ پر لاہور تک ملنے والی ''لفٹ'' کے دوران roads، routes، directions کے بارے میں جتنا کچھ سیکھا تھا وہ ملٹری attachment کے دوران سارا دن کنٹونمنٹ میں ملٹری maps پڑھ پڑھ کر نہیں سیکھا تھا۔ شیر دل جیسے اس علاقے کے تمام roads اور routes

کے بارے میں اسے عملی معلومات دینے کا ذریعہ بنا ہوا تھا...... اور ہمیشہ کی طرح اس بات سے لاعلم تھا کہ وہ اسے اس بار کس طرح serve کر رہا تھا۔

''تو......؟'' عکس نے اندازہ لگایا کہ وہ اب رات نو بج کر چالیس منٹ کے قریب لاہور کی بیرونی حدود کے قریب ہوں گے...... اگر اس سے پہلے کوئی اور turn نہ لے لیا گیا۔

''تو؟'' شیر دل کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔

''ہاں تو؟''

''تمہیں اپنے دوست کے کرتوتوں کے بارے میں جان کر کوئی فرق نہیں پڑتا؟'' شیر دل نے جیسے بے یقینی سے کہا۔

''نہیں۔'' عکس نے بے حد اطمینان سے کہا۔ ''وہ میری بہت عزت کرتا ہے اور میرے لیے یہ کافی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں کیا کرتا ہے وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔''

''وہ ابھی تمہیں trap کرنے کے لیے جال بچھا رہا ہے۔'' شیر دل نے استہزائیہ انداز میں ہنس کر کہا۔

''جال میں جانور اور مچھلیاں آتے ہیں، میں انسان ہوں۔'' عکس نے اتنے ہی اطمینان سے جواب دیا۔ وہ شیر دل کی جھلاہٹ سے مکمل طور پر محظوظ ہو رہی تھی۔

''وہ کسی عورت کی عزت کرنے والا مرد نہیں ہے۔'' شیر دل نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''پھر مجھے اور بھی خوش ہونا چاہیے کیونکہ شاید وہ مجھے ''مرد'' سمجھ کر عزت اور پروٹوکول دیتا ہے...... برابر کا درجہ...... Good۔'' شیر دل اس کی حسِ مزاح سے محظوظ نہیں ہوا تھا۔ اس کو چند منٹ چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''تمہیں وہ کیوں پسند ہے؟''

''بہت ساری وجوہات ہیں، تم کتنی سننا چاہتے ہو؟'' عکس نے اس بار بھی اسی انداز میں کہا۔ شیر دل تپا تھا۔

''تم ریسرچ کرنا اس پر...... مجھے دلچسپی نہیں ہے کچھ بھی سننے میں۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم چاہو۔'' عکس نے بے حد پُرسکون انداز میں اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ شیر دل کچھ دیر خفگی کے عالم میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا پھر کچھ دیر بعد اس نے ایک بار پھر بات کا آغاز کیا۔

''وہ میرے بارے میں بہت کچھ کہتا ہو گا تم سے؟''

''نہیں۔''

''I don't believe it۔''

''یقین نہ کرنا یا کرنا تمہاری مرضی ہے لیکن وہ واقعی تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔'' عکس اب سنجیدہ ہو گئی تھی۔ وہ غنی حمید کے لیے شیر دل کی ناپسندیدگی کا بیک گراؤنڈ کسی نہ کسی حد تک جانتی تھی اور وہ غنی حمید کے اس ایشو کے بارے میں بات نہ کرنے کے باوجود یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بھی شیر دل کے بارے میں کم و بیش شیر دل والے ہی جذبات رکھتا تھا۔

''اس نے تمہیں منع نہیں کیا کہ تم مجھ سے دوستی نہ کرو۔''

''نہیں۔''

''میں یقین نہیں کر سکتا کہ اس کو کوئی اعتراض نہ ہوا ہو۔'' شیر دل نے سر جھٹکا۔

''اس کو اگر کوئی اعتراض ہوتا بھی تو مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی...... میں اس سے بھی یہی سب کچھ کہہ رہی ہوتی جو تم سے کہہ رہی ہوں۔ لیکن خوش قسمتی سے غنی نے کبھی تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی...... اچھی یا بری کوئی بات بھی۔'' عکس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''اس کے باوجود میں اس کے بارے میں سب کچھ کہتا رہا ہوں گا۔'' شیر دل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ضرور۔'' عکس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''اگر تمہارے پاس نان ایشوز پر بات کرنے کے لیے وقت ہے تو

www.paksociety.com

ضرور کیا کرو اس کے بارے میں بات۔'' شیر دل بے اختیار مسکرایا۔

''تو غنی ایک نان ایشو ہے؟'' اسے ایک عجیب سی ٹھنڈک محسوس ہوئی تھی جس کو ختم کرنے میں عکس نے دیر نہیں لگائی تھی۔

''میرے اور تمہارے درمیان غنی ایک نان ایشو ہے۔ وہ میرا دوست ہے ہمیشہ دوست ہی رہے گا...... تم اسے دشمن سمجھتے ہو...... That's ok with me۔'' شیر دل نے کچھ خفا سے انداز میں اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''وہ تمہیں بھی اسکینڈ لائز کرے گا تم یاد رکھنا۔''

''شیر دل میں اسے ڈیڑھ سال سے جانتی ہوں، مجھے اس سے کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیونکہ ہم عورت اور مرد بن کے نہیں ملتے، تم پریشان مت ہو میرے بارے میں۔'' اس نے شیر دل کو عجیب تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ اس کا خیال تھا شیر دل دوبارہ غنی حمید کے حوالے سے اس سے بات نہیں کرے گا لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ شیر دل نے غنی حمید کے حوالے سے اس سے بحث کرنا نہیں چھوڑی تھی اور عکس نے اس کے ساتھ اپنی بڑھتی ہوئی دوستی اور قربت کے باوجود غنی حمید کو نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا خیال تھا شیر دل، غنی کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ وہی کر سکتا تھا جو وہ ہمیشہ کرتا رہا تھا...... اس کی برین واشنگ کی کوشش...... یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی غنی اور اس کی دوستی کو کسی رشتے میں بدلنے سے روکنے کے لیے اس سے رابطہ بھی کر سکتا تھا...... شیر دل کے ساتھ وہ اس کا پہلا بڑا جھگڑا تھا جو شیر دل کی غنی کو کی جانے والی اس کال کے بعد ہوا تھا جو اس نے عکس کے یہ بات شیئر کرنے کے بعد کی تھی کہ غنی اس میں انٹرسٹڈ تھا اور اس نے عکس کو پروپوز کیا تھا۔

''شیر دل اس سے مل لیتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔'' خیر دین نے اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے پر ایک بار پھر اپنی بات دُہرائی۔ عکس نے ایک گہری سانس لے کر خیر دین کو دیکھا۔ وہ شیر دل کے لیے خیر دین کی شدید پسندیدگی سے واقف تھی لیکن وہ اس بات سے کبھی واقف نہیں تھی کہ خیر دین بھی شیر دل کے لیے اس کے دلی جذبات سے واقف تھا۔

''نانا اگر شیر دل سے مشورہ ہوتا رہا تو میری شادی کبھی نہیں ہوگی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے خیر دین سے کہا۔

''اس نے ہمیشہ صحیح مشورہ دیا ہے تمہیں...... ہمیشہ نقصان سے بچاتا رہا ہے وہ تمہیں...... پھر تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' خیر دین اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔ وہ جواباً خاموش ہوگئی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ خیر دین سے وجوہات کو کیا ڈسکس کرتی۔

خیر دین نے اس سے اصرار نہیں کیا تھا۔ جواد کے ساتھ اس کا رشتہ شیر دل کے ''مشورے'' سے بچ گیا تھا لیکن شراب والے واقعے میں پکڑے جانے کے بعد عکس اور خیر دین کے لیے اگلا دن بڑا تکلیف دہ تھا۔ دونوں اپنے تمام خدشات آنکھیں چراتے ہوئے جواد کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہے تھے اس کی بات کو سچ نظر آتے ہوئے بھی نہ ماننے کی کوشش کر رہے تھے۔

عکس کے لیے اگر کچھ مکمل طور پر ناقابلِ قبول تھا تو وہ شراب نوشی تھی۔ امریکا میں دو سال جواد کے ساتھ رہتے ہوئے اسے بھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ شراب پیتا ہے...... یا پی سکتا ہے۔ اس نے چند بار اس سے اس حوالے سے بات بھی کی تھی اور ہر بار جواد اتنے صاف لفظوں میں شراب کے لیے اپنی ناپسندیدگی جتاتا رہا کہ عکس کے لیے اب یہ ماننا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اس بارے میں اس سے جھوٹ بولتا رہا اور وہ ہمیشہ سے شراب پیتا رہا تھا...... یا پھر وہ جواد کو یہ مارجن دیتی کہ وہ عادی شراب نوش نہیں تھا پہلی بار ہی شراب پیتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔

جواد نے عکس کی نظروں میں اپنے آپ کو مزید اس وقت گرا لیا تھا جب اس نے اس کے آفس میں آکر اس سے تلخ کلامی کی تھی۔ عکس کے لیے اس کی شراب نوشی جتنی ناقابلِ یقین تھی اس کا یہ رویہ اس سے زیادہ ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے جواد کو کبھی ایک جاہل مرد نہیں سمجھا تھا۔ اس کے لیے یہ ماننا مشکل تھا کہ کوئی ہاورڈ سے پڑھنے والا کسی ذاتی نوعیت کے جھگڑے کو آفس تک لے جا کر وہاں شور مچانے کی کوشش کرے گا۔ جواد کے بارے میں یہ دوسرا خطرے کا الارم تھا جو اس کے لیے بجا تھا۔

اور خیر دین سے یہ معاملہ ڈسکس کرنے میں وہ متامل تھی۔ اس نے صبح خیر دین کی پریشانی رات والے اسکینڈل کی وجہ سے دیکھی تھی اور اب شام کو وہ اس کے سامنے جواد کے خلاف ایک نیا کیس رکھ دیتی۔ جواد کی شخصیت کی یہ تہیں کھلنے پر وہ جہاں رنجیدہ تھی وہاں اسے بے حد ندامت بھی تھی۔ جواد اس کا انتخاب تھا اور اس کا انتخاب انتہائی ناقص نکل رہا تھا۔

خیر دین سے بہت دیر یہ بات چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ کیونکہ عکس کے لیے ہی یہ بہت مشکل ہو گیا تھا کہ وہ اس mess میں ہوتے ہوئے خیر دین سے اس کا ذکر نہ کرے۔

''میں نے تمہیں بڑی محنت سے پالا ہے چڑیا اور میں نے یہ محنت اس لیے نہیں کی کہ کوئی دوسرا آکے اسے ضائع کرے۔ میں چاہتا ہوں تمہیں ساتھ دینے والا عزت دینے والا جیون ساتھی ملے صرف شوہر نہیں۔'' خیر دین نے ایک بار پھر جیسے اس کے کندھوں سے بوجھ ہٹا لیا تھا۔ اس رشتے سے نکل جانے کا آپشن اس کے سامنے رکھ دیا تھا جس سے نکلنا اسے بہت اعتبار سے مشکل لگ رہا تھا۔

''اللہ پر توکل بڑی شے ہے اور اللہ کے پاس خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ جو ہمیں کامل لگتا ہے اللہ کے پاس اس سے بھی اچھی اور عمدہ شے ہوتی ہے۔'' عکس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے وہ جانتی تھی اس کا نانا اس کے درد اور مشکل سے واقف تھا...... یہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا اس کے ساتھ کہ دل پسند شے چھوڑنی پڑ رہی تھی۔ پہلے ایک سلطان پھر غنی حمید اور اب جواد ملہی...... عکس جانتی تھی خیر دین کی گنتی میں ایک شیر دل نہیں تھا...... اس کی گنتی میں وہ سب سے پہلے نمبر پر تھا۔

''مجھے لگتا ہے نانا میرے ہاتھ میں شادی کی لائن نہیں ہے...... نہ شادی کی نہ اچھے ساتھی کی...... میرے نصیب کا یہ ایک خانہ خالی ہے...... میں خوامخواہ وقت ضائع کرتی ہوں relationships بنانے میں۔'' اس کے لہجے میں ایسی مایوسی خیر دین نے سالوں بعد دیکھی تھی اور وہ کٹ گیا تھا۔

''ناامیدی گناہ ہے چڑیا۔''

''ناامیدی کی بات نہیں ہے نانا...... بعض چیزیں حقائق ہوتی ہیں۔ ان سے نظریں چرانا بے وقوفی ہوتی ہے۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا تھا۔

''انسان کو اپنی تقدیر کے بارے میں اندازے نہیں لگانے چاہئیں۔ یہ حساب کا سوال نہیں ہے چڑیا...... ایمان کا حصہ ہے، رب پر ہی چھوڑ دینا چاہیے اسے۔'' خیر دین نے اسے سمجھایا تھا۔ ''تم بہت اچھی لڑکی ہو...... اللہ نے کتنی نعمتوں سے دامن بھرا ہے تمہارا...... اور اللہ کے پاس کوئی کمی نہیں ہوگئی نعمتوں کی۔'' عکس قائل ہوئی یا نہیں اس نے بحث نہیں کی تھی۔ خیر دین کو اپنے دکھتے ہوئے وجود کو سہلانے اور ان پر پھائے رکھنے دیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں باقی کی زندگی میں تمہیں وہ ساتھی ملے جو تمہاری عزت کو اپنی عزت سمجھے...... تم کو قیمتی اثاثہ سمجھ کر سنبھالتا پھرے...... میں اپنی چڑیا کو کسی کے سر کا تاج دیکھنا چاہتا ہوں پاؤں کی جوتی نہیں۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہنس دی۔ خیر دین اسے دن میں خواب دکھا رہا تھا۔ ہمیشہ ہی دکھاتا آیا تھا...... وہ انہیں خیالی پلاؤ سمجھ سکتی تھی زبان سے کہہ نہیں سکتی تھی۔

جواد ملہی سے رشتہ رکھنے نہ رکھنے کا فیصلہ وہ سنگاپور سے واپسی پر کرنا چاہتی تھی۔ وہ جواد اور اپنے آپ دونوں کو وقت دے رہی تھی۔ ایک بڑا فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کے لیے...... جواد کا رویہ ویسے بھی اس واقعے کے بعد ضرورت سے کچھ زیادہ اچھا اور محتاط ہو گیا تھا۔

''تم جواد کو فون کرلو۔'' شیر دل نے عکس کی حلیمہ سے بات کروانے کے بعد اسے مشورہ دیا تھا۔

''امی کہہ رہی ہیں وہ انکل کی فیملی میں سے کسی کو نانا کے پاس بھجوا دیں گی جب تک ان کی ٹکٹس کا نہیں ہو جاتا۔'' عکس نے فون اسے واپس دیتے ہوئے اپنے سوتیلے والد کے حوالے سے کہا۔

''تم پھر بھی جواد کو انفارم کرو۔'' شیر دل نے فون واپس لیے بغیر اصرار کیا۔ وہ کچھ دیر متامل رہی پھر اس نے کال ملانی شروع کر دی۔ شیر دل کال ملتے ہی اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ عکس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے بھی اندازہ نہیں تھا جواد سے اس کی گفتگو کس نوعیت کی ہو سکتی تھی۔

www.Paksociety.com

جواد کے لیے عکس کی کال غیر متوقع تھی۔ اگرچہ سنگاپور جانے سے پہلے دونوں کی آپس میں بات ہوئی تھی اور وہ اسے سی آف کرنے کے لیے بھی آنا چاہتا تھا لیکن عکس نے کوئی بہانہ بنا دیا تھا۔ وہ جواد کے حوالے سے جو فیصلہ کرنا چاہتی تھی اس کے بعد وہ جواد کے ساتھ کوئی ایسا وقت نہیں گزارنا چاہتی تھی جو اسے کمزور کر دیتا لیکن خیر دین کی اچانک آنے والی بیماری نے وقتی طور پر اسے عجیب طرح سے کمزور کیا تھا۔ جواد سے بات کرتے ہوئے اسے اندازہ ہوا خیر دین کے بعد جواد کے بھی نہ ہونے سے وہ بالکل تن تنہا ہو جانے والی تھی اور کچھ دیر کے لیے اس سوچ نے بھی اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ جواد اسے تسلیاں دیتا رہا اور وہ روتی رہی۔ وہ شیر دل نہیں تھا جس کے لفظوں اور آواز میں اس کے لیے جادو بوٹی جیسی تاثیر اور مسیحائی ہوتی لیکن پھر بھی دوسراہٹ کا ایک عجیب احساس ہو رہا تھا اسے جو اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔

شیر دل جب کمرے میں واپس آیا تو وہ فون بند کر چکی تھی اور اب اپنے دوبارہ آنسوؤں سے بھیگ جانے والے چہرے کو خشک کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بات ہو گئی؟" وہ اس سے بہت فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں...... وہ نانا کے پاس جا رہا ہے۔" عکس نے فون سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں نے تمہیں کافی پریشان کیا"۔ اس کو اب پہلی بار رات کے وقت کا اور شیر دل کی خواری کا احساس ہوا...... صبح اب قریب تھی اور وہ اتنے گھنٹوں سے ایک کے بعد ایک فون کرتا اور سنتا رہا تھا۔

شیر دل بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ تو تم کئی سالوں سے کر رہی ہو۔" اس نے جواباً دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ سائڈ ٹیبل پر پڑا فون اٹھا کر اس نے عکس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ اپنے پاس رکھو۔ تمہیں ضرورت پڑے گی اس کی پاکستان رابطہ کرنے کے لیے۔"

وہ جھجکی۔ "تم کیا کرو گے فون کے بغیر؟"

"اتنا لمبا کورس نہیں ہے میرا گزارہ ہو سکتا ہے۔ ضروری ہوا تو لے لوں گا یہاں سے کوئی فون۔" اس نے عکس سے کہا۔

سہ پہر کو وہ ابھی اپنا سامان سمیٹ کر فارغ ہوئی تھی جب شیر دل آ گیا تھا۔ "تم کیوں آئے ہو...... ابھی تو کلاس چل رہی ہو گی۔" عکس نے اس سے کہا۔

"تمہیں سی آف کرنا تھا میں نے۔"

"میں چلی جاتی ٹیکسی لے کر۔"

"تم سوئی نہیں؟" شیر دل نے بات بدلتے ہوئے اس کی سرخ اور متورم آنکھیں دیکھ کر کہا۔

"نیند نہیں آئی۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"کچھ کھایا ہے؟"

"شیر دل تم واپس جاؤ...... اپنا کورس خراب مت کرو میرے لیے...... کوئی نیگیٹو ریمارکس چلے گئے تمہاری رپورٹ میں تو تمہارے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔" عکس کو اس حالت میں بھی تشویش ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا۔" اس کے بیگز اٹھاتے ہوئے اس نے بے پروائی سے کہا تھا۔

فلائٹ دو گھنٹے لیٹ تھی اور عکس کی فرسٹریشن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شیر دل نے اسے زبردستی کھانا کھلایا تھا۔ وہ اندر جانے کے بجائے باہر وقت گزارنے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے عکس کو نیند آنے لگی تھی۔ وہ اس کا ذہن بٹانے کے لیے اسے دن میں اٹینڈ کی ہوئی کلاسز میں لیکچرز کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

"تمہیں نیند آ رہی ہے تو تم سو جاؤ۔" شیر دل نے اس کی بند ہوتی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ عکس نے بینچ کی پشت سے سر ٹکا کر نیم دراز ہوتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"تم ٹائم کا خیال رکھنا اور گھڑی دیکھتے رہنا۔" آنکھیں بند کرنے سے پہلے وہ اسے ہدایت دینا نہیں بھولی تھی۔ وہ فلائٹ مس کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"Don't worry" شیر دل نے اسے تسلی دی۔ وہ اب اس کا پہرا دینے لگا تھا۔ وہ اس کے بے حد قریب تھی۔ زندگی میں اگر وہ کبھی کسی رشتے کو صرف محبت کی کیٹگری میں بھی نہیں رکھ پایا تھا تو وہ اس عورت کے ساتھ رشتہ تھا...... اس کا دل اس کے وجود کے ساتھ تعلق کے کن کن دھاگوں سے بندھا ہوا تھا وہ کبھی بیٹھ کر گن نہیں پایا۔ گنتا تو دھاگے الجھ جاتے اور مشکل اسی کو ہوتی۔

نیند کے جھونکے میں وہ اس کی طرف جھکی۔ شیر دل اس کے قریب ہو گیا اس نے جیسے اس کے سر کو ٹکانے کے لیے سہارا دیا تھا۔ وہ نیند میں ہی کچھ اور اس کی طرف جھک آئی۔ شیر دل کو شہر بانو یاد آئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح سفر کرتے ہوئے اکثر سو جایا کرتی تھی۔ اس کے کندھے پر سر ٹکائے اس کے پیٹ کے گرد بازو حمائل کیے وہ کسی بچے کی طرح اس سے لپٹ کر سوتی تھی...... ملکیت کے احساس کے ساتھ تحفظ کے اعتماد کے ساتھ۔ وہ سارا راستہ اپنے laptop پر کام کرتا رہتا یا کوئی کتاب پڑھتا رہتا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کے جسم کی کسی حرکت سے شہر بانو کی نیند خراب نہ ہو۔ بعض دفعہ ایک ہی حالت میں کئی گھنٹے بیٹھے ہوئے اس کے جسم کا وہ حصہ بھی سن ہو جاتا تھا اور تب وہ بڑی احتیاط کے ساتھ شہر بانو کو خود سے الگ کرتے ہوئے جیسے کچھ دیر کے لیے خود کو آرام دینے کی کوشش کرتا اور شہر بانو تب بھی سوئی رہتی۔ وہ چند منٹ آرام کرنے کے بعد اسے پھر اپنے ساتھ لگا لیتا تھا اور وہ پھر اسی طرح نیند میں اس سے لپٹ کر سو جاتی...... شیر دل، شہر بانو کے ساتھ سفر کے دوران آج تک کبھی نہیں سو سکا تھا وہ سوتی جاگتی کیفیت میں رہتا لیکن کبھی آنکھیں بند نہیں کر پاتا تھا۔ عجیب لاشعوری انداز میں وہ جیسے شہر بانو کی حفاظت کر رہا ہوتا تھا۔ وہ نیند میں بھی بعض دفعہ اپنا سر اور ہاتھ پاؤں کہیں نہ کہیں مار لیتی تھی۔

عجیب بات تھی وہ شہر بانو کو دیکھتا تو اسے عکس یاد آتی اور اب عکس کو دیکھ رہا تھا تو شہر بانو یاد آنے لگی تھی۔ اس کا دل دو عورتوں سے عجیب انداز میں بندھا ہوا تھا۔ عکس نے نیند میں اپنے جسم کو ذرا سا ٹیڑھا کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔ شیر دل کچھ دیر کے لیے حرکت کرنا بھول گیا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کے بازو سے سرکتے سرکتے اس کے ہاتھ پر آ کر ٹک گیا تھا اور اس کے ہاتھ کی ایک انگلی میں شیر دل نے وہ انگوٹھی دیکھی جو اسے ایک جھٹکے سے جیسے اس خیالی دنیا سے باہر لے آئی تھی۔

"یار دیکھو تمہاری اور میری شادی صرف ایک سال چلنی ہے...... زیادہ سے زیادہ...... تو تم ایک سال کے لیے مجھ سے شادی کر لو اس کے بعد تم وہاں شادی کر لینا جہاں تمہارے نانا کہیں اور میں اپنی فیملی میں کہیں شادی کر لوں گا۔" اس نے اپنا پرپوزل چوتھی بار ریجیکٹ کرنے پر جھلا کر عکس سے کہا تھا۔

"یہ funny بات نہیں ہے cheap بات ہے۔" عکس نے بڑے اطمینان سے اس سے کہا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہ یقین کیوں نہیں آ رہا کہ مجھے واقعی تم سے محبت ہے اور میں تمہارے بارے میں سیریس ہوں۔" شیر دل نے اس کی لعنت و ملامت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اصل میں کسی اور سے محبت ہے اس لیے۔" اس نے شیر دل کے سر پر جیسے بم پھوڑا تھا۔

نیند میں عکس نے پبلک اناؤنسمنٹ سسٹم پر کوئی آواز گونجتی سنی اس نے یک دم ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی فلائٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔ چیک ان اسٹارٹ ہو چکا تھا اور اس کے برابر بیٹھا شیر دل گہری نیند میں تھا۔ اس نے اپنا ٹکٹ نکال کر ایک بار پھر چیک کیا۔ وہ اسی کی فلائٹ تھی جو دو گھنٹے کے بعد اب روانگی کے لیے تیار تھی۔ اس کی آنکھ اگر خود نہ کھل جاتی تو وہ اور شیر دل یقیناً وہیں سوئے پڑے رہتے۔

"شیر دل، شیر دل...... اٹھ جاؤ۔" اس نے شیر دل کا بازو تھپتھپایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

"oh my god...... میں کیا سو گیا تھا؟"

"تم اب جاؤ...... تھکے ہوئے ہو۔" عکس کو اسے سوتے دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ وہ بھی اس کے جانے کے بعد سو نہیں سکا تھا اور صبح کلاسز ہونے کی وجہ سے دن میں سونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

"تمہارا فون!" وہ اب بیگ سے اس کا فون نکال کر اسے دے رہی تھی۔

www.Paksociety.com

''اسے پاس رکھو۔ connecting flight ہے...... پتا نہیں آگے کہیں مزید delay نہ ہو جائے۔ میں کم از کم تم سے رابطے میں تو رہوں گا۔'' وہ اس کا سامان اٹھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

انٹرنیشنل ڈیپارچر کے سامنے کھڑے اسے رخصت کرتے ہوئے شیر دل نے اس سے کہا۔ ''مجھے شاید تمہارے ساتھ جانا چاہیے تھا۔'' عکس کا دل بھر آیا تھا۔ وہ فکرمندی بناوٹی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے حوالے سے تشویش میں مبتلا تھا۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں، تمہیں کورس مس نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارے لیے ضروری ہے یہ کورس۔ ورنہ تو میں شاید چاہتی کہ تم بھی ساتھ آتے نانا تم سے مل لیتے...... تمہیں بہت پسند کرتے ہیں وہ۔'' بات کرتے ہوئے اس کی آواز پھر بھرائی تھی۔

''میں سنگاپور آتے ہوئے ان سے مل کر آیا تھا۔'' وہ فریز ہو گئی۔ ایک لمحے میں اس نے خیر دین کی اس اچانک بیماری کی وجہ کو جان لیا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو نے آج جانا تھا کہ لاعلمی کو نعمت کیوں کہا جاتا تھا...... منزہ کی فون کال بند ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک بت بنی فون گود میں رکھے بیٹھی رہی تھی۔ پتا نہیں زندگی میں ناممکنات کہاں پائے جاتے ہیں اور کس کے لیے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے تو وہ یک دم اپنا وجود اور مفہوم ہی کھو بیٹھے تھے۔ شیر دل اور عکس...... شیر دل، عکس سے شادی کرنا چاہتا تھا...... اور وہ شہر بانو اس کی زندگی میں متبادل کے طور پر آئی تھی...... اتنے سالوں میں متبادل ہی رہی تھی شاید...... اور عکس اور اس کے نانا کی وجہ سے اس کی ممی اور پاپا میں علیحدگی ہوئی تھی۔ ان کا گھر ٹوٹا تھا۔ پتا نہیں کس بات کا رنج اور غصہ زیادہ تھا اس کو...... رنج اور غصے کے علاوہ ایک تیسرا احساس دھوکے اور تذلیل کا تھا۔ شیر دل اس کی آنکھوں کے سامنے عکس سے افیئر چلا رہا تھا اور اسے شائبہ تک نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے شوہر پر، اس کی محبت پر اس کی وفاداری پر فخر کرتی رہی، قصیدے پڑھتی رہی۔ وہ اس کی آنکھوں میں اس طرح دھول کیسے جھونک سکتا تھا...... کس طرح سے زیادہ بڑا سوال تھا کہ کیوں جھونک رہا تھا۔

زندگی میں جن چند چیزوں کو ایک عورت کبھی سمجھ نہیں پاتی اس میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرد جو آپ کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو، آپ سے چاند ستارے توڑ لانے کے وعدے کرتا ہو، وہ اچانک کسی اور کی محبت میں گرفتار کیسے ہو جاتا ہے...... کیسے ہو سکتا ہے؟ اخلاقیات نام کے ڈھیر میں سے کوئی ایک بھی اس کے لیے رکاوٹ کیوں نہیں بنتی اور یہاں پر معاملہ اس سے بھی زیادہ خراب تھا۔ وہ اسے زندگی میں اس لیے لے کر آیا تھا کیونکہ وہ اس عورت سے شادی نہیں کر سکا تھا جس سے وہ کرنا چاہتا تھا...... منزہ نے اس سے کہا تھا کہ عکس اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ شہر بانو کم از کم اب اس معاملے کو ون سائیڈڈ سمجھنے پر تیار نہیں تھی۔ شیر دل کی زندگی میں عکس نام کا ڈارک ہول اب کم از کم شہر بانو کے لیے ڈارک نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے اندر جھانک کر دیکھ سکتی تھی لیکن یہ مسٹری اس کی زندگی میں بہت غلط وقت پر حل ہوئی تھی، وہ عکس مراد علی کے ساتھ سنگاپور میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ اس کے کہنے پر بے وقوفوں کی طرح آ کر امریکا بیٹھ گئی تھی۔ اسے امریکا کا ٹرپ لمبا کرنے کا مشورہ اسی کا تھا اور وہ اس کی عدم موجودگی میں عکس مراد علی کی جنگ لڑنا چاہتا تھا...... کس کے خلاف؟ اس کے پاپا کے خلاف...... جن کا وہ کبھی فیورٹ ہوا کرتا تھا۔ اس نے اتنے سالوں میں کبھی ایک بار اسے تکلیف نہیں پہنچائی تھی اور اب تکلیف پہنچانے پر آیا تھا تو بیک وقت کہاں کہاں سے ہرٹ کر رہا تھا۔

خیر دین اور اس کی نواسی...... عکس مراد علی...... اس کے ماں باپ کے جھگڑے...... اور دو ناموں کی بازگشت...... خیر دین اور چڑیا...... وہ ان ناموں کو بھول چکی تھی...... زندگی اسے بہت آگے لے آئی تھی لیکن آج منزہ کی ایک کال نے اسے علیحدگی سے پہلے شرمین اور شہباز کے درمیان ہونے والے شدید جھگڑوں کی یاد دلائی تھی جس میں شرمین، شہباز کو برا بھلا کہتی تھی ''کسی چیز'' کے حوالے سے...... وہ کیا چیز تھی شہر بانو کو نہ اس وقت سمجھ آیا تھا نہ اب یاد آ رہا تھا...... چڑیا کے حوالے سے بہت ساری باتیں...... بہت سارے الزامات لگتے دیکھتی...... الزامات...... جنہیں وہ سمجھ نہیں پاتی تھی لیکن

چڑیا کا نام اس کے حافظے کا حصہ بن گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے ماں باپ کے جھگڑوں میں اس نام کو بار بار سنا تھا۔ اس وقت اسے چڑیا یاد تھی وہ اس کی محبت میں گرفتار تھی اور وہ حیران تھی کہ اس کے ماں باپ چڑیا کی وجہ سے کیوں جھگڑتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ چڑیا اور اس کا نام اس کے حافظے سے غائب ہوتا گیا۔ اسے یہ بھی بھولتا گیا کہ آٹھ نو سال کی عمر میں اس کے ماں باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں کی نوعیت اور وجہ کیا تھی اور اب آج جیسے منزہ کے عکس کو اس کے ماں باپ کی علیحدگی کی وجہ قرار دینے پر اسے یاد آ گیا تھا...... کہ اس کے ماں باپ کے درمیان کسی ملازم اور اس کی بچی پر جھگڑا ہوتا تھا لیکن شہر بانو کو اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں تھا۔

ساڑھے تین سے ساڑھے چار سال وہ راک اسٹار کے اسٹارڈم والی جس چڑیا کے عشق میں گرفتار رہی تھی اسے اس وقت کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ نہ چڑیا نہ وہ وقت نہ وہ گھر...... صرف اسکول تھا جس کے بارے میں اسے شرمین کے بتانے کی وجہ سے یاد تھا کہ اس نے اپنی اسکولنگ کا آغاز وہاں سے کیا تھا اور یہ بات شیر دل بھی اس کے بتائے بغیر جانتا تھا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ بھی بچپن میں وہاں رہ چکی تھی۔ تب وہ بہت چھوٹی تھی اور تب وہ بھی وہاں چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ شہر بانو نے بڑی دلچسپی سے شیر دل کی گفتگو سنی تھی۔ شیر دل پاکستان میں گزارے جانے والے سالوں میں جھانکنے والی اس کی واحد کھڑکی تھی۔ شرمین اس کی اور اپنی زندگی کے اس حصے کے بارے میں بات ہی نہیں کرتی تھی۔ شیر دل کرتا تھا۔ اسے جو کچھ شہر بانو کے بارے میں، اس کے بچپن کے حوالے سے علم تھا اس نے شہر بانو کو وہ بتا دیا تھا...... جب بھی جو بھی یاد آ جاتا تھا وہ بتا دیا کرتا تھا...... اسی نے اسے اس گھر کے بارے میں بھی بتایا تھا جب وہ وہاں رہنے کے حوالے سے خائف تھی۔ اور شہر بانو کو یہ جان کر ایک عجیب سی طمانیت ہوئی تھی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ اس سے پہلے اس گھر میں رہ چکی تھی...... اور اگر وہ گھر اتنا خوفناک ہوتا تو اس کے پاپا اسے کیسے وہاں رہنے دیتے...... وہ گھر یک دم اس کے لیے آسیب زدہ نہیں رہا تھا۔ وہ اس گھر میں پھرتے ہوئے ہر جگہ پر شہباز حسین کی موجودگی کے احساس سے دوچار رہتی تھی اور اسے جیسے یقین ہو گیا تھا کہ وہاں اسے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

گھر میں ہونے والے عجیب و غریب واقعات کے باوجود شہر بانو کا ابتدائی خوف اور بدحواسی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ گھر اس کی زندگی کو دوسری بار تباہ کر رہا تھا۔ مثال دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔

''ممی پارک جانا ہے۔'' مثال نے اس کے قریب آ کر اس کا ہاتھ کھینچا۔ وہ ماں کا چہرہ پڑھ سکتی تو کبھی اس وقت اسے کہیں جانے کے لیے نہ کہتی۔ شہر بانو لٹھے کی طرح سفید چہرے کے ساتھ ایک ممی کی طرح وہاں بیٹھی تھی یوں جیسے اس کا سارا خون کسی نے نکال لیا تھا۔ منزہ کی کال ایک ڈریکولا کی طرح لگی تھی اسے۔

''ممی۔'' مثال نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ کھینچا۔ شہر بانو نے مثال کا چہرہ دیکھا اور اس کا دل بھر آیا۔ وہ ایک بت سے گوشت پوست کے انسان میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنا سارا بچپن ماں باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں، گھر ٹوٹنے کے خوف اور گھر اور باپ کے ختم ہو جانے کے trauma میں گزاری تھی...... لیکن اس کے پاس بچپن کے پھر بھی کچھ اچھے اور یادگار سال تھے...... وہ چند سال جب وہ لاہور میں تھے جب شرمین اور شہباز کے درمیان جھگڑے ہونا شروع نہیں ہوئے تھے...... جب اس کے ماں باپ نے اسے کسی آنے والے بہن یا بھائی کی نوید سنائی تھی اور وہ اس کے بارے میں اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ ایکسائیٹڈ تھی جب زندگی مزہ تھی...... سکون...... تحفظ...... انجوائے منٹ سے بھرپور...... جب وہ ایلس تھی لیکن اپنے ماں باپ کے ساتھ تھی ونڈر لینڈ میں نہیں۔

اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا زندگی اسے اور اس کی اولاد کو کبھی اسی راؤنڈ اباؤٹ پر لے آئے گی جہاں سے وہ اپنے پیر اور وجود زخمی کر کے گزر چکی تھی...... وہ مثال اور شیر دل کو ساتھ دیکھ کر اپنی ہی بیٹی پر رشک کیا کرتی تھی...... وہ اس سے بہتر بچپن اور بہتر زندگی گزار رہی تھی اور اسے یقین تھا اس کا سارا بچپن ایسے ہی ہنستے مسکراتے اپنے ماں باپ کی مضبوط پناہ میں گزر جائے گا...... اور اب......

شہر بانو نے مثال کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور رونے لگی۔ پتا نہیں بڑے بچوں کے سامنے روتے ہوئے یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھیں گے کچھ نہیں کھوجیں گے کوئی سوال نہیں کریں گے...... اور انہیں ان آنسوؤں سے تکلیف بھی نہیں ہو

www.paksociety.com

گی...... کیونکہ وہ بچے ہوتے ہیں...... آنسو ہر ایک پر ایک جیسا اثر کرتے ہیں...... درد ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے...... غم کو ہر کوئی سمجھ لیتا ہے...... بڑوں اور بچوں کے درمیان فرق صرف لفظوں کی کمی کا ہوتا ہے عمر کے سالوں کا نہیں۔

مثال بھی اپنے وجود سے لپٹی ماں کے بہتے آنسوؤں اور سسکیوں سے شاکڈ اور حواس باختہ تھی۔ یہ اس کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ اس کی ماں کو اپنے آنسوؤں اور تکلیف شیئر کرنے کے لیے اس سے لپٹنا پڑا ہو ورنہ یہ کام وہ کیا کرتی تھی۔

''پاپا کو بتاؤں کہ ممی رو رہی ہے۔'' پہلا خیال اسے وہی آیا تھا جو اسے آنا چاہیے تھا۔ اس کی ہر بات پاپا کو بتا کر شروع ہوتی تھی یا اس پر ختم ہوتی تھی۔ شیر دل، شہر بانو کی طرح اس کی بھی زندگی کا محور تھا۔ وہ پارک بھول گئی تھی۔ کینڈیز بھی بھول گئی تھی، جھولے بھی بھول گئی تھی اور باتیں بھی بھول گئی تھی...... وہ بس کھڑی رہی...... گم صم...... پریشان...... الجھی ہوئی...... وہ شہر بانو کو تسلی دینا چاہتی تھی نہیں دے سکی...... اس کے آنسو پونچھنا چاہتی تھی وہ بھی نہیں کر سکی...... وہ دونوں بڑوں کے کام تھے وہ کرنا نہیں جانتی تھی لیکن اس نے وہی کیا جو وہ اپنی باربی ڈول کو سلانے کے لیے کرتی تھی...... نیند میں آنسو رک جاتے ہیں وہ کم از کم یہ تو جانتی ہی تھی۔ اس نے شہر بانو کا سر تھپکنا شروع کر دیا...... اس کی تھپکیوں نے شہر بانو کی سسکیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔

''Do you want to talk to papa?'' مثال نے بالآخر اس کی سسکیوں سے پریشان ہو کر کہا۔

''Are you missinq papa...?'' اس نے اوپر نیچے شہر بانو سے سوال کیے۔ یوں جیسے اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی جو اس کی ماں کو پریشان کر کے رُلاتی۔

''I would never speak to your papa again۔'' اس کے جواب نے مثال کو شاکڈ کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ صدمے کی حالت میں باری باری ان تمام کاغذات کو دیکھتا گیا تھا جو اس کی ماں نے کچھ دیر پہلے اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے ان کاغذات میں موجود کیس کی نوعیت بتاتے ہوئے آگ بگولہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''تم اس عورت کی جرأت دیکھو کہ کس دھڑلے سے تمہیں فریق بنا رہی ہے وہ...... انگور کھٹے ہیں والی صورتِ حال ہو گئی ہے یہ تو...... تم نے شادی نہیں کی اس کے ساتھ...... وہ کر لیتے تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا اور اب وہ گڑے مردے اکھاڑنے پر تلی ہوئی ہے...... نانا کے ساتھ ناانصافی ہوئی...... یہ تو شہباز کا بڑا پن تھا کہ اس نے اس بڈھے کو سزا میں جیل نہیں کروائی ورنہ جتنا مالی نقصان وہ پہنچاتا رہا تھا اسے اصولی طور پر جیل کروا دینی چاہیے تھی اسے...... ایسے لوگوں پر ترس کھانے اور چھوٹ دینے کا مطلب اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہوتا ہے...... آستین کے سانپ کو دودھ پلانے والی بات ہے یہ تو...... اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا میں کیوں تمہاری اس کے ساتھ شادی کرنے پر تیار نہیں تھی۔ میں پہلے دن سے اس کی اصلیت جانتی تھی۔ اس لیے بار بار تمہیں منع کرتی تھی کہ اس سے دور رہو لیکن تم پر بھی میری کسی بات کا اثر نہیں ہوا...... اب دیکھ لیا نا کہ خاندان اور خاندانی پن کی کیا اہمیت ہوتی ہے...... خاندان اپنا آپ دکھاتا ہے شیر دل جیسے اس عورت کا دکھا رہا ہے۔'' وہ سر جھکائے ان کاغذات کو ہاتھ میں لیے بت کی طرح اس میں ایک ہی نام کو بار بار مختلف صفحات پر دیکھ رہا تھا...... وہ شہباز حسین کے داماد اور بھانجے کے طور پر فریق بنایا گیا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے شہر بانو اور منزہ کو فریق نہیں بنا ڈالا تھا۔ منزہ کا کوئی ایک جملہ کوئی ایک لفظ شیر دل کی سمجھ میں نہیں آیا تھا...... اس کا ذہن اس وقت کچھ ایسا ہی مفلوج ہوا تھا۔

ڈاکٹر عکس مراد علی...... اور وہ برہنہ لرزتی کانپتی روتی اور چلاتی ہوئی چڑیا...... ان دونوں ناموں میں ایک شیر دل کوئی تعلق کیسے نکال پاتا...... وہ طاقت اور بے بسی کو آپس میں کیسے جوڑتا...... آخری image جو اس نے چڑیا کا اس رات کے پچھلے پہر دیکھا تھا اس نے موسم گرما کی ان چھٹیوں میں اس کے ساتھ گزارے ہوئے تمام خوشگوار لمحات اور یادوں کو اپنی ہولناکی اور بدصورتی سے گہنا دیا تھا...... چڑیا اسے جب بھی یاد آئی تھی اسی ایک منظر کے حوالے سے آئی تھی اور

وہ اس منظر کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جس نے اس کی زندگی میں سے اس کا آئیڈیل نکال دیا ہے...... کچھ بھی نہ سمجھ پانے کے باوجود اس نے شہباز حسین کا وہ بت ضرور توڑ دیا تھا جس کی وہ پرستش کرتا تھا...... وہ ہمیشہ انکل شہباز کی طرح ہونا چاہتا تھا لیکن وہ اب کبھی انکل شہباز کی طرح نہیں بننا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر عکس مراد علی...... اور...... چڑیا...... اور خیر دین...... ایک گہری سانس لے کر اس نے ان تمام کاغذات کو واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پانی پیا...... ماؤف اعصاب اور حواس کو بحال کرنے کے لیے وہ اس وقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جو کچھ اس نے چند لمحوں پہلے دیکھا اور پڑھا تھا وہ اس کا بدترین خواب تھا۔

''میں نے تمہارے پاپا کو ابھی کچھ نہیں بتایا انہیں پتا چلے گا تو وہ تو حشر کر دیں گے اس عورت کا...... اور ساتھ تمہارا بھی...... کیونکہ تمہاری دوستی نے ہی اس عورت کو اتنی جرأت دی ہے...... اب جا کر ملو اس سے...... اور شٹ اپ کال دو اسے...... یا پھر تم کو پہلے سے پتا تھا کہ وہ کون تھی اور کیا کرنے والی تھی۔'' منزہ نے تحکمانہ انداز میں اس سے بات کرتے کرتے اچانک کسی وہم میں اس سے پوچھا۔

شیر دل نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''نہیں' میں نہیں جانتا تھا۔'' اس نے مختصراً ماں سے کہا اور منزہ کو اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

وہ وہاں تین گھنٹے بیٹھا منزہ کی باتیں سنتا رہا، وہ غصے میں تھی اور بہت زیادہ ہرٹ بھی...... شہباز اس کا اکلوتا بھائی تھا۔ اسے حد سے زیادہ عزیز تھا۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اس کی ناگہانی موت کا صدمہ بھول نہیں سکی تھی اور اب اس کے اسی عزیز ترین اکلوتے بھائی کو اس کی موت کے بعد کوئی ایک ''برا'' ثابت کرنے پر تل گیا تھا۔ وہ تڑپ نہ جاتی تو کیسے نہ تڑپ جاتی۔ شیر دل کو اپنی ماں کی تکلیف کا اندازہ تھا...... اس کو اس شاک اور تکلیف کا بھی اندازہ تھا جو شہر بانو کو اس کیس کے بارے میں جاننے سے ہو سکتی تھی۔

''آپ شہر بانو سے کچھ مت کہیے گا۔'' شیر دل نے منزہ کی گفتگو کے اختتام پر اٹھتے ہوئے کہا۔ وہاں سے واپسی کا سارا سفر بھی اس نے اسی گم صم کیفیت میں کیا تھا۔ وہ عکس کے بارے میں سوچتا رہا اور وہ چڑیا کے بارے میں سوچتا رہا...... ڈاکٹر عکس مراد علی پہلے دن سے اس سے واقف تھی۔ کم از کم وہ اب یہ خوش فہمی نہیں پال سکتا تھا کہ وہ اکیڈمی میں آنے کے بعد اس سے متعارف ہوئی تھی...... اتفاقاً...... وہاں یقیناً بہت کچھ اتفاق نہیں تھا...... وہ اسے کیوں اس بری طرح سے avoid کرتی تھی۔ اس کی وجہ وہ اب سمجھ پا رہا تھا، وہ اس کی arrogance نہیں تھی اس کا ایک شیر دل ہونا تھا جو اس کے لیے مسئلہ تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی پہلی بار ان کے درمیان برف کیسے پگھلی تھی۔ رقابت اور انا کی برف...... اسے یاد آیا تھا وہ STP کی ٹریننگ کے دوران کنٹری ٹور پر ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے اور وہاں ریسٹ ہاؤس میں لنچ کے دوران اس کے حلق میں مچھلی کھاتے ہوئے کانٹا پھنس گیا تھا۔ اس نے کھانسنا شروع کیا، چند لمحوں کے لیے اسے سانس لینے میں دقت ہوئی۔ پورا گروپ فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور عکس اٹھ کر اس کے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس گروپ میں موجود واحد ڈاکٹر تھی اور شیر دل کو فرسٹ ایڈ دینا کہے بغیر بھی اسی کی ذمے داری تھی۔ بالکل ایک پروفیشنل ڈاکٹر کی طرح شیر دل کو دلاسا دیتے ہوئے اس نے اس کی پشت کو تھپکا۔ پھر سامنے پڑی چپاتی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر شیر دل کو نگلنے کے لیے دیا۔ ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا لقمہ نگلنے پر بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ البتہ شیر دل کو اب سانس لینے میں پہلے جیسی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ عکس نے روٹی کے ٹکڑوں کے کام نہ کرنے پر ایک گلاس میں لیموں کا رس نکلوا کر پلایا تھا۔ اس سے شیر دل کا کانٹا نکل گیا تھا لیکن گلا بیٹھ گیا تھا۔

رات کے وقت وہ ریسٹ ہاؤس کے لان میں سگریٹ پینے کے لیے آ کر بیٹھا تھا۔ ان دنوں اس نے نئی نئی اسموکنگ شروع کی تھی جب اس نے عکس کو بھی لان میں واک کرتے دیکھا۔ وہ سگریٹ سلگاتے سلگاتے رک گیا اور اس کی طرف چلا آیا۔ وہ بھی اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر رک گئی تھی۔

''گلا کیسا ہے اب تمہارا؟'' اس نے شیر دل سے پوچھا۔

WWW.Paksociety.com

''بہتر ہے۔'' شیر دل نے اپنی لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ وہ ہمدردانہ انداز میں مسکرائی۔

''گرم پانی سے غرارے کرنے چاہئیں اب تمہیں نمک ڈال کر...... میرا خیال ہے صبح تک بہتر ہو جائے گا۔'' اس نے پھر کسی فزیشن کی طرح اس سے کہا تھا۔ شیر دل نے بات کرتے کرتے اس کی نظروں کو اس کے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ اور لائٹر پر مرکوز دیکھا تھا پھر وہ دوبارہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

''ویسے ایک لحاظ سے تو اچھا ہے۔ اب کچھ وقت تو تم چپ رہو گے۔'' شیر دل نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی لیکن جملہ سنجیدہ نہیں تھا۔

''مطلب؟'' وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا لیکن پھر بھی پوچھنے سے نہیں چوکا تھا۔

''کوئی خاص مطلب نہیں۔'' عکس نے اطمینان سے کہا۔

''تم اگر ڈاکٹر ہوتیں تو اچھی ڈاکٹر ہوتیں۔'' اس نے دقت کے ساتھ بھی بولنے سے گریز نہیں کیا۔

''میں جانتی ہوں۔'' جواب کمال اطمینان سے آیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

''میں بھی واک کرنے آیا تھا۔'' شیر دل نے کہا۔

''ضرور کریں۔'' عکس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے لان کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسری طرف چل دی۔ شیر دل کچھ لمحوں کے لیے بالکل ٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ پھر وہ بے اختیار اس کے عقب میں آیا۔ عکس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ شیر دل ڈھٹائی سے مسکرایا تھا۔

''ہم ساتھ بھی کر سکتے ہیں واک۔''

''ساتھ صرف باتیں ہو سکتی ہیں واک نہیں۔''

''میرا گلا خراب ہے اس لیے آج میں صرف تمہیں سنوں گا۔'' شیر دل نے بڑی فیاضانہ آفر کی۔

''اور میرے پاس سنانے کے لیے کچھ ہے نہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''ہو سکتا ہے کچھ یاد آ جائے۔'' شیر دل نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے عکس کو ایک گہری سانس لے کر کہتے ہوئے سنا۔

''ہاں یاد تو بہت کچھ آ سکتا ہے لیکن میں کچھ یاد نہیں کرنا چاہتی۔''

''ویسے یہ حیرانی کی بات ہے کہ ہم میں بات چیت کا سلسلہ اتنا محدود ہے۔'' شیر دل نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ عکس نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔

''تمہاری کوئی رائے نہیں ہے؟''

''اگر تم اس طرح بولتے رہے تو اگلے دو دن بھی تمہارا گلا اسی طرح رہے گا۔'' عکس نے یک دم اسے ٹوک کر وارن کیا۔ ''مجھے اگر یہ غلط فہمی تھی کہ تم اپنے گلے کی اس حالت کے ساتھ بول نہیں سکتے تو وہ دور ہو گئی۔'' شیر دل بے اختیار ہنسا۔

''اگر تم بات نہیں کرو گی تو ظاہر ہے مجھے ہی بات کرنی پڑے گی۔'' اس نے جیسے ملبہ عکس کے سر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے سوچنے کا موقع دو گے تو میں بات کروں گی نا۔'' اس نے ساتھ چلتے ہوئے جواباً کہا۔

''اچھا سوچو۔'' شیر دل نے فوراً پسپائی اختیار کی اور خاموش ہو گیا۔ عکس اس کے ساتھ چلتے ہوئے کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے ایک بہت عجیب سوال کیا تھا۔

''تم مجھے ناپسند کرتے ہو؟'' شیر دل کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکا...... سوال اتنا ہی غیر متوقع تھا پھر چند لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا۔

''ناپسند...... تو نہیں...... لیکن ہاں تم مجھے کچھ عجیب لگتی تھیں۔''

''لگتی تھی؟'' عکس نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں پہلے زیادہ لگتی تھیں۔ اب تھوڑا کم لگتی ہو اور آج تھوڑا اس سے بھی کم۔'' وہ مسکرا دی۔ ''تم بھی تو مجھے ناپسند کرتی ہو؟''

''No way۔'' عکس نے بے ساختہ کہا۔

''اچھا؟ مجھے ہمیشہ لگا۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ تم غنی حمید کے ساتھ ہوتی ہو زیادہ تر...... میں نے سوچا شاید اس نے میرے بارے میں ایسا کچھ کہا ہے کہ تم مجھے ناپسند کرنے لگی ہو۔'' شیر دل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''غنی حمید نے مجھے تمہارے بارے میں کیا کہنا تھا؟'' عکس نے جواباً بڑی سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

''کوئی جھوٹ۔''

''میں جھوٹ پرکھ سکتی ہوں۔''

''بعض لوگ بہت اچھا جھوٹ بولتے ہیں، ان کے جھوٹ کو پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔'' شیر دل نے سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو تم لیکن غنی بہت اچھا انسان اور دوست ہے۔'' بڑے سادہ سے انداز میں بنا سوچے سمجھے کہے گئے اس جملے نے شیر دل کو جلا کر کوئلہ کر دیا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا زندگی میں وہ کسی عورت کو اتنی attention دیتا پھر رہا ہو اور وہ پھر بھی اس کے سامنے کسی دوسرے مرد کے گن گائے اور وہ بھی غنی حمید کے جس کی وہ شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرتا ہو۔

''اچھے انسان کا تو مجھے یقین نہیں لیکن تمہارا دوست ضرور ہے وہ۔'' شیر دل کے لہجے کی گرم جوشی یک دم غائب ہو گئی تھی۔ ''او کے...... میں چلتا ہوں۔''

''Good night۔'' عکس نے جواباً اس سے کہا۔ وہ شدید خفا ہوا اور اسے جواباً گڈ نائٹ کہے بغیر وہاں سے آ گیا۔ اس کا خیال تھا وہ جانے کا ارادہ ظاہر کرے گا اور وہ اسے روکنے کی کوشش کرے گی۔ دل سے نہ سہی رسماً ہی اسے رکنے کا کہہ دے گی...... عکس مراد علی نے ایسی کوئی رسم نہیں نبھائی تھی۔ یہ بالکل ایسا تھا ''میں جا رہا ہوں۔'' ''سو بسم اللہ۔'' شیر دل اس رات کمرے میں آ کر بھی تپا رہا۔ اس لڑکی کی طرف سے اسے کوئی لفٹ نہیں مل رہی تھی۔ مسئلہ یہ اتنا بڑا نہیں تھا مسئلہ یہ تھا کہ وہ جس شخص کو اس پر ترجیح دے رہی تھی بد قسمتی سے وہ غنی حمید تھا۔

اگلی صبح ڈائننگ روم میں ناشتے کے دوران اس کی عکس سے دوبارہ ملاقات ہوئی تھی اور اس نے خوش دلی سے اس سے اس کے گلے کے بارے میں پوچھا تھا۔ شیر دل چاہتے ہوئے بھی اس سے خفگی برقرار نہیں رکھ سکا۔ عکس مراد علی بھی کچھ عجیب طرح سے اثر انداز ہوتی تھی اس کے اعصاب اور حواس پر اور وہ جس طرح سے اسے اور اپنے batch mates کو ہینڈل کیا کرتی تھی شیر دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ستائش کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ ہر ایک سے خوش دلی سے بات کرنے کے باوجود ہر ایک کو ایک فاصلے پر رکھے ہوئے تھی...... غنی حمید کے ساتھ اگرچہ اس کی دوستی ان سب ہی کی نظروں میں تھی لیکن غنی حمید کے ساتھ دوستی کے باوجود ان سب کو وہ دونوں ہر وقت اکٹھے نظر نہیں آتے تھے۔ نہ ہی کونوں کھدروں میں بیٹھ کر باتیں کرتے پائے جاتے تھے اور نہ ہی عکس مراد علی اپنے ہر کام کے لیے غنی حمید کی خدمات کی منتظر یا طلب گار رہتی تھی...... شیر دل اپنے تمام اختلافات اور رقابت کے باوجود ان دونوں کے تعلق میں کوئی ایسی چیز نہیں ڈھونڈ پایا تھا جو سرگوشیوں کو جنم دیتی یا جو ان پر انگلیاں اٹھانے کا باعث بنتی...... وہ دونوں اکثر جہاں بات چیت کرتے پائے جاتے وہاں گروپ کے باقی لوگوں میں سے بھی کوئی نہ کوئی ہوتا اور ان کے درمیان جو بھی بات چیت ہوتی تھی وہ سب کے سامنے تھی۔ شیر دل شاید اس گروپ کا واحد شخص تھا جسے ان کی دوستی پر اعتراض تھا۔

وہ اب عکس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ وہ دانستہ طور پر اسے tease کرنے کے لیے یہ سب کر رہی تھی۔ گاڑی اس کے گھر کے پورچ میں رکی تھی جب اس نے فون پر عکس کی کال آتے دیکھی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ کچھ دیر اس کے نام کو دیکھتا رہا۔ چند گھنٹوں نے کیا کچھ بدل دیا تھا ان دونوں کے بیچ میں۔

''ہیلو۔'' فون اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ہیلو۔'' دوسری طرف سے آنے والی آواز میں اس نے پہلی بار چڑیا کو شناخت کرنے کی کوشش کی اور چڑیا مل گئی تھی۔ اس نرم آواز میں آج بھی چڑیا کی ریشمی آواز کی ملائمت جھلکتی تھی۔ دونوں کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے دوران وہ بہت کم بولا تھا۔ وہ ایک رات پہلے اس کی کہی جانے والی باتوں کو

www.Paksociety.com

اب سمجھ رہا تھا۔ معنی پہنانے کے قابل ہو گیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' اس سے چند منٹ بات کرنے میں بھی عکس نے اس کے غیر معمولی رویے کو نوٹس کیا تھا۔

''ہاں، کیوں؟'' شیر دل نے حیران ہوئے بغیر کہا۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتے تھے اس لیے چھپانے کی کوشش میں وہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے لہجے کو جتنا بھی نارمل رکھتا وہ پھر بھی اس کی ذہنی کیفیت کو بھانپ جاتی۔

''خاموش ہو۔''

''طبیعت ٹھیک نہیں کچھ۔'' یہ واحد بہانہ تھا جو سب کچھ چھپا لیتا۔ وہ اسے اپنا خیال رکھنے اور آرام کرنے کا کہتی رہی پھر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ اس رات قریباً ساری رات اسموکنگ کرتا رہا۔ وہ سو نہیں سکا تھا۔ بعض جنگیں ضمیر اور بے ضمیری کے درمیان ہوتی ہیں۔ وہ بھی اس رات وہی جنگ لڑ رہا تھا۔ عکس مراد علی کے اس نئے تعارف نے اسے بہت پیچھے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایک شدید احساس جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔ چڑیا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کا عینی شاہد تھا اور یہ شہادت اس کے دل پر ایک بوجھ کی طرح تھی۔ اس دائر کیے جانے والے کیس میں اس الزام کے حوالے سے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شہباز حسین کے خلاف ایک سادہ misconduct اختیارات کے غلط استعمال اور خیر دین پر لگائے گئے جھوٹے الزامات کا کیس تھا اس کے باوجود شیر دل صرف اس ایک رات کے بارے میں سوچتا رہا تھا...... بہت کچھ اب اس کی یادداشت میں اس طرح محفوظ نہیں رہا تھا جیسے پہلے تھا لیکن اس کے باوجود جو کچھ اسے یاد تھا اس کے بعد عکس مراد علی سے نظر ملانا اس کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا۔

عکس اس وقت لاہور میں تھی اور اسے اس رات لاہور ہی میں رہ کر اگلے دن وہاں سے سنگاپور کی فلائٹ لینی تھی۔ وہ نہیں جانتا اسے کیا خیال آیا تھا لیکن اگلے دن لاہور جانے سے پہلے وہ صبح سویرے خیر دین سے ملنے چلا آیا تھا۔

☆☆☆

''تم نے ان سے کیا کہا؟'' چیک ان اسٹارٹ ہونے کے اعلانات کے باوجود اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس نے شیر دل سے پوچھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار شیر دل پر بے تحاشا غصہ آیا تھا اتنا غصہ کہ...... وہ اس کے ساتھ دھوکا کر رہا تھا، اس سے پوچھے بغیر اسے بتائے بغیر اس کی عدم موجودگی میں وہ اس کے گھر خیر دین سے ملنے پہنچ گیا تھا۔

''میں ان سے ایکسکیوز کرنے گیا تھا اور میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکا...... کیونکہ تم نے انہیں ہر بات سے بے خبر رکھا ہے۔'' شیر دل اس کے چہرے سے جیسے اس کے دل تک پہنچ رہا تھا۔ وہ لمحوں میں آگ سے موم ہوئی تھی۔

''کس چیز کے لیے ایکسکیوز؟''

''ہر چیز کے لیے۔'' ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بالمقابل کھڑے رہے...... ساکت......

سانس روکے...... ایک دوسرے کی آنکھوں میں اس چیز کو پہچاننے اور پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے جو نظر آ رہی تھی...... اس چیز کو کھوجنے کی کوشش کر رہے تھے جو چھپی ہوئی تھی۔ شیر دل کی آنکھوں میں عکس نے تھکن کو دیکھا اور اس کے پیچھے ندامت کو...... شیر دل نے اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک دیکھی اور اس کے پیچھے جھلکتی افسردگی کو...... انہوں نے بیک وقت سانس لی تھی، بیک وقت نظریں چرائی تھیں، بیک وقت سر جھکا کر دوبارہ سر اٹھایا۔ پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا پھر نظریں چرائیں...... یوں جیسے دونوں مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی کشش کے اثر کے حصار سے نکالنے، توڑنے، چھڑانے، چرانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

ہر چیز میں کیا کیا تھا؟ عکس نے ایک لمحے سے بھی کم میں سمجھ لیا تھا لیکن یہ ایکسکیوز وہ لینے پر تیار نہیں تھی۔ کم از کم زندگی کے اس لمحے میں نہیں۔

''دیر ہو رہی ہے میں چلتی ہوں۔'' وہ اس سے کہتے ہوئے یک دم پلٹ گئی تھی۔ شیر دل وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے بھی اس کو اندازہ تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ وہ اسے وہاں بات کرتے ہوئے روکتا تو وہ اس کے

سامنے رو پڑتی۔ وہ ان آنسوؤں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ اس کا اپنا خاندان تھا۔ وہ سنگاپور ائرپورٹ پر ''روتی ہوئی چڑیا'' کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا...... اس لیے اس نے ڈاکٹر عکس مراد علی کو جانے دیا لیکن وہ تب تک وہاں کھڑا رہا جب تک عکس اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

عکس نے ایک بار بھی اندر جانے کے بعد اسے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ وہاں کھڑا تھا اور جب تک وہ نظر آ رہی تھی وہ وہاں سے ہل نہیں سکے گا...... وہ اس سے ایکسکیوز کر رہا تھا اور کہاں کھڑا ہو کر کر رہا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اپنے چہرے کو بار بار بھیگنے سے نہیں روک پا رہی تھی۔ شیر دل نے کہا تھا کہ اس نے خیر دین سے کچھ نہیں کہا تھا اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ اس نے خیر دین سے کچھ کہا ہو گا۔ وہ دونوں اس حد تک ایک دوسرے کی بات پر یقین رکھتے اور کرتے تھے۔

امیگریشن کروانے کے بعد لاؤنج سے گزرتے ہوئے اس نے شیر دل کے فون سے باری باری کچھ کالز کی تھیں۔ پہلی کال اس نے جواد کو کی تھی اس نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔ اس نے چند بار اور کوشش کی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ پھر اس نے پاکستان میں اپنے عملے کے اس شخص سے رابطہ کیا تھا جو ہاسپٹل میں خیر دین کی دیکھ بھال کر رہا تھا پھر اس کو شیر دل کے کروائے ہوئے کچھ انتظامات کے ذریعے لاہور منتقل کر دیا گیا تھا۔ جواد ایک بار اس کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا لیکن اس کے بعد عملے کے اس فرد کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ عکس کو اس وقت جواد کا غائب ہو جانا کچھ چبھا تھا لیکن اس وقت اپنی پریشانی میں اس نے اس کی وجوہات پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جواد سے ہونے والی بات چیت میں اس نے اسے اپنے فلائٹ شیڈول کے بارے میں بتایا تھا اور اس نے اسے کہا تھا کہ وہ ائرپورٹ پر اسے پک کر لے گا لیکن اب رابطہ نہ ہونے پر عکس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے عملے کو ائرپورٹ پر بلوا لیا تھا۔ پاکستان کالز کرنے کے بعد اس نے کویت حلیمہ کو کال کر کے اس سے پاکستان آمد کا شیڈول پوچھا تھا۔ وہ اگلی شام کی فلائٹ سے پاکستان پہنچ رہی تھی۔ ان تمام کالز سے فارغ ہونے کے بعد وہ چند میسجز کر رہی تھی جب اس نے فون پر شہر بانو کا نام دیکھا...... اس نے text کیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے عکس کو سمجھ نہیں آئی۔ وہ اس text کا جواب دے یا نہ دے۔ text نہ کھولنے کے باوجود اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اس سے فوری طور پر بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ عجیب کشمکش میں بیٹھی رہی۔ پھر اس نے text کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا ہاسٹل واپس پہنچ کر شیر دل، شہر بانو کو خود ہی کال کر لیتا اور اسے فون کے عکس کے پاس ہونے کے بارے میں بتا دیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ فون رکھ دیتی سیل فون پر ایک لوکل نمبر سے کال آنے لگی تھی۔ وہ شیر دل تھا جو اس سے اس کی فلائٹ کی روانگی چیک کرنا چاہتا تھا۔

''شہر بانو کو فون کر لو...... اس کا message آیا تھا وہ تم سے ایمرجنسی میں بات کرنا چاہتی ہے۔''

''او کے میں اسے کال کر لیتا ہوں۔ تم نے اسے بتایا ہے کہ فون تمہارے پاس ہے؟'' شیر دل نے جواباً پوچھا تھا۔

''نہیں، میں نے نہیں بتایا۔ مجھے عجیب لگا تھا کہ......'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ٹھیک کیا۔ میں خود اس سے بات کر لوں گا۔'' چند منٹ دونوں بات کرتے رہے۔ گفتگو کے اختتام پر عکس نے ایک بار پھر شیر دل سے کہا۔

''شہر بانو کو فون کر لینا وہ ایمرجنسی میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔'' اسے شیر دل کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا تھا اور سونے کے موڈ میں تھا۔

''ہاں میں کر لوں گا۔'' شیر دل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

چار گھنٹے کے بعد ملائشیا میں اپنی connecting فلائٹ کے لیے ملائشیا ائرپورٹ پر قدم رکھتے ہوئے عکس کا فون بہت سارے ٹیکسٹ میسجز سے بجنے لگا۔ اس نے ان تمام میسجز کو چیک کیا ان میں شہر بانو کا کوئی بھی میسج نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ یقیناً شیر دل اور شہر بانو کی آپس میں بات ہو گئی تھی۔ تین گھنٹے کے اسٹاپ اوور میں ملائشیا ائرپورٹ پر بیٹھے اس نے ایک بار پھر خیر دین کی خیریت دریافت کی تھی اور ایک بار پھر جواد سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ خیر دین کی حالت ویسی ہی تھی اور جواد بھی اسی طرح غائب تھا اور جب بالآخر ان کالز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے

فون رکھنا چاہا تو اس کے فون پر کسی مسز فاروق کی کال آنے لگی تھی۔ وہ چند لمحے اس کال کو دیکھتی رہی اور یہ طے کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اسے کال لینی چاہیے یا نہیں۔ اس نے بالآخر کال لینے کا فیصلہ کیا۔ ہیلو کہنے پر دوسری طرف کچھ دیر کے لیے آواز ہی نہیں آئی تھی۔ عکس کو دو تین بار ہیلو...... ہیلو کہنا پڑا اور بالآخر اس نے شرمین کی آواز سنی۔

''میں ایک شیر دل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' عکس کو اس آواز میں ایک عجیب سی حیرانی اور بے یقینی کی کیفیت محسوس ہوئی جسے وہ سمجھ نہیں سکی۔

''وہ اس وقت available نہیں ہیں۔ آپ مجھے میسج دے دیں میں ان کو فارورڈ کر دوں گی، وہ آپ کو خود کال کرلیں گے۔'' عکس نے بے حد شائستگی سے کہا۔

''آپ کون ہیں؟'' مسز فاروق نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس سے کہا۔ عکس کو اپنا تعارف کروانے میں تامل ہوا۔

''آپ اپنا میسج دے دیں میں انہیں فارورڈ کر دوں گی۔'' اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی بات دُہرائی۔

''آپ عکس مراد علی ہیں؟'' عکس دوسری طرف سے اپنا نام لیے جانے پر یک دم حیران رہ گئی تھی۔ وہ کون تھیں جو اس کے نام سے واقف تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ اگر اس وقت وہ نمبر اس کے پاس تھا تو پھر وہ عکس مراد علی تھی۔

''جی۔'' وہ اس بار اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی اور پھر یک دم فون بند ہو گیا۔ عکس کو لگا شاید کال اتفاقاً ڈس کنیکٹ ہوئی تھی اور مسز فاروق کچھ دیر میں اسے دوبارہ کال کریں گی لیکن دوبارہ کوئی کال نہیں آئی تھی۔ عکس نے ایک بار مسز فاروق کا نمبر چیک کیا تھا۔ وہ امریکا کا نمبر تھا اور امریکا میں شیر دل کی آدھی سے زیادہ فیملی تھی یہ عکس جانتی تھی لیکن وہ کون تھی شہر بانو کے علاوہ جو اسے اس طرح پہچان جاتی؟ جو اس کے نام سے اس طرح واقف ہوتی کہ شیر دل کے فون پر اس کی آواز سنتی تو اسے اس کے نام سے پہچان لیتی۔ یہ انتہائی تشویشناک بات تھی اس کے لیے اور انتہائی الجھا دینے والی بھی۔ اس کا ذہن ایک لمحے کے لیے شہر بانو اور اس کی ماں کی طرف گیا تھا لیکن وہ یہ یقین نہیں کر سکتی تھی کہ شرمین اسے فون کرنے پر اسے اس کے نام سے پہچانے گی۔ شہر بانو اور اس کے درمیان ایک رسمی علیک سلیک کے علاوہ بھی کچھ نہیں ہوا تھا اور وہ یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ شیر دل اپنی ساس کے سامنے اس کا ذکر کرتا رہا ہوگا اگر کرتا بھی رہتا تب بھی ان کا اس طرح اس کی آواز پر پہلا اندازہ اس کے بارے میں لگانا...... وہ بری بری طرح الجھی تھی۔ اسے شیر دل سے یہ معاملہ ڈسکس کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے اسے کال نہیں کی تھی اور وہ کوشش کرتی تو سیل فون میں اس کے کمرے کا نمبر ڈھونڈ کر آپریٹر کے ذریعے اس سے رابطہ کر لیتی لیکن وہ رات کا آخری پہر تھا اور وہ چاہتی تھی کہ شیر دل سوتا رہے۔ وہ اسے ایک معمولی سی بات کے لیے نیند سے جگانا نہیں چاہتی تھی۔

وہ اگلی صبح گیارہ بجے خیر دین کے پاس پہنچی تھی اور آئی سی یو کے شیشے سے اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ چند لمحوں کے لیے یہ بھول گئی تھی کہ وہاں اس کا عملہ تھا اور ڈاکٹر تھا۔ اس نے بچپن سے آج تک خیر دین کو ہاسپٹل کے بستر پر بیمار نہیں دیکھا تھا، اس طرح پڑے نہیں دیکھا تھا اور اب وہ دیکھ رہی تھی تو اسے یہ سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ خیر دین کو کچھ ہو سکتا تھا...... پہاڑ ٹوٹتے ہیں لیکن جب تک ہم انہیں اپنے سامنے ٹوٹتا ہوا نہ دیکھ لیں ان کا قابلِ شکست ہونا ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ خیر دین بھی اس کے لیے پہاڑ تھا اور پہاڑ کو ریت بنتے دیکھنا...... وہ بہت دیر بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہیں آئی سی یو کے شیشے سے خیر دین کو دیکھتی رہی...... اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکی پھر وہ ڈاکٹر کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔

اس نرم جھریوں بھرے کمزور سوئیوں لگے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر سسکیوں سے رونے لگی تھی۔ حلیمہ کی شادی ہو جانے اور اپنا خاندان شروع کر لینے کے بعد خیر دین کے علاوہ اس کا دنیا میں واقعی کوئی نہیں رہا تھا۔ اس بستر پر خیر دین نہیں تھا اس کا سارا خاندان تھا۔ ماں...... باپ...... بہن...... بھائی...... دوست...... سب کچھ وہی ایک شخص تھا اس کے لیے...... وہ کئی گھنٹے خیر دین کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے پوری کائنات تھے اور خیر دین کے بے ہوش ہوتے ہوئے بھی عکس کو یقین تھا وہ اس کے ہاتھ کا لمس پہچانتا تھا۔

شام کو حلیمہ بھی پاکستان پہنچ گئی تھی۔ وہ اکیلے ہی آئی تھی۔ اس کے شوہر یا بچوں میں سے کوئی ساتھ نہیں آسکا تھا۔ شام کو وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ابھی اس کلب میں پہنچی ہی تھی جہاں شیر دل نے اس کی عارضی رہائش کا انتظام کروایا تھا۔ شیر دل کی کال آگئی تھی۔ خیر دین اور اس کی خیریت کے بارے میں بات کرنے کے بعد عکس کو مسز فاروق یاد آگئی تھیں۔

''شیر دل...... مسز فاروق کون ہیں؟'' اس نے اچانک شیر دل سے پوچھا تھا۔ وہ چونکا۔

''کون مسز فاروق؟''

''تمہارے سیل فون میں ایک نمبر saved ہے۔''

''اوہ وہ...... شہر بانو کی ممی ہیں۔'' شیر دل نے دانستہ شہباز حسین کی سابقہ بیوی کے حوالے سے شرمین کا تعارف نہیں کروایا تھا۔ عکس کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکی تھی۔

''کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''ملائشیا میں اسٹاپ اوور کے دوران ان کی کال آئی تھی تمہارے فون پر......''

''میرے فون پر......؟'' شیر دل بے اختیار حیران ہوا۔

''ہاں انہوں نے تمہارا پوچھا پھر میرے بارے میں پوچھا، میں نے جب نام نہیں بتایا تو انہوں نے کہا کیا تم عکس مراد علی ہو؟''

''یہ تم سے شرمین آنٹی نے کہا؟'' شیر دل ہل گیا تھا۔

''ہاں...... وہ میرے بارے میں کیسے جانتی ہیں؟'' شیر دل فی الحال جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا شرمین عکس مراد علی کے بارے میں کیسے جان پائی ہوں گی۔

☆☆☆

شرمین، مثال کی بات پر ہل کر رہ گئی تھیں۔

''شہر بانو رو رہی ہے......؟ کس لیے؟'' ایک چار سالہ بچی سے کیا جانے والا یہ سوال احمقانہ تھا لیکن وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ وہ اپنے بیڈ روم میں اپنی وارڈروب سے کچھ کپڑے نکال رہی تھیں جب مثال دروازہ کھول کر بہت اداس سی ان کے پاس آئی تھی۔

''آؤ بیٹا......'' شرمین نے اپنے کام میں مصروف اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

''نانو! ممی رو رہی ہیں۔'' مثال نے اندر آ کر کوئی تمہید باندھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کام کرتے کرتے رک گئیں۔

''شہر بانو رو رہی ہے؟''

''Yes''۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''ممی نے کہا میں آپ کو نہ بتاؤں کہ وہ رو رہی ہیں۔'' شرمین کو مثال کی اگلی بات پر جیسے ایک اور دھچکا لگا تھا۔ وہ وارڈ روب بند کرنا بھی بھول گئی تھی اور وہاں سے سیدھا شہر بانو کے کمرے میں آ گئی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ دروازہ بجا کر اندر آتیں لیکن اس بار انہوں نے دروازہ تک نہیں بجایا تھا۔ شہر بانو واقعی اندر بیٹھی رو رہی تھی۔ شرمین کے یک دم اندر آ جانے پر اسے اتنا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ کوئی احتیاطی تدابیر کر سکتی۔

''کیا ہوا جان؟'' شرمین کے ہاتھ پاؤں اسے اس بری طرح سے روتے دیکھ کر کچھ مزید پھول گئے تھے۔ شہر بانو جھوٹ بولنا چاہتی تھی۔ کوئی بہانہ بنانا چاہتی تھی۔ ہنس کر بات ٹال دینا چاہتی تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکی۔ شرمین کے پاس آ کر بیٹھنے پر وہ بلکتے ہوئے ان کی گود میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ شکست خوردگی کا کیا بلا کا احساس تھا جس نے اسے اس وقت اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا کیوں رو رہی ہو؟ کچھ تو بتاؤ؟'' شرمین گھبرائی ہوئی اس سے سوال پر سوال کر رہی تھی۔ اور اس کے پاس کہنے کے لیے جیسے ایک لفظ نہیں تھا۔ وہ شرمین اسے یہ کیسے کہہ دیتی کہ اس کی ساری پیش گوئیاں اور وارننگز ٹھیک ثابت ہوئی تھیں۔ شیر دل ویسا ہی مرد ثابت ہوا تھا جیسا وہ اسے سمجھتی تھیں۔ وہ شوہر کی محبت اور وفاداری کا جو تاج سجائے پھرتی تھی وہ آج جیسے بیچ بازار سر سے گرا تھا۔ کیا وہ اس شرمناک ذلت کے احساس کو صرف خود تک رکھنا چاہتی تھی لیکن یہ بھی مشکل تھا یہ بھی ناممکن تھا۔

ماں کی گود میں منہ چھپائے رکھتے ہوئے اس نے شرمین سے کہا۔ ''ممی! شیر دل اپنی کسی کولیگ کے ساتھ افیئر چلا رہا ہے۔'' شرمین کپکپانے لگی تھی۔

''کون کولیگ؟''

''عکس مراد علی۔'' شہر بانو نے روتے ہوئے کہا۔ جو بات تھی وہ بتا نہیں سکتی تھی...... بتا دیتی تو اس کی ماں کے اپنے زخموں کے کھرنڈ اترنے لگتے...... اس کے باپ کے حوالے سے پھر سوالیہ نشان اٹھتے...... وہ شرمین کو ایسا کوئی حوالہ دینا نہیں چاہتی تھی جو عکس مراد علی کو ''ظالم'' نظر نہ آنے دیتا۔

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم سے کس نے کہا؟ شیر دل ایسا نہیں کر سکتا۔'' شرمین نے عجیب بے یقینی اور دل گرفتگی سے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے تک تو وہ خوش باش تھی...... ہر روز تو وہ شیر دل کی تعریفیں کرتی تھی...... اس کی کوئی بات شیر دل کے حوالے کے بغیر پوری نہیں ہوتی تھی اور اب یک دم وہ کہہ رہی تھی کہ...... شرمین کو یقین نہیں آیا۔ اس خاندان کے حوالے سے خدشات رکھنے کے باوجود اسے یقین نہیں آیا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ وہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔

''ممی نے بتایا ہے مجھے کچھ دیر پہلے فون پر کہ......'' شہر بانو نے روتے ہوئے کہا۔

''کیا بتایا ہے؟'' شرمین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس یہی بتایا ہے کہ سنگاپور میں بھی اکٹھے ہیں دونوں۔''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بیٹھے بٹھائے شیر دل کیوں ایسا کچھ کرنے لگا...... تم نے پہلے کبھی......''

''ممی میں کچھ نہیں جانتی تھی...... میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔'' وہ شرمین کی بات کاٹتے ہوئے ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس ساری گفتگو میں یہ پہلا سچ تھا جو وہ بول رہی تھی۔ وہ واقعی عکس اور شیر دل کے ماضی کے اس تعلق کے حوالے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔

شرمین کچھ دیر کے لیے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ ''اس سے بات کرو تم...... پوچھو'' شرمین نے بالآخر جیسے عجیب

www.Paksociety.com

اضطراب کے عالم میں کہا۔

''ممی میں اب اس سے کبھی بات نہیں کروں گی۔''

''شہر بانو یہ ٹھیک نہیں ہے...... بات تو کرنی چاہیے اور تم نہیں تو میں بات کرتی ہوں اس سے۔'' شرمین نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''ممی آپ اس سے بالکل بات نہیں کریں گی...... اس نے مجھے ہرٹ کیا ہے۔''

''میں جانتی ہوں بیٹا! لیکن پھر بھی بات تو کرنی چاہیے۔ پوچھنا تو چاہیے کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا؟'' شرمین اسے سمجھا رہی تھی۔

''میں اس سے جو کچھ بھی پوچھوں گی اب سامنے پوچھوں گی۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''وہ اب یہاں آئے گا تو ہی بات ہو گی...... میں جب تک یہاں ہوں میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گی۔''

شرمین عجیب خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی اس کی بات سنتی رہی تھی۔ عکس مراد علی کے نام نے اس کے ذہن میں بہت سی گھنٹیاں بجائی تھیں۔ اسے خیر دین اور اس کی نواسی کا نام یاد آیا تھا لیکن اسے یہ یقین نہیں تھا کہ خیر دین کی نواسی کا نام عکس مراد علی ہی تھا۔ وہ مراد علی کا نام یاد کرتے ہوئے الجھی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بچی ایک شیر دل کی کولیگ ہو سکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ افیئر چلا سکتی تھی۔ یہ یقیناً کوئی اور عکس تھی جسے وہ خیر دین کی نواسی کے نام کی وجہ سے کنفیوز کر رہی تھی۔

''تم جانتی ہو شیر دل کی اس کولیگ عکس مراد علی کو......؟'' شرمین نے جیسے پھر بھی اپنے کسی واہمے کی تصدیق کی تھی۔ اس نے اور اس کے سوال نے شہر بانو کو یک دم جیسے ہوش میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ہاں میں جانتی ہوں...... دو چار بار ملی ہوں...... ڈاکٹر ہے وہ......'' اس نے کچھ لپیٹ کر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

''فیملی بیک گراؤنڈ کیسا ہے؟'' شرمین کے سوال نے شہر بانو کو اپنی کی گئی وارننگ یاد دلائی۔

''اس کی ممی کویت میں ہوتی ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی اور خود وہ لاہور میں based ہے۔'' آخری جملہ اس کا اندازہ تھا کہ وہ لاہور سے ہی تعلق رکھتی ہو گی۔ شرمین کو اطمینان ہوا پھر یہ وہ والی عکس نہیں ہو سکتی وہ تو کسی دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتی تھی اور وہ اپنے نانا کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی ماں کی شادی ہو چکی تھی۔

''میں منزہ سے بات کرتی ہوں اگر شیر دل سے بات نہیں کرنی تو۔'' شرمین نے اسی مضطرب انداز میں کہا۔

''نہیں ممی آپ شیر دل کی ممی سے بات نہیں کریں گی۔'' شہر بانو نے فوراً سے پیشتر کہا۔

''تو پھر یہ معاملہ کیسے حل ہو گا؟'' شرمین نے کچھ حیرانی سے ہچکیاں لیتی ہوئی بیٹی کو دیکھ کر کہا۔

BeB®
IN

www.Paksociety.com

"ہوجائے گا حل...... اگر حل ہونا ہوا تو۔"
"ہوسکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہو۔" شرمین نے جو جملہ کہا تھا وہ یہ جملہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔
"کیسی غلط فہمی؟" شہر بانو نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"شیر دل کے حوالے سے۔" شرمین نے جیسے عجیب آس کے ساتھ کہا۔ شہر بانو کا دل کٹا تھا۔ اس کی ماں زندگی میں پہلی بار شیر دل کو defend کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور کہاں کر رہی تھی۔

"کاش غلط فہمی ہی ہوتی ممی۔" وہ کہتے ہوئے ایک بار پھر سسک پڑی۔ شرمین بہت دیر اس کے پاس بیٹھی اسے تسلی دیتی رہی تھی لیکن وہ بے حد پریشان تھی اور اسی پریشانی میں اس نے شیر دل سے اس سارے معاملے کے بارے میں خود بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ شہر بانو کے پاس سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آگئی تھی اور اس نے وہاں سے شیر دل کے نمبر پر کال کی تھی اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس وقت وہ سو رہا ہوگا اسے اس وقت شاک لگا تھا جب اس کی کال کسی لڑکی نے receive کی تھی۔ چند لمحوں کے لیے شرمین کو لگا آسمان اس کے سر پر آگرا تھا۔ رات کے اس پہر... شیر دل کے فون پر آنے والی کالز ریسیو کرنے والی کون ہوسکتی تھی اور اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ وہ دونوں اس وقت اکٹھے کیا کر رہے تھے۔ اس نے شیر دل سے کیا بات کرنی تھی اور کیا نہیں وہ سب بھول گئی تھی اور اس نے اس لڑکی سے وہ پوچھا تھا جو وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ ملنے والے جواب نے اس کی رہی سہی ہمت بھی توڑ دی تھی۔ اس نے مزید کچھ بھی پوچھے کچھ بھی کہے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ آج اس کی زندگی کا ایک اور سیاہ دن تھا۔ تاریخ اپنے آپ کو بہت غلط وقت پر بہت غلط طریقے سے دُہرا رہی تھی۔ فون ہاتھ میں لیے وہ بیٹھی رہی...... بے حس و حرکت...... ابھی ابھی اسے جو پتا چلا تھا وہ شہر بانو کے ساتھ اسے شیئر کرنا چاہیے تھا یا نہیں......؟ یہ سوال یک دم کسی جھکڑ کی طرح اس کے ذہن میں گونجنے لگا تھا...... اسے شہباز حسین یاد آیا تھا...... اس کے ساتھ گزاری ہوئی اچھی زندگی اور اس کے بعد آنے والی تباہی...... وہاں بیٹھے بیٹھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس درد سے دوبارہ گزری تھی جو کبھی مندمل ہوا ہی نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا...... بعض کانٹے آپ کو ساری عمر چبھتے رہتے ہیں آپ لاکھ جتن کر کے بھی ان کو نکال نہیں پاتے...... کیونکہ وہ نظر نہیں آتے۔ بس ان سے اٹھنے والی ٹیسیں آپ کو یاد دلاتی رہتی ہیں کہ وہ "ہیں" اور آپ کے وجود کے اندر سے آپ کو بے حال کیے ہوئے ہیں۔

"شہر بانو بتا رہی تھی کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تم بہت رو رہی تھیں۔" شہباز اس دن آفس سے گھر آتے ہی اس کے پاس آیا تھا۔ وہ اس وقت وارڈ روب سے کپڑے نکال رہی تھی۔ ہر روز کی طرح اس نے شہباز کا استقبال گھر کے دروازے پر نہیں کیا تھا۔ اس نے پلٹ کر شہباز کو دیکھا تھا۔ وہ مرد جس کی وجاہت پر وہ کبھی مرمٹی تھی اس وقت اسے ایک بھوت کی شکل میں نظر آرہا تھا۔ مکروہ آنکھوں، سیاہ داغدار شکل، طوطے جیسی مڑی ہوئی ناک اور لمبے نوکدار زرد ٹیڑھے میڑھے دانتوں والا ایک چہرہ...... جس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس سے خوف زیادہ آتا ہوگا یا گھن......

اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی شہباز کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں تھی۔ سرخ سوجی ہوئی آنکھیں، ستا ہوا چہرہ اور رگڑ رگڑ کر سرخ ہوجانے والی ناک۔

"کیا ہوا ڈارلنگ؟" وہ جیسے کچھ بے چین انداز میں اس کو console کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔
"آج میں سسٹر ایگنس سے ملی۔" اس کے ٹھنڈے لفظوں نے شہباز کے قدموں میں جیسے زنجیر ڈالی تھی۔ وہ فریز ہو گیا تھا۔ اتنے سالوں بعد اس نام کی بازگشت اسے آسیب کی آواز جیسی لگی تھی۔
"تم نے چڑیا کے ساتھ کیا کیا تھا؟" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا شرمین کے اگلے سوال نے ایک پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔
"کون چڑیا؟" وہ یہ سوال کرتے ہوئے بھی شرمین کا چہرہ دیکھتے ہوئے جانتا تھا وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی۔

"تم چڑیا کو نہیں جانتے؟" شرمین نے ایک قدم آگے بڑھا کر اس سے پوچھا۔

"نہیں؟" شہباز کے پاس انکار کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک زوردار تھپڑ نے شہباز کو کسی مزید جھوٹ کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔
"چڑیا تمہاری بیٹی تھی...... جیسے شہر بانو...... جسے ساری دنیا کے مردوں سے چھپائے پھرتے ہو تم...... اس لیے چھپائے پھرتے ہو؟" وہ چلائی تھی۔
"دیکھو تم کچھ غلط سمجھ رہی......" شہباز جانتا تھا سب کچھ ڈوب چکا تھا۔ اس نے پھر بھی جیسے اپنا گھر بچانے کی آخری کوشش کی۔
"ایک لفظ بھی مت کہنا تم شہباز حسین...... میں تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔" وہ وارڈ روب سے دوبارہ اپنے کپڑے نکالنے لگی تھی۔
"شرمین میری بات سنو۔" وہ لپکتا ہوا اس کی طرف آیا تھا۔
"تم مجھے ہاتھ بھی مت لگانا۔" اس نے اسے قریب نہیں آنے دیا تھا۔
"وہ سب سازش کر رہے ہیں میرے خلاف...... تم کو اندازہ نہیں ہے کہ سسٹر ایگنس مجھے تباہ کرنا چاہتی ہے...... ایسی کوئی بات ہوتی تو خیر دین میرے خلاف کیس کرتا...... تمہارے پاس آتا...... پریس میں جاتا...... سسٹر ایگنس بکواس کر رہی ہے۔" شہباز کو اندازہ نہیں تھا وہ اس وقت اعترافِ جرم کرنے کے بجائے جھوٹ بولنے پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہا تھا۔
"میں خیر دین سے مل کر آئی ہوں...... تم نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا وہ سن کر آئی ہوں...... جھوٹ بولنا چھوڑ دو شہباز کم از کم...... اب چھوڑ دو۔" وہ غرائی تھی۔ شہباز حسین کو جیسے قسمت نے ایک پنجرے میں ڈال دیا تھا۔
"وہ بھی بکواس کرتا ہے...... یہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں...... مجھے اور میری فیملی کو بلیک میل کرنا چاہتے ہیں، تم ان نوکروں کی ذہنیت سے واقف نہیں ہو...... میں جانتا ہوں۔" شہباز عجیب بے بسی اور خوف سے چلایا تھا۔ اسے اپنا گھر ٹوٹتا ہوا نظر آرہا تھا۔
"اور تم...... تمہاری ذہنیت کیا ہے؟ تمہیں تو جیل میں ہونا چاہیے شہباز...... اور آج نہیں تو کل تم جیل میں ہی ہو گے۔" وہ اس پر چلاتے چلاتے رو پڑی تھی۔ "تمہیں شہر بانو کا سوچنا چاہیے تھا۔ میرا سوچنا چاہیے تھا...... یہ سب کرتے ہوئے...... اتنا گرتے ہوئے...... اس طرح جانور بنتے ہوئے۔" وہ روتے ہوئے اس سے کہتی گئی تھی۔ شہباز اسے وضاحتیں دینے کے لیے ایڑیاں رگڑ تا رہا تھا اور اس کی ہر وضاحت اسے شرمین کی نظروں میں کچھ اور گراتی گئی تھی۔ شہباز کی سر توڑ کوشش کے باوجود وہ اس کا گھر چھوڑ کر شہر بانو کو لیے وہاں سے ایک ہوٹل میں چلی آئی تھی۔ شہباز حسین کے گھر میں وہ اس کا آخری دن تھا۔
"مجھ سے یہ مت پوچھیں کہ میں شہباز کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتی لیکن مجھے اس سے الگ ہونے دیں۔" امریکا واپس آکر پاکستان خلع کے لیے کیس فائل کرنے سے پہلے اس نے اپنے ماں باپ سے کہا تھا۔ اس کے لیے وہ وجہ اپنے ماں باپ کو بھی بتانی شرمناک محسوس ہو رہی تھی جو اس کے اور شہباز کے درمیان علیحدگی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ ایک راز تھا جو اس نے کبھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا صرف اس لیے کہ شہر بانو کی زندگی پر اس انکشاف کے بہت سے منفی اثرات ہوسکتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے اس فیصلے نے شہر بانو کی نظروں میں اسے ایک ولن بنا دیا تھا لیکن وہ یہ قیمت ادا کرنے پر تیار تھی۔

اور اب اتنے سالوں بعد وہ شہر بانو کو اسی دوراہے پر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

"آپ نے شہر بانو سے کوئی بات کی ہے؟" شیر دل نے رسمی علیک سلیک کے بعد کسی تمہید کے بغیر منزہ سے فون پر پوچھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس غیر متوقع سوال کا جواب منزہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

www.Paksociety.com

”کیا بات؟“ منزہ کو کوئی اور جواب نہیں سوجھا تھا۔

”ممی وہ میری کال نہیں لے رہی۔ آپ نے کیا کہا ہے اس سے؟“ شیر دل نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے وقفے وقفے سے شہر بانو کو کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی اور وہ اب بے حد اپ سیٹ ہو رہا تھا۔

”تم نے عکس کو سمجھانے سے انکار کیا تھا تو پھر مجھے شہر بانو سے بات کرنی ہی تھی، میں نے اس سے صرف یہ کہا تھا کہ وہ تمہیں سمجھائے۔“ منزہ نے بے حد آرام سے کہا۔ شیر دل ان کے انداز پر حیران رہ گیا تھا۔

”ممی میں نے آپ کو منع کیا تھا۔“

”اور میں نے بھی تم سے کہا تھا تم عکس کو یہ کیس واپس لینے پر مجبور کرو۔“

”عکس اپنی زندگی کے فیصلے مجھ سے پوچھ کر نہیں کرتی اور نہ ہی میں اسے کسی چیز کے لیے مجبور کر سکتا ہوں...... وہ اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہے۔“ شیر دل نے دوٹوک انداز میں ایک بار پھر ماں کے سامنے وہی بات دُہرائی تھی جو وہ پہلے بھی کہہ چکا تھا۔

”تمہیں اپنی فیملی کی پروانہیں ہے تمہیں انکل شہباز کی پروانہیں ہے، تمہیں اپنی بیوی کے مرے ہوئے باپ کی عزت کا خیال نہیں ہے تمہیں پرواہے تو اس دو ٹکے کی لڑکی کی۔“ منزہ کو اس کی بات پر یک دم غصہ آ گیا تھا۔

”ممی فرض کریں وہ میری دوست نہ ہوتی' میں اس کو جانتا بھی نہ ہوتا اور یہ کیس فائل ہو جاتا انکل شہباز کے خلاف تب کیا ہوتا؟“

”تم میرے ساتھ امکانات کی بات نہ کرو حقائق کی بات کرو۔“ وہ اس کی بات پر مزید خفا ہوئی تھیں۔

”حقائق بڑے تلخ ہوتے ہیں ممی...... ان کا سامنا کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔“

”تم میرے سامنے فلسفہ بولنے کی کوشش مت کرو۔“

”آپ کو اندازہ ہے کہ آپ نے شہر بانو کو اس کیس کے بارے میں بتا کر کتنا ہرٹ کیا ہوگا...... آپ انکل شہباز کے حوالے سے اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت سے اچھی طرح واقف ہیں پھر بھی آپ نے لحاظ نہیں کیا۔“ شیر دل نے بات کا موضوع بدل دیا تھا۔

”شیر دل تمہیں شہر بانو کی ذہنی اور جذباتی حالت کی پروانہیں ہے، تمہیں ٹینشن صرف اس بات کی ہے کہ شہر بانو کو عکس کے حوالے سے تمہارے تعلق اور رشتے کی نوعیت کا پتا چل گیا ہے۔“ شیر دل چند لمحے جیسے صدمے سے بول نہیں سکا تھا۔

”آپ نے شہر بانو کو کیا بتایا ہے میرے اور عکس کے بارے میں؟“

”جو کچھ تھا اور جو کچھ ہے...... سب کچھ......“ منزہ نے انتہائی سنگ دلی سے کہا۔ ”اور میں کیوں نہ بتاتی...... میں تم سے ڈرتی تو نہیں ہوں۔“

”عکس اور میرے درمیان جو بھی تھا وہ یکطرفہ تھا...... وہ بھی میری طرف سے...... اور وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے...... پرانی بات ہو گئی ہے اب...... میں اس کے ساتھ کوئی افیئر نہیں چلا رہا اب...... اس کی شادی ہونے والی ہے میں نے آپ کو بتایا تھا...... میں بھی شادی شدہ ہوں ایک بچے کا باپ ہوں...... آپ کیا سمجھتی ہیں میرے اور اس کے رشتے کو......؟ ہم دوست ہیں اور کچھ نہیں ہے ہمارے درمیان۔“ وہ اب شدید غصے میں تھا اور اس کی خفگی نے منزہ کو یک دم کچھ defensive کر دیا تھا۔

”تم دوست ہو یا جو بھی ہو...... تم اسے سمجھا سکتے ہو منع کر سکتے ہو یہ سب کچھ کرنے سے...... وہ میرے مرے ہوئے بھائی کی عزت اچھالنے پر تل گئی ہے۔“ منزہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بات بدل دی تھی۔

”اگر شہباز انکل نے اس کے نانا کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو اسے پورا حق ہے کورٹ کے ذریعے اپنا حق لینے

کا...... میں اور آپ اس کا گلا نہیں دبا سکتے۔“ شیر دل نے انتہائی خفگی سے آخری جملہ کہا تھا اور پھر مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا اسے پتا نہیں کیا یاد آ گیا تھا۔ انسان کا لاشعور بعض دفعہ اپنے اندر چھپے راز بیچ بازار تھوک دیتا ہے۔

”تم اپنے انکل کو جانتے ہو پھر بھی یہ باتیں کر رہے ہو...... شہباز کسی کے ساتھ ناانصافی، زیادتی کر سکتا ہے؟“ منزہ نے بھی اس بار چلا کر کہا۔ ”کوئی لاکھ بار بھی آ کر کہے تو بھی میں نہیں مانوں گی...... مان ہی نہیں سکتی...... وہ میرا بھائی تھا...... اس کی ساری عمر میرے سامنے گزری ہے...... اور......“ شیر دل نے ماں کی بات کاٹ دی۔

”آپ انکل شہباز کی خاطر اب میرا گھر تڑوا دیں گی۔ شرمین آنٹی نے فون کیا تھا مجھے...... شہر بانو نے یقیناً سب کچھ انہیں بتا دیا ہے میں جس mess کو سمیٹنا چاہتا تھا آپ نے اسے بہت بڑھا دیا ہے میرے لیے۔“ شیر دل نے بے حد تلخی سے ماں سے کہا۔ منزہ کچھ دیر بول ہی نہیں سکی۔ وہ شہر بانو سے اس کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

”شرمین نے تمہیں فون کیا تھا؟ میں نے شہر بانو کو منع کیا تھا اس سے بات کرنے سے۔“ منزہ کو پہلی بار کچھ regret ہوا۔

”میں نے بھی آپ کو منع کیا تھا شہر بانو سے کچھ بھی کہنے سے...... اگر آپ میری بات اگنور کر سکتی ہیں تو شہر بانو آپ کی بات کیوں مانے گی؟“ شیر دل نے تلخی سے ماں سے کہا۔

”کیا کہا شرمین نے تم سے؟“ منزہ اب شدید اضطراب میں تھی۔

”میری ان سے بات نہیں ہو سکی...... اب کرنا چاہتا ہوں۔“ شیر دل انہیں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ شرمین کی کال عکس نے ریسیو کی تھی اور اس کا فون عکس کے پاس تھا۔ یہ منزہ کے غصے کو نئے سرے سے جگانے کا باعث بنتا۔

”مجھے لگتا ہے مجھے اب تمہارے باپ سے بات کرنی چاہیے...... عکس کے خلاف کوئی محکمانہ کارروائی ہو گی تبھی اس مسئلے کا کوئی حل نکلے گا۔“ منزہ نے یک دم جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

”ممی آپ ایک mess کھڑا کر چکی ہیں ایک اور مت کریں...... آپ پاپا سے اس طرح کی کوئی چیز نہیں کروائیں گی۔ جس سے اس کے کیریئر کو کوئی نقصان پہنچے۔“ شیر دل نے دوٹوک انداز میں ماں کو خبردار کیا۔

”تم اس کو اس کیس کو واپس لینے پر رضامند نہیں کرو گے اور تم اس کے خلاف کچھ کرنے نہیں دو گے...... شیر دل تم اس کے لیے اپنے خاندان کو تماشا بنواؤ گے...... اور وہ میں نہیں ہونے دوں گی۔“ منزہ نے بڑی تلخی کے ساتھ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ شیر دل فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے پہلے ازدواجی کرائسس میں پھنسا تھا اور فی الحال اسے اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ وہ شہر بانو سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا تھا...... سنگاپور میں بیٹھے آنے والے دنوں کا تصور اسے ہولا رہا تھا۔ ایک دن پہلے تک...... صرف عکس کی پریشانی تھی جو اس کی ایڑھی کا کانٹا بنی ہوئی تھی اور اب یک دم شہر بانو کی خفگی...... وہ زندگی میں پہلی بار اس سے خفا ہوئی تھی شیر دل کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی خفگی کو کس طرح دور کرے اس سے پہلے چھوٹے موٹے معمولی جھگڑے ہوتے تھے ان دونوں کے درمیان جن کا دورانیہ چند گھنٹوں سے زیادہ کبھی نہیں بڑھ پایا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے تھے اور شیر دل اسے خفا نہیں رہنے دیا کرتا تھا۔ شہر بانو بچے کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہل جایا کرتی تھی اور شیر دل نے اس کی خفگی کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ خفا تھی اور دور تھی اور اسے بات یا وضاحت کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا منزہ نے شہر بانو سے کس طرح بات کی تھی خاص طور پر عکس کے حوالے سے...... لیکن شہر بانو کے اس طرح سے غائب ہو جانے سے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی کہا گیا تھا وہ شہر بانو کے لیے بہت زیادہ پریشان کن تھا۔

سنگاپور میں قیام کے باقی دنوں میں سرتوڑ کوشش کے باوجود وہ شہر بانو سے بات نہیں کر سکا تھا۔ فون اٹھایا جاتا اور اس کی آواز سنتے ہی کچھ کہے بغیر رکھ دیا جاتا اور یہ شرمین اور شہر بانو دونوں کی طرف سے ہو رہا تھا۔ اس نے بہت اپ سیٹ ہو کر بالآخر ایک دن فاروق کو کال کی تھی۔ فاروق کا رویّہ بھی بے حد سرد مہری لیے ہوئے تھا اور اس نے بہت صاف لفظوں

میں اس سے کہا تھا کہ یہ اس کا اور شہر بانو کا مسئلہ ہے وہ اسی کے ساتھ حل کرے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے شہر بانو سے بات کرانے کے سلسلے میں بھی صاف انکار کر دیا تھا۔

شیر دل نے شدید خفگی اور ڈپریشن میں دوبارہ منزہ کو فون کیا تھا۔ ”آپ اب خود دوبارہ شہر بانو سے بات کریں...... یہ مصیبت میرے لیے آپ نے پیدا کی ہے آپ کی ذمے داری بنتی ہے کہ آپ اب اسے ختم بھی کریں۔“ شیر دل کو ماں سے شدید شکایت تھی۔ منزہ نے واقعی بیٹھے بٹھائے باہر جاتی پریشانی کو اس کے گھر لا بٹھایا تھا اور منزہ کو اب اس کا احساس ہونے لگا تھا۔

”بیٹا میں نے تم کو شیر دل کو سمجھانے کے لیے کہا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ تم اس سے بات چیت ہی ختم کر دو۔“ منزہ نے شیر دل سے بات کرنے کے بعد اس دن شہر بانو کو فون کیا تھا۔ شیر دل کے فون کے برعکس شہر بانو نے منزہ کی کال ریسیو کر لی تھی۔

”ممی میں ایک ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہوں گی جو مجھ سے sincere نہیں ہے۔ اگر اس کے لیے کوئی دوسری عورت اہم ہے تو اسے اس دوسری عورت کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔“ شہر بانو نے دوٹوک انداز میں کہا۔

”تم کیا حماقت کرنا چاہ رہی ہو؟“ منزہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”تم یہ چاہتی ہو کہ وہ اس عورت کے ساتھ مل کر شہباز کی عزت اور نام خراب کرے؟ اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے پاپا کا ہی خیال کرو تم۔“ منزہ نے اسے سمجھانے کی کوششوں کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نے تم سے کہا تھا اپنی ممی سے ذکر مت کرنا تم نے ان سے بات کیوں کی اس معاملے پر...... تم ہماری فیملی کا حصہ ہو شرمین کی فیملی کا نہیں...... شرمین نہ اس مسئلے کو سمجھ سکتی ہے نہ ہی وہ اس کا حل نکال سکتی ہے۔ وہ صرف تمہیں غلط مشورے دے سکتی ہے۔“ منزہ نے بے حد تنفر سے کہا تھا۔

”ممی انہوں نے مجھے کوئی مشورہ نہیں دیا اور میں نے ان سے پوری بات ڈسکس نہیں کی صرف شیر دل اور عکس کے افیئر کے حوالے سے بتایا ہے۔“

”بس تو پھر کافی ہے اتنا ہی...... تمہیں اس سے زیادہ شرمین کو بتانا بھی نہیں چاہیے۔ تم پاکستان آجاؤ اور یہاں آکر شیر دل سے بات کرو۔“ منزہ نے جیسے سکون کی سانس لی تھی کہ شہر بانو نے شرمین سے بہت کچھ چھپا لیا تھا۔ شہر بانو انکار کرنا چاہتی تھی لیکن وہ منزہ کو انکار نہیں کر سکی تھی۔ وہ شیر دل کا فون نہیں لے رہی تھی اور وہ اسے اور شرمین کو کالز پر کالز کر رہا تھا لیکن اب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات نہ کرنے سے اور امریکا میں بیٹھے رہنے سے بھی کیا ہوگا۔ اس مسئلے کا حل بات چیت سے ہی نکلنا تھا آخر میں...... اسے شیر دل کی بات سننی ہی تھی...... لیکن وہ شیر دل کے منہ سے اب عکس کا نام نہیں سننا چاہتی تھی۔ وہ اتنے سالوں بعد بڑی خوشی سے امریکا چھٹیاں گزارنے آئی تھی لیکن اب اس کی واپسی عجیب احساسات کے ساتھ ہونے والی تھی۔

”ممی آپ نے پاپا سے divorce کیوں لی تھی؟“ شہر بانو نے شرمین کو اپنے اور منزہ کے درمیان ہونے والی بات چیت کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن اس نے شرمین کو یہ ضرور بتا دیا تھا کہ وہ واپس جانے کا سوچ رہی تھی کیونکہ وہ شیر دل سے اس سلسلے میں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنا چاہتی تھی۔ شرمین نے اسے روکنے یا منع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن وہ خود اندر سے بہت سے خدشات کا شکار تھی، اس نے شہر بانو کو اس رات شیر دل کا فون ملانے پر عکس کے فون اٹھانے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ شہر بانو کو یہ بات بتا سکتی۔ شہر بانو نے اس سے کہا تھا کہ عکس کی کچھ عرصے تک شادی ہونے والی تھی اور لاشعوری طور پر شرمین کو یہ آس بندھ گئی تھی کہ اس کی شادی کے ساتھ ہی یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ یہ کرائسس اس کی بیٹی کی زندگی سے ختم ہو جائے گا۔ شیر دل اس کی نظروں سے بری طرح گر گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ جیسے اپنی بیٹی کی خوشیاں اور گھر بچانے کے لیے اسے ایک آخری موقع دے رہی تھی۔ اس ساری گفتگو کے دوران شہر بانو نے وہ سوال کیا تھا۔ شرمین کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ اس نے کئی سالوں بعد اس سے دوبارہ یہ سوال پوچھا تھا اس کے باوجود کہ وہ اس کو جواب دے چکی تھی۔

”تمہیں بتایا تھا میں نے...... ہم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ نہیں تھی۔“ شرمین نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے پتا نہیں کون کون سا زخم ہرا ہو گیا تھا اس کا۔

”انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو تو انسان اتنے سال تو اکٹھے نہیں رہتا...... بس دو چار سال میں سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔“ شہر بانو نے ماں کی بات کو پہلی بار کھلے لفظوں میں رد کرتے ہوئے کہا۔

”بعض شادیاں سالوں چلنے کے بعد بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔“ شرمین نے عجیب دل گرفتگی کے عالم میں کہا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا جب شہباز سے اپنی شادی کے بارے میں بات کرتے ہوئے شہر بانو نے شرمین کو رنجیدہ دیکھا تھا ورنہ وہ ہمیشہ ایک بے تاثر چہرے اور سرد مہر لہجے میں اس ایشو پر بات کرتی تھیں یوں جیسے وہ کسی اور کی زندگی کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔

”ایسا کیا ہوا تھا آپ میں اور ان کے درمیان کہ آپ نے divorce جیسا بڑا فیصلہ کر لیا۔“ شہر بانو نے اپنے سوال پر اصرار کیا۔

”تمہیں آج بیٹھے بٹھائے مجھ سے یہ پوچھنے کا خیال کیسے آ گیا؟“

”ہمیشہ ہی پوچھنا چاہتی تھی آپ نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔“ شہر بانو نے ماں کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”بہت وقت گزر گیا بہت پرانی بات ہو گئی اب اس کے بارے میں بات کرنے کا کیا فائدہ...... زندگی بہت آگے آ گئی ہے۔“ شرمین نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”میرے لیے نہیں آئی...... میری زندگی کا ایک حصہ، پاپا کے ساتھ بندھا ہوا تھا وہ آج بھی وہیں ہے۔“ بہت تکلیف دہ اعتراف تھا یہ شہر بانو کا اور اتنا ہی تکلیف دہ یہ شرمین کے لیے تھا۔ شہر بانو، شہباز سے کس طرح اٹیچڈ تھی شرمین کو اس کا اندازہ اور احساس تھا اور شادی کے اس رشتے کو توڑتے ہوئے اگر اسے کسی چیز کی سب سے زیادہ تکلیف تھی تو وہ یہی تھی۔ جھگڑے کی وجہ وہ نہ ہوتی جو تھی تو وہ شہر بانو کو شہباز سے اس طرح دور نہ کرتی لیکن پتا نہیں اسے شہباز اور شہر بانو کے حوالے سے عجیب سے وہم ہوتے تھے۔ نفسیاتی طور پر وہ شہر بانو کو شہباز کے پاس اکیلا چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور یہ ایک ایسا خوف اور وہم تھا جسے وہ کسی کے ساتھ شیئر کر کے اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ شہباز، شہر بانو کا باپ تھا اور یہ سوچنا بھی شرمناک تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ کوئی غلط حرکت کر سکتا تھا لیکن شرمین اس ایک انکشاف کے بعد ہر طرح کے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئی۔ اس کا گھر زمین بوس نہیں ہوا تھا، اس کی پوری شخصیت زمین پر آ گری تھی۔ شہباز اپنے جرم کا اعتراف کرنے پر تیار نہیں تھا اور اس کی اس ڈھٹائی نے شرمین کے خوف اور عدم تحفظ کو بڑھا دیا تھا۔ وہ شہباز سے اعترافِ جرم کا مطالبہ کر رہی تھی اور وہ اس سے انکاری تھا۔

”تم خود سوچو میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔ میں ذہنی طور پر بیمار ہوں کیا؟“ اسے منانے کی کوششوں کے دوران وہ بار بار ایک ہی جملہ بولتا رہتا تھا اور ایک پوائنٹ پر آ کر شرمین چلا اٹھی تھی۔

”تم ذہنی طور پر بیمار ہو۔ تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔ اس inode of denial سے باہر نکل آؤ شہباز...... کم از کم اب جب تم یہ بھی جانتے ہو کہ سب کچھ پتا چل گیا ہے مجھے۔“ شہباز پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ سب ٹھیک ہو جاتا اگر اسے منزہ کی اتنی بھرپور اور کھلی حمایت نہ ملتی۔ اسے اپنی زندگی میں کبھی اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا نہ ہوتا اگر خلع ہو جانے کے کچھ عرصے کے بعد شہباز نے خودکشی نہ کر لی ہوتی۔

اس کی موت نے شرمین کو اس سے رشتہ ختم ہو جانے کے باوجود بری طرح توڑ دیا تھا...... وہ پہلا موقع تھا جب اس نے اپنے فیصلے کے نتائج کے بارے میں دوبارہ سوچنے کی کوشش کی تھی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ شہباز حسین کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی اس کی زندگی کا بہترین حصہ تھا جب تک اسے چڑیا کے بارے میں پتا نہیں چلا تھا اور زندگی کے بہترین حصے کو اپنی یادوں سے مکمل طور پر کاٹ دینا آسان نہیں تھا...... فاروق کے زندگی

www.Paksociety.com

میں آجانے کے بعد بھی...... وہ شہباز کے لیے کبھی کسی کے سامنے نہیں رو سکی تھی...... یہ کام اس نے ہمیشہ اکیلے میں کیا تھا۔ کسی چیز پر جج بن کر فیصلہ کر دینا ایک بات ہوتی ہے لیکن اس فیصلے کے ہاتھوں ساری زندگی suffer کرنا ایک دوسری بات...... ضمیر کی آواز پر اس نے فیصلے تو کیے تھے لیکن زندگی ان فیصلوں کے بعد بھی کبھی آسان نہیں لگی تھی شرمین کو۔

''تم نے کیا فیصلہ کیا ہے پھر؟'' شرمین نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

''پاکستان جارہی ہوں میں...... شیر دل سے بات کروں گی اور اگر کوئی حل نہ نکلا تو......'' شہر بانو بات مکمل نہیں کر سکی تھی۔ شرمین نے اس تو کے بعد اگلے جملے کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

''جو بھی تم بہتر سمجھتی ہو کرو لیکن بس ہمیشہ یہ یقین رکھنا کہ تم اپنے ہر فیصلے میں مجھے ساتھ پاؤ گی۔'' شرمین نے اسے تسلی دی تھی۔ شہر بانو نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا کہ کہنے کے لیے اب اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ غرور اور فخر جو وہ شیر دل کی ذات کی وجہ سے لیے پھرتی تھی وہ ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

خیر دین کی حالت آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی تھی اور اس کی حالت کے سنبھلنے کے ساتھ ساتھ جیسے عکس کی جان میں جان آنا شروع ہو گئی تھی۔ حلیمہ بھی پاکستان واپس آچکی تھی اور ہاسپٹل میں ہی اس نے جواد یا اس کی فیملی کی طرف سے کسی قسم کا رابطہ نہ ہونے پر عکس سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

''میں نے جواد کو سنگاپور سے ہی نانا کے بارے میں انفارم کیا تھا اور اس نے نانا کے پاس آنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن پتا نہیں اس کے بعد کیا ہوا...... میرے اسٹاف نے کہا کہ وہ ایک بار آیا تھا میرے پاکستان پہنچنے سے پہلے کی بات ہے...... لیکن بس اس کے بعد اس کے ساتھ میرا کوئی رابطہ نہیں۔ میں نے چند ایک بار فون کیا تھا اسے لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی پھر میں نے بھی دوبارہ کال نہیں کی...... یہاں نانا کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ آفس سے چھٹی پر ہوں لیکن وہاں سے بھی کالز پر کالز اٹینڈ کرتی رہی ہوں سارا دن۔'' وہ حلیمہ کو تفصیل سے جواد سے رابطے کے حوالے سے بتا رہی تھی جو بات وہ ماں کو نہیں کہہ پا رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ جواد کے اس رویے اور بے اعتنائی سے بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔ وہ مستقبل میں اس کا لائف پارٹنر بننے والا تھا اور اس کی زندگی کے اس مشکل وقت میں اس نے اس سے مکمل طور پر رابطہ ختم کر دیا تھا۔ وہ سپورٹ جو وہ اس سے چاہتی تھی وہ اسے شیر دل سے مل رہی تھی۔ وہ پاکستان میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے رابطے میں تھا۔ ہاسپٹل انتظامیہ سے رابطے میں تھا۔ اس کی رہائش کے انتظامات فوری طور پر اس کی وجہ سے ہوئے تھے۔ اس کا اسٹاف تقریباً ہر روز اس سے رابطہ کر کے کسی بھی کام کے حوالے سے اپنی خدمات پیش کر رہے تھا۔ شیر دل کا اثر و رسوخ اس کے اثر و رسوخ سے کہیں زیادہ تھا اور اس کی وجہ سے خیر دین کو ہاسپٹل میں وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جا رہا تھا...... اور وہ اگر نہ ہوتا تو عکس کو بہت سارے کاموں کے لیے بہت سارے لوگوں کو کہنا پڑتا...... اثر و رسوخ جواد اور اس کی فیملی کا بھی کم نہیں تھا لیکن ان کی طرف سے اس کے لیے کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ باقی سب کچھ وہ اگر نظر انداز کر بھی دیتی تو اس کے لیے یہ نظر انداز کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کسی نے عیادت کے لیے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

''میں سوچ رہی ہوں میں فون کرتی ہوں جواد کو۔'' حلیمہ نے اس سے کہا تھا۔

''امی آپ کو نہیں لگتا کہ یہ اس کی ذمے داری ہے۔'' عکس نے...... بے حد سنجیدگی سے ذکر نہ کرتے ہوئے بھی جواد کی بے اعتنائی جتائی تھی۔

''ہاں فرض تو بنتا تھا ان کا...... اور یہ اچھا نہیں کیا اس نے لیکن پھر بھی وہ...... چلو ایک بار ابا کو دیکھنے تو آیا تھا...... میں سوچ رہی تھی ہو سکتا ہے کوئی مصروفیت ہو۔'' عکس نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''مصروفیت کسی کو ایک کال کرنے سے تو منع نہیں کرتی۔''

''گلے شکوے تو ہوتے رہتے ہیں بیٹا...... سسرال والے یہی سب کرتے ہیں...... اتنا بڑا اور اونچا خاندان ہے ان کا...... ہم تو ان سے شکایت بھی نہیں کر سکتے۔'' حلیمہ نے بالآخر اپنے احساسِ کمتری کا اظہار کیا تھا۔ عکس کو ماں کی اس بات پر شدید تشویش ہوئی تھی۔ اس کے لیے جواد ''خاندان'' نہیں تھا اس کے لیے جواد ''جواد'' تھا۔ زندگی میں اگر ایک چیز اس کے اندر خیر دین نے کبھی نہیں آنے دی تھی تو وہ احساسِ کمتری تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اپنے ''سابقوں'' اور ''لاحقوں'' کو نہیں چھپایا تھا۔ اپنے ''حوالوں'' پر شرم محسوس نہیں کی تھی۔ وہ ''اچھے'' خاندان کو پہچان سکتی تھی۔ ''اونچے'' خاندان کی تعریف اور شناخت سے لاعلم تھی۔ اور اب حلیمہ اس کے سامنے ایک عجیب سوال لے آئی تھی۔ اس نے حلیمہ سے بحث نہیں کی تھی اس کے اصرار پر اس بار اپنے بجائے اپنے اسٹاف سے فون لے کر جواد کو کال ملائی تھی۔ کال unknown نمبر کی وجہ سے ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ بے عزتی محسوس کرنا چاہتی تو یہ بھی کافی تھی۔ غیر متوقع طور پر اس کی آواز سننے پر جواد کچھ دیر کے لیے گڑبڑا گیا تھا۔ پھر اس نے نارمل ہوتے ہوئے اس سے حال چال پوچھا، نانا کے بارے میں دریافت کیا۔

''امی تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' عکس نے اس سے کہا اور اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس سے کہا۔

''میری امی بھی تمہاری امی سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ عکس پوچھے بغیر نہیں رہ سکیں۔

''کس لیے؟''

''میرے پیرنٹس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ فوری طور پر کچھ بول نہیں سکی۔ چند ہفتوں پہلے تک وہ خود اس رشتے کو ختم کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن اس کے باوجود چند لمحوں کے لیے اسے عجیب ٹھیس سی لگی تھی جواد کے منہ سے یہ بات سن کر۔

''میں وجہ جان سکتی ہوں؟'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جواد سے پوچھا۔

''وجہ تم اچھی طرح جانتی ہو عکس۔''

''اگر میں جانتی ہوتی تو تم سے کبھی نہ پوچھتی۔''

''تمہیں شیر دل اور اپنے بارے میں مجھے بتانا چاہیے تھا...... لیکن تم......'' وہ رشتہ ختم کرنے کے بارے میں سن کر اتنا شاکڈ نہیں ہوئی تھی جتنا جواد کے منہ سے شیر دل کا نام سن کر۔

''تم اگر شیر دل کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں تو......'' جواد کے لہجے میں عجیب سی خفگی تھی۔ عکس نے بے حد الجھ کر اس کی بات کاٹی۔

''تم سے کس نے کہا کہ میں شیر دل سے شادی کرنا چاہتی تھی؟''

''اس کی ممی نے میری ممی کو فون کیا تھا۔'' عکس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ آخری چیز جس کی توقع وہ منزہ بختیار شیر دل سے کر سکتی تھی وہ یہ تھی جو وہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

''آپ اسے suspend کروائیں...... اس کے خلاف کوئی انکوائری کروائیں لیکن اس کو سبق سکھا دیں، اسے پتا چل جائے کہ اس طرح کی حرکت کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ آپ ذرا سوچیں ہماری فیملی کی عزت خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے...... پتا نہیں کہاں سے یہ کمی کمینوں کے بچے آرہے ہیں سول سروس میں اور پھر آکر خاندانی لوگوں کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں......'' منزہ پچھلے پندرہ منٹ سے بختیار شیر دل کے سامنے عکس کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف تھی۔

بختیار کو اس کورٹ نوٹس کا علم ہو گیا تھا کیونکہ کورٹ کی طرف سے ویسا ایک نوٹس ایس اینڈ جی اے کو بھی موصول ہو گیا تھا اور اس کے بعد یہ خبر بختیار تک پہنچنی مشکل نہیں تھی۔ وہ جیسے کیس کی نوعیت سے زیادہ کیس کرنے والے کے بارے میں سن کر ہکا بکا ہوئے تھے۔ عکس کی شیر دل کے ساتھ دوستی سے وہ واقف تھے اور کسی کو بھی شاک

www.Paksociety.com

لگتا اگر انہیں ان دونوں کے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ نہ ہوتا۔ کیس کی details شاک کی شدت بڑھانے کے لیے کافی تھیں۔

انہوں نے گھر آ کر منزہ سے اس بارے میں بات کی تھی اور منزہ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں رہا تھا کہ وہ عکس کے خلاف جتنا زہر اگل سکتی تھی اگلتی۔

''شہباز کی reputation ایک ایماندار اور قابل آفیسر کے طور پر تھی۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کسی ملازم کے ساتھ بغیر کسی وجہ کے اتنی بڑی زیادتی کرے اور وہ ملازم اتنے سال چپ رہنے کے بعد اب اس کے لیے کیس کر رہا ہے۔'' بختیار کے لیے بھی کیس کی مندرجات سے متفق ہونا مشکل تھا۔

''یہ آدمی چور تھا...... چوریاں کرتا رہا شہباز کے گھر میں...... اور وہ اس پر اتنا ٹرسٹ کرتا تھا۔ جب پکڑا گیا تو شہباز نے اسے نکال دیا اور اس پر ترس کھاتے ہوئے اس کے خلاف کیس نہیں کیا لیکن اس نے شرمین سے مل کر اسے شہباز کے خلاف بھڑکایا۔ شہباز پر بہت گھناؤنا الزام لگایا...... شرمین نے اسی آدمی کی باتوں میں آ کر شہباز کو چھوڑا تھا...... میرے تو یہ سامنے آجائے تو میں اسے شوٹ کردوں......'' منزہ بالکل آگ بگولا تھی۔ معاملے کو وہ جتنا لپیٹنے اور hushed up رکھنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنا ہی پھیلتا جا رہا تھا۔

''کیا الزام لگایا تھا اس نے شہباز پر؟'' بختیار نے یک دم اس سے پوچھا۔

منزہ چند لمحوں کے لیے کچھ بھی بول نہیں سکی تھیں۔ انہیں اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا انہیں بختیار کے سامنے الزامات کی بات شاید کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ یہ نہیں تھا کہ انہیں یہ خدشہ تھا کہ خیر دین کے لگائے ہوئے الزام کی نوعیت جان کر بختیار کو شہباز پر کوئی شبہ ہونے لگتا لیکن اس کے باوجود وہ بختیار کے سامنے وہ الزام دُہرانا نہیں چاہتی تھیں۔

شرمین اور شہباز کے درمیان طلاق والے معاملے کو بھی انہوں نے جس حد تک ممکن تھا بختیار سے چھپائے رکھنے کی کوشش کی تھی۔ بختیار نے معاملہ بہت بار بگڑنے پر چند ایک بار اس معاملے کو حل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن منزہ نے انہیں اس معاملے کے درمیان آنے نہیں دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں شرمین کے الزامات کی بازگشت بختیار تک پہنچے۔ اپنے اکلوتے بھائی کے نام اور عزت کو ہر طرح سے محفوظ رکھنے کے لیے منزہ کسی بھی حد تک جانے پر تیار تھیں۔

''تم نے بتایا نہیں کہ شہباز پر کیا الزام لگایا تھا اس نے؟'' بختیار نے انہیں یوں گم صم دیکھ کر جیسے ایک بار پھر اپنے سوال کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ منزہ بے حد کنفیوزڈ تھیں۔

☆☆☆

عکس مراد علی کے suspend (معطل) ہونے کی خبر شیر دل کو لاہور ائرپورٹ پر پہنچتے ہی مل گئی تھی۔ اس کا اسٹاف وہاں اسے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کے پی اے نے اسے مختلف معاملات پر update کرتے ہوئے عکس کی معطلی کی بھی اطلاع دی تھی شیر دل کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

''suspend ہوگئیں؟ کس لیے......؟ کب؟'' شیر دل نے بے حد اضطراب کے عالم میں پی اے سے پوچھا۔ ابھی پچھلی رات اس کی عکس سے بات ہوئی تھی اور اس سے بات چیت کے دوران اسے اس کے لہجے تک سے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی کرائسس میں تھی۔

''کل آرڈرز نکلے ہیں اور وجہ کا نہیں پتا۔'' اس کے پی اے نے اسے جواباً بتایا تھا۔ شیر دل بہت اپ سیٹ ہوگیا تھا اس کی چھٹی حس نے اسے جیسے خبردار کیا تھا اور اگر یہ اس کی فیملی کی وجہ سے ہوئی تھی تو اس کا مطلب تھا یہ سارا معاملہ اس کے باپ تک پہنچ چکا تھا چیس بورڈ پر تمام چھوٹے پیادے پٹ چکے تھے۔ اب صرف بڑے مہرے رہ گئے تھے اور بڑے مہرے صرف سیدھی نہیں ٹیڑھی چالیں بھی چل سکتے تھے۔

(باقی آئندہ)

زندگی سے خواہش اور خواب نکل جائیں تو انسان روبوٹ بن جاتا ہے... اور زندگی سے ویلیوز نکل جائیں تو انسان حیوان بن جاتا ہے اور میں اجیہ احمد عرف جیا روبوٹ تو بہت عرصے پہلے بن چکی تھی۔ میرا یہ خیال بالکل فائنل تھا لیکن جب مجھے آدم کے بیٹے نے انسان کے عہدے سے اتر کر کسی اور دنیا کا باسی بننے کو

جیا کی امی

نوشین ناز اختر

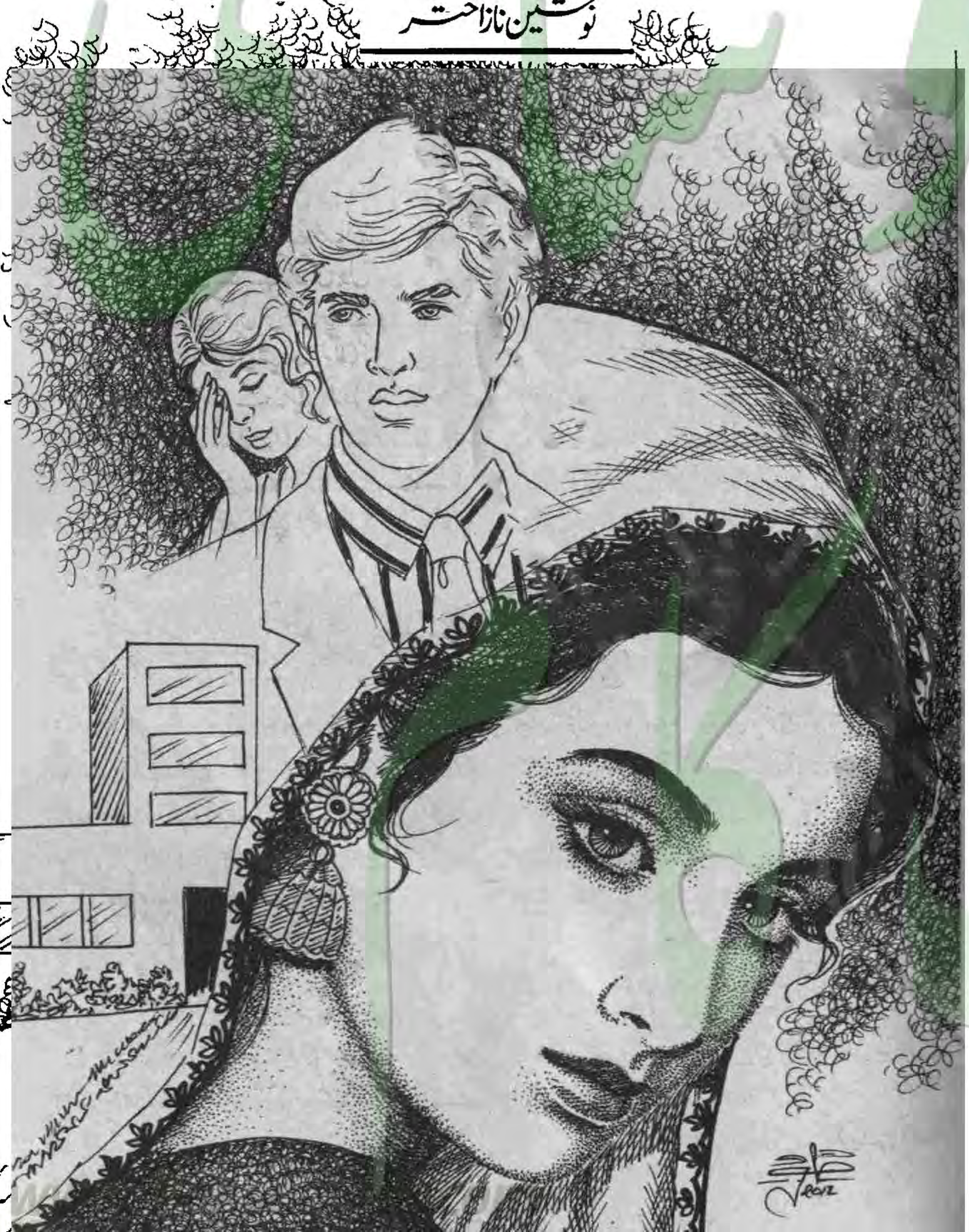

کہا تو مجھے احساس ہوا کہ جیا ابھی مکمل روبوٹ نہیں بنی۔ ابھی اس میں زندگی باقی تھی۔ کیونکہ زندگی سے بے شک اس کی دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی لیکن جہاں عزت کا معاملہ آیا تو اس کے اندر پلس مائنس کا ایسا شور اٹھا کہ اسے اندازہ ہوا وہ اپنی ویلیوز چھوڑ کر حیوانوں کی دنیا میں داخل نہیں ہوسکتی۔

تو اب وہ کیا کرے......؟ کیا وہ سرنڈر کردے یا پھر لڑے؟ لڑنے کے لیے تو ہمت چاہیے ہوتی ہے ناں؟ لیکن اس کے اندر کی تو بوند بوند اس کی ماں کے ''خوف'' نے چوس لی تھی۔

اس کی ماں کا خوف۔ کیا تھا اس کی ماں کا خوف؟ چھ عدد بیٹیوں کی زندگی کا خوف......! حیرت تھی کہ وہ ہر بیٹی کی نئی زندگی کی بنیاد رکھنے کے لیے پہلی بیٹی کی قربانی چاہتی تھیں۔

آسیہ باجی جن کے پروفیسر شوہر ان کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے تھے لیکن امی جی کے خوف کی وجہ سے وہ عرصہ بارہ سال سے بنا شکوہ کیے مار کھا رہی تھیں کیونکہ اگر بڑی بہن گھر آکر بیٹھ گئی تو باقی پانچ کا کیا ہوگا؟

آمنہ باجی سارا دن اسکول سے اکیڈمی میں سر کھپا کر جو رقم اپنے بچوں کے لیے لاتی تھیں شاہد بھائی وہ بڑے دھڑلے سے لے اڑتے تھے یہ سوچے بنا کہ ان کے بچوں نے کچھ کھایا ہے یا بھوکے ہی سو گئے ہیں۔ لیکن وہ اپنے شوہر کے اس عمل پر چوں بھی نہیں کرسکتی تھیں کیونکہ ان کا احتجاج انہیں میکے بٹھا سکتا تھا اور ان کے میکے بیٹھنے سے باقی چار کا کیا ہوگا؟ پس ان کو بھی قربانی دینی پڑتی تھی اور یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ اپنے نکھٹو شوہر کو کچھ بھی کہہ نہیں سکتی تھیں۔

پھر عائشہ باجی تھیں، وہ مصدق بھائی کی ماں بہنوں سے اس قدر ڈرتی تھیں کہ اگر وہ اپنے اللہ سے اتنا ڈرتیں تو شاید ولایت کے درجے پر فائز ہوتیں۔ مصدق بھائی کی ماں بہنوں کی بے دام غلام جو صبح اذانوں سے آن ڈیوٹی ہوتیں تو رات گئے تک چھٹی نہ ملتی تھی۔ رات کا آخری کام نمازِ عشا کے بجائے ساس صاحبہ کے پاؤں دبانا ہوتا تھا اور تب تک چھٹی نہ ملتی جب تک وہ خراٹے نہ لینے لگتیں۔ اس خدمتِ بیگار پر کبھی ان کو دو بول تحسین کے تو نہ ملے تھے لیکن اکثر ساسو ماں کی زوردار لات ضرور ملتی تھی جس سے وہ اکثر نیند میں دھڑام سے زمین پر آگرتی تھیں۔

نوکروں سے کمتر حقوق رکھنے والی عائشہ باجی ......اب بھی امی جی کے خوف کا شکار تھیں۔ ''تیرا کوئی بھائی تو ہے نہیں جو تیرے پیچھے پھرے گا۔ باپ سدا کا معذور انسان ہے، بری بھلی جیسی بھی ہے بس قسمت جان کر گزار لو۔'' اور عائشہ باجی ساسو ماں کی زبردست لاتوں کا دکھ بھول کر منہ کھولے امی کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں۔ جب ان کی سگی ماں ہی ان کے حقوق کو ماننے کو تیار نہیں تھیں تو ساس سے وہ کیسے کوئی حق مانگنے کی جرأت کرپاتیں۔

پھر میں تھی اجیہ......! پہلے تو صرف لوگ کہتے تھے کہ میرا حسن پرستان کی کسی پری جیسا ہے پھر اس کی پکی سند دینے کے لیے عمار احمد نے ہمارے گھر کی دہلیز پکڑ لی تھی۔ سانولے سے دراز قد عمار احمد امی کے اسکول کے ڈائریکٹر کے بیٹے تھے۔ ان کے باپ کے اسکولز کے علاوہ گروپ آف کالجز بھی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ باپ کا سیاسی بیک گراؤنڈ......وہ بحیثیت انسان کیسے تھے؟ امی نے جانچنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ ان کی معاشی، معاشرتی حیثیت سب سے زیادہ حاوی تھی پھر اسی کے حق میں انہوں نے فیصلہ دے دیا تھا۔

میں جو اسکول کے فنکشن میں امی کے ساتھ گئی تھی وہیں پر عمار احمد کی نظروں نے مجھے فوکس کیا تھا۔

''امی میں پڑھنا چاہتی ہوں۔'' میں نے بہت

حسرت سے کہا تھا۔

''اور پڑھ کر کیا کروگی؟ باقی بڑی بہنوں سے تیری قسمت اچھی ہے۔ تجھے اپنے بچاؤ کے لیے معاش کی فکر میں دوڑنا نہیں پڑے گا۔ تجھے امیر شوہر، بڑا گھر مل رہا ہے جا کر عیش کر، یہاں ماں کے گھر کی روکھی سوکھی سے جان چھوٹے گی؟'' امی نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

''امی عمار سترہ سال بڑا ہے جیا سے۔'' عائشہ باجی ہلکے سے منمنائی تھیں۔

''تو کیا ہوا؟ تمہارے ابا مجھ سے پندرہ سال بڑے تھے۔ پھر مرد تو عمر میں بڑے ہی اچھے لگتے ہیں۔'' امی نے بے حد پُرسکون انداز میں کہا تھا۔

''امی اتنا زیادہ کلاس کا فرق آگے جا کر مسائل پیدا کرے گا۔'' آسیہ باجی نے نرمی سے کہا۔

''تمہارے جیسے مسائل سے تو الگ ہوں گے اس کے مسائل......زیادہ سے زیادہ وہ اسے غریب ماں باپ کے گھر آنے سے روک دے گا۔ ہم نے کون سا یہاں بیٹھے رہنا ہے؟ تمہارا کوئی بھائی تو ہے نہیں جو میکا بنا رہے گا۔ باپ ہمیشہ کا بیمار، میں خود اسکول سے ریٹائر ہونے والی ہوں۔ کل کو زندگی سے ریٹائر ہوجاؤں گی۔ یہ گھونسلا تو ختم ہی سمجھو۔ اپنا اپنا گھونسلا بناؤ، تم لوگوں کو اب وہیں رہنا ہوگا۔'' ان کے لہجے میں بے پناہ تھکن تھی۔ ابا کی معذوری کے بعد انہوں نے زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے ان تھک محنت کی تھی۔ اب وہ بس بیٹیوں کے فرائض جلد از جلد پورے کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی سوچ تو اچھی تھی لیکن طریقۂ کار بالکل اچھا نہ تھا۔ اپنی ہی بیٹیوں کو گائے بھینس کی طرح کہیں بھی ڈھو دینا کہاں کا انصاف تھا؟ لیکن ان کی عدالت میں ہمارا ان کی بیٹیاں ہونا ہی اتنا بڑا جرم تھا کہ ہم میں سے کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا تھا۔

عمار احمد سے شادی کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں تو جیسے مریخ سے امپورٹ کی گئی ہوں۔ عمار کی دنیا کا میں ''ایلین'' تھی۔ جس کو سب زور شور سے اپنی دنیا کا باسی بنانے پر تل چکے تھے۔ پہلے دن سے آج کے دن تک اجیہ احمد کو بدلنے کی بھرپور کوشش کامیاب ہوچکی تھی۔

میرے ماضی اور حال میں ہائی کنٹراسٹ تھا۔ اتنا ہی جتنا کسی کالے گورے میں ہوتا ہے، اندھیرے اجالے میں ہوتا ہے اور میں...... اجالے سے اندھیرے میں دھکیل دی گئی تھی۔ عبا سے چادر کا سفر نہیں تھا میرا۔ عبا سے سلیولیس لباس کا سفر تھا میرا۔ منہ ٹیڑھا کر کے انگلش بولنا، مرد اور عورت کی دوستی کے رشتے میں موجود غلاظت کو کسی ایوارڈ کی طرح خود پر سجانا تو معمولی باتیں تھیں ان سب کے لیے۔ میرے لیے آخری بات بہت غیر معمولی تھی اور میں کیسے سرنڈر کرلیتی۔

''جیا......اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے شوہر کی خوشنودی کے لیے وہ لباس زیبِ تن کرلو جو اسے پسند ہو۔'' امی کا پیغام ادھورا تھا۔

اللہ نے کب شوہر کی خوشنودی کے لیے ننگے لباس کی اجازت دی تھی۔ میں امی کو کیسے بتاتی کہ میں عمار کے لیے وہ خوب صورت پروڈکٹ ہوں جس کو شو کے کارڈ کی طرح اس نے استعمال کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔

میری برداشت کی حد ختم ہوگئی تھی۔ غزنی گروپ آف انڈسٹریز کے مالک نے میرے سامنے ہی مجھے میرے شوہر سے ایک فائل کے عوض چند دن کے لیے مانگ لیا تھا اور میں ہکا بکا رہ گئی... جب عمار احمد نے کیچوے کی طرح بغیر مزاحمت کے خوشامدی انداز میں ہامی بھری تھی۔

اس پارٹی میں غزنی نے جس طرح مجھ پر حملہ کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا میں بہت مشکل سے خود کو بچا کر بھاگی تھی۔ مجھے اپنے سارے وجود سے گھن آ رہی تھی۔ میرے سارے وجود کو اس نے چھوا تھا۔ بس غنیمت تھی کہ میں عزت بچا کر بھاگی تھی۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ میں بھاگ کر وہیں پہنچی جہاں میری عزت کا رکھوالا نہیں لیٹرا موجود تھا۔

عمار نے مجھے مار مار کر ادھ مؤا کر دیا تھا۔ سنگین نتائج کی دھمکیاں دے کر وہ مجھے بارہ گھنٹے کی مہلت دے کر نکلا تھا۔ ان دھمکیوں میں سنگین ترین دھمکی میری کنواری بہنوں کے اغوا سے شروع ہوتی تھی اور میں جانتی تھی کہ عمار احمد کے لیے ایسا کرنا مشکل نہیں تھا۔

عجیب رات تھی۔ پلڑے میں ایک جانب میری عزت تھی اور دوسری طرف دو بہنوں کی عزت تھی۔ کتنی مشکل گھڑی تھی۔

”امی اگر آپ نے کچھ اعتماد ہمیں دیا ہوتا، زندگی کو حل کرنے کا کوئی گر یا حوصلہ دیا ہوتا تو بیٹیاں آج مشکل میں نہ ہوتیں۔“ میں نے روتے روتے شکوہ کیا تھا۔ میرے اتنے رات گئے فون کرنے اور اس طرح شکوہ کرنے پر امی چونکی تھیں۔ جواباً میں نے ساری حقیقت اور دل میں رکھے برسوں کے شکوے ان سے کر ڈالے تھے۔

”تم فون رکھو، میں عمار سے بات کرتی ہوں۔“ امی کی آواز کنویں سے آئی تھی۔

مجھے یقین تھا وہ میرے بجائے اپنی دو بیٹیوں کی زندگی اور عزت بچائیں گی۔ اس لیے میں نے ان سے مزید کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

”عمار تم جیا کے ساتھ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔“ امی نے عمار کو فون کر کے کہا تھا۔

”ارے چپ رہ بڑھیا...... ورنہ میں تیری بیٹیوں کا وہ حشر کروں گا کہ تو شرم سے منہ چھپاتی پھرے گی۔“ عمار نے امی کو بہت زیادہ بے عزت کیا تھا۔

امی نے روتے ہوئے فون رکھ دیا تھا۔ واقعی وہ کمزور عورت کیا کر سکتی تھیں، ساری عمر انہوں نے یہی تسلیم کیا تھا کہ وہ کمزور عورت ہیں اور اسی لیے انہوں نے اپنی بیٹیوں کو کمزور رہنے دیا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ ایک کمزور عورت...... کیا ایک کمزور ماں بھی ہو سکتی تھی؟ قیامت کی رات میں شاید مناجات نہیں کی جاتیں ہوں گی کیونکہ امید اور زندگی تو ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد تو بس رزلٹ ڈے ہوتا ہے ناں......؟

میں نے بھی مناجات بے شک بالکل نہیں کی تھیں پھر بھی میں نے اپنے رب کو بہت پکارا تھا۔ میں مر جانا چاہتی تھی، وہ سورج دیکھنے سے پہلے جو میری عزت لے ڈوبنا چاہتا تھا جو میری پاکیزہ زندگی کو ذلت اور رسوائی دینے والا تھا۔

”نہیں جیا...... تو ایسے نہیں جیے گی، اس سے بہتر تو موت ہوگی...... ایک باعزت موت۔“ میرے اندر کے پلس مائینس کا حساب بہت تیز ہو چکا تھا۔

”کاش امی آپ مجھے یہاں نہ بیاہتیں۔“ میں نے شیشے میں اپنے جگمگ کرتے روپ کو دیکھ کر بے اختیار کہا تھا۔

یہ بے انتہا حسن میری زندگی میں خوشیوں کے بجائے روگ کی وجہ بنا تھا۔ مجھے بے اختیار خود سے ہی نفرت ہونے لگی ...... زندگی سے نفرت ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

”تو کیا سوچا تم نے جیا؟“ عمار نے بند کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے زمین سے اٹھا کر پوچھا تھا۔

”عمار پلیز مجھے چھوڑ دیں...... میں آپ کے اور آپ کے اسٹیٹس کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے آپ

طلاق دے دیں۔“ میں نے عمار کے پاؤں پکڑ لیے تھے یہ جانتے ہوئے کہ یہ شخص اس قابل نہیں ہے اس کا ہاتھ تک تھاما جائے لیکن میں اس کے پاؤں پکڑے بیٹھی تھی۔ عمار نے حقارت سے مجھے جھٹک دیا تھا۔

”تمہارا انکار میرے اندر غصے کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ آج تک عمار احمد کے کہے کو کسی نے انکار نہیں کیا۔ میں اکیلا اس گھر میں رہتا ہوں۔ میرے کہے کو کوئی روکتا نہیں ٹوکتا نہیں ہے۔ یہ میرا سسٹم ہے اور یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔“ عمار کو میں نے غور سے دیکھا تھا۔

یقیناً فرعون کی شکل عمار جیسی نہیں ہوگی لیکن ”خدائی“ کا ایسا دعویٰ کرنے والا ہر شخص فرعون تو ضرور ہوتا ہوگا ناں۔

”یو آر ہیلپ لیس...... میری مانو ...... سدا عیش کرو گی پھر یہ روز تھوڑی ہوگا۔ ارے روز کے لیے کال گرلز کم ہوتی ہیں کیا؟ یہ تو اسپیشل لوگوں سے ایک ”بگ ڈیل“ کے لیے ضروری ہوتا ہے اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ میں خود کئی بار بہت اچھا وقت گزار چکا ہوں بہت عورتوں کے ساتھ اور وہ سب ہائی کلاس سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ بہت زیادہ ذہین اور کارآمد ہوتی ہیں۔ وہ بہت اچھا بزنس لاتی ہیں۔ یہ عام سی بات ہے۔“ عمار نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر بہت نرمی سے سمجھایا تھا۔

”ہاں تم ایک دلال ہو۔ کوٹھے کی عورتوں کی دلالی اور میری دلالی میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ میرا دلال پڑھا لکھا ہے اور وہ میرا شوہر ہے۔“ میری بات کے اختتام پر مجھے بے حد زوردار تھپڑ سے نوازا گیا تھا کہ میں دور جا گری تھی۔

”شٹ اپ...... تم نہیں جانتیں کہ تم نے کس سے ٹکر لی ہے۔“ عمار نے فوراً کسی کو فون ملایا تھا اور کچھ ہدایت دے کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

”تمہارے لیے اطلاع ہے جیا...... تمہاری چھوٹی بہن کو میں نے اٹھوا لیا ہے۔ اگر زبردستی مجھے اپنی بات منوانی ہے تو کیوں نہ تمہاری بہن سے شروعات کی جائے۔“

”نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے......“ میں نے اس کے پاؤں ایک بار پھر پکڑ لیے تھے۔

”میں ایسا ہی کروں گا...... اور ہاں تمہاری بات پر میں غور کر سکتا ہوں کیونکہ تمہاری بارہ گھنٹے کی مہلت میں ابھی چار گھنٹے باقی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ رکا نہیں بلکہ دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلا گیا تھا اور میں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر بے اختیار اللہ سے سوال کیا تھا۔

”وہ کہتا ہے کہ میں ہیلپ لیس ہوں۔ کیا واقعی میں ہیلپ لیس ہوں؟ اے میرے مولا! تیرے ہوتے ہوئے بھی......؟ تیرے ہوتے ہوئے بھی کوئی

مکتبہ اہلا و سہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama,Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications

www.Paksociety.com

بے آسرا ہے۔''

☆☆☆

باہر دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ دروازہ تو باہر سے بند تھا تو پھر یہ باہر سے دستک کون دے رہا تھا؟ میں نے بے اختیار سوچا تھا۔ رو رو کر مجھ پر غنودگی اور نقاہت چھائی ہوئی تھی۔ باہر سے آوازیں آرہی تھیں ان میں سے ایک نسوانی آواز مانوس سی تھی۔ بھلا یہ کس کی آواز تھی......؟ میں نے دماغ پر زور دینے کی کوشش کی تھی لیکن میں ایک بار پھر غنودگی میں چلی گئی۔

☆☆☆

وہ دونوں اس وقت میرے پاس سوئی ہوئی ہیں۔ ان کے چہروں پر بچپن سے لے کر اب تک موجود خوف اور بے چینی آج غالب ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے ناں......لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تین ماہ ہو گئے ہیں۔ میں روز پولیس کا انتظار کرتی ہوں لیکن کوئی نہیں آتا ہے۔ ہر گزرتا دن مجھے حیران کرتا جاتا ہے اور مزید طاقتور بناتا جاتا ہے۔ آج سے تین ماہ پہلے تک میں دنیا کی کمزور ترین عورت تھی اور آج جب میرے اللہ کے یقین کی طاقت موجود ہے تو مجھے اپنا آپ دنیا میں بہت طاقتور محسوس ہوتا ہے۔

میں عفت طاہر......ایک معمولی اسکول ٹیچر ہوں۔ زندگی میں یکے بعد دیگرے چھ بیٹیاں مجھے ہر پل احساس دلاتی رہیں کہ میں بہت کمزور عورت ہوں۔ بیٹیاں کسی پہاڑ کے بوجھ کی طرح مجھے محسوس ہونے لگی تھیں۔ شوہر کی معذوری کے بعد میں نے خود کو مزید کمزور محسوس کیا۔ میرے پاس شوہر کی سپورٹ اور بیٹے کا مان نہیں تھا تو میں کیسے زمانے کے مقابل کھڑی ہو سکتی تھی؟ اور کیسے لڑ سکتی تھی؟

''میں نے اپنی بیٹیوں کے اندر سے خواہشوں، خوابوں اور امیدوں کا ذخیرہ ادھیڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کو خالی خوفزدہ ڈبے بنا دیا۔ میں نے ان کو ایک چیز کا سبق پڑھایا کہ بس سروائیو کرنا ہے چاہے اس کے لیے اپنی انا، خوشی اور پہچان سے ہی کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑیں۔

''میں مظلوم بن کر جینے میں آسودہ تھی۔ میری بیٹیاں مظلوم تھیں لیکن پھر بھی اپنے اپنے سسٹم میں سروائیو کر رہی تھیں۔ ہر ظلم وہ جبراً سہتی آرہی تھیں۔ لیکن آج سے تین ماہ پہلے میری زندگی مکمل طور پر بدل کر رہ گئی۔ جیا کے فون کے بعد میں ایک بار پھر مظلوم ماں کا رول ادا کرنے والی تھی۔ میں نے تسلیم کر لیا تھا اندر سے کہ میں کچھ نہیں کر سکتی تبھی تو میں جیا کے بھیانک انجام کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار کھڑی تھی۔

لیکن اسما کے اغوا نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میٹرک کلاس کی بچی میرے سامنے واپسی پر اسکول سے اٹھالی گئی تھی۔ میرے ہی داماد کی گاڑی میں اسے لے جایا جا رہا تھا۔ میں دیوانوں کی طرح اس کے گھر جا پہنچی تھی۔

''صاحب ٹیرس پر ہیں، اس وقت ان کے پینے کا وقت ہوتا ہے۔'' چوکیدار نے نظریں جھکا کر کہا تھا۔

''میری بیٹیاں کہاں ہیں بابا؟'' میں نے چوکیدار سے پوچھا۔

''کیا تم واقعی ان معصوموں کو لینے آئی ہو؟'' چوکیدار نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ ''اگر ایسا ہے تو میں تم کو اندر جانے دیتا ہوں ورنہ جاؤ بی بی......ہم ایک اور ظلم دیکھ لے گا۔'' چوکیدار نے آہ بھر کر کہا تھا۔ ''تم پولیس کو کیوں نہیں لائیں؟'' چوکیدار نے پھر سوال کیا تھا۔

''پولیس میری کیوں مانے گی، میں غریب اور لاچار عورت ہوں۔'' میں نے روتے ہوئے کہا تھا۔

عمار ٹیرس پر میز کرسی رکھے پی رہا تھا۔ نشے میں

دھت وہ مجھے گالیوں اور اپنی بکواس سے نوازتا رہا۔ جب اس نے میری کسی منت کی پروا نہیں کی تو جانے کہاں سے میرے اندر طاقت آ گئی۔ میں نے ٹیرس کی گرل کے ساتھ لگے عمار کو زور سے نیچے دھکا دے دیا۔ میں جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور عورت تھی لیکن آج میں ایک ماں تھی۔ میں نے اپنا آپ بھلا دیا تھا لیکن آج اللہ نے مجھے میری ذمے داری یاد دلائی تھی۔ عمار گرتے گرتے مجھے بھی گرانے لگا تھا لیکن مجھے کسی نے پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔ یہ چوکیدار تھا۔

''فوراً آؤ اور اپنی بیٹیاں لے جاؤ۔'' چوکیدار نے اتنے سکون سے کہا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہیں ہو۔

میں نے چوکیدار اور اس کی بیوی کی مدد سے اسما اور جیا کو نکالا اور گھر آ گئی۔ وہاں سے گھر تک کا رستہ جس طرح میں نے طے کیا یہ میرا اللہ ہی جانتا ہے۔ میں اس دن سے آج تک روز انتظار کرتی ہوں کہ پولیس آئے گی اور مجھے پکڑ کر لے جائے گی لیکن ابھی تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔

عمار کی موت اس کے خاندان کے لیے معمہ نہیں تھی کیونکہ اسے نشے کی شدید لت تھی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق وہ ڈبل ڈوز شراب پیے ہوئے تھا۔

جیا ان کے خاندان میں مس فٹ بہو تھی۔ عمار کی موت پر جیا کا خاموش اور گم صم رویہ بھی ان لوگوں کی ہمدردی نہ لے سکا اور یوں جیا کو اس کے خاندان سے نجات مل گئی۔

میں نے عمار کا قتل، چالیسواں سب اٹینڈ کیا تھا اور ہر بار میں منتظر رہی تھی کہ پولیس مجھے پکڑ کے لے جائے کہ میں قاتل ہوں......لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

میرے سجدے لمبے ہو گئے تھے۔ پہلے میرے سجدوں میں دعا نہیں ہوتی تھی، شکر نہ تھا کیونکہ میں جس طرح کے حالات میں تھی میں نے قبول کر رکھا تھا۔ اب میں دعا بھی کرتی ہوں اور شکر بھی کہ اس مولا نے اب تک مجھے دودھ میں سے بال کی طرح نکال کر الگ کر دیا تھا۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میری حیرت ابھی تک قائم تھی کہ میں پکڑی کیوں نہ گئی۔ آج چوکیدار اور اس کی بیوی گاؤں جانے سے پہلے مجھ سے مل کر گئے تھے۔

''ہم نے شاید زندگی میں کوئی اتنا اچھا کام نہیں کیا تھا لیکن اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمار صاحب کے قتل کو چھپا پایہ ہم نے ایک اچھا کام کیا۔ بس آئندہ اپنی بیٹی کسی غلط آدمی کے ہاتھ نہ دینا کیونکہ بیٹی تو رحمت ہوتی ہے اور اللہ کی رحمت کی قدر کرنا چاہیے۔ اسے اچھی تعلیم، تربیت کے بعد اچھی جگہ بیاہنا جنت میں جگہ دیتا ہے بی بی ان کی قدر کرنا لازمی ہے یہ جنت کی کنجیاں ہیں۔'' وہ ان پڑھ انسان مجھے زندگی کا سب سے بڑا سبق دے رہا تھا۔

''ہم نے پولیس کو بھی یہ بیان دیا تھا کہ صاحب نشے میں تھا، گر گیا ہوگا۔ اللہ کو یہی منظور تھا، پولیس کو تمہاری وہاں موجودگی کا کوئی ثبوت بھی نہیں ملا تھا۔ اب تم سکون سے رہو اپنی بچیوں کے ساتھ اللہ حافظ......''

چوکیدار اپنی بیوی کے ساتھ چلا گیا اور میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی لیکن میری سانس تب اٹک گئی۔ جب میں نے اسما اور جیا کو دروازے میں کھڑے دیکھا تھا۔ مجھے ایک دم دھڑکا لگا تھا کہ جیا جانے کیا ردِعمل دکھاتی ہے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب جیا اور اسما میرے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔

''آئی لو یو امی۔'' اسما نے کہا تھا۔

''آئی لو یو امی...... آئی ایم پراؤڈ آف یو امی......'' یہ جیا نے کہا تھا۔

www.paksociety.com

تشنگی کا سفر

یاسمین نشاط اختر

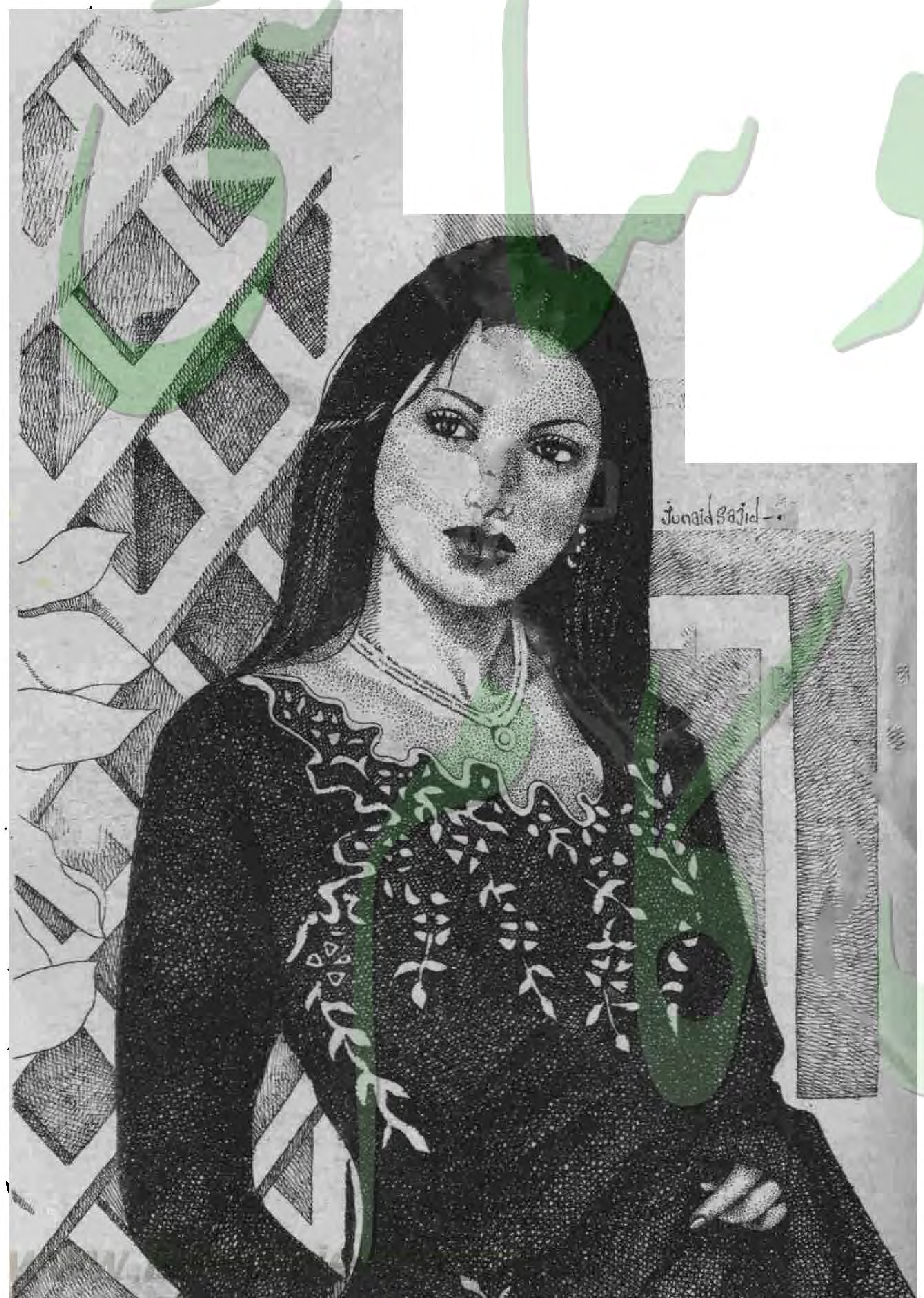

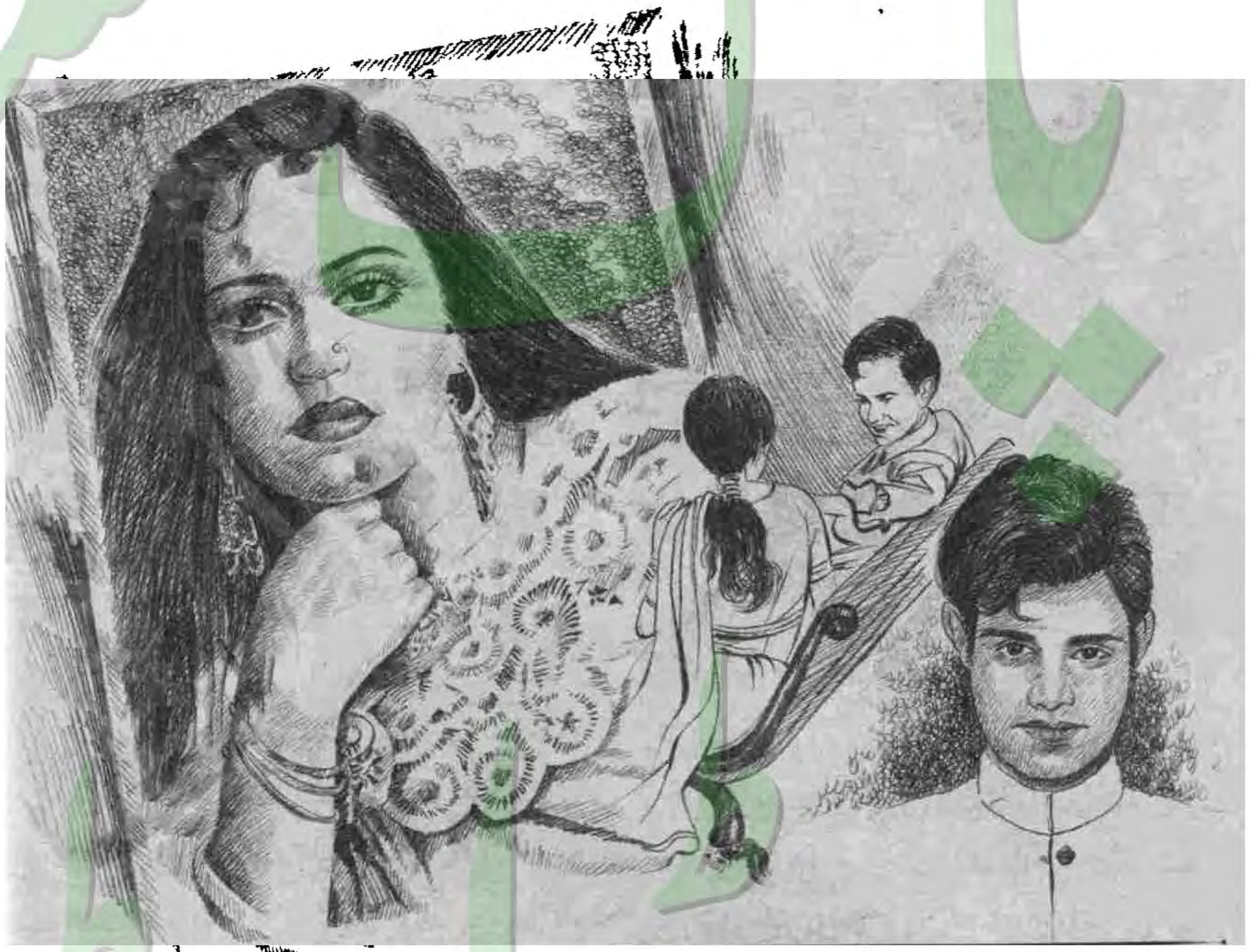

سردی سے ٹھٹرتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ لیدر کی جیکٹ میں ڈالے اور ونڈو گلاس کے اس پار دیکھنے لگا۔ برف روئی کے نرم گالوں کی طرح آسمان سے گر رہی تھی۔ باہر کی ہر چیز سفید ہو چکی تھی اور بڑی بڑی عمارتیں کسی دیومالائی کہانی کا حصہ معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے سردی کی وجہ سے سرخ ہوتی ناک کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑا اور ایک نظر آتش دان میں دہکتے کوئلوں پر ڈال کر دوبارہ باہر دیکھنے لگا۔

WWW.PakSociety.com

دھیرے دھیرے شام پھیل رہی تھی اور اب اکا دکا اسٹریٹ لائٹس جگمگانے لگی تھیں لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی برف کی تہ میں چھپتی جا رہی تھیں۔ چوک پہ کھڑا سارجنٹ اب زیادہ مستعد نظر آنے لگا تھا۔ ٹریفک اگرچہ نہ ہونے کے برابر تھی پھر بھی دفتروں، فیکٹریوں سے لوٹنے والے لوگ بہر حال موسم کی پروا کیے بغیر اپنے اپنے گھروں کو رواں دواں تھے۔

ہیری نے ایک بار پھر آتش دان کے کوئلوں کو دیکھا۔ ان کی لو اب مدھم پڑنے لگی تھی اور کمرے کی ٹھنڈک میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے جانے کیوں ہاتھ بڑھا کر ونڈو کھول دی۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا اس کے کھلے چہرے سے آ ٹکرایا۔ اسے خون اپنی رگوں میں جمتا محسوس ہوا۔ پھر بھی وہ کچھ دیر ایسے ہی کھڑا رہا۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں سے اس کی ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا لیکن وہ کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ باہر مکمل اندھیرا چھا گیا اور آتش دان میں دہکتے شعلے راکھ میں بدل گئے۔ تب وہ دھیرے سے پلٹا اور آتش دان میں مزید لکڑیاں سلگانے لگا۔ کمرے میں عنبر کی مہک پھیل گئی۔ اسے یہ خوشبو بہت اچھی لگتی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر خوشبو اندر کھینچی پھر الیکٹرک کیتل سے اپنے لیے کافی تیار کرنے لگا۔ وہ اس وقت بالکل خالی الذہن تھا۔ یہ کیفیت کچھ عرصے سے اس پر طاری رہنے لگی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

"Harry are you here" باہر سے ایک مہین سی آواز آئی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ اٹھ کر کہیں چھپ جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا... کیونکہ کرسٹی اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھول کر اندر آ چکی تھی۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپا نہ سکا۔

"سوری!" کرسٹی بھی اس کا چہرہ پڑھنے میں مہارت رکھتی تھی۔ اس لیے فوراً معذرت کی۔

"ایک کپ کافی پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ دستانوں کی قید سے آزاد کیے اور آتش دان کے قریب رکھے فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

"تم کچھ ڈسٹرب ہو؟" اس کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے پوچھا۔ ہیری اپنی کافی ختم کر چکا تھا۔ ٹیبل پر خالی مگ رکھتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا پھر اٹھ کر اس کے لیے کافی بنانے لگا۔

کرسٹی نے ریموٹ سے ٹی وی آن کر دیا اور چینلز بدلنے لگی۔

"تم کافی پی کر چلی جاؤ گی ناں؟" کافی کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے پوچھا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"تم واقعی ڈسٹرب ہو۔" اس نے مگ تھامتے ہوئے کہا پھر کافی پینے تک اُن میں کوئی بھی بات نہیں ہوئی اور کافی پینے کے بعد وہ چلی گئی۔ اس کے جانے سے ہیری کو اطمینان ہوا تھا۔

☆☆☆

جہاز اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ اس نے کھڑکی سے نیچے جھانکا تو اس کو اپنا دل رکتا محسوس ہوا۔ وہ زمین سے بہت بلندی پر تھے۔ اس نے بے ساختہ ساتھ بیٹھے عباد کے بازو پر گرفت مضبوط کی۔

"ہوں!" وہ جو آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا، فوراً اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہم اتنی بلندی پر ہیں عباد...... اگر نیچے گریں تو ککھ بھی نہ بچے۔" اس نے کسی بچے کی سی معصومیت سے کہا تھا۔ عباد ہنس دیا۔

"تم پہلی بار جہاز پر بیٹھی ہو ناں اس لیے ایسی باتیں سوچ رہی ہو۔"

"تم جہاز کی بات کر رہے ہو عباد، میں تو اس شہر سے پہلی دفعہ باہر نکلی ہوں اور قسمت دیکھو، نکلی بھی تو دوسرے ملک کے لیے۔" اس نے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔ اس کے بالوں سے اٹھتی مہک عباد کو اسے دیکھتے رہنے پر مجبور کر گئی۔

وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی معصوم بھی......

چھ ماہ پہلے جب وہ پہلی بار اسے جوائے لینڈ میں ملی تھی تب ہی اس نے آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دے لیا تھا۔ کیونکہ وہ پاکستان آیا ہی اس مقصد سے تھا کہ کسی مشرقی لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لے حالانکہ اب پاکستان میں اس کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔

وہ اس وقت ایک بینچ پر بیٹھا ٹھنڈے مشروب سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب اپنے قریب سے نسوانی چیخ سن کر پلٹا تھا۔ یوں تو پورا جوائے لینڈ ہی چیخوں اور شور سے گونج رہا تھا کہ جب بڑے بڑے جھولے اوپر نیچے آتے جاتے تو اس میں بیٹھے بڑے، بچے سب چلانے لگتے۔ چند ایک جھولے تو اتنے خطرناک تھے کہ انہیں دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ لیکن لوگ بھرپور انجوائے کر رہے تھے۔

چیخ اسے دوبارہ سنائی دی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ذرا فاصلے پر لگے بڑے سے آسمانی جھولے سے وہ آواز آ رہی تھی۔ جھولا برق رفتاری سے اوپر نیچے آ جا رہا تھا۔ آس پاس لوگ کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

"آپا مجھے نیچے اتاریں، میرا دل بند ہو رہا ہے۔" لڑکی کی آواز آئی تھی اور تب عباد نے بے ساختہ ہی لیور پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ جھولا آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ جھولے والا اس سے الجھنے لگا لیکن وہ اس سے بے نیاز جھولے سے اترتی اس بے حد خوفزدہ لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی کوئی رشتے دار خاتون اس کے ہاتھ ملنے لگیں۔ ایک بچہ بھاگ کر پانی لے آیا اور وہ ایک ہاتھ دل پر رکھے آہستہ آہستہ پانی پینے لگی۔ وہ اس لڑکی کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اردگرد کو بالکل بھول گیا تھا۔ اس کے حواس قدرے درست ہوئے تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خاتون اسے سرزنش کر رہی تھیں کہ وہ جھولے پر سوار کیوں ہوئی۔

"میں کب آپا، وہ زیبی اور فضی نے زبردستی بٹھا لیا۔ میں نے منع بھی کیا پھر بھی......" اس کے آتشیں لب وا ہوئے اور پھر جیسے عباد کا سارا کروفر بھی وہیں سجدہ ریز ہو گیا۔

"بس یہی لڑکی...... اور کوئی نہیں۔" اس نے فوراً فیصلہ کیا اور دل نے تصدیق کی مہر لگا دی اور اگلے ہی پل وہ اس لڑکی کی آپا سے مخاطب تھا۔

"میں عباد ہوں، گزشتہ دس سال سے مانچسٹر میں مقیم ہوں اچھی جاب، اچھی تنخواہ، اپنا گھر، اپنی گاڑی...... نہ کوئی آگے، نہ پیچھے...... میں آپ کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنا خاطر خواہ تعارف کروا کے ساتھ ہی مدعا بھی بیان کیا۔

خاتون نے بے حد حیرت سے اس نوجوان کو دیکھا جو جان نہ پہچان میں تیرا مہمان کی تفسیر بنا کھڑا تھا۔

"میری بہن......؟" وہ خاتون متعجب ہوئی تھیں۔

"جی...... یہ...... یہی تو...... جو ابھی خوف سے چلا رہی تھیں۔" اس نے بینچ پر بیٹھی اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو ہونق بنی اس اجنبی کو دیکھ رہی تھی جو بڑے دھڑلے سے اس کا ہاتھ مانگ رہا تھا۔

"یہ میری بہن نہیں بیٹی ہے۔" خاتون مسکرائی تھیں۔

"جی!" اب کہ وہ حیران ہوا تھا اس نے ایک بار پھر "آپا" کا اور اس لڑکی کا جائزہ لیا تھا۔ دونوں کی عمروں میں خاص فرق معلوم نہ ہوتا تھا۔

"چلیں زرمینے؟" آپا اب اس لڑکی سے مخاطب تھیں۔

"جی۔" وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے دباتی اٹھ

www.paksociety.com

کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وہاں دو لڑکیاں اور ایک خاتون سولہ سترہ سالہ لڑکے کے ہمراہ آگئیں۔ زرمینے کی ماں ہنس ہنس کر تھوڑی دیر پہلے کا واقعہ سنانے لگیں۔ عباد کو انہوں نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ تلملاتا ہوا کبھی زرمینے اور کبھی اس کی ماں کو دیکھ رہا تھا جو بڑے مزے سے اب آگے جا رہی تھیں۔ عباد کا دل چاہا اس لڑکی کا ہاتھ پکڑے اور بھاگ جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آج کے بعد وہ ان لوگوں سے کبھی نہیں مل سکے گا اور ساری عمر زرمینے کے لیے تڑپتا رہے گا۔ یہ خیال اسے سوہانِ روح لگا اور اس نے یکا یک ان لوگوں کے پیچھے دوڑ لگا دی اور عین زرمینے کی ماں کے سامنے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اُن کے چہرے پر ناگواری کے واضح تاثرات ابھرے۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھو لڑکے!'' انہوں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم بلاوجہ ہمیں تنگ کر رہے ہو۔''

''نہیں، میں تنگ نہیں کر رہا۔'' اس کے لہجے میں قدرے لجاجت تھی۔ ''میں تو آپ سے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگ رہا ہوں۔'' اس نے بات مکمل کی۔

''کس لیے؟'' وہ کڑے تیوروں سے بولیں۔

''جی......'' وہ گڑبڑایا پھر نارمل ہوتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔ ''شادی کرنے کے لیے...... میرا مطلب ہے میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا دو گے......؟'' وہ ایک دم ہی کاروباری باتوں پر اتر آئیں۔

''جی......'' وہ ایک بار پھر متعجب ہوا... کہ وہ کس طرح کی بات کر رہی تھیں۔ میرا مطلب ہے میں تو شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرا بینک بیلنس ہے۔ کچھ پراپرٹی ہے۔ مانچسٹر میں میرا فلیٹ ہے جہاں میں رہتا ہوں اور وہ کوئی عام فلیٹ نہیں ہے۔ لاکھوں پاؤنڈز اس کی قیمت ہے اور شادی کے بعد ظاہر ہے زرمینے بھی اس سب کی حصے دار ہوگی۔'' وہ الجھ رہا تھا پھر بھی اپنے بارے میں تفصیلات بتا ڈالیں...... تب دوسری خاتون آگے بڑھیں۔

''یہ باتیں سڑکوں پر کرنے کی نہیں ہوتیں۔ تم کل شام کو گھر آؤ۔ وہاں بیٹھ کر تسلی سے باتیں ہوں گی۔'' اس خاتون نے سمجھداری کا مظاہرہ کیا جبکہ زرمینے کی ماں ابھی تک اکھڑی کیفیت میں تھیں۔ وہ اسے ڈیفنس کے ایک بنگلے کا پتا دے کر رخصت ہو گئیں۔ عباد کو یقین نہیں تھا کہ انہوں نے اسے اپنے گھر کا صحیح ایڈریس دیا ہوگا۔ لیکن اگلے دن کم وبیش ڈیڑھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وہ مطلوبہ ایڈریس ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

گیٹ چوکیدار نے کھولا تھا اور اس کا نام پتا پوچھ کر اندر چلا گیا تھا۔ عباد نے ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑی چٹ پر لکھے ایڈریس اور نیم پلیٹ پر لکھے ایڈریس کا موازنہ کیا تھا۔

''آجائیں!'' چند لمحوں بعد چوکیدار پلٹا اور اسے ساتھ لے کر اندر آ گیا۔ طویل روش پر چلنے کے بعد چوکیدار نے اسے ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔ عباد ڈرائنگ روم کی سجاوٹ سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ چھت پر لگے فانوس، فرشی کارپٹ اور دیواروں پر قیمتی پینٹنگز، کرسٹل پیس، میزیں، صوفے غرض ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چائے اور لوازمات سے سجی ٹرالی لیے ایک ملازمہ اندر آگئی۔

''آپ چائے پیجیے، بیگم صاحبہ ابھی آتی ہیں۔'' وہ اسے چائے سرو کر کے چلی گئی۔ وہ چائے کے ہلکے ہلکے سپ لینے لگا۔ تبھی زرمینے کی ماں اور وہ دوسری خاتون اندر داخل ہوئیں۔ وہ احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے بیٹھنے کا کہہ کر انہوں نے خود بھی سامنے نشست سنبھال لی۔

''عمر کیا ہے تمہاری؟'' اُن کی طرف سے پہلا سوال آیا۔

''تھرٹی پلس!'' عباد نے چائے کا گھونٹ اندر اتارتے ہوئے جلدی سے بتایا۔

''زرمینے سکسٹین پلس ہے۔'' ان خاتون کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔

''جی......'' وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''تم ہمارے بارے میں کچھ جانتے ہو کہ نہیں؟'' اگلا سوال مزید حیران کُن تھا۔ عباد متعجب سا اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

زرمینے کی ماں نے جو کچھ اپنے اور اپنی فیملی کے بارے میں بتایا اس کے بعد کوئی بھی مرد وہاں شادی کرنے کی نیت سے نہیں رک سکتا تھا لیکن عباد آزاد منش تھا۔ اور پھر فیملی بھی نہیں تھی اس لیے اس نے ان ساری باتوں کو قطعی غیر اہم گردانا اور اگلے ہی پل وہ بھی خالصتاً کاروباری لہجے میں ان سے مخاطب تھا۔

''آپ کیا قیمت چاہتی ہیں؟'' اس نے چائے کا کپ ساسر میں رکھا اور منتظر نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ دونوں خواتین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا۔ پھر زرمینے کی ماں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ دوسری خاتون نے بڑی گہری نظروں سے عباد کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کمرے میں ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ عباد بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

''زرمینے ابھی کم سن ہے۔'' بڑی دیر بعد خاتون گویا ہوئیں۔ وہ سمجھ گیا اب زرمینے کی قیمت بڑھانے کے لیے بہت سی باتیں گنوائی جائیں گی۔

''ابھی اس کی نتھ بھی نہیں اتری...... اصل میں

زرمینے اور مزاج کی لڑکی ہے۔ اس کی دو بڑی بہنیں اور بھی ہیں۔ وہ سارے ہنر سے آگاہ بھی ہیں۔ تم اگر چاہو تو اُن کو دیکھ لو...... وہ زرمینے سے زیادہ خوب صورت بھی ہیں۔'' عباد کی سوچ صحیح ثابت ہوئی تھی۔

''مجھے زرمینے سے شادی کرنی ہے اور میں نے اچھی طرح سے سوچ لیا ہے۔ آپ قیمت بتائیں؟'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''شادی کتنے دن یا مہینے چلے گی۔ میرا مطلب ہے زرمینے کو واپس کب بھجوائیں گے؟'' ان خاتون کا اگلا سوال آیا۔ عباد کا دماغ کھول گیا...... لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔

''میں نے بتایا ناں محترم خاتون، میں زرمینے سے شادی کر کے اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ وہ میرے گھر میری بیوی بن کر رہے گی...... آپ سودا طے کریں۔ کتنے کا چیک کاٹوں......؟'' اس نے حتمی انداز میں کہا تو وہ خاتون ہنس دیں۔

''آپ فیصلہ بہت جلدی میں کر لیتے ہیں۔ چلیں، آپ زرمینے سے ملاقات کیجیے۔ اس کے بعد آپ خود طے کیجیے گا اپنی پسند کی قیمت اور میں دیکھوں گی کہ آپ کی پسند کی قیمت کیا ہے؟'' وہ خاتون کہتے ہوئے اٹھ کر باہر چلی گئی تھیں۔ عباد چکرا کر رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد زرمینے آگئی۔ آتشیں رنگ کے جارجٹ کے سوٹ میں ہلکے میک اپ کے ساتھ اس کا حسن بھی دو آتشہ ہو رہا تھا۔ عباد اسے دیکھ کر پہلو بدل کر رہ گیا۔ وہ آداب کر کے اس کے دائیں ہاتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ سر جھکائے دونوں ہتھیلیاں اپنی گود میں دھرے بیٹھی تھی پتا نہیں ان خرانٹ عورتوں نے اسے کیا بتا کر بھیجا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔ عورت یا عورت کی قربت اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ گزشتہ دس سالوں میں اسے عورت سے قربت کے اتنے

www.paksociety.com

مواقع میسر آئے تھے کہ وہ گنتی بھی نہیں جانتا تھا لیکن اس لڑکی کو دیکھتے ہی اسے یک دم گھر بسانے کا خیال آیا تھا۔ اب اس کا دل باہر کی زندگی سے اکتا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا جب دن بھر کا تھکا ہارا وہ واپس آئے تو فلیٹ پر موجود اس کی خریدی ہوئی عورت کے بجائے ایک ایسی عورت اس کا استقبال کرے جو اس کی محبت کے نشے میں چور ہو۔ وہ صبح ہونے پر اسے چھوڑ نہ جائے بلکہ اپنی دلفریب مسکراہٹ سے اسے جگائے، اس کے لیے ناشتا تیار کرے، کھانا بنائے، دروازے تک اسے چھوڑنے جائے۔ اس کا انتظار کرے اور یہ سب اسے زرمینے کی صورت میں مجتمع نظر آیا تھا۔

کافی دیر بعد اس نے اپنا دایاں ہاتھ دھیرے سے اس کی ہتھیلیوں پر رکھ کر پوچھا۔ ”میں تمہیں عزت کی زندگی دینا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں منظور ہے؟“ اور زرمینے آنکھوں میں آنسو بھرے اسے دیکھتی وہاں سے اٹھ کر بھاگی تھی۔

”آپ جتنی رقم چاہیں بھر لیں۔ میں کل ہی زرمینے سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔“ عباد نے ایک بلینک چیک زرمینے کی ماں کے حوالے کیا اور زرمینے کی ماں چمکتی آنکھوں سے بلینک چیک کو دیکھتی مسکرا کر سر ہلانے لگیں۔

اگلے دن وہ شادی کی شاپنگ جس میں زرمینے کا عروسی جوڑا، زیورات، پھل، مٹھائیاں شامل تھے کے ساتھ اس بنگلے پر پہنچ گیا۔

”میرا یہاں کوئی واقف نہیں، اس لیے گواہوں کا بندوبست بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا۔“ اس نے سارا سامان زرمینے کی ماں کے حوالے کیا۔ وہ مسکرا کر اسے ایک کمرے میں لے گئیں۔ جہاں چند اور لوگ بھی جمع تھے لیکن وہ حلیے سے قطعاً معزز نہیں لگ رہے تھے۔

”عباد!“ زرمینے نے اس کے کندھے سے سر ٹکائے پکارا اور وہ خیالات کے تسلسل سے باہر نکل آیا۔

”ہوں...... کیا ہوا؟“ وہ اس پر جھکا۔

”میں سوچ رہی ہوں سب کچھ کتنا اچانک ہوگیا؟“ وہ آنکھیں موندے گزشتہ دنوں کے سحر میں گم تھی۔ وہ دن جو اس نے عباد کی قربت میں ان خوب صورت وادیوں میں گزارے تھے۔

”ہاں!“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”میری زندگی کا ایسا کچھ پلان نہیں تھا۔ گھر، بیوی، بچے میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ ان سارے جھمیلوں میں پڑنے کا لیکن تمہیں دیکھ کر میرے سارے ارادے ریت کے محل ثابت ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں مینوتم نے مجھے فتح کرلیا ہے۔“ وہ سرشاری سے بولا اور ایسی ہی سرشاری کی کیفیت زرمینے پر بھی طاری تھی۔ ائرہوسٹس اعلان کر رہی تھی کہ وہ لینڈ کرنے والے ہیں۔

”پتا نہیں رچرڈ ائرپورٹ آیا بھی ہوگا یا نہیں۔“ جہاز سے اترتے ہوئے عباد نے سوچا پھر موبائل نکال کر بٹن پش کرنے لگا۔

☆☆☆

رات بھر ہونے والی برف باری کچھ دیر کو تھمی تھی۔ اس نے گرم پانی سے شاور لینے کے بعد اپنے لیے کافی کا مگ تیار کیا۔ ساتھ ہی پہننے والے کپڑوں کی سلیکشن بھی کی۔ رات کی نسبت وہ خاصا پُرسکون تھا۔ وہ اضطرابی کیفیت شاید کچھ دیر سو لینے سے ختم ہوگئی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ رات اس نے کرسٹی سے مس بی ہیو کیا تھا اور اسے سیدھے سبھاؤ اپنے گھر سے نکل جانے کا کہا تھا۔ وہ یقیناً اس سے خفا ہوچکی ہوگی۔ اسے آج کرسٹی کے ساتھ ڈنر کرلینا چاہیے۔ اس نے پلان کیا۔ اس نے کرسٹی کو sms کیا۔ شام کو واپسی پر وہ اسے اسٹور سے پک کرنا چاہ رہا تھا پھر وہ دھیمے لہجے میں گنگناتا ہوا تیار ہونے لگا۔

الیکٹرک کیٹل سے کافی انڈیل کر کپ اس نے ہاتھ میں پکڑا اور پھر دریچے میں آ کھڑا ہوا۔ اسے ہمیشہ وہاں کھڑے ہو کر کافی پینا اچھا لگتا تھا۔ باہر کا منظر وہی کل والا تھا۔ کبھی کبھی اسے زندگی بے حد ٹھہری ہوئی لگتی۔ جامد...... تبھی اس کے موبائل پر بپ ہوئی۔ اس نے دیکھا۔ ایبی کالنگ آرہا تھا۔

”اوہ......!“ اسے یک دم سے کچھ یاد آیا۔ یس کا بٹن پش کرتے ہی اس نے بولنا شروع کردیا۔ ”تم بے فکر رہو، میں پہنچ رہا ہوں دس منٹ میں۔“

”دس منٹ میں کیا اڑ کر آرہے ہو؟“ دوسری جانب سے استہزائیہ کہا گیا۔

”تمہارے پہنچنے سے پہلے میں پہنچ جاؤں گا۔ ڈونٹ وری......“ اس نے موبائل آف کیا۔ اپنا رین کوٹ اٹھا کر کندھوں پر ڈالا۔ برف باری کسی بھی وقت شروع ہوسکتی تھی۔ اپنا والٹ، کی رنگ اور موبائل جیبوں میں ڈالتا وہ بہ عجلت باہر نکلا۔ راستے میں اسے ایبی کے فلیٹ کا جائزہ بھی لیتے ہوئے جانا تھا اور اس کے پاس وقت نہایت کم تھا۔

☆☆☆

عباد اور اس کا انگریز دوست، جس کا تعارف اس نے شاید رچرڈ کہہ کر کرایا تھا مسلسل باتوں میں مصروف تھے اور یہ گفتگو انگلش میں ہورہی تھی۔ زرمینے انگلش میں روانی نہیں رکھتی تھی پھر بھی تھوڑی بہت سمجھ ضرور لیتی تھی لیکن جس تیز رفتاری سے وہ بول رہے تھے اس کے پلے بالکل بھی نہیں پڑ رہا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اس شخص نے اس پر ایک نگاہ بھی ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ صرف تعارفی رسم ادا ہوئی تھی۔

”یہ میرا دوست اور پارٹنر رچرڈ اور رچی یہ میری وائف زرمینے......“ اور اس کے بعد وہ انگریزی زبان میں مصروفِ گفتگو ہوگئے۔ زرمینے گاڑی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ تقریباً پون گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ ایک بہت اونچی بلڈنگ کے سامنے رکے تھے۔

”ہمارا فلیٹ اس میں ہے؟“ عباد نے پلٹ کر اسے بتایا۔ اور وہ سر ہلا کر دوبارہ اس اونچی بلڈنگ کو دیکھنے لگی۔ جس میں اوپر تک کھڑکیاں اور بالکونیاں بنی تھیں۔

رچرڈ انہیں ڈراپ کر کے چلا گیا۔ وہ گاڑی سے اتر کر منتظر نظروں سے عباد کو دیکھنے لگی جو کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

”کیا ہوا، عباد؟“ وہ اس کا شانہ ہلا کر پوچھنے لگی۔

”نہیں، کچھ نہیں۔“ وہ یک دم چونکا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ زرمینے نے اس کی تقلید کی تھی۔

فلیٹ بہت زبردست تھا اور اس کی سجاوٹ عباد کی نفاست کی آئینہ دار تھی۔ زرمینے نے بہت دلچسپی سے سارا فلیٹ دیکھا۔ بیڈ رومز، کچن، ٹی وی لاؤنج غرض ہر جگہ کی سیٹنگ انتہائی خوب صورت تھی۔ ”یہ گھر اس کا ہے۔“ ایک طمانیت بھری سوچ نے اس کا احاطہ کیا تھا۔

”تم بھی ایزی ہو جاؤ...... رچرڈ ابھی کھانا لے کر آتا ہوگا۔“ عباد کی آواز اسے خوش کُن تصورات کی دنیا سے باہر لائی تھی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اپنا بیگ گھسیٹتی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ جب فریش ہو کر آئی تو عباد آتش دان میں آگ جلائے حرارت لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بھرپور طریقے سے مسکرایا۔ زرمینے بلش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”آجاؤ بہت سردی ہے۔“ وہ ہولے سے بولا۔ زرمینے تھوڑا سا ہچکچا کر اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”بہت خوب صورت لگ رہی ہو اس وقت۔“ وہ چہرہ اس کے بے حد قریب لا کر بولا۔ تبھی بدبو کا ایک ناگوار بھبکا زرمینے کی ناک سے ٹکرایا اور اس نے گھبرا کر عباد کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''آپ ڈرنک کرتے ہیں؟'' بے ساختہ اس کے لبوں سے ادا ہوا۔

''اوہ جانِ من! تمہاری شربتی آنکھوں کی مے کے سامنے سارے نشے ہیچ ہیں۔'' اس نے ایک بازو اس کی کمر میں حمائل کرتے ہوئے سرگوشی کی تھی اور زرمینے عجیب سی کیفیات میں گھری کسمسانے لگی تھی۔

☆☆☆

''سردی بہت بڑھ گئی ہے!'' کرسٹی نے ڈانسنگ فلور پر ہیری کے سنگ ہولے ہولے جھومتے ہوئے کہا۔

وہ آج بہت خوش تھی۔ ہیری بہت دنوں بعد اسے ڈنر پر لایا تھا ورنہ پچھلے کئی ماہ سے وہ ہیری میں کئی تبدیلیاں رونما ہوتے دیکھ رہی تھی اور چاہنے کے باوجود بھی وہ ڈسکس نہیں کرسکی تھی۔ اس کے اندر کہیں خوف تھا کہ ہیری اس سے ناراض ہوجائے گا اور ہیری کے ناراض ہونے کا رسک وہ نہیں لے سکتی تھی۔

اس نے اپنا سر ہیری کے شانے پر ٹکا دیا۔

ہیری نے اس کے گولڈن بالوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر یک دم اسے اپنے سے الگ کر کے وہ ڈانسنگ فلور سے نیچے اتر آیا۔ کرسٹی نے متعجب ہوکر اسے دیکھا پھر ٹھنڈی آہ بھرتی وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ ہیری کا چہرہ اس سے سرخ ہورہا تھا۔

''آر یو آل رائٹ ہیری؟'' وہ پریشان ہو اٹھی۔

روح تک کو ٹھٹھرا دینے والی سردی میں ہیری یوں سرخ ہورہا تھا جیسے اس کے اردگرد انگارے دہک رہے ہوں۔

ہیری نے کہا کچھ نہیں...... گلاس میں ڈرنک انڈیل کر لبوں سے لگا کر ہلکے ہلکے سپ لینے لگا۔ کرسٹی پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔ یہ اسے کیا ہوجاتا تھا اچانک...... وہ ایسا تو نہیں تھا۔ کلب، پارٹیز، لڑکیاں...... یہ سب تو ہیری کی زندگی کا حصہ تھیں۔ پھر اب یکایک اسے کیا ہونے لگا تھا۔ وہ اسے کسی سائیکا ٹرسٹ کے پاس لے جائے گی اور ہیری یقیناً اس کے ٹریٹ منٹ سے پہلے جیسا ہوجائے گا۔ اس نے خود کو مطمئن کیا تھا۔ ہیری نے ایک ڈرنک ختم کرنے کے بعد دوسرا پیگ اور پھر یکے بعد دیگرے کئی پیگ ختم کر ڈالے تھے اور کرسٹی نے سب کچھ خاموشی سے دیکھا تھا۔ پھر رات کافی بیت جانے پر وہ اسے گاڑی میں ڈال کر اس کے اپارٹمنٹ لے آئی تھی۔

ہیری صرف ڈسٹرب نہیں بہت زیادہ ڈسٹرب تھا یہ اندازہ وہ لگا چکی تھی۔ کیا کاروباری پرابلم، امی کے ساتھ جھگڑا یا پھر کچھ اور......؟ وہ ہر پہلو پر سوچ رہی تھی اور حقیقتاً پریشان ہورہی تھی۔ اس نے ہیری کو بیڈ پر لٹا کر کمبل اوڑھایا۔ لائٹس آف کیں اور دروازہ بند کر کے باہر نکلنے کو تھی کہ ہیری کچھ بڑبڑایا۔

وہ فوراً واپس پلٹی۔

''ہیری آر یو اوکے......؟'' وہ اس کے اوپر جھکی لیکن اگلے ہی پل جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ ہیری دھیرے دھیرے کچھ بول رہا تھا اور کرسٹی کا دماغ گھوم رہا تھا۔ یہ لفظ، یہ لفظ ہیری کیوں بول رہا ہے اور وہ بھی مدہوشی کی کیفیت میں...... اس کا پورا وجود جھنجھنانے لگا تھا۔

وہ دروازہ بند کر کے الٹے قدموں باہر بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

''اللہ کہاں ملتا ہے مادام......؟'' آواز پر مریم نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر ساکت رہ گئیں۔ ابھی ابھی مسلم کمیونٹی کی کچھ بچیاں قرآن پاک پڑھ کر گئی تھیں۔ وہ قرآن پاک ان کے جزدان میں لپیٹتی اپنے دھیان میں تھیں لیکن یہ سوال جیسے انہیں چونکا گیا تھا۔ سوال اتنا چونکانے والا نہیں تھا لیکن جس نے کیا تھا وہ ان کے لیے ضرور حیران کُن تھا۔

''آؤ بیٹا...... اندر آجاؤ......'' اگرچہ مریم کسی اجنبی مرد سے ملتی نہیں تھیں لیکن اس سوال نے جیسے ان کے اندر یک دم سے کچھ پھونک دیا تھا۔ وہ سحرزدہ سا چلتا اندر آیا۔ وہ کوئی چھبیس، ستائیس سال کا نوجوان تھا۔ سنہرے بال، نیلی آنکھیں اور شہابی رنگت۔ چہرے پر اضطراب، بلو لائننگ والی شرٹ اور وائٹ پینٹ میں وہ خوب صورت لگ رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ......'' انہوں نے سائڈ پہ پڑے کاؤچ کی طرف اشارہ کیا اور خود قرآن پاک اٹھا کر جگہ پر رکھنے لگیں۔

''آپ نے بتایا نہیں اللہ کہاں ملتا ہے؟'' وہ مضطربانہ گویا ہوا۔ وہ پلٹ کر مسکرائیں۔

''یہاں!'' انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ رکھا۔

''یہاں!'' اس نوجوان کا دایاں ہاتھ اپنے سینے کی طرف اٹھا تھا۔ وہ استعجابیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''ہاں یہاں، دل میں، شہ رگ سے زیادہ نزدیک، وہی تو ہے جس نے انسانوں کو جمے ہوئے خون کی ایک بوند سے پیدا کیا۔ وہی تو ہے جو بس کہتا ہے کہ ''ہوجا'' اور... ہوجاتا ہے......''

''مجھے کیوں نظر نہیں آتا؟'' وہ بے تابی سے گویا ہوا۔

''تمہارے پاس دیکھنے والی نظر نہیں ہے۔'' وہ مسکرائیں۔

''اور یہ نظر میرے پاس کیوں نہیں ہے؟''

''تم نے کوشش نہیں کی۔'' وہ کچھ اور کہتے کہتے بات پلٹ گئیں۔ ''کیا کرتے ہو؟''

''بہت کچھ...... ایک بار چلاتا ہوں، ایک ڈسکو بھی ہے...... ڈھیر ساری لڑکیوں سے بھی دوستی ہے لیکن کرسٹی سب سے اچھی لگتی ہے۔ اکثر شام کو ہم اکٹھے ہی ہوتے ہیں۔ بہت اچھی اور پیاری لڑکی ہے۔'' وہ بچوں کی معصومیت سے اپنے بارے میں بتانے لگا پھر یک دم ہی چپ ہوگیا۔ مریم خاموشی سے

اس کی وہ باتیں سن رہی تھیں۔ وہ پھر بولا۔

''آپ کے مذہب میں یہ ساری باتیں اچھی نہیں سمجھی جاتی ہیں نا......؟'' مریم مسکرانے لگیں۔

''برائی کسی بھی مذہب میں شامل نہیں، خواہ وہ عیسیٰؑ کا لایا ہوا مذہب ہو یا میرے سوہنے آخری نبی ﷺ کا...... برائی تو ہمارے اندر ہے اور یہ ہمارا اندر ہی ہمیں بتاتا ہے کہ کیا غلط ہے کیا صحیح۔ جو یہ آواز سن لیتا ہے، پہچان لیتا ہے وہ اس راہ پر خود بخود چل پڑتا ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''آپ مجھے پڑھائیں گی؟'' اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھا تھا۔

''کیا......؟'' مریم نے سر اٹھایا۔ وہ عجیب متذبذب سی کیفیت میں تھا لب کاٹتا ہوا۔ جیسے کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہو لیکن کر نہ پا رہا ہو۔

''وہ قرآن!'' اس نے سامنے اشارہ کیا۔

''تم مسلمان ہونا چاہتے ہو؟'' مریم نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

''ہاں لیکن اس طرح نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے میں باباجان سے بات کروں گی۔'' انہوں نے کسی گہری سوچ میں خود کو ڈوبتے پایا تھا۔

☆☆☆

عباد نے اس کے ریشمی بالوں سے کھیلتے کھیلتے اپنی بانہوں کے حصار میں لیا تھا اور وہ کسی چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی تھی۔ عباد نے غور سے اسے دیکھا تھا۔

''ایک بات کہوں مینے...... تم بہت عجیب لڑکی ہو...... شاید میری اماں کے دور کی لڑکی...... یہ شرمانا، لجانا، سمٹنا آج کل کی لڑکیوں میں مفقود ہے۔ میری کسی بھی جسارت پر تم یوں بلش ہوتی ہو جیسے یہ سب کچھ نیا ہو تمہارے لیے۔'' اس کی بات پر وہ تڑپ کر

www.Paksociety.com

پیچھے ہٹی تھی۔

''کیا..... کیا مطلب ہے عباد آپ کا اس سے؟''

''دیکھو..... مجھے غلط نہیں سمجھنا۔ طنز نہیں کر رہا ہوں لیکن سچ میں مجھے تمہاری حرکات کبھی کبھی بے حد بناوٹی لگتی ہیں۔ جس جگہ، ماحول سے تمہارا تعلق ہے وہاں تو اِک اِک ادا بکتی ہے۔ میں یہ سب تمہارے لیے نہیں کہہ رہا لیکن تمہارے گھر میں اور بہت سی لڑکیاں بھی دیکھی ہیں میں نے..... اور پھر یہ سب نہ بھی ہو تو آج کل کے میڈیا اور بے تحاشا چینلز نے بہت کچھ اتنا عام کر دیا ہے کہ ایک چھوٹی عمر کی بچی یا بچہ بھی kiss کا مطلب سمجھتا ہے اور تم یوں ری ایکٹ کرتی ہو۔''

''عباد.....'' اس کے حلق سے مری مری آواز نکلی تھی۔

گزشتہ چھ میں عباد نے ایک بار بھی تو اسے احساس نہیں دلایا تھا کہ وہ اس کی قیمتِ چکا کر آیا ہے۔ اس کی وارفتگیاں..... اس کی شوخیاں اس کے لیے سچ مچ ایک نیا احساس تھا۔ اسے تو عباد کی محبت کی دنیا سپنوں کی دنیا لگتی تھی۔ ایسی دنیا جہاں غم دکھ، پریشانی کچھ بھی نہیں تھا پھر یکا یک یہ عباد کے دل میں شک کا بیج کیونکر اگ آیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ شدتِ ضبط سے اس نے لب بھینچ لیے تھے اور نچلے ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔ عباد پریشان ہو اٹھا۔

''اوہ کم آن مینے..... ڈارلنگ میں نے اِک بات کی تھی۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ پلیز یوں خود کو.....'' اس نے زرمینے کو قریب کرنا چاہا لیکن وہ بہت آہستگی سے اپنا آپ چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ آنکھوں میں بے تحاشا پانی جمع ہو رہا تھا۔ عباد نے یہ کس طرح کی بات کر دی تھی اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عباد اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ الماری سے ڈرنک نکال کر اپنا غم غلط کرنے لگا تھا اور پیتے پیتے وہیں لڑھک گیا تھا۔

بہت پہلے، بہت ہی پہلے جب شاید اسے اچھا یا برا، کچھ بھی نہیں پتا تھا اماں نے گھنگرو لا کر اس کے آگے رکھے تھے۔

''یہ کیا ہے باجی.....؟'' اس نے پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر پوچھا تھا اور اماں نے اسے سر سے پیر تک گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آ ٹھہری تھی۔

''گھنگرو.....'' اماں نے ان کو آپس میں ٹکرایا تھا۔

''کس لیے اماں.....؟'' اس نے اب بھی کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی۔

''تو باندھے گی..... سوچ رہی ہوں تجھے آج سے ڈولی کے ساتھ استاد جی کے پاس بٹھا دوں۔ تو نے دیکھا نہیں وہ کیسا رقص کرتی ہے۔ بس کچھ وقت گزرنے دے..... سارے شہر میں اس کی واہ واہ نہیں مچی تو میرا نام زیب النساء نہیں۔'' انہوں نے پان کا بیڑہ دانتوں تلے دبایا تھا۔ وہ تصور میں ڈولی کو شہرت کی بلندیوں پر دیکھ رہی تھیں۔

''پر باجی.....'' اس نے قلم بند کرتے ہوئے اپنی ماں کو دیکھا جو باجی کہلوانے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔

''میں تو یہ نہیں باندھوں گی۔ مجھے پڑھنا ہے..... بہت سارا..... اور پھر کسی اچھے آدمی سے شادی کر کے چلے جانا ہے۔'' زیب النساء کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔ کئی لمحے تو وہ اس کی شکل ہی دیکھتی رہ گئیں۔

''کیا کہا ری تو نے..... کس نے سکھایا تجھے یہ سب؟'' انہوں نے زرمینے کو جھنجوڑ ڈالا۔

''ہاں تو باجی ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے نیناں آپی

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

www.Paksociety.com

نے سمجھایا ہے۔ وہ کہتی ہے یہ سب گندے کام ہیں اور زرمینے اچھی لڑکی ہے۔ وہ یہ کام نہیں کرے گی۔'' اس نے اسی معصومیت سے کہا تھا۔ اماں کو تو جیسے کرنٹ لگ گیا۔

''کیا...... کیا...... نیناں نے پڑھایا ہے تجھے یہ سب۔ وہ ابھی سے تیرے دماغ میں زہر گھول رہی ہے۔ اس سے تو میں نمٹ لوں گی اور کان کھول کر سن لے اگر تو نے دوبارہ اس کے پاس قدم بھی رکھا تو......'' وہ دانت پیستی وہاں سے ہٹ گئیں۔

نیناں آپی نے تو کچھ غلط نہیں بولا۔ پھر باجی کیوں ناراض ہوئیں، وہ سوچنے لگی۔ نیناں آپی اس سے بہت پیار کرتی تھی اور بہت خیال بھی رکھتی تھی۔ اسے بھی اماں یعنی باجی سے زیادہ نیناں آپی ہی اچھی لگتی۔ اس گھر میں اور بھی بہت سی آپیاں تھیں۔ نیلم آپی، سوہن آپی پھر ایک دن اس نے نیناں آپی کو باجی سے جھگڑتے سنا۔ باجی بہت زور زور سے چلا رہی تھیں اور آواز نیناں آپی کی بھی کم نہیں تھی۔

''آپ نے وعدہ کیا تھا باجی کہ آپ میری بیٹی کو اس دلدل میں نہیں گھسیٹیں گی۔''

بیٹی! وہ چونکی تھی۔ کیا وہ نیناں آپا کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنے کان دریچے کے ساتھ لگا دیے۔

''وقت کو ساتھ لے کر چلتے ہیں نیناں...... کیا کرے گی تو اس کو پڑھا لکھا کر۔ بول اگر تو یہ خواب پھر سے دیکھ رہی ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی کسی شریف آدمی سے کرے گی تو تو دوسری بار یہ غلطی کر رہی ہے۔ اپنی زندگی تو ایک شریف زادے کی بھینٹ چڑھا چکی۔ اب کیا اس کی بھی چڑھائے گی۔ کچھ نہیں ہے ان شریف زادوں کے پلے۔ نرے بزدل...... ایک طوائف کو اپنی بیوی بنا تو لیتے ہیں لیکن اسے گھر میں بسانا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا...... طوائف عیاشی کے لیے ہے اور اسے اپنا مقام نہیں بھولنا چاہیے۔'' اماں کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر...... میری بیٹی پیروں میں گھنگرو نہیں باندھے گی۔ میں ساری عمر آپ کے اشاروں پر ناچنے کے لیے تیار ہوں مگر میری بیٹی نہیں۔'' نیناں کے لہجے میں عزم تھا۔

''تو اور کتنی دیر ناچے گی نیناں...... دو سال، چار سال...... ڈھلتی جوانی کب تک تیرا ساتھ دے گی۔ اپنا بڑھاپا مت خراب کر...... اس کے دماغ میں ابھی سے اس کا مستقبل ڈال۔ سہانے خواب مت دکھا ورنہ خود تو ذلیل ہوئی ہے ساتھ اس کو بھی ساری عمر ذلیل کرے گی۔''

''مجھے یہ ذلت منظور ہے۔ میں اس کے ماتھے پر ذلالت کا ٹیکا نہیں سجنے دوں گی۔'' اماں کا زوردار قہقہہ گونجا۔

''تو اتنی نادان ہے تو نہیں بہر حال...... دو چار سال اور سوچ لے جب تک تجھ میں دم خم ہے۔ جب یہ دم خم ٹوٹنے لگے پھر ایک بار سوچ لینا۔ شاید بیٹی کی چڑھتی جوانی تیرے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا کر دے۔''

اماں، زیب النساء بائی پُرامید تھیں کہ ایک نہ ایک دن نیناں خود اپنی بیٹی کو اس بازار میں لا کھڑا کرے گی۔ بھوک سے بڑا عفریت اور کوئی نہیں۔ خالی پیٹ کب تک کوئی شرافت کی زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ نیناں کی عمر ڈھلنے کا انتظار کرنے لگیں اور نیناں اس امید پر جینے کی کوشش کہ ایک نہ ایک دن اس کی بیٹی کو کوئی شریف آدمی بیاہ کر لے جائے گا۔

''زرمینے!'' وہ رات کا شاید پچھلا پہر تھا جب عباد مندی مندی آنکھیں لیے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ چونکی تھی۔

''تم مجھے وہیں اکیلا چھوڑ آئیں؟'' وہ جھومتا ہوا بیڈ کی پائنتی کی طرف گرا اور وہیں آڑا ترچھا لیٹ گیا۔

اس نے لیٹے لیٹے اپنی ٹانگیں سمیٹیں۔

''میں اس الجھن میں ہوں، تم طوائف کی بیٹی ہو پر لگتی کیوں نہیں ہو۔'' اس کی سوئی ہنوز وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ زرمینے کے لبوں سے سرد آہ نکلی۔

''اس لیے کہ میری رگوں میں ایک شریف باپ کا خون ہے اور میری ماں نے مجھے حرام کی کمائی سے نہیں اپنے ہاتھوں کی محنت کی کمائی سے پالا ہے۔'' اس نے بے حد آہستگی سے کہہ کر کروٹ بدل لی تھی۔

''جو داغ ازل سے ماتھے پر لگ جائے وہ کبھی نہیں مٹتا۔ دنیا والے مٹنے ہی نہیں دیتے۔'' زیب النساء کا کبھی کا کہا ہوا جملہ اس کی سماعتوں میں گونجا اور وہ بے آواز رونے لگی۔

☆☆☆

''نہیں، میں مسلمان نہیں ہونا چاہتا۔'' اس نے سختی سے انکار کیا تھا۔ ''میں بس...... میرے اندر ایک بے چینی ہے۔ ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ میں اس کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے سکون نہیں ہے۔ یہ شراب جو مین بچپن سے پیتا آیا ہوں اب میرے اندر آگ لگا دیتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے گیارہ سال عورتوں کے ساتھ گزارے ہیں۔ ان کی قربت میں لیکن اب کسی عورت کو دیکھتے ہی میرے وجود میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگتی ہیں۔ کرسٹی میری گرل فرینڈ ہے۔ ہمارا ساتھ بہت پرانا ہے مگر اب...... اسے دیکھتے ہی میرا جی اسے بھگا دینے کو چاہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ میرے قریب آئے گی یا میں اس کو چھوؤں گا تو کوئی خفا ہو جائے گا، ناراض ہو گا۔ کون...... 'یہ کون' مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ اس نے اپنی نگاہیں مجھ پر گاڑ رکھی ہیں۔ میرے اندر صحیح، غلط، ثواب اور گناہ کی جنگ چھیڑے رکھتا ہے۔ یہ جو اتنے سالوں سے میں زندگی گزار رہا ہوں کیا غلط ہے؟ اگر غلط ہے تو کیوں......؟ مجھے اس کون اور کیوں کے جواب ڈھونڈنے ہیں۔ مے یو ہیلپ می۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا رکھی تھیں اور چہرہ شدید اضطراب کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔

پروفیسر عمار الحسن نے بہت سکون اور تحمل سے اسے سنا تھا۔ وہ اس کا مسئلہ جان چکے تھے۔ مریم نے انہیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ قرآن پاک پڑھنا چاہتا تھا۔ کیوں؟ اس کی وضاحت وہ کر چکا تھا۔ لیکن عمار الحسن جانتے تھے اس کی وجہ کچھ اور تھی۔

''بے شک جسے رب العالمین راہِ راست پر لانا چاہے۔'' ان کی آنکھوں میں اشک چمکے تھے۔ انہوں نے دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ ڈالی۔ عصر کا وقت ہو گیا تھا۔

''تم بیٹھو گے' میں نماز پڑھ لوں؟' انہوں نے وضو کے لیے اٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ہیری نے اثبات میں سر ہلایا۔ عمار الحسن وضو کرنے چلے گئے۔ ہیری وہیں دو زانو بیٹھا اضطرابی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے میں برائے نام سامان تھا۔ ایک طرف کونے میں رکھی رائٹنگ ٹیبل ایک رائٹنگ چیئر۔ ذرا پرے کمپیوٹر ٹیبل پر پڑا لیپ ٹاپ، دائیں طرف دیوار گیر بک شیلف اور وہ تمام کی تمام کتابوں سے بھری ہوئی۔ کچھ کے نام وہ پڑھ سکتا تھا جبکہ باقی کتابیں دوسری زبان شاید اردو میں تھیں وہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کب عمار الحسن اندر آئے اور نماز کی نیت باندھ لی۔

وہ انہیں دیکھنے لگا۔ پہلے کھڑا ہونا، پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکنا پھر سیدھے کھڑے ہونا پھر نیچے بیٹھ کر خود کو سمیٹ کر ماتھا زمین پر ٹیک دینا۔ پھر سیدھے ہونا پھر ماتھا ٹیک دینا۔ انہوں نے کم از کم سارے عمل کو چار بار دُہرایا۔ پھر دائیں بائیں دیکھ کر دونوں ہاتھ

پھیلا کر آنکھیں بند کر کے منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے۔ شاید دعا مانگ رہے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد وہ پھر اس کے قریب آبیٹھے۔

''ہوں...... تو تم مسلمان نہیں ہونا چاہتے۔'' انہوں نے اس کا بھرپور جائزہ لیا۔

''نہیں!'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ متلاشی تھا۔

''قرآن پڑھو گے؟''

''میں بس اس ''کون'' کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کیا قرآن پڑھنے سے میں اس کے بارے میں جان سکوں گا؟'' اور عمار الحسن خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگے۔ وہ کافی دیر وہاں بیٹھا اپنے دل کی باتیں کرتا رہا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، اپنی بدلتی کیفیت کی باتیں۔ وہ کھوج کی کیفیت میں تھا۔ پھر اسی طرح وہ اٹھا اور چلا گیا۔ عمار الحسن اس کی کیفیت کو سمجھ رہے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس کھوج کا سرا وہ خود ڈھونڈے تاکہ اس کی صحیح سمت کا تعین کیا جاسکے۔

☆☆☆

اب تو وہ بھی سوچنے لگی تھی کہ وہ طوائف کی بیٹی تھی تو لگتی کیوں نہیں تھی۔ وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی رہتی۔ اپنے جسم، اپنے چہرے کا ایک ایک عضو ٹٹولتی...... کیا ہوتا ہے طوائف میں، جو عام عورت میں نہیں ہوتا۔ یا عام عورت میں کیا ہوتا ہے جو طوائف میں نہیں ہوتا۔ وہ سوچتی اور سوچتی چلی جاتی۔ عباد پہلے کی طرح اس سے پیار کرتا تھا، اس کا خیال بھی رکھتا لیکن رات کو اس کا وہی سوال ہوتا جو وہ گھما پھرا کر کیا کرتا۔ وہ شرماتی تو اعتراض، وہ بے باک ہوتی تو اعتراض، وہ چپ کر کے لیٹ جاتی تو اعتراض، وہ اس کے دن بھر کی روداد سننا چاہتی تو اعتراض۔ رات اس کے لیے آرام نہیں تکلیف وہ بن کر اترتی اور وہ حقیقتاً کانٹوں پر گزرتی لیکن صبح ہوتے ہی عباد کے چہرے پر ماسک چڑھ جاتے اور وہ نئے سرے سے آئینے کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ رات وہ عباد کے سوالات کی زد میں ہوتی اور دن کو وہ خود اپنا محاسبہ کرنے بیٹھ جاتی۔ اپارٹمنٹ کی ایک ایک چیز اسے کھانے کو دوڑتی۔ اس کا دل چاہتا وہ یہاں سے بھاگ جائے پر کہاں......؟ عباد رات گئے شراب کے نشے میں دھت آتا اور اب تو وہ دعائیں کرتی رات نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔

''کل شام پھر گھر میں گیٹ ٹوگیدر رکھی ہے۔'' صبح ناشتے پر عباد نے اطلاع دی تو سلائس کی طرف بڑھتا ہاتھ رک سا گیا۔

''پھر......؟'' اس کے گلے سے مری مری آواز نکلی۔ عباد نے چائے کا گھونٹ لیا اور بتانے لگا۔

''کل سارے دوست آئیں گے اور پلیز تم وہ اپنے بیک ورڈ بلکہ آکورڈ ڈریسز کہیں پھنکوا دو۔ میں نے مارتھا سے کہہ دیا ہے وہ تمہارے لیے ڈریسز بھجوا دے گی اور شام کو آکر تمہاری لک بھی چینج کردے گی۔ یہ جو پینڈو سی لک ہے ناں تمہاری مجھے چڑ ہوتی ہے اس سے۔'' اس نے جوس کا خالی گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے ایک تمسخرانہ نظر اس کے وجود پر ڈالی۔

''عباد...... آپ کو میری اسی لک سے محبت ہوئی تھی؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہا، ہا، ہا......'' وہ ہنسا اور پھر دیر تک ہنستا رہا۔ ''ہر نئی چیز اٹریکٹ کرتی ہے مس زرمینے... لیکن وہ کیا ہے کہ میں زیادہ دیر یکسانیت برداشت نہیں کرسکتا۔ کسی بھی چیز میں۔ تمہاری اس لک سے نہیں، مجھے تمہارے چہرے سے محبت ہوئی تھی لیکن چہرے کے ساتھ تمہارا وجود بھی ہے اسے بدل بدل کر میرے سامنے لاؤ تاکہ یہ محبت برقرار رہے...... ہوں...... سویٹ ہارٹ۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اس کی ناک کھینچی اور پھر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

اسے عباد کی پارٹیز سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے حلقۂ احباب میں سب مقامی باشندے تھے اور ان سب کے لیے یہ آکورڈ نہیں تھا لیکن اسے ان ننگے جسموں اور شراب کے بھبکوں سے کراہیت آتی تھی۔ ایک دو دفعہ تو عباد نے اس کے حلیے کو برداشت کیا تھا لیکن اب وہ کھلم کھلا اس پر تنقید کرنے لگا تھا۔ وہ اسے بھی ان لوگوں میں گھل مل جانے کو کہتا۔ اس کے دوست اس کا ہاتھ پکڑتے...... اسے ڈانسنگ فلور پر لے آتے...... وہ ہچکچاتی...... کچھ دیر اُن کا ساتھ دیتی پھر موقع ملتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتی لیکن عباد کی کرخت نظریں اسے پھر ڈھونڈ لاتیں۔

پچھلی گیدرنگ میں تو حد ہی ہوگئی۔ اس کے بزنس پارٹنر نے پہلے تو اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے خوب ہی ڈانس کیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اوچھی حرکتوں پر اتر آیا اور تب وہ اسے زور سے پرے دھکیلتی بھاگتے ہوئے وہاں سے آگئی۔ عباد اس وقت کہیں اور کسی کے ساتھ گم تھا لیکن بعد میں جب اسے پتا چلا تو اس نے زرمینے کی خوب دھنائی کی۔

''میں اس کیٹیگری کی لڑکی نہیں ہوں عباد اگر مجھے یہ سب کرنا ہوتا تو میں پڑی رہتی وہیں کوٹھے پر...... لاکھوں کماتی...... لیکن تم تو مجھے میری ہی نظروں سے گرا رہے ہو۔ میں تمہاری عزت ہوں۔ کچھ تو خیال کیا کرو۔'' وہ رونے لگی لیکن اس پر اس کے رونے کا قطعی اثر نہ ہوا۔ بڑے آرام سے جا کر سو گیا۔

وہ ساری رات سسکتی، کراہتی رہی اور صبح دم اس کی آنکھ لگ گئی۔ عباد کب اٹھا، کب گیا اسے خبر نہ ہوئی۔ دوپہر کو اس کی آنکھ کھلی تو فوراً اٹھ بیٹھی۔ اس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ اپنے لیے کافی بناتے ہوئے اس کی نظر کھڑکی سے باہر پڑی۔ موسم ابر آلود تھا اور سردی میں شدت آچکی تھی۔ سامنے والے اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں اسے کوئی اِستادہ نظر آیا۔ وہ بلا ارادہ ہی اسے تکنے لگی۔ کافی کے سپ لیتے ہوئے وہ مسلسل اسے دیکھتی رہی۔ تبھی اس کی نظروں کی محویت کو جان کر اس نے ہاتھ ہلایا۔ وہ شرمندہ ہو کر پلٹ آئی۔ کیا سوچا ہوگا اس نے... کہ میں...... وہ تیزی سے کچن سے باہر آئی جیسے وہ کھڑکی توڑ کے اندر گھسا آرہا ہو۔

اس شام پہلی بار اس نے اماں (نیناں آپی) کو فون کیا۔ جب وہ وہاں سے نکلی تھی تو نیناں نے اس سے عہد لیا تھا کہ وہ پلٹ کر نہیں دیکھے گی۔ اسے عباد پر بھروسا تھا یا زرمینے پر پتا نہیں۔ لیکن زرمینے نے بھی سوچا تھا کہ وہ عباد کی محبتوں میں اپنا ماضی بھلا دے گی۔ کبھی پلٹ کر نہیں دیکھے گی لیکن چھ ماہ میں ہی عباد کی شدتوں اور محبتوں کے خول اترنے لگے تھے اور وہ اتنی مضبوط بہر حال نہیں تھی کہ ڈٹ جاتی۔ اماں کی آواز سنتے ہی جیسے اس کے زخموں کی ٹیسوں میں شدت آگئی۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔

''کیا ہوا مینے؟'' ان کا دل یکبارگی دہلا تھا۔ کیا اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو خود اُن کے ساتھ ہوا تھا۔

''مینے سب ٹھیک ہے ناں......؟'' انہوں نے آواز دھیمی رکھی تھی مبادا ''باجی'' کے کانوں میں بھنک بھی پڑے۔

''ہاں آپا......'' اس نے بہ مشکل خود پر قابو پایا تھا۔ ''بس یونہی آپ لوگوں کی یاد آگئی۔'' اس نے فوراً بات بنائی۔

''عباد تجھے ٹھیک تو رکھتا ہے ناں، دیکھ ہمیں یاد مت کرنا، یہ اچھی یادیں نہیں ہیں۔ کوشش کر کے بھلا دینا سب۔ کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ اچھا...... باجی آرہی ہیں۔ میں فون رکھتی ہوں۔'' انہوں نے فون بند کر دیا اور وہ ریسیور کو تکتی رہ گئی۔

☆☆☆

''ہیری تم بدل گئے ہو...... بہت زیادہ۔ آج کل

تمہارا اٹھنا، بیٹھنا کن لوگوں میں ہے۔'' کرسٹی آج بہت غصے میں تھی۔ ہیری کو چند چیزیں لینا تھیں اور وہ کرسٹی کے اسٹور پر آیا تھا۔ کافی دنوں سے ان کا رابطہ منقطع تھا۔ وہ کئی بار اس کے فلیٹ پر بھی گئی لیکن وہ لاکڈ ملا۔ فون آف ہوتا تھا اور آج جب وہ اسے نظر آیا تو وہ پھٹ پڑی۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو، عجیب ملگجا سا حلیہ...... یہ وہ ہیری تو نہ تھا۔

''نہیں تو...... میں کیوں بدلوں گا اور کس لیے۔'' اس نے شاپنگ بیگ کس کر پکڑا تھا جیسے وہ ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر جائے گا۔

''ہیری...... کیا تم کسی اور سے محبت کرنے لگے ہو؟'' وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

''محبت......'' وہ ہنسا...... ''یہ محبت وغیرہ کچھ نہیں ہوتی، کرسٹی اصل مزہ تو عشق کرنے میں ہے۔'' اس نے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے...... وہ بھاگ کر مدِمقابل آئی۔

''میں آج شام تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں اور اس بارے میں میں کوئی انکار نہیں سنوں گی۔'' اس نے قطعیت سے کہا تھا۔

''نہیں...... میں شام کو گھر پر نہیں ہوں گا۔'' اس نے شاپنگ بیگ دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور جوتے کی ٹوہ سے پلر کو ٹھوکر مارنے لگا۔

''ہیری تم شام جہاں بھی گزارو گے میں وہاں جانا چاہوں گی، اوکے شام کو ملیں گے۔'' وہ الٹے قدموں لوٹ گئی اور وہ گھر آگیا۔

''اب اس کرسٹی سے کیسے پیچھا چھڑاؤں؟ اگر اسے پتا چل گیا کہ میں کہاں جاتا ہوں تو خود تو طوفان کھڑا کرے گی ہی ساتھ میں پورے ملک میں ہنگامہ مچادے گی۔'' تمام راستے وہ یہی سوچتا رہا تھا اور اسی لیے کرسٹی کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ نکل آیا۔ جب وہ لفٹ سے نیچے آرہا تھا اس نے کرسٹی کو اوپر جاتے دیکھا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ وہ اس کے آنے سے پہلے نکل آیا تھا۔

آج کل وہ عمار الحسن کے ساتھ شام کو واک کے لیے جارہا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ ان کے معمولاتِ زندگی کا مشاہدہ کرنے لگا تھا۔ عمار الحسن اسے آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے اسلام کے بارے میں بتاتے رہتے۔ کبھی نبی کریم ﷺ کی عظمت کے بارے میں کوئی واقعہ سنادیتے، کبھی اُن کی تبلیغ میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کرتے۔ ان کے ساتھیوں کا نبی پاک ﷺ سے عشق بیان کرتے اور ان کی گفتگو کا اختتام ہمیشہ اس جملے پر ختم ہوتا۔ ''آپ ﷺ وجہِ تخلیقِ کائنات ہیں'' اور کبھی کبھی بات کرتے ہوئے رک جاتے پھر تبسم کے ساتھ کہتے۔

''عشق کرنا ہے تو نبی کریم ﷺ سے کرو۔ اللہ آپ سے محبت کرنے لگے گا۔ پھر تم عشق کی کرامات دیکھو گے۔ دنیاوی عشق تو دکھ دیتا ہے، رُلاتا ہے، یہ عشق تمہیں سکون، سکھ اور راحتیں دے گا۔ بس نبی کریم ﷺ کا دامن تھام لو۔ جو اللہ کے محبوب سے محبت کرے گا، اس کی محبت، اس کی رضا خود بخود پالے گا۔'' اور اس رات وہ خوب رویا۔ اس کے اندر کی بے چینی نے اسے جی بھر کے رُلایا اسے اس نامکمل عشق نے رُلایا۔ جس کو وہ مکمل نہیں کر پارہا تھا۔ تبھی اگلے روز صبح سویرے ہی وہ عمار الحسن کے گھر پہنچ گیا۔

موسم آج بھی بے حد خراب تھا۔ برف باری سے راستے بند تھے اور سردی ایسی کہ رگوں میں خون منجمد کیے دیتی تھی۔ وہ اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے جب عمار الحسن کے گھر کی بیل بجانے کا ارادہ کررہا تھا تبھی اس کی نظر پول کے نیچے ایک گٹھری نما چیز پر پڑی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی انسانی وجود ہو۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس قدر خون منجمد کردینے والی سردی میں کوئی لبِ سڑک بیٹھا

www.Paksociety.com

کر بھی کیا رہا تھا؟ لیکن اخلاقیات...... اس نے بہت آہستگی سے اس وجود کو چھوا لیکن اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی اس نے تھوڑی شدت سے کندھا ہلایا اور تبھی وہ وجود لڑھک کر پیچھے جا گرا۔

''اوہ...... مائی گاڈ......'' اس نے مدد کے لیے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اس کی نظر سارجنٹ پر پڑی جو غالباً انہیں دیکھ کر اِدھر ہی آرہا تھا۔ قریب آتے ہی اس نے سارجنٹ کو ساری صورتِ حال بتائی۔ اس نے جھک کر اس وجود کو سیدھا کیا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ سارجنٹ نے اس کی نبض چیک کی جو ہلکی ہلکی چل رہی تھی۔

''ہاسپٹل!'' سارجنٹ نے اسے دیکھ کر کہا اور وہ تیزی سے اپنی گاڑی اِدھر لانے کے لیے چل دیا۔

پھر اس لڑکی کو ہاسپٹل چھوڑنے کے چکر میں اس کے ذہن سے نکل گیا کہ وہ آج عمار الحسن کے پاس کس کام سے صبح صبح آیا تھا۔ وہ لڑکی بے ہوش تھی اور اس کا اتا پتا بھی معلوم نہیں تھا۔ محض اخلاقیات نبھانے کو وہ دن میں دو دفعہ ہاسپٹل کے چکر بھی لگانے لگا۔ تیسرے دن اسے ہوش آیا تو... ہیری نے شکر ادا کیا۔ ہاسپٹل والے اس سے معلومات لینے لگے۔

''میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔'' ہیری نے اسے تسلی دی تھی لیکن جیسے ہی ہاسپٹل سے فارغ ہو کر وہ اسے گھر چھوڑنے کی نیت سے گاڑی تک لایا اس نے انکار کردیا۔

''میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔'' اس نے اردو میں کہا تھا اور ہیری اس کا منہ تکنے لگا۔

''میرا مطلب ہے......'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں اسے اپنا مدعا سمجھانے لگی۔ ہیری کچھ سمجھا اور بہت کچھ نہیں سمجھا۔ اسے یہی سوجھا کہ فی الحال وہ اسے اپنے اپارٹمنٹ میں لے جائے وہاں بیٹھ کر تسلی سے بات ہوسکتی تھی۔ اس کے ساتھ جاتے ہوئے اس لڑکی کے چہرے پر جتنا خوف تھا ہیری بخوبی دیکھ سکتا تھا اور تبھی اس نے اس کا نام پوچھا تھا۔

''زرمینے...... زرمینے فرام پاکستان......'' اس نے آہستگی سے جواب دیا تو ہیری نے چونک کر اسے دیکھا۔

''مسلم؟''

''یس۔'' وہ مختصراً کہہ کر باہر جھانکنے لگی۔ وہ الجھا الجھا سا گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

☆☆☆

بہت دنوں بعد اس نے آپی کو فون کیا تھا بلکہ شاید مہینوں بعد۔

''اوہ رچ...... یار کہاں تھے تم اتنے دنوں سے، تم تو غائب ہی ہوگئے۔'' عباد اس کی آواز سنتے ہی چہکا تھا۔ ''اور یہ تمہارا سیل کیوں آف رہنے لگا ہے؟'' ساتھ ہی شکایت بھی کی۔

''یار...... تمہاری بیوی کہاں ہے؟'' اس نے فوراً پوچھا تھا جو خیال اس کے ذہن میں تھا وہ اس کے بارے میں کنفرم کرنا چاہتا تھا۔

''بیوی...... خیر تو ہے، میری بیوی کی ضرورت تمہیں کیوں پڑ گئی...... اور وہ کرسٹی کہاں چلی گئی......'' جواباً وہ خباثت سے ہنسا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں......'' وہ خجالت سے بولا تھا۔ ''میں یونہی پوچھ رہا تھا۔'' وہ پھر ہنسنے لگا۔

''کچھ دن پہلے بھاگ گئی۔ اصل میں یہ ٹپیکل پاکستانی مسلم گرلز...... شائی ہونے کا بڑا ناٹک کرتی ہیں۔ آجائے گی، جائے گی کہاں...... دھکے کھالے ذرا باہر کے اور پھر ٹرینڈ بھی ہوجائے گی۔ ہاہاہا...... دنیا بڑی ظالم ہے سب کچھ سکھادیتی ہے۔'' اس نے مصنوعی ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ ہیری نے گھبرا کر فون بند کردیا۔ وہ عباد کی گھٹیا فطرت سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اس کا پرانا کسٹمر تھا اور پھر جانے

www.Paksociety.com

کیسے جان پہچان دوستی میں بدل گئی۔ عمروں میں تفاوت کے باوجود جلد ہی ان میں گاڑھی چھننے لگی۔ وہ کافی سالوں سے یہاں رہائش پذیر تھا اور یہاں کے رنگ میں مکمل طور پر رنگ جا چکا تھا۔ وہ کیا کرتا تھا، کہاں رہتا تھا، کہاں سے آیا تھا، ہیری نے کبھی جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور نہ ہی اس نے بتانے کی۔ کچھ عرصے قبل ہی اسے پتا چلا تھا کہ وہ پاکستانی تھا۔ وہ بھی تب جب اس نے ہیری کو بتایا تھا کو وہ پاکستان جا رہا ہے۔ پھر زرمینے کو پسند کرنے سے لے کر شادی تک ساری تفصیلات اس نے فون پر ہیری کو بتائی تھیں۔ اس کی واپسی پر اس کے اپارٹمنٹ کو ڈیکوریٹ کرنے کا کام بھی اس نے ہی کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے انٹرنیٹ سے مدد لی تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ زرمینے کو ائر پورٹ سے اپارٹمنٹ تک پہنچانے کے باوجود اس نے اس کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی تھی یا پھر شاید اس نے کوشش ہی نہیں کی تھی ورنہ وہ دیکھ ہی لیتا۔

اس نے آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈالیں۔ باہر سردی عروج پر تھی۔ اس نے صوفے کی طرف نگاہ کی۔ زرمینے کمبل لپیٹے بیٹھے بیٹھے ہی نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی۔ شاید دوائیوں کا اثر بھی باقی تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ زرمینے نے گھر کیوں چھوڑا ہوگا۔ عباد اور اس کے دوست جس طرح ایک دوسرے کی گرل فرینڈز شیئر کرتے تھے یقیناً انہوں نے اس کے ساتھ بھی یہی کیا ہوگا اور تبھی اسے یاد آیا کچھ عرصے قبل تک وہ بھی ان باتوں کو برا نہیں سمجھتا تھا۔ پھر یک دم سے اس کے اندر کچھ بدلا تھا اور اسے یہ سب برا لگنے لگا تھا۔ عورتیں، شراب، قماربازی۔ اسے ان سب سے نفرت ہونے لگی تھی پھر رفتہ رفتہ اس نے بار جانا کم کر دیا تھا اور وہ عمار الحسن ...... اوہ ...... اسے یک دم یاد آیا۔ وہ تو اس روز صبح عمار الحسن سے ملنے گیا تھا۔ اس نے جلدی سے لانگ شوز پہنے، اوور کوٹ چڑھایا اور باہر نکل آیا۔ اس قدر گرم کپڑے پہننے کے باوجود سردی کی لہر اس کی ہڈیوں کے اندر تک اتری تھی۔ اس نے گلوز چڑھائے اور جلد از جلد گاڑی باہر نکالی اور سڑک پر ڈال دی۔ سڑک ایک بار پھر بلاک ہو چکی تھی۔ بہت مشکل سے صاف جگہوں سے ہوتا ہوا وہ آدھے گھنٹے کے بجائے دو گھنٹوں میں عمار الحسن کے گھر پہنچا تھا۔ تیسری بیل پر دروازہ کھلا۔

''عمار الحسن؟'' سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اس نے مختصراً کہا۔

''بیمار ہیں وہ...... تم اندر آنا چاہو تو آسکتے ہو؟'' انہوں نے بتاتے ہوئے سائڈ پر ہو کر اس کے گزر جانے کا راستہ بنایا تھا۔ وہ جھجکتا ہوا اندر آیا۔ مریم اس کے لیے کافی لینے چلی گئیں۔ وہ عمار الحسن کے پاس چلا آیا۔ وہ آتش دان کے قریب ہی میٹرس لگائے لیٹے تھے۔

''آؤ......'' وہ خوش دلی سے مسکرائے تھے۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا......؟'' وہ پریشانی سے ان کی پیشانی کو چھوتے ہوئے بولا۔ اتنی سردی میں بھی ان کے بدن میں تپش تھی۔

''ہاں، الحمد للہ ...... سردی بہت ہو گئی ہے ناں...... تو بوڑھی ہڈیاں جواب دے جاتی ہیں۔'' انہوں نے ایک بار پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ مریم کافی کا مگ رکھ گئیں۔ عمار الحسن کے اشارے پر وہ ہلکے ہلکے سپ لینے لگا۔ عمار الحسن بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ آج اس کے چہرے پر اضطراب نہیں تھا۔ ایک سکون تھا جیسے وہ کوئی فیصلہ کر چکا ہو، اس کے اندر کی تلاش مکمل ہو گئی ہو۔

''سر...... میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔'' کافی کا آخری سپ لیتے ہوئے اس نے کہہ ہی ڈالا۔

☆☆☆

کرسٹی نے کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ تھوڑے سے سرکے ہوئے پردے کے پیچھے سے اسے آتش دان میں سلگتی آگ بھی نظر آ گئی اور صوفے پر لیٹا ہیری بھی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ بالآخر وہ ہیری تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ آج وہ سارے حساب بے باق کرے گی اور اپنے اس تعلق کو کوئی نام دے کر ہی چھوڑے گی۔ اس نے سوچا تھا۔ آج وہ ہیری کو شادی کے لیے ہر صورت منا لے گی اور اس کے ذہن میں جو گندگی بھری ہے وہ بھی صاف کر ڈالے گی۔ ڈپلیکیٹ کی سے لاک کھولتے ہوئے اس نے کئی منصوبے بنا لیے تھے۔ اندر داخل ہو کر اس نے دونوں ہاتھ کو آپس میں رگڑا اور ہیری کو جگانے کا طریقہ سوچنے لگی۔

وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے صوفے کے قریب آئی اور تبھی اس کی نظر سائڈ ریک پر رکھی ان کتابوں پر جا پڑی جن کو دیکھ کر اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ ساری کتابیں اسلام کے بارے میں تھیں۔ اس نے ایک ایک کتاب کو اٹھا کر دیکھا، پلٹا ...... اور اس کے اندر تک اندھیرا اترتا گیا۔ ہیری مسلمان ہو چکا ہے۔ اسے یاد آیا ...... ایک رات جب وہ ہیری کو مدہوشی کی حالت میں گھر لائی تھی تو اس کی زبان سے اللہ نکلا تھا۔ اسے چند دن اس نام نے بہت پریشان رکھا تھا لیکن پھر وہ بھول بھال گئی تھی۔ تو یہ گریز ...... یہ تبدیلی اس لیے تھی۔ یہ اس نے کیا کیا تھا۔ وہ کس سے انسپائر ہو گیا تھا۔ اس کے تو دوستوں میں بھی ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو مسلمان ہوتا پھر ...... کہاں ...... کس وجہ سے اس میں تبدیلی آ گئی جو اس نے اپنا مذہب چھوڑ دیا۔ پہلے تو اسے ہیری پر شدید غصہ آیا۔ پھر جیسے اس کو کھو دینے کا احساس غصے پر حاوی ہو گیا۔ وہ وہیں بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

''ہیری...... یہ تم نے کیا کیا...... کیا کیا...... یہ۔''

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
ماہنامہ سرگزشت
جولائی 2012ء کی جھلکیاں
محسنِ غالب
اس نابغۂ روزگار کا سوانح جس نے کلامِ غالب کو معراج بخشا، ایک بڑے محقق کی داستان
شاطر مصلح
صوبہ پختون خواہ و افغانستان کے سورش زدہ علاقوں میں تعلیم عام کرنے کے نام پر لاکھوں ڈالرز خرد برد کرنے والے امریکی کی روداد
اولادِ چنگیز
چنگیز خان کی اولادیں کس حال میں ہیں ایک سیر حاصل تحریر، قصہ دلپزیر
نجمہ
ایک دکھی عورت کی دکھ بھری سچ بیانی
آج ہی قریبی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

www.Paksociety.com

اس کی آواز بلند ہوگئی اور شور کی وجہ سے بے سدھ..... سوئی زرمینے کی آنکھ کھل گئی۔

''یہ کون رو رہا ہے۔ کہیں میں مر تو نہیں گئی؟''

اس نے اپنے ہاتھ سے خود کو چھوا اور پھر کمبل اتار کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کرسٹی صوفے کی پشت پر سر رکھے رو رہی تھی۔ اسے لگا شاید اس کے رونے کی وجہ وہ تھی اور جیسے ہی کرسٹی کی نظر اس پر پڑی وہ چپ ہوگئی۔ تو ہیری ڈارلنگ گریز کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ وہ رونا دھونا بھول کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ زرمینے کو اس کے تیوروں سے خوف آنے لگا۔ وہ اس کو سمجھانا چاہ رہی تھی۔ اپنے بارے میں بتانا چاہتی تھی لیکن وہ اس کی زبان سمجھتی تب ناں...... کرسٹی نے آگے بڑھ کر تڑاخ تڑاخ اس کے منہ پر تھپڑ مارے اور ''یو ڈرٹی بچ'' کہہ کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ زرمینے اس حملے کے لیے قطعی طور پر تیار نہیں تھی۔

''میں دیکھ لوں گی تمہیں بھی اور اس نومسلم کو بھی...... جینا حرام کردوں گی میں تم دونوں کا...... انڈر اسٹینڈ ناٹ...... یو......'' وہ گالیاں بکتی باہر نکل گئی اور زرمینے گال پر ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر تہی داماں ہوجائے گی۔ وہ جو اسے بلینک چیک کے عوض بیاہ کر یا خرید کر لایا تھا اور اسے ہمیشہ اپنی عزت بنا کر رکھنے کا وعدہ کیا تھا کیسے بھول گیا تھا سب۔ اسے تو شاید یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ اس کی بیوی تھی ورنہ کوئی شوہر اپنی بیوی کسی دوسرے مرد کو سونپتا ہے؟ وہ کم عمر تھی۔ زندگی کی باریکیوں کو نہیں سمجھتی تھی لیکن اچھا برا اور غلط صحیح تو جانتی تھی۔ عباد کی زندگی کے اپنے اصول تھے۔ وہ صرف نام کا مسلمان تھا۔ اس کے خیالات اس معاشرے سے میل کھاتے تھے۔ وہ دوستوں کی بیویاں شیئر کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا تھا تو اسے اس بات کی بھی شرم نہیں تھی کہ اس کا کوئی دوست اس کی بیوی شیئر کرے۔ اس کی روح پر ابھی بھی وہ لمحہ کسی زخم کی طرح دہک رہا تھا جب وہ عباد کا لایا ہوا ڈریس پہن کر باہر نکلی تھی۔ لباس کے نام پر جو چیتھڑے اس نے اپنے جسم پر چپکائے تھے انہیں لباس کے علاوہ سب کچھ کہا جاسکتا تھا۔ مدہوش کردینے والی کلون کی مہک، گہرا شوخ میک اپ، اس کا نیم عریاں وجود عباد کو کسی بجلی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ ''آج سب کے ہوش اڑ جائیں گے۔'' اس نے سگریٹ کا دھواں اس کے چہرے پر چھوڑا تھا اور تبھی اس نے ڈرتے ہوئے کہا تھا۔

''عباد مجھے شرم آرہی ہے۔''

''کیا...... اپنے اس بے ہودہ لباس کے ساتھ تمہاری یہ ''مس شائی اندر ہی رہ گئی کیا؟'' اس کے لہجے میں نرمی لیکن انداز میں جو چنگھاڑ تھی اس نے اسے دوبارہ بولنے ہی نہیں دیا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے پیچھے آگئی...... اور پھر ساری پارٹی میں عباد کے دوستوں کی منظورِ نظر وہی رہی۔ سب نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر خوب خوب ڈانس کیا اور وہ ایک ایک لمس پر سوچتی رہی شاید طوائف ہونا اس سارے عمل سے کم تکلیف دہ ہوتا ہو اور جب جان اس کا بازو پکڑ کر تقریباً گھسیٹ کر وہاں سے لے جانے کے درپے ہوا تو زرمینے کی برداشت جواب دے گئی۔ بلا ارادہ ہی اس کا ہاتھ جان پر اٹھ گیا۔ جان تو ششدر ہوا ہی، وہاں موجود سب لوگوں نے بے حد حیرت سے اس کے اس عمل کو دیکھا۔ عباد بھاگ کر آیا۔ اور اب کھڑا خشمگیں نظروں سے زرمینے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا کر عباد کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی لیکن عباد نے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے اسے اپنے سامنے لاکھڑا کیا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم مسٹر جان کے منہ پر تھپڑ مارو......'' وہ غرایا۔

''عباد یہ مجھے اپنے ساتھ......'' اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ آنسوؤں سے حلق میں پھندے پڑنے لگے۔

''تو...... کیا قیامت آرہی تھی۔ میں تنگ آچکا ہوں تمہارے اس رویئے سے۔ کیا تم اس طرح کر کے اپنے اوپر لگی طوائف کی چھاپ ہٹانا چاہتی ہو...... یو بچ......'' اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کیا۔

''عباد......'' وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''کیا ہوجائے گا اگر تم ایک رات جان کے ساتھ چلی جاؤ گی۔ تم جانتی ہو جان سے مجھے کتنا بڑا فائدہ ملنے والا ہے۔ اتنی دولت ملے گی کہ تمہاری سات پشتوں نے بھی نہیں کمائی ہوگی۔'' وہ غرایا۔

''میں تمہاری بیوی ہوں اور تم خود مجھے ایک رات کسی غیر مرد کے ساتھ گزارنے کو کہہ رہے ہو۔'' اسے لگ رہا تھا قیامت بس اب آنے کو ہے۔

''بیوی...... بیوی...... شٹ...... تم جن تین بولوں پر اتراتی پھرتی ہو، میں ان بولوں کے رشتے سے تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں...... طلاق دیتا ہوں...... طلاق دیتا ہوں......'' اس نے بڑی سفاکی سے اپنا اور اس کا رشتہ ختم کیا تھا۔

''عباد......'' اسے عباد سے اس انتہائی اقدام کی توقع نہیں تھی۔

''اور سن لو میں نے تمہیں صرف اس رشتے سے آزاد کیا ہے، اپنی غلامی سے نہیں...... بلینک چیک کے عوض خریدا ہے میں نے تمہیں، ایک دو تین نہیں پورے اسی لاکھ بھرے تھے تمہاری ماں نے...... اور وہ اسی لاکھ تمہیں پورے کرنے ہوں گے۔ صرف آج ہی نہیں، آج کے بعد ہر رات جہاں میں چاہوں گا وہیں گزرے گی تمہاری...... اور اگر تم نے بھاگنے کی

مجھ سے ملیے

میرا نام زم زم ہے۔ کاش میں سچ مچ کی زم زم ہوتی۔ جو بیمار روحوں کو اندر سے معطر ٹھنڈا شفا یاب ،پاک کردیتا ہے۔ مگر میں تو کچھ بھی نہیں۔ اے پروردگارِ عالم، میں گنہگار ہوں، خطا کار ہوں لیکن تیری بخشش کی طلب گار ہوں۔ جانتی ہوں میں آزمائشیں تو اپنے پیاروں کی ہی کرتا ہے۔ میرے امی، ابو مجھے گھر میں پیار سے ساجن کہتے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ اب کان ترس گئے ہیں امی ابو کے پیار بھرے لہجوں کو سننے کے لیے اس لیے ہم سارے گھر میں بے قرار سے پھرتے رہتے ہیں۔ آہ...... عادتاً میں دوست نواز ہوں، ہر ایک کے ساتھ مخلص ہوں کوئی مجھے دھوکا دے جھوٹ بولے یا بے وقوف بنائے تو میں بالکل برداشت نہیں کرسکتی۔ محبت میری کمزوری ہے اور جس رشتے سے بھی محبت کی، زخم اور کانٹے ہی ملے۔ اب تو محبت سے بھی ڈر لگتا ہے۔ اس لیے اس مفاد پرست دنیا میں میری کوئی دوست نہیں۔ پاکیزہ، جلترنگ اور ناول...... اپنی مثال آپ ہیں۔ آنٹی انجم ہی کی وجہ سے میں پاکیزہ پڑھتی ہوں، گرمیوں کی لمبی دوپہریں اور سردیوں کی لمبی اداس راتیں مجھے مزید اداس کردیتی ہیں۔ صبر شکر سے تنہا وقت گزار رہی ہوں۔

از: زم زم، وہاڑی

www.paksociety.com

کوشش کی تو تمہارا مقدر صرف اور صرف موت ہوگی۔'' عباد کے چہرے سے نقاب کیا اترا تھا وہ تو سر تا پیر لرز کر رہ گئی تھی۔

''نہیں، میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔ میں وہ عباد کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنوں گی۔ میں باجی، آپا سب کو فون پر بتادوں گی۔ وہ مجھے ضرور واپس لے جائیں گی۔ میں عباد کے گھناؤنے کاروبار میں شریک نہیں ہوں گی، کبھی نہیں۔'' اس نے ایک عزم کے ساتھ اپنے آنسو پونچھے۔ ایک نظر عباد اور ساتھ کھڑے جان پر ڈالی اور قدم باہر کی طرف بڑھادیے۔ عباد اس کے پیچھے لپکا۔ سب دم سادھے تماشا دیکھ رہے تھے۔

''مجھے جانے دو عباد۔'' اس نے بے حد سرد لہجے میں کہا تھا اور جواباً عباد نے اسے بالوں سے پکڑ کر دو جھٹکے دیے۔ اس نے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی۔ عباد نے ایک اور تھپڑ جڑ دیا۔

''مجھے جانے دو!'' وہ چیخی تھی لیکن وہ اسے گھسیٹتا اُدھر ہی لے گیا جدھر جان اسے لے جانا چاہ رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتی رہی چیختی چلاتی رہی لیکن عباد پر قطعاً اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اتنا گھناؤنا ہوگا وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ عباد نے اسے اس قدر پیٹا تھا کہ اسے اپنے جسم کا ایک ایک حصہ ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ جانے کب تک روتی رہی۔ تڑپتی رہی باہر میوزک بجتا رہا۔ شور وغوغا پہلے آہستہ ہوا پھر کم ہوتے ہوتے خاموشی ہوگئی۔ شاید سب ہی نشے میں دھت ہو کر لڑھک گئے تھے۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر سے لاکڈ تھا۔ وہ یہاں سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اُن سب کے ہوش میں آنے سے پہلے اس نے ایک موہوم سی آس پر دروازے کو جھٹکے دیے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ واپس آکر پھر وہیں بیٹھ گئی۔ اتنی مار کھانے کے باوجود اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا، پھر کوشش کر کے اس نے پچھلی کھڑکی کھول لی اور باہر چھلانگ لگادی۔ وہ ایک تنگ گلی تھی۔ سردی انتہا کی اور وہ راستوں سے انجان۔ اس نے وہ بیڈشیٹ جو آتے ہوئے بیڈ پر سے کھینچی تھی اپنے گرد اچھی طرح لپیٹی۔ ہیل والے جوتے اتار کر پرے پھینکے اور دوڑ لگادی لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس خراب موسم میں وہ ننگے پاؤں زیادہ دیر بھاگ تو کیا چل بھی نہیں سکے گی۔ اس کے پاؤں شل ہونے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ نڈھال ہو کر گر سی گئی۔ برف باری شروع ہوگئی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر شیڈ تلاش کرنا چاہا لیکن دھندلاتے موسم میں اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ وہیں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی۔ برف گر رہی تھی۔ باہر بھی اور اس کے اندر بھی۔ اسے لگا اس کے آنسو بھی برف کے تودے بن کر اس کے دل پر گرنے لگے تھے اور پھر وہ کب ہوش وخرد سے بیگانہ ہوئی اسے یاد نہیں تھا۔ اس کی آنکھ ہاسپٹل میں کھلی تھی اور وہ آدمی پریشانی سے اسے تک رہا تھا۔

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ کے محسن، مہتر وہ سلوک آپ کے ساتھ کرتے ہیں جو آپ سوچ بھی نہیں سکتے اور کبھی کوئی انجان، غیر آپ کے زخموں پر پھاہا رکھنے آموجود ہوتا ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کے دل میں جینے کی خواہش بھی اتنی قوی نہیں تھی۔ عباد کے اس روپ نے اسے اندر تک توڑ کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

آنسوؤں کا ایک سمندر تھا جو اس کے اندر بہہ نکلا تھا۔ اس نے کلمہ کیا پڑھا تھا سر سے لے کر پیر تک دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ بے چینی، بے سکونی یک لخت جیسے ختم ہوگئی تھی۔ وہ عمار الحسن کے دونوں ہاتھ پکڑ کر رو رہا تھا۔ روئے چلا جا رہا تھا۔

''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' وہ بولتا اور زار زار رونے لگتا۔

کیسی جہالت بھری زندگی گزاری تھی اس نے اور کیا تھا وہ۔ جانور...... نہیں جانور بھی نہیں...... تمام چرند پرند بھی تو اس ربِ سبحان کی تسبیح پڑھتے ہیں اور وہ تو رب کے وجود سے بھی ناواقف تھا۔

''اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نورِ محمدیؐ پیدا کیا تھا اور اس نور نے کئی ہزار برس قدرتِ الٰہی سے اللہ کی عظمت اور بزرگی کا مشاہدہ کیا اور تسبیح وطواف میں مصروف رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس نور کو چار قسم میں کر کے ایک قسم سے عرش پیدا کیا، دوسری قسم سے قلم کو تیسری قسم سے بہشت کو، چوتھی قسم سے عالمِ ارواح اور ساری مخلوق کو تخلیق کیا اور ان چار میں سے چار قسم نکال کر تین قسموں سے عقل، شرم اور عشق پیدا کیا اور قسم اول سے عزیز ومکرم حضرت محمد ﷺ کو پیدا کیا اور فرمایا اللہ نے کہ اے محمد ﷺ اگر میں آپ کو نہ پیدا کرتا تو ہرگز نہ پیدا کرتا میں زمین وآسمان اور ساری مخلوق کو۔'' (واللہ اعلم بالصواب) عمار الحسن بولتے جاتے اور وہ سن سن کر ایک ایک لفظ دل میں اتارتا جاتا۔ اس کا اسلامی نام عمار الحسن نے عبدالرحمٰن تجویز کیا تھا۔

☆☆☆

''میں واپس نہیں جاسکتی، نہیں تو کوٹھے پر بٹھادی جاؤں گی۔'' اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ مریم نے سرد آہ بھر کر اسے دیکھا پھر اس کی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگیں۔

''عبدالرحمٰن کو کب سے جانتی ہو؟'' پلیٹ اس کے آگے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں اُن کو نہیں جانتی...... انہوں نے مجھے ہاسپٹل پہنچایا تھا۔ وہاں سے اپنے گھر اور پھر یہاں لے آئے۔ ہم دونوں میں کوئی بات چیت بھی نہیں ہوئی۔ وہ میری زبان نہیں سمجھتے اور میں اُن کی۔'' اس نے وضاحت سے کہا۔

''تم جانتی ہو قانوناً تم یہاں بھی نہیں رہ سکتی ہو۔ ابھی تمہیں شہریت نہیں ملی اور...... اب آگے مشکل ہے۔ میرا مطلب ہے جس رشتے سے تم یہاں آئی تھیں وہ ختم ہو چکا۔ پاسپورٹ تک نہیں ہے تمہارے پاس اور نہ ہی کوئی اور ڈاکومنٹس...... خود تمہارا سابقہ شوہر ہی تمہیں بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کرسکتا ہے۔'' مریم اس کے لیے حقیقتاً فکرمند ہو رہی تھیں۔ وہ رونے لگی۔

''میں نے تو سوچا تھا مجھے اس غلاظت بھری زندگی گزارنے سے نجات مل جائے گی۔ عباد کو پا کر مجھے ایک لمحے کے لیے بھی پچھلا خیال نہیں آیا۔ آپ یقین کریں گی، نیناں آپا نے مجھے اتنی گندگی میں بھی کیسے بچا بچا کر رکھا۔ اماں نے جنہیں ہم باجی کہتی ہیں اور وہ نانی ہیں ہماری، اسی لاکھ میں بیچا عباد کے ہاتھ مجھے اور اب وہ یہ قیمت وصول کرنا چاہتا ہے...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کروں؟'' اس کے رونے میں شدت آگئی۔

مریم اسے فقط حوصلہ ہی دے سکتی تھیں۔ کیونکہ وہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ زرمینے کے ساتھ کیا ہوسکتا تھا۔ عبدالرحمٰن اسے یہاں چھوڑ گیا تھا کیونکہ وہ اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے ریکوئسٹ کی تھی کہ اسے کچھ دن پناہ دے دی جائے پھر وہ اس کے بارے میں کچھ سوچے گا...... کیا؟ یہ وہ بھی نہیں جانتا تھا۔

اسے یہاں آئے دو ہفتے ہوگئے تھے۔ مریم نہ صرف اس کا خیال رکھ رہی تھیں بلکہ ہر ممکن اس کی دلجوئی میں بھی مصروف رہتی تھیں۔ عمار الحسن بھی اس کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتے تھے۔ پھر بھی اسے بے شمار سوچیں پریشان کیے رکھتی تھیں۔ اس روز عبدالرحمٰن آگیا...... جب سے وہ اسے یہاں چھوڑ کر گیا تھا عمار الحسن کے پاس سے ہو کر باہر سے ہی چلا جاتا تھا کبھی اندر نہیں آیا تھا۔ زرمینے نے خود سے پوچھنے کی

www.paksociety.com

کوشش نہیں کی تھی۔

’’میں عباد سے ملا ہوں۔‘‘ وہ کہنے لگا۔ زرمینے کچھ سمجھ نہ آنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ پھر اسے یاد آیا...... زرمینے کو سمجھ نہیں آرہی۔ وہ مریم کو بتانے لگا۔

’’تم عباد کو کیسے جانتے ہو؟‘‘ مریم نے پوچھا۔

’’وہ میرا دوست تھا۔‘‘ اس نے تھا پر خاصا زور دیا۔ ’’میں نے فرسٹ ٹائم زرمینے کو تب ہی دیکھا تھا جب وہ اس سے شادی کر کے پاکستان سے آیا تھا۔ وہ بہت چیپ انسان ہے۔ کہتا ہے اگر زرمینے دوسری شادی کرنے کے چکروں میں ہے تو وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گا کیونکہ وہ اس بات سے انکار کردے گا کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے۔‘‘ مریم پریشانی سے اس کی بات سنتی رہیں۔

’’کیا وہ جانتا ہے کہ زرمینے کہاں ہے؟‘‘ انہوں نے سوال کیا۔

’’نہیں...... لیکن اسے شک ہو چلا ہے کہ میں زرمینے کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہوں۔‘‘

’’اللہ اچھا کرے۔‘‘ مریم اتنا کہہ کر زرمینے کو سب بتانے لگیں۔ زرمینے کا چہرہ پیلا پڑنے لگا۔

’’میں کسی صورت اس کے پاس واپس نہیں جاؤں گی۔ وہ مجھے گناہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کردے گا۔‘‘ وہ پھر رونے لگی۔

’’اللہ پر بھروسا رکھو...... وہ ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا۔‘‘ مریم نے اسے گلے لگا کر تسلی دی تھی۔

☆☆☆

وہ آج کل اردو سیکھ رہا تھا، کیوں؟ یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا لیکن جہاں اس کی زندگی کے ہر پہلو کا دھارا مڑا تھا وہیں اسے احساس ہوا تھا کہ قرآن مجید کا جتنا مفصل ترجمہ اردو میں ہے شاید دوسری کسی زبان میں نہیں۔ وہ بہت جلد سیکھ گیا تھا پانچ وقت کی نماز...... قرآن مجید وہ عمارالحسن سے باقاعدگی سے پڑھنے لگا تھا۔ مشکل تھا ناممکن نہیں اور پھر جو لگن اس کے اندر آگ لگائے ہوئے تھی اس کے آگے سب رکاوٹیں ہیچ تھیں۔

’’اللہ کو پانا ہے تو اس کے محبوب ﷺ سے محبت کرو۔‘‘ عمارالحسن کہتے اور وہ محبت کی راہوں پر چل پڑتا۔ آپ ﷺ کو کیا پسند تھا کیا ناپسند...... ان کا رہن سہن، مشکلات، صبر و تحمل، ایک ایک عمل مثال، ایک ایک عمل مشعلِ راہ...... زندگی کا دھارا ہی بدل گیا تھا لیکن وہ بے چینی اب سکون میں ڈھل گئی تھی۔ جیسے تپتے صحرا میں چلتے چلتے یک لخت کوئی نخلستان آگیا تھا۔

اس روز وہ اردو کی کلاس لے کر لوٹا تو دروازے کے باہر ہی کرسٹی کو بیٹھا پایا...... وہ حیران ہوا۔ کرسٹی اسے شکوہ کرتی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

’’کیا تم نے چابی کھودی ہے؟‘‘ کرسٹی کو پیچھے آتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

’’یس...... آئی ہو لاسٹ ایوری تھنگ......‘‘ وہ بہت مایوسی سے بولی تھی۔ وہ خاموشی سے فریش ہونے واش روم میں گھس گیا۔ کرسٹی وہیں کھڑی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ شاید کچھ ایسا دیکھنا چاہ رہی تھی جس کو بنیاد بنا کر وہ ہیری کی طبیعت صاف کرسکے۔ وہ تولیے سے منہ پونچھتا باہر آیا۔

’’کافی لوگی؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’نو......‘‘ اس نے انکار کیا پھر چلتے ہوئے اس کے قریب آگئی۔ اتنے قریب کہ اسے الجھن ہونے لگی۔ وہ پیچھے ہٹا۔

’’میری بات سنو ہیری......‘‘ وہ اس کے رویے پر تڑپ ہی تو گئی۔ ’’تم مجھے کیوں اوائیڈ کررہے ہو۔ تم جانتے ہو میں تم سے کس قدر محبت کرتی ہوں۔‘‘ ہیری

نے ایک نگاہِ غلط انداز اس پر ڈالی۔

’’کرسٹی...... تمہیں یہ جان کر شاک لگے گا کہ میں اب ہیری نہیں عبدالرحمٰن ہوگیا ہوں۔‘‘ اس نے بہت آہستگی سے اسے بتایا تھا۔ کرسٹی چند لمحے اسے دیکھتی رہی جیسے خود پر قابو پانے کی کوشش کررہی ہو۔ پھر جیسے وہ کامیاب ہوگئی۔

’’کیوں ہیری......؟‘‘ اس کے لہجے میں بلا کا سکون تھا۔ عبدالرحمٰن کو اس کے رویے پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ تو اس سے چیخنے چلانے کی توقع کررہا تھا۔

’’میں خود نہیں جانتا کیوں؟‘‘ اس نے تولیا چیئر کی بیک پر پھیلایا اور اپنے لیے کافی بنانے لگا۔

’’تم نے بہت برا کیا ہیری...... بہت برا......‘‘ وہ اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ عبدالرحمٰن کو اس پر فقط ترس آیا تھا۔

☆☆☆

عباد زرمینے کا کھوج لگاتا عمارالحسن کے گھر پہنچ گیا تھا۔ عبدالرحمٰن نے سچ کہا تھا اسے شک ہوگیا تھا اس لیے پہلے تو اس نے اس کے گھر پر زرمینے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہاں ناکامی کے بعد اس نے ایک دن ہیری کا پیچھا کیا اور عمارالحسن کے گھر پہنچ گیا اور محض کنفرم کرنے کے لیے اس کے وہاں سے جانے کے بعد دروازے پر اس نے دستک دی تھی اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ عبدالرحمٰن کے جانے کے بعد وہ جو دروازہ بند کر کے مڑی تھی، دستک پر واپس آکر دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سامنے عبدالرحمٰن نہیں بلکہ عباد کھڑا ہوگا۔ اس کے تو جیسے بدن سے جان نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔

’’اوہ...... تو محترمہ یہاں ہیں۔‘‘ وہ بڑی خباثت سے مسکرایا تھا۔ اس نے فوراً دروازہ بند کرنا چاہا تھا لیکن اس نے ٹانگ اڑا دی اسی لمحے پیچھے سے مریم کی آواز سنائی دی تھی۔

’’مینا بیٹا! کہاں رہ گئی ہو، نماز کا وقت نکلا جارہا ہے۔‘‘ اور جواباً اس سے بولا بھی نہیں گیا...... وہ کانپتے وجود کے ساتھ کھڑی ایک ٹک عباد کو دیکھ رہی تھی۔

’’کون لایا تمہیں یہاں ... بیری ...؟‘‘ اب وہ خشمگیں نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

’’جھوٹ مت بکو......‘‘ وہ غرایا...... ’’میرے ساتھ چل رہی ہو یا......؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔

’’کون ہے مینا وہاں......؟‘‘ مریم نے پھر آواز لگائی تھی اور اب کہ اسے جیسے ہمت ملی۔

’’آ...... آ...... نٹی......‘‘ وہ پوری قوت سے چلائی تھی اور مریم جلدی سے سلام پھیر کر گھبرا کر باہر نکلیں۔

’’کیا ہوا؟‘‘ انہوں نے تھرتھر کانپتی زرمینے کو دونوں بازوؤں سے تھاما۔ اس نے اسی کیفیت میں ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ مریم اسے سہارا دے کر اندر لے آئیں، اسے پانی پلایا۔ وہ ابھی تک شدید خوف کی کیفیت میں تھی۔

’’وہ...... عباد......‘‘ اس نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔

’’کیا وہ یہاں پہنچ گیا......؟‘‘ مریم نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

’’ہاں...... اور اب وہ مجھے یہاں سے لے جائے گا۔ پلیز آنٹی...... میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اس نے...... اس نے مجھے تین بار طلاق دی ہے۔ وہ کسی صورت مجھے نہیں لے جاسکتا۔ آپ پلیز...... بابا جان سے کہیں وہ کچھ کریں۔ ان کے تو

www.paksociety.com

بڑے بڑے افسروں سے تعلقات ہیں۔ یونیورسٹی میں کسی سے بات کریں۔ کوئی تو حل ہوگا ناں اس ذلت بھری زندگی سے نکلنے کا...... پلیز آنٹی......'' وہ اُن کے آگے ہاتھ جوڑے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور مریم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کریں۔

☆☆☆

عبدالرحمٰن نے ہر ممکن کوشش کرلی لیکن عباد ٹس سے مس نہیں ہوا۔

''اسی نہیں ایک لاکھ پاؤنڈز یا زرمینے...... ویسے یار اتنی نایاب تو نہیں تھی وہ لڑکی...... اور میں کتنا پاگل، عشق میں اندھا ہوکر اتنی مہنگی بیوی خرید لایا لیکن اس میں کوئی شک نہیں، وہ ہے ہی لاکھوں میں ایک۔ کیا حسنِ بلاخیز ہے، اندھا کردینے والا۔ بائی دی وے تم اتنی منت کیوں کررہے ہو۔ کیا پسند آگئی ہے۔ یار...... اگر ایسی بات ہے تو رکھ لو دو چار دن، اب یاروں سے کیا حساب کتاب۔ آج تک میں نے تم سے کوئی حساب کتاب کیا ہے کیا۔ میری چیز تمہاری۔ تمہاری میری...... رکھ لو، جب دل بھر جائے مجھے فون کردینا میں آکر لے جاؤں گا۔'' اس نے خباثت کی انتہا کردی تھی لیکن عبدالرحمٰن بھی آج شاید ہر صورت اس قصے کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ اس نے کچھ سوچا پھر پیشکش کردی۔

''اگر میں زرمینے سے شادی کرنا چاہوں تو......؟''

''ہیں......'' وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ ''تم اس سے شادی کروگے...... مگر کیوں......؟

''میں اپنا سوال دُہراتا ہوں۔'' وہ اسی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''تو......'' اس نے شاطرانہ انداز میں نظریں گھمائی۔ ''تو زرمینے کو طلاق دینے کے ایک لاکھ پاؤنڈز...... میں اسے یہاں لایا، چھ مہینے اس کا خرچ اٹھایا وغیرہ وغیرہ...... تم خود حساب لگالو...... اب دیکھو نا جب میں نے زرمینے کی ماں سے اس کا رشتہ مانگا تو اس نے پوچھا تھا کیا دوگے...... اور میں نے بلینک چیک انہیں تھما دیا تھا۔ میری پچیس سالوں کی کمائی ایک لمحے میں اس نے بینک سے نکلوالی۔ دوبارہ اتنی رقم جمع کرنے میں مجھے پھر سے پچیس نہیں تو بیس سال تو لگیں گے ہی اور کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔'' وہ انتہائی بھونڈے پن سے ہنسا تھا۔

''مجھے تحریری طور پر طلاق نامے کے کاغذات، اس کا پاسپورٹ اور باقی سارے ڈاکومنٹس چاہئیں۔ ایک ہفتے بعد تمہیں رقم مل جائے گی۔ میرا انتظار کرنا اور اعتبار بھی......'' وہ کہہ کر باہر کی جانب بڑھا۔

''میں نے تمہیں بتایا ناں، اتنی زیادہ قیمت نہیں ہے اس طوائف زادی کی، وہ تو چند سکوں کے عوض......'' عباد نے پھر کہنا چاہا تھا۔

''بس......'' وہ پلٹ کر دہاڑا تھا۔ ''اس سے آگے کچھ نہیں۔ تمہیں تمہاری رقم مل جائے گی۔ تم کاغذات تیار کرواؤ۔'' اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ عباد کو اس سے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے جاتا دیکھنے لگا۔

پھر اس کا بینک ڈپازٹ، فلیٹ اور بار کو بیچ کر بھی مطلوبہ رقم حاصل نہیں ہوئی تھی۔

''تم نے سب کچھ بیچ دیا...... اب کروگے کیا اور رہوگے کہاں......؟'' عمار الحسن نے فکرمندی سے پوچھا تھا تو وہ مسکرادیا۔

''آپ خود ہی تو کہتے ہیں۔ اللہ سب کام بنانے والا ہے تو یقیناً اس نے میرے لیے کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا۔''

''بے شک اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔'' عمار الحسن نے سوچا تھا۔

''پورے ہوگئے پیسے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ہوجائیں گے۔ دس ہزار پاؤنڈز کم ہیں۔ میں نے ایک دوست سے بات کی ہے......'' اس نے دھیمے سے جواب دیا۔ کیونکہ اسے کوئی خاص توقع نہیں تھی۔ سب جان گئے تھے کہ اس نے اپنا بار اور فلیٹ بیچ دیا ہے اور کچھ لوگوں تک اس کے مسلمان ہونے کی بھی خبر پہنچ چکی تھی۔

کرسٹی ایسی دوست تھی جو اسے پوری رقم بھی دے سکتی تھی لیکن وہ اس کے پاس جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے عزائم جارحانہ تھے، اس کا اظہار وہ اس کے سامنے کر بھی چکی تھی۔ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ اس نے عمار الحسن سے اجازت چاہی تبھی انہوں نے ایک چیک اس کی طرف بڑھایا۔ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''بقیہ رقم ہے، کچھ حصہ مجھے بھی اس کارِ خیر میں ڈالنے دو۔'' انہوں نے کہا تو اس نے چیک تھام لیا۔

''بے شک اللہ بہت بڑا کارساز ہے۔'' اس کا دل جھوم اٹھا۔

☆☆☆

اس نے چھ ماہ میں عربی اور اردو کے کورسز کرلیے تھے، وہ اب بڑی روانی سے اردو بولنے لگا تھا اور عربی بھی سمجھنے لگا تھا۔ صرف پہلے دو سپارے عمار الحسن نے اسے پڑھائے تھے باقی وہ خود سے پڑھنے لگا تھا۔ پھر تقریباً نو ماہ میں اس نے قرآن پاک بھی ختم کرلیا۔ اس نے ترجمہ بھی ساتھ ہی پڑھا تھا۔ اور اب عمار الحسن اسے تفسیر کی تعلیم دے رہے تھے۔ وہ ایک ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا اور وہیں پر ہی چند لڑکوں کو وہ ٹیوشن دینے لگا تھا۔

شام کو ایک پیٹرول پمپ پر چلا جاتا۔ کچھ رقم وہاں سے بھی مل جاتی۔ سو گزر بسر خوب ہونے لگی تھی۔ زرمینے کے تمام کاغذات بھی مل گئے تھے اور عمار الحسن اسے قرآن پاک کی تعلیمات بھی دینے لگے تھے۔ زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی تھی۔ کرسٹی نے بہت شور مچایا تھا پھر منت سماجت پر اتر آئی تھی۔

''تم لوٹ چلو ہیری...... اس دنیا میں بہت کچھ ہے۔ دولت، محبت، اسٹیٹس، کیا غریبوں والی زندگی گزار رہے ہو۔''

''اس زندگی میں سب کچھ ہے۔'' وہ مسکرایا تھا۔ ''اطمینان، سکون، اور یہ امید کہ میں اس نبی ﷺ کا امتی ہوگیا ہوں اور وہ مجھے بخشوالیں گے۔''

''یہ جو بھی تم بول رہے ہو...... اصل میں تمہارا علاج کسی سائیکاٹرسٹ سے ہونا ضروری ہوگیا ہے اور یہ تم کیا کہہ رہے ہو...... کیا ہم ــــ نبی ﷺ کو نہیں مانتے۔ یسوع مسیح ہمارے باپ ہیں، ہمارے لیے وہ صلیب پر چڑھ گئے...... اور......'' عبدالرحمٰن نے بات کاٹ دی۔

''میں اس بحث میں نہیں پڑتا...... بے شک وہ بھی نبی ہیں اور ایمان کا ایک جزو سب نبیوں پر ایمان لانا ہے۔ لیکن تکمیل تو حضرت محمد ﷺ پر ہوتی ہے اور بخشش بھی انہی کے وسیلے سے ہوگی۔ کرسٹی سوچو...... یہ ساری کائنات، اس کی ایک ایک چیز بنی ہی اس لیے ہے کہ وہ سوہنا نبی ﷺ اس دنیا میں آنا تھا۔ میرا خیال ہے تم خوا مخواہ مجھ پر اپنا ٹائم ویسٹ کررہی ہو...... تم اپنی زندگی انجوائے کرو...... میں کیا ہوں...... کیسا ہوں...... یہ سوچنا چھوڑ دو...... بلکہ میرا خیال تک اپنی زندگی سے اپنے ذہن سے نکال دو۔ میں جن راستوں کا مسافر ہوا ہوں وہ تم تک یا کسی بھی اور عورت تک نہیں آتا۔ میری منزل کچھ اور ہے۔ میرا مقصود کچھ اور ہے۔ اور......''

''کیا وہ لڑکی...... وہ جس کو تم نے اپنا سب کچھ بیچ کر بچایا ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر تلخی سے گویا ہوئی تھی۔

www.Paksociety.com

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

''نہیں، وہ محض انسانیت تھی۔'' وہ پُرسکون تھا۔

''اونہہ انسانیت...... میں دیکھتی ہوں یہ ڈھونگ کب تک چلے گا تمہارا......'' وہ غصے سے پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میرا رب جانتا ہے کہ یہ ڈھونگ نہیں یہ سچ ہے۔ اے میرے اللہ! مجھے ہمت دینا میں اُس رستے پر ثابت قدمی سے چل سکوں۔ کوئی شیطانی طاقت، نفسانی خواہش مجھے اس راستے سے بھٹکا نہ سکے۔'' وہ دعا مانگتا رہا اور روتا رہا۔

☆☆☆

عمارالحسن نے اسے مریم سے نکاح کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

''اسے ایک پناہ گاہ میسر آ جائے گی اور تمہیں ایک اچھی رفیق......'' انہوں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا لیکن اس نے سہولت سے منع کر دیا۔ شادی اس کی منزل نہیں تھی۔ اس کی طلب کچھ اور تھی۔

''سوچ لینا بیٹا...... وہ بے سہارا ہے اور مجھے امید ہے تم اس کے لیے بہتر سہارا ثابت ہو گے۔'' انہوں نے ایک بار پھر کہا تھا لیکن وہ انہیں کسی جھوٹی امید میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے بارے میں یا اپنے کل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ فی الوقت تو اسے ایک ہی طلب تھی اور وہ اسی طلب کو پانا چاہتا تھا۔ وہ ان گلیوں کی خاک کو چومنا چاہتا تھا جہاں کبھی وہ مبارک قدم اترے تھے۔ وہ ان فضاؤں کی پاکیزگی کو اپنے اندر اتارنا چاہتا تھا جن میں نبی کریم ﷺ کی سانسوں کی مہک ابھی بھی باقی تھی۔ وہ وہاں کی ایک ایک شے کو چومنا چاہتا تھا۔

''محبوب کو پانا ہو تو اس کے محبوب سے محبت کرو۔ محبوب مل جائے گا۔'' اس نے کہیں پڑھا تھا اور وہ اسی فارمولے پر عمل پیرا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا اس نے جس ذاتِ بابرکات کا دامن تھاما ہے وہ اسے اس کے محبوب سے ملوا دے گی۔ اس کی خوشنودی دلوا دے گی۔ وہ مقرب ہو جائے گا۔

''میں مدینہ جانا چاہتا ہوں۔'' اس روز اس نے عمارالحسن سے کہا تھا.. اور انہوں نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن کی صرف آنکھیں ہی نہیں پورا چہرہ لو دینے لگا تھا۔

''جس کو وہ سرکارِ مدینہ ﷺ منظوری دیں۔'' انہوں نے جواب میں صرف اتنا کہا اور عبدالرحمٰن منظوری کا انتظار کرنے لگا اور پھر یہ منظوری ہو گئی۔ اس کا سارا وجود لرز رہا تھا جب اس نے یہ خوش خبری عمارالحسن کو سنائی تھی اور وہ بھی حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

پھر عبدالرحمٰن کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ کئی سال گزر گئے۔ شروع شروع میں وہ فون کرتا تھا پھر وقفے آنے لگے۔ وہ یہی کہتا تھا۔ ''میں واپس نہیں آؤں گا۔ میں یہ مٹی چھوڑ کر کیسے آ جاؤں سر۔'' اس کے لہجے میں اتنی عقیدت اور احترام ہوتا کہ بعض اوقات عمارالحسن بھی کانپ جاتے۔ وہ نومسلم ہو کر ان سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ محبت تو وہ بھی کرتے تھے لیکن عبدالرحمٰن کی محبت عشق میں ڈھل گئی تھی۔ زرمینے کا نکاح انہوں نے تین سال قبل اپنے بھتیجے سے کر دیا تھا اور وہ اس کو لے کر شارجہ چلا گیا تھا۔ وہ وہاں خوش تھی۔

''بے شک نیک مردوں کے لیے ہی نیک بیبیاں ہیں۔'' عمارالحسن نے فواد سے کچھ نہیں چھپایا تھا اور اس نے خوش دلی سے زرمینے کا ہاتھ تھاما تھا۔ زرمینے وقتاً فوقتاً انہیں فون کرتی رہتی تھی۔ مریم اور عمارالحسن اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے کہ وہ اپنے فرض سے سبک دوش ہوئے عمارالحسن کی پوری کوشش کے باوجود مریم کا گھر دوبارہ نہیں بس سکا تھا۔ اور وہ جو اِن دنوں نئے نئے یہاں سٹیلڈ ہو رہے تھے بہت پہلے انہوں نے یہاں کی مشہور یونیورسٹی میں اپلائی کیا

www.Paksociety.com

تھا اور انہیں انٹرویو کال آگئی تھی اور پھر وہ سلیکٹ ہوگئے تھے لیکن بیمار بیوی کو چھوڑ کر وہ یہاں نہیں آسکتے تھے اس لیے وہ سال میں چار بار یہاں لیکچر دینے آتے تھے۔ پھر ان کی بیوی کی اچانک وفات ہوئی تو مریم کی شادی اس کے ماموں زاد سے کر کے وہ ہمیشہ کے لیے یہاں آگئے لیکن مریم کا گھر نہیں بس سکا تھا۔ سجاد نہ صرف آوارہ منش بلکہ شرابی بھی تھا اور یہ بات انہیں پہلے معلوم نہ ہوسکی تھی۔ مریم جیسی نیک اور دیندار عورت نے اپنی بھرپور کوشش کی لیکن قسمت میں نہیں تھا۔ سجاد نے انہیں طلاق دے دی اور یوں کچھ عرصے وہ اپنی خالہ کے پاس گزار کر عمار الحسن کے پاس آگئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ عمار الحسن نے بہتیری کوشش کی تھی کہ وہ دوبارہ شادی کرلیں لیکن انہوں نے انکار کردیا تھا۔

''ایک تجربہ کافی ہے بابا جان۔'' انہوں نے باپ کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ پھر جب ہیری نے ان کے پاس آنا شروع کیا تو وہ اسے بیٹوں کی طرح چاہنے لگیں۔ اور پھر عمار الحسن کی تربیت نے اسے سیدھے راستے پر لا کھڑا کیا۔ وہ ہمیشہ اس کے ثابت قدم رہنے کی دعا کیا کرتی تھیں۔ اور اب اتنا عرصہ گزر گیا تھا اس کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ عمار الحسن اب لاغر ہوگئے تھے بڑھاپے نے ان پر چڑھائی کردی تھی۔ بینائی بھی کم ہوگئی تھی۔ خود مریم کو جوڑوں کے درد نے آگھیرا تھا۔ وہ تو کسی سے عبدالرحمٰن کا پتا بھی نہیں کرواسکتے تھے کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ بھی ان دونوں کی گفتگو میں عبدالرحمٰن اور زرمینے کے ذکر میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی انہیں اسی طرح یاد کرتے تھے۔

پھر ایک دن عمار الحسن کے نام ایک چٹھی آئی۔ ان کے دل نے کہا ہو نہ ہو یہ عبدالرحمٰن کی ہی چٹھی ہے اور ایسا ہی تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

''میرے عظیم محسن......!

السلام علیکم!

آپ بھی حیران ہوں گے کہ میں کس قدر احسان فراموش نکلا کہ پلٹ کر آپ کو یاد بھی نہیں کیا۔ ایسی بات نہیں، میں نے آپ کو پل پل یاد کیا اور جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے آپ ان دعاؤں میں ضرور شامل ہوئے۔ میرے محسن! میری زندگی ایک بے آب وگیاہ صحرا تھی اور میں گناہوں کی دلدل میں اس قدر غرق تھا کہ بچ پانے کی کوئی امید نہیں تھی۔ میری زندگی بار، جوا خانہ اور عورتوں کے گرد گھومتی تھی۔ میں جانتا ہی نہیں تھا کہ گناہ اور ثواب کیا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایک تو میں نے آج تک اپنے جنم دینے والوں کو نہیں دیکھا۔ ایک میٹرنٹی ہوم میں جانے کون مجھے چھوڑ گیا۔ ہمارے معاشرے میں جائز اور ناجائز کا تصور نہیں تھا۔ مادر پدر آزاد معاشرے میں تو شادیاں ہوتی ہی انڈراسٹینڈنگ کے بعد ہیں اور اس دوران پیدا ہونے والے بچے ناجائز نہیں کہلاتے اور پیرنٹس ان کو اون کرتے ہیں۔ پھر جانے کون کس خوف کے تحت مجھے وہاں چھوڑ گیا۔ کیسے پلا بڑھا یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال میں ایک سیلف میڈ انسان تھا۔ پھر ایک دن ایک عجیب حال شخص میرے بار میں آیا۔ وہ سر سے لے کر پیر تک عجیب حالت میں تھا۔ سر کے بال الجھے، لمبا مگر صاف ستھرا چوغہ، سفید گورا رنگ اور ہلکی ہلکی داڑھی میں اسے کوئی ہپی سمجھا۔ وہ ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا اور بیئر کا آرڈر دیا۔ میرے بار میں سب ویٹرس تھیں اور انتہائی خوب صورت...... جینی نے اسے سروس دی۔ اس نے ایک گلاس بھرا...... اور اپنے سامنے رکھ لیا۔ پھر اس پر نظر جما کر بیٹھ گیا۔ میں غیر ارادی طور پر اسے دیکھنے لگا۔ میرے خیال سے تو اس نے پوری بوتل ختم کرکے اٹھنا تھا لیکن وہ اسی ایک گلاس کو سامنے رکھے اس پر نظریں جمائے بیٹھا رہا پھر اٹھا اور گلاس کو سنک میں انڈیل دیا۔ واپس آکر اس نے دوبارہ گلاس بھرا پھر ویسے ہی بیٹھ گیا۔ اس نے کئی بار ایسا کیا۔ یہاں تک کہ بوتل خالی ہوگئی۔ اس نے پے منٹ کی اور اٹھ کر چلا گیا۔ پھر ایسا روز ہونے لگا۔ مجھے اس آدمی میں کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ پھر ایک دن میں اس کے پاس جا بیٹھا اور اس کے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی۔ وہ کچھ نہیں بولا اپنے کام میں منہمک رہا۔ مجھے تجسس نے آن گھیرا اور پھر ایک دن میں نے اسے بولنے پر مجبور کردیا۔

''تمہیں سمجھ نہیں آئے گی یہ بات۔'' اس نے کہا۔ ''یہ اللہ اور شیطان کا معاملہ ہے۔''

''اللہ! یو مین گاڈ......؟'' میں نے ''اللہ'' پہلی دفعہ سنا تھا۔ اس نے انگلش میں گفتگو کرنے کے باوجود ''اللہ'' بولا تھا۔

''نو...... گاڈ نہیں ''اللہ''۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میں آج کل کرائسس میں ہوں۔ میرا کاروبار ڈوب گیا۔ قرض خواہوں نے میری جان عذاب کردی...... اور ایسے میں میرے اندر کے شیطان نے مجھے بغاوت پر اکسا دیا ہے......! بولتا ہے تم جو اتنی نمازیں پڑھتے ہو، زکوٰۃ دیتے ہو، صدقات دیتے ہو، اس کے باوجود تمہارے رب نے تمہاری پروا نہیں کی تمہیں رنج والم میں مبتلا کردیا۔ چلو میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ایک دوسری دنیا میں لے چلتا ہوں جہاں یہ سب رنج والم نہیں ہوں گے۔ شیطان میرا بازو پکڑ کر یہاں لے آیا۔ میں نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن شیطان کے بہلاوے دلفریب تھے۔ میں نے جیسے ہی جام بھرا اور اس کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے دیکھا میرے سینے کے بائیں طرف میرا اللہ تھا۔ میرا وجود لرز گیا۔ میری ہمت نہیں پڑی کہ وہ جام اٹھا کر لبوں سے لگالوں......'' اب، وہ رکا۔ اس نے جام اٹھایا اور سنک میں انڈیل دیا۔

''اب شیطان میرے سامنے بیٹھتا ہے۔ میرے دل میں وسوسے ڈالتا ہے لیکن جب جام میرے ہونٹوں کے بجائے سنک کو چھوتا ہے تو اسے تکلیف ہوتی ہے۔ وہ رو رو کر مجھے میرے مصائب کے بارے میں بتاتا ہے۔ میری تکلیفوں کو دہراتا ہے اور ایسا وہ بوتل ختم ہونے تک کرتا رہتا ہے۔ لیکن میرا اللہ ہر روز مجھے بچالیتا ہے اور اس بات کی اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور میں محض شیطان کو تکلیف دینے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔''

''تو تم مت آیا کرو یہاں...... اگر ایسی بات ہے۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ وہ ہنسنے لگا۔

''جس تن لگیا عشق کمال۔ تم نہیں سمجھو گے...... تیرے عشق نچایا کرتھیا تھیا......'' وہ اٹھ کر گول گول گھومنے لگا تب مجھے اس کی بات کی سمجھ نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ جب وہ شراب پینا چاہتا ہے تو اللہ اس کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ میں سمجھا ''اللہ'' اور ''گاڈ'' دو مختلف ہیئت ہیں کیونکہ اس نے بھی یہی کہا تھا ''گاڈ'' نہیں ''اللہ'' اس روز میں نے چلتے پھرتے بے خودی میں کئی بار لفظ ''اللہ'' دہرایا...... اور ہر بار مجھے اپنے اندر عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی۔ اگلے کئی روز تک وہ نہیں آیا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ حتیٰ کہ مہینے بیت گئے۔ میرے اندر کی بے چینی میں اضافہ ہوتا رہا۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے ''اللہ'' اور ''گاڈ'' کا فرق معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا ''گاڈ'' وزیبل ہے۔ مختلف شکلوں، مختلف صورتوں میں ہمیں کہیں نہ کہیں نظر آہی جاتا ہے۔ لیکن اللہ کیسا ہے؟ کیا وہ دکھتا ہے؟ دکھتا ہے تو کیسا؟ وہ بولتا ہے تو کیا؟ میں جیسے جیسے سوچتا جاتا...... میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جاتی...... اور میں پاگل ہونے لگتا...... مجھے برے کاموں سے الجھن ہونے لگی۔ میں زیادہ وقت تنہائی میں گزارنے لگا لیکن مجھے میرے سوالوں کا جواب کہیں نہ مل سکا۔

www.paksociety.com

پھر ایک دن وہ آ گیا۔ میں اب بار بھی کبھی کبھی جاتا تھا۔ اس روز بھی میرا جانے کا موڈ نہیں تھا کہ بار سے فون آ گیا۔ کوئی کسٹمر مجھ سے ملنے پر بضد تھا۔ میرے دل نے گواہی دی۔ یہ وہی ہے میں بھاگم بھاگ بار پہنچا۔ وہ اپنی مخصوص ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ کاؤنٹر بوائے نے میری سوالیہ نگاہوں کے جواب میں اس طرف ہی اشارہ کیا۔ میں جیسے ہی کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھنے لگا اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر کڑک کر بولا۔

"ملا جواب......؟" پھر خود ہی بولا۔ "نہیں ناں......" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

میرا وجود لرزنے لگا۔ جانے کیوں ایک عجیب سا خوف مجھ پر طاری ہو گیا۔

"بے وقوف! باہر کہاں ٹکریں مارتا پھرتا ہے۔ اپنے اندر جھانک...... ٹٹول کر دیکھ...... تجھے اللہ ہی اللہ نظر آئے گا۔ تو ڈھونڈ تو سہی...... تیرے روم روم میں نہ بسا ہو تو کہنا...... ڈھونڈ...... یہاں ڈھونڈ......"

اس نے میرے سینے پر ہاتھ مارا...... میرا سارا وجود لرزنے لگا۔ یہاں ملے گا تجھے اللہ...... بس دیکھنے والی نظر لا...... پھر دیکھ تیری دنیا کیسے بدلے گی۔" اور میں اس تلاش میں نکل پڑا۔ میں نے کتابیں پڑھیں۔ مسجدوں میں گیا...... بہت سارے مسلمز سے بھی ملا لیکن میرے اندر سے اٹھتے سوالوں کا جواب کہیں نہ ملا پھر آپ سے ملاقات ہوئی اور ایک دن میں مسلمان ہو گیا لیکن پھر میرے دل میں یہ سوال پیدا ہونے لگا۔ کیا صرف کلمہ پڑھنے سے انسان مسلمان ہو جاتا ہے؟ نہیں! بہت سارے کلمہ گو ایسے ہیں، جن کے اندر کی سیاہی جوں کی توں ہے۔ وہ سجدے تو کرتے ہیں لیکن دکھاوے کے لیے...... وہ قرآن تو پڑھتے ہیں لیکن عمل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے سے کم علم والوں پر رعب ڈالنے کے لیے...... انہیں ڈرانے کے لیے۔ وہ صرف لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ اللہ کے عذاب سے، جہنم کی آگ سے، بچھوؤں سے، سانپوں سے، آگ کے گرزوں سے۔ انہوں نے رب تعالیٰ کو قہار و جبار بنا کر پیش کیا ہے جبکہ وہ تو رحیم و کریم ہے اور سب سے بڑھ کر رحمٰن ہے۔

"تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

کوئی جنت کی بات نہیں بتلاتا، کوئی مبشر نہیں، سب منذرین ہیں۔ کوئی نہیں، وہ کس قدر مہربان ہے۔ میں شکر گزار ہوں اس آدمی کا کہ جس نے میرے دل میں اللہ کا خیال ڈالا۔ میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ کی بدولت میں اس عظیم ترین مذہب میں داخل ہوا۔ اور رسول کریم ﷺ کی کفالت میں آ گیا۔ میں نے اللہ سے محبت اس سے ڈر کر نہیں کی۔ اس کی بے شمار رحمتوں اور نعمتوں کے عوض ایک شکرانہ دیا ہے۔ میں نے محبوب سے محبت کر کے محبت تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈا ہے۔ میں یہاں مدینۂ منورہ میں ہوں۔ معطر فضاؤں میں سانس لیتا ہوں۔ خاکِ مدینہ کو چومتا ہوں اور اس سعادت پر خوش ہوں کہ مجھے اللہ نے اس گھر کی صفائی کے لیے چن لیا ہے۔ میں جتنی بار یہاں صفائی کرتا ہوں مجھے اپنے قلب سے اپنے وجود سے گناہوں، غفلت اور گمراہی کی گرد چھٹتی محسوس ہوتی ہے۔ میرے لیے دعا کریں کہ میرا خاتمہ بالایمان ہو"

فقط عبدالرحمٰن۔"

عمار الحسن نے خط پڑھ کر تہ کیا تو ان کی آنکھوں سے سیلِ رواں جاری تھا۔ انہیں عبدالرحمٰن پر رشک آ رہا تھا۔ وہ تمام عمر اس مقام پر نہیں پہنچ سکے تھے جہاں عبدالرحمٰن چند سالوں میں پہنچ گیا تھا۔ بے شک وہ جسے چاہے عزت دے۔ عبدالرحمٰن کا عشق پختہ تھا۔ انہوں نے اپنا آپ ٹٹولا...... ان کے عشق میں ابھی تک دنیاداری تھی۔ وہ اٹھے اور وضو کر کے جانماز پر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ذہن میں ایک ہی دعا تھی۔ یا الٰہی! میرے ہر وضو کے ساتھ میرے اندر کی سیاہی بھی دھو دے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے بیگانے

سعدیہ رئیس

وہ ایک گہری اور پُرسکون نیند لے کر بیدار ہوئی تو ذہن بے حد ہلکا پھلکا سا محسوس ہوا مگر جب کمرے سے باہر نکلی تو ماما اور ڈیڈی کی آوازوں پر ٹھٹک گئی۔ شدید کوفت اور بیزاری نے اس کے اعصاب پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ آج پھر اس کی ذات ان دونوں کے درمیان موضوعِ گفتگو بنی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہی اسے بہت چاہتے تھے بچپن سے آج تک جب وہ شباب کی سرحدوں پر آ پہنچی تھی ان دونوں نے اسے

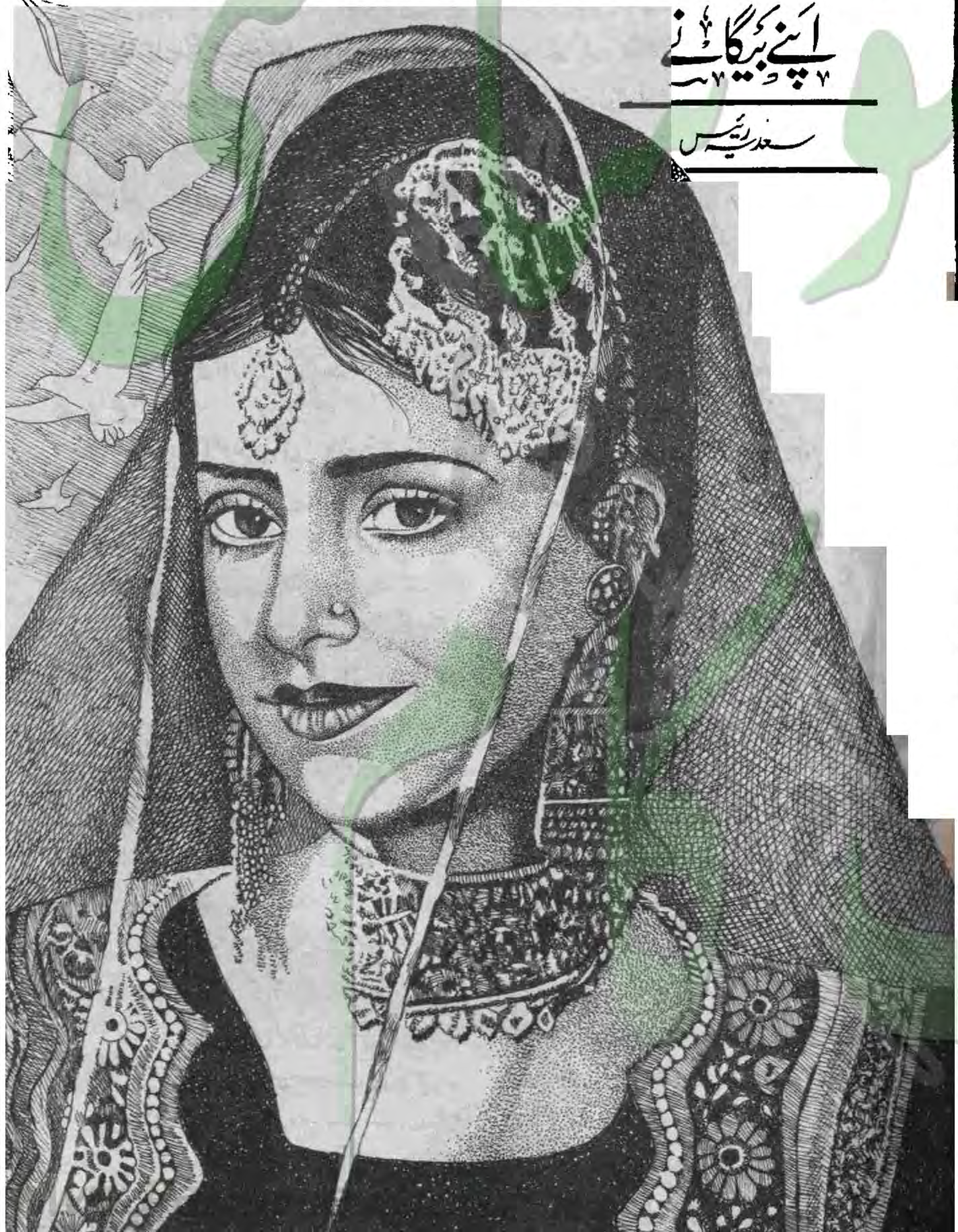

ہتھیلی کا چھالا بنا کر بہت لاڈ پیار سے اس کی پرورش کی تھی، وہ ان دونوں کی خوشیوں اور راحتوں کا سبب تھی مگر اب زندگی کے اس موڑ پر اپنی ذات کے اور اک نے اسے باشعور کر دیا تھا اور وہ ان دونوں کے لیے بحث و تکرار کا سبب بن گئی تھی۔ اس کی وجہ سے اس کے اتنے پیارے والدین ایک دوسرے سے الجھنے لگے تھے اور یہ بات اس کے لیے حد درجہ باعثِ تکلیف تھی۔

شاید ان دونوں کو ہی اس کے دکھ کا احساس نہ تھا اور نہ ہی وہ دونوں اس وقت وہاں اس کی آمد سے باخبر تھے سو خوب شد و مد سے کھل کر ایک دوسرے کی بات کو رد کر رہے تھے اور اپنی اپنی بات منوانے پر تلے ہوئے تھے۔

''بس میں نے کہہ دیا اس بار قرینہ کے لیے جو بھی معقول رشتہ آئے گا میں اسے اوکے کر دوں گی۔'' ساحرہ جلال نے پورے جلال کے ساتھ اپنے فیصلے اور ارادے سے جلال صاحب کو آگاہ کیا۔

''اونہہ...... میری نظر میں وہ رشتہ بالکل بھی معقول نہیں ہوتا جس میں آپ کو چاند تارے اور ہیرے موتی ٹکے نظر آتے ہیں۔ آپ کا بس چلے تو اس کا ہاتھ کسی بھی اوتگے بوتگے کو تھما کر چلتا کریں۔ آخر قرینہ سے کیا دشمنی ہے آپ کو۔'' جلال صاحب کی بات پر ساحرہ جلال کے تو پتنگے ہی لگ گئے انہوں نے ڈائریکٹ ان کی ممتا پر حملہ کیا تھا اور ان کی محبت کو مشکوک بنا دیا تھا۔ وہ قرینہ کی ماں تھیں اور ماں سے زیادہ محبت اولاد سے کوئی بھی نہیں کرتا۔

''دشمنی...... میں دشمنی کروں گی اپنی جان سے پیاری بیٹی سے...... مجھے تو آپ غلط لگ رہے ہیں۔ بلاوجہ کے اعتراضات کر کے اس کو گھر بٹھا...... رکھا ہے۔ آپ کی انہی باتوں کی وجہ سے وہ چھبیس کی ہوگئی ہے اور آپ ہیں کہ اپنی ہی پخ لگا رکھی ہے۔ آسمان سے کوئی شہزادہ اتر کر آئے گا جیسے اس کے لیے۔'' وہ بھڑک کر بولیں۔

''آسمان کا نہیں زمین کا شہزادہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔ تم خوامخواہ جلد بازی نہ کرو، صبر اور سکون سے انتظار کرو۔ چھبیس سال کی عمر کوئی اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تم اس کی فکر میں ہلکان ہو۔'' وہ بڑے سکون سے بولے۔

''اس عمر میں، میں دو بچوں کی ماں بن چکی تھی جناب۔ جانے کس دنیا میں گم ہیں آپ۔ سنجیدگی سے بات کو لے ہی نہیں رہے۔ فیصل کا رشتہ اتنا اچھا رشتہ تھا مگر آپ کو اس میں بھی کیڑے نظر آنے لگے۔ اب ہر خوبی تو ایک فرد میں ملنا مشکل ہے۔ آپ کو اپنا خیال بدلنا ہی ہوگا۔'' وہ بدستور ان پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔

''بیگم میری پہلی ترجیح آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہے...... تعلیم یافتہ لڑکا چاہیے مجھے اور خاندان میں بدقسمتی سے زیادہ تر لڑکے ادھوری تعلیم چھوڑ کر کاروبار کرنے میں لگ گئے۔ جو ایجوکیٹڈ ہیں وہ باہر نکل گئے اور وہ فیصل (...... وہ تو مڈل پاس بھی نہیں ہے۔'' وہ ہنوز اسی اٹل انداز میں بولے جیسے ساحرہ جلال کی بات کا ان پر رتی بھر بھی اثر نہ ہوا ہو۔ وہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں ان کو دیکھتی رہیں۔ کئی سالوں سے وہ ان سے سر پھوڑ رہی تھیں مگر قرینہ کے معاملے میں وہ کچھ نہیں سن رہے تھے۔ ان کے خیالات بدلنے سے وہ قاصر تھیں مگر پھر بھی چند دن بعد ان کو لے کر بیٹھ جاتی تھیں، ہر بار نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اور اب بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کے کٹھور پن سے زیادہ ان کو بیٹی کی نکلتی عمر کا صدمہ پریشان کیے ہوئے تھا۔ اتنی دعاؤں کے باوجود بھی جلال صاحب کے معیار کا رشتہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ مایوسی کی انتہاؤں پر پہنچی جا رہی تھیں کیونکہ انہیں نظر آ رہا تھا کہ جلال صاحب اپنے فیصلے اور خیالات سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے

تھے۔

''تو ایک اسی وجہ سے آپ اسے اسی دہلیز پر بٹھا کر بوڑھا کر دیں گے۔'' دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے بڑے بے رحم الفاظ میں ان کے جذبات کو جھنجوڑنے کی کوشش کی۔

''کیسی جاہلوں والی باتیں کر رہی ہیں آپ......''

ان کی سنگین بات پر جلال صاحب گرم ہوگئے۔ دونوں میں گرما گرمی شروع ہوگئی۔ قرینہ چپکے سے واپس کمرے میں پلٹ آئی۔ ان دونوں کی آپس کی لڑائی میں اس کا دل برا ہو جاتا تھا۔ کمرے میں آ کر ایک عجیب سی پژمردگی اس پر طاری ہوگئی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو دیکھنے لگی۔ بے حد گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک اور کٹاؤ دار ہونٹ...... کوئی کمی نہیں تھی اس میں...... ہاں بس ان دونوں کی باتوں سے امیدوں کے دیئے بجھتے جا رہے تھے۔

ان دونوں کی آپس کی تکرار سے وہ بہت پریشان رہنے لگی تھی ورنہ اپنی زندگی میں وہ بہت پُرسکون اور مطمئن تھی اور بڑے سبھاؤ سے اپنی زندگی کے ہم سفر کی منتظر تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور اس کا ہم سفر وقت آنے پر خود ہی اس کے سامنے آ جائے گا۔

☆☆☆

پھر یہی ہوا کہ وقت آنے پر اس کی خوش بختی کے دروازے خود بخود کھل گئے۔ جاذب کا رشتہ چھان بین کے بعد جلال صاحب نے اوکے کر دیا مگر اس بار ساحرہ جلال پس و پیش کرنے لگیں۔ حالانکہ لڑکا اچھا تھا...... اس کی جاب بھی پُرکشش تھی، ایجوکیٹڈ، ہینڈسم اور ہر لحاظ سے موزوں تھا مگر ساحرہ جلال رضامند نہ تھیں۔ خود قرینہ بھی کچھ اپ سیٹ اور خوفزدہ سی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ رشتہ خاندان سے ہٹ کر تھا۔ لوگ دیکھے بھالے اور جانے بوجھے نہ تھے۔ چند ایک رشتے دار خواتین نے قرینہ اور ساحرہ جلال کو کچھ اور بھی ڈرا دیا تھا۔

''دیکھو بھئی...... یہ جو دور جا رہا ہے نا...... بڑا خراب جا رہا ہے، دھوکا دہی کا زمانہ ہے یہ...... ذرا دیکھ بھال کر رشتہ جوڑنا...... معاملہ بیٹی کا ہے کہیں ایسا نہ...... ہو کہ بعد میں پچھتاؤ۔'' ساحرہ جلال نے اپنے طور پر ہر قسم کی چھان بین کر ڈالی مگر دل خوفزدہ تھا۔ بالکل انجانے اجنبی لوگوں میں بیٹی دیتے وہ ہچکچا رہی تھیں۔

''ارے بھئی اب اور کتنا چھانو گی...... دیکھو جتنا چھانو اتنا ہی کرکرا ہوتا ہے۔ آخر کیا قباحت ہے اس رشتے کو قبول کرنے میں...... ہیرا لڑکا ہے جاذب اور

غزل

کچھ تو کہیے آپ نے تو کچھ بھی فرمایا نہیں
یہ ستم کیا کم ہے کہ کوئی ستم ڈھایا نہیں
آندھیوں کے رقص میں بارش کی دُھن ایسی بجی
چشمِ تر میں موجزن دریا نظر آیا نہیں
اے میرے قاتل ہوں تیری تیزیِ خنجر سے خوش
وہ مہارت پائی ہے تو نے کہ تڑپایا نہیں
وہ تو وفا شعار ہے اس سے نہیں کچھ بھی گلہ
خوبیِ تقدیر ہے اس نے تو ٹھکرایا نہیں
کیا جیا ساحر کہ تیری زلف گر سر نہ ہوئی
کچھ گرہیں باقی ہیں اب تک جنہیں سلجھایا نہیں

شاعر: فرقان اللہ ساحر
مرسلہ: نیہاں عزیز، کراچی

یہ بھی سن لو کہ خوش قسمتی کا دروازہ صرف ایک بار ہی کھلا کرتا ہے، بار بار یہ مواقع نہیں ملتے۔'' جلال صاحب نے ان کا تردد دیکھ کر کھلے لفظوں میں انہیں سمجھایا۔

''کچھ بھی ہے...... لڑکا لاکھ ہیرا ہے مگر میرا دل نہیں مانتا...... وہ لوگ تو بالکل ہی غیر ہیں۔ خاندان کے نہیں ہیں اور نہ ہی ان سے معمولی سی شناسائی اور جان پہچان ہے۔ بس آپ کے دوست نے تعریف کردی تو آپ فوراً تیار ہوگئے رشتہ جوڑنے پر...... کیا گارنٹی ہے آپ کے پاس ان لوگوں کی کہ وہ میری بیٹی کو خوش رکھیں گے اور صاف بات تو یہ ہے کہ قرینہ بھی بہت گھبرا رہی ہے اتنے انجان لوگوں میں رشتہ ہونے پر۔'' انہوں نے اپنے سارے خدشے ان پر عیاں کردیے۔

''واہ...... کیا لاجک ہے آپ کی! اور گارنٹی کی کیا بات کی آپ نے...... ارے بھئی شادی تو ویسے بھی جوا ہوتی ہے۔ اچھی اور بری قسمت ہم اور آپ نہیں بنا سکتے۔ میں نے تو اچھے اچھوں کی زندگی مٹی ہوتے دیکھی ہے شادی کے بعد، کسی پر اعتبار کرنے میں اپنے یا غیر ہونے کی کوئی دلیل میں آپ کو نہیں دے سکتا کہ بعض اوقات اپنے اتنے برے اور غیر اتنے اچھے نکل آتے ہیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ کے خیالات اتنے بودے اور دقیانوسی ہیں۔ یہ اس قسم کی خرافات آپ ہی نے قرینہ کے ذہن میں بھری ہوں گی۔'' وہ غصے میں بولتے ہی چلے گئے۔

''خوامخواہ بات کو نہ بڑھائیں، میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ قرینہ کی شادی خاندان میں ہو۔'' وہ بگڑ کر بولیں۔

دونوں میں پھر تکرار ہونے لگی۔ قرینہ نے وحشت سے ان دونوں کو دیکھا اور وہیں صوفے پر بیٹھ کر رونے لگی تو ان دونوں کو اس کا خیال آیا اور اپنی لڑائی بھول کر اسے چپ کرانے میں لگ گئے۔

''تم پریشان نہ ہو بیٹی، یہ تمہاری ماں خوامخواہ کے وسوسے ڈال رہی ہیں تمہارے دل میں...... میں نے سب دیکھ بھال کی ہے۔ لڑکا بہت معقول اور سمجھدار ہے اور دیکھو ہر لڑکی جب کسی نئے گھر میں جاتی ہے تو وہاں کا ماحول اس کے لیے اجنبی ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہاں رہتے ہوئے وہ وہاں کے لوگوں اور طور طریقوں میں خود کو ایڈجسٹ کرلیتی ہے۔ کوئی غیریت باقی نہیں رہتی سب اپنے ہوجاتے ہیں۔'' جلال صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔

''ہاں، ہاں قرینہ یہ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ جب تم وہاں جاؤ گی تو آہستہ آہستہ سب اپنے ہوجائیں گے۔'' اس کے آنسو دیکھ کر ساحرہ بھی اپنے تمام اوہام کو پیچھے دھکیل کر اسے سمجھانے لگیں۔ جاذب انہیں بہت پسند آیا تھا مگر صرف ایک اسی وجہ سے وہ متردد تھیں۔

''کچھ عرصے بعد ہم غیر لگنے لگیں گے تم کو...... کیوں بھئی ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں...... اپنے میکے کا رستہ بھول گئیں نا تم......'' انہوں نے طنزیہ سی شوخی سے ساحرہ کو چھیڑا۔

''ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب میری کل متاع میرا شوہر، میری اولاد اور میرا گھر ہے۔ یہ سب ہی میرے اپنے ہیں۔'' ساحرہ نے خلافِ توقع کھلے دل سے اعتراف کیا۔ شاید اس وقت وہ اپنی بیٹی قرینہ کا دل مطمئن کرنا چاہ رہی تھیں۔ اس کے دل سے ہر خدشے اور ہر وہم کو زائل کرنا چاہتی تھیں۔

''قرینہ اب یہ بات تم بھی اپنے ذہن میں بٹھالو بیٹی، یہ گھر پرایا ہے تمہارے لیے۔ تمہارا اصل گھر تو تمہاری سسرال ہوگی۔ وہی لوگ تمہارے اپنے ہوں گے۔'' ساحرہ نے جذباتی سے انداز میں اسے سمجھایا۔ درحقیقت اس وقت انہیں بھی شدت سے اپنا میکا یاد آرہا تھا۔ گھر اور بچوں کی مصروفیات میں وہ اپنے میکے سے دور ہوگئی تھیں۔ ان کی اپنی قلبی کیفیت موم ہوگئی۔ بالآخر ایک روز قرینہ وداع ہوکر سسرال چلی گئی۔

☆☆☆

جس وقت قرینہ نے اپنی سسرال کی دہلیز پر قدم رکھا اس روز اس کے من میں بہت سے ننھے منے خوف کلبلا رہے تھے۔ زرتار آنچل کی اوٹ میں اس کے تاثرات کوئی بھی نہ جانچ پایا۔ سارے خوف اور خدشے دل میں لیے نئی زندگی کا آغاز ہوگیا اور لبوں پر تو اس نے اول روز ہی قفل لگا کر رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

چند ماہ گزرنے کے بعد اس کے سارے خوف اور خدشے خود بخود زائل ہوگئے۔ جاذب بے انتہا محبت کرنے والا سمجھدار شوہر تھا اور اس کی ساس تو آنگن میں بہو اترنے پر اتنی شاداں تھیں کہ اس کی بلائیں لیتے نہ تھکتی تھیں۔ چند روز ہی اسے اجنبیت اور نئے پن کا احساس ہوا پھر تو جیسے وہ گھر کے ہر فرد سے مانوس ہوگئی اور ہر گوشے سے اپنائیت چھلکنے لگی۔ صرف کچھ ہی عرصہ اس نے وہاں سہمے سہمے خیالات کے ساتھ گزارہ۔ اس کے بعد وہ ان سب میں یوں شیر و شکر ہوگئی جیسے برسوں سے وہاں رہتی آرہی ہو۔

ایک عام روایتی سسرال سے ہٹ کر اس کی ساس بہت حلیم الطبع اور شفیق خاتون تھیں گھر کے ہر معاملے میں وہ اسے اہمیت دیتی تھیں۔ نندیں بھی اس سے راضی تھیں۔ وہ اپنی خوش بختی پر جتنا بھی ناز کرتی کم تھا لیکن خود اس کا اپنا اخلاق اور برتاؤ بھی اتنا اچھا تھا جس نے سب کے دل موہ لیے تھے، وہ ان سب میں گھل مل کر ان ہی جیسی بن گئی تھی۔ صرف اچھے اخلاق اور محبت نے سب کو اس کا گرویدہ کردیا تھا۔

جس روز گھر میں نندوں کی دعوت ہوتی تو اسی کے

میرے نسوانی حسن کا راز
بلوسم بریسٹ ڈویلپنگ اینڈ ٹائٹننگ کریم (ہربل)
چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کرکے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کرکے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
Rs.250/=
چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔ قیمت 125/=
یونانی کریم گلیسی
قیمتی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ۔ بدنما داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کرکے رنگ گورا کرتی ہے۔

- خواجہ اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
- صدر میڈیکل اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
- مسلم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
- ابراہیم سن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
- وقاص میڈیکل اسٹور الآصف اسکوائر 22 کراچی
- تھری اسٹار جنرل اسٹور مدینہ چوک ریشم بازار حیدرآباد
- نیو علی دواخانہ وکٹوریہ روڈ سکھر
- ڈیمن ہومیو اسٹور چنیوٹ بازار فیصل آباد
- ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور
- صدیقی دواخانہ صرافہ بازار گوجرانوالہ
- خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد
- زمان دواخانہ رہتاس روڈ جہلم
- قدیمی چنیوٹی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا
- جان میڈیکا چوک سکندر پورہ پشاور
- شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار فیصل آباد
- جعفری دواخانہ اسماعیل مارکیٹ جھنگ
- حبیب پنساری مین بازار میانوالی
- الشفاء ہومیو سینٹر پارہ چنار
- سلیم پنساری گوجرانوالہ روڈ حافظ آباد
- ڈاکٹر تحسین بخاری ٹاؤن نادر علی شاہ ڈیرہ اسماعیل خان
- شافی دواخانہ اندرون فرید گیٹ شاہی بازار بہاولپور
- علی ہومیو کچہری روڈ ملتان
- ابن سینا اسٹور گھنٹہ گھر بازار ڈیرہ غازی خان
- پاکستان جنرل اسٹور کچہری بازار گول چوک سرگودھا
- یوپی پنساری اسٹور کیشن روڈ کوئٹہ
- کلاسک ہومیو اسٹور مسجد روڈ کوئٹہ
- محمد علی دواخانہ اسلام آباد 2278463
- حق سائیں دواخانہ سنہری مسجد روڈ پشاور
- علی ہومیو اسٹور سرکلر گجرات
- ایس ایس ٹریڈرز 22 علامہ اقبال روڈ لاہور
- حی القیوم جنرل اسٹور ہسپتال روڈ چکوال
- بوسال پنساری اسٹور صدر بازار منڈی بہاؤالدین
- عظیم بیوٹی سینٹر مدینہ مارکیٹ ستیانہ روڈ فیصل آباد

ڈسٹری بیوٹر بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی 051-5502903-5533528 اپنا ایڈریس SMS کرکے لٹریچر مفت منگوائیں
معین الدین برادرز کچی گلی نمبر 1، ڈینسو ہال کراچی۔ فون 2433682 ریاض محمد 69 نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264
پورے پاکستان میں گھر پر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کمی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ ڈویلپر آلہ کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔ Cell: 0333-5203553, Website: wwwdevapk.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشورے سے مینیو ترتیب دیا جاتا تھا۔ وہ اپنی نگرانی میں بہت محنت کے ساتھ تمام ڈشز تیار کرواتی تھی۔ اس کے دن کا آدھا حصہ اسی کام میں گزر جاتا تھا۔ وہ اپنی نندوں اور... جیٹھانی کو بھی تحفے تحائف دیا کرتی تھی۔ اس کی ایک جیٹھانی تھیں وہ بھی ساتھ ہی رہتی تھیں۔ اپنے دوستانہ مزاج کی بدولت ان کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات تھے۔ سب اس سے خوش تھے۔ اس کے دل میں رائی برابر بھی کوئی اندیشہ یا وہم نہیں رہا تھا۔ ایک عام نارمل زندگی سے ہٹ کر وہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی باعثِ حیرت بنی ہوئی تھی کہ جس کے سسرال میں سب سے اچھے تعلقات قائم تھے اور اس میں سارا کمال اس کی انکساری، محبت اور اخلاق کا تھا جس نے سب کے دل جیت لیے تھے۔

☆☆☆

انہی دنوں اس کی ساس بیمار پڑگئیں۔ اگرچہ ابھی اس کی شادی کو صرف آٹھ ماہ ہی ہوئے تھے اس کا شمار ابھی نئی دلہنوں میں ہی کیا جاتا تھا لیکن وہ ان سب کے درمیان کسی پرانے مکین کی طرح رہ رہی تھی۔ اس کی اسی خوبی نے اسے ان سب میں ایڈجسٹ کردیا تھا۔ وہ ہر کسی سے محبت اور خوش اخلاقی سے بولتی تھی اسی لیے اس نے سب کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ ہر کام اس کے بغیر ادھورا اور ہر تقریب اس کے بِنا سونی پڑجاتی تھی۔ اب بھی ماتھے پر شکن لائے بغیر وہ بیمار ساس کی خدمت گزاری میں جٹ گئی....

دراصل ان کی ہڈیاں کمزور پڑگئی تھیں اور ڈاکٹروں نے انہیں زیادہ ہلنے جلنے اور چلنے پھرنے سے منع کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے گردے میں پتھری بھی ہوگئی تھی۔ ان کا زیادہ وقت پلنگ پر ہی گزرتا تھا۔ قرینہ ہی ان کا کمرا صاف کرواتی، ان کا سامان سنبھال کر رکھتی، ان کے نئے کپڑے نکال کردیتی، سر میں تیل لگا کر کنگھی کرتی اور وقت پر ان کو میڈیسن بھی دیتی تھی۔

جیٹھانی کے پاس تو ویسے بھی وقت کم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تین بچوں میں مصروف رہتی تھیں۔ قرینہ نے اس کا بھی کبھی برا نہیں مانا بلکہ الٹا اپنے فارغ وقت میں وہ ان کے بچوں کو...... ہوم ورک کرادیتی تھی۔ وہ منع کرتیں مگر قرینہ مانتی ہی نہیں تھی۔ گھر کا بیشتر ذمہ قرینہ کے کاندھوں پر ہی تھا لیکن اس کے باوجود ساس کی خدمت اور تیمارداری میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

''بہو ہو تو ایسی ہو...... قرینہ نے تو اس گھر کا قرینہ ہی بدل دیا۔'' کہنے والوں نے کھلے دل سے اسے سراہا۔ قرینہ کے کانوں میں یہ جملہ امرت کی طرح ٹپکا۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھی کہ اس نے اپنی سسرال میں اپنے شوہر کو تو کیا سب کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا اور یہ سب کرنے کے لیے اس نے اچھی بیٹیوں کی طرح بہت بار اپنے خوابوں اور خواہشوں کو کچلا، کئی بار اپنی پسند کو ایک طرف ڈال کر شوہر اور ساس کی خوشنودی کے لیے ان کا من پسند لباس پہنا۔ آرام کا موڈ ہونے کے باوجود نندوں کے ساتھ شاپنگ پر گئی۔ یہ ساری محنت اس نے صرف اس لیے کی تھی کہ وہ سب اس کے اپنے ہوجائیں اور آج وہ کامیابی کی چوٹی پر کھڑی تھی۔

اس روز گھر میں کام بہت زیادہ تھا۔ قرینہ کی ساس گردے کی پتھری کے آپریشن کے بعد گھر آگئی تھیں۔ گھر کی ملازمہ انہی دنوں چھٹی لے کر گاؤں گئی تھی اس لیے اضافی کام کا بوجھ بھی بڑھ گیا تھا۔ جیٹھانی کے بیٹے کو یرقان ہوگیا تھا وہ اس کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھیں۔ قرینہ کی ساس کی عیادت کے لیے مستقل مہمان آرہے تھے، وہ کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ ان کی خاطر مدارات میں بھی لگی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مہمان زیادہ آئیں گے اس لیے کولڈ ڈرنک اس نے پہلے سے منگوالی تھی ساتھ ہی ہلکا پھلکا

ناشتا سرو کررہی تھی۔ ساس کے لیے پرہیزی کھانا بھی اسی نے بنایا تھا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ کپڑے بدل کر اپنا حلیہ بھی درست کرلے مگر اسے وقت ہی نہیں ملا۔ قرینہ کی ساس ذرا ذرا سی بات کے لیے اسے ہی پکار رہی تھیں۔

جس وقت وہ کچن سے فارغ ہوئی اسی وقت جیٹھانی کے بیٹے نے پھر کسی نئے مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔ قرینہ ایک گہری سانس بھر کر ادھر چل دی۔ آج کا سارا دن اسی مصروفیت کی نذر ہوگیا تھا لیکن اس کی تیوری پر ایک بھی بل نہیں تھا۔ وہ اپنا فرض پوری دیانتداری سے ادا کررہی تھی اور مطمئن تھی۔ وہ ساس کے کمرے میں داخل ہوئی تو ٹھٹک سی گئی۔ اس کے سامنے کچھ اجنبی سے چہرے تھے جنہیں اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''آؤ قرینہ، رک کیوں گئیں، اندر آجاؤ...... یہ میرے چھوٹے دیور اور دیورانی ہیں، یعنی تمہارے چچا سسر اور چچی ساس...... سلام کروانہیں۔ ملک سے باہر رہتے ہیں یہ، آج کل آئے ہوئے ہیں اسی لیے ملنے کے لیے آئے ہیں۔'' ساس نے اسے ان اجنبی چہروں سے متعارف کروایا۔

''اور بھابی...... یہ کون ہیں؟'' ان کی دیورانی حبیبہ نے تجسس سے پوچھا۔

''بھئی یہ میری بہو قرینہ ہے...... میرے جاذب کی دلہن ہے۔ ماشاء اللہ بہت پیاری، بہت سگھڑ اور بہت نیک بچی ہے۔'' ساس اس کی تعریف میں رطبُ اللسان ہوگئیں۔

اس وقت قرینہ کا سیروں خون بڑھ گیا۔ وہ اتنی ہی تعریف، اتنی ہی محبت اور عزت کی حق دار تھی۔ اس نے بڑے حق سے اپنے یہ اعزازات وصول کیے اور تفاخرانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ساس کے پاس بیٹھ گئی۔

حبیبہ بیگم نے بڑے اشتیاق سے اس کی من موہنی صورت کو دیکھا۔ اس کی سیرت کے گن تو وہ اس کی ساس کے منہ سے سن ہی چکی تھیں اور صورت بھی پیاری سی تھی۔ بہت مان، بہت استحقاق سے وہ اپنی ساس کے پاس مودب بیٹھی ہوئی تھی۔

''ماشاء اللہ...... آپ کی بہو تو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ کس کی بیٹی ہے یہ؟'' حبیبہ بیگم نے فطری سے انداز میں ایک روایتی سا سوال کیا۔

''وہ...... یہ دراصل......'' اس کی ساس نے پہلو بدل کر اٹھنا چاہا، قرینہ نے آگے بڑھ کر انہیں تھام لیا۔ اس کے سہارے سے وہ اٹھ بیٹھیں...... قرینہ نے جلدی سے ان کے پیچھے تکیہ لگایا۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ قرینہ کی اتنی خدمتوں کی بہت زیادہ عادی ہوگئی تھیں۔ اٹھ کر بیٹھنے کے بعد انہوں نے چند لمحوں کے لیے اپنی سانس ہموار کی اور ہلکے سے کھنکھار کر اپنی بات مکمل کی۔

''دراصل ان کے والدین کو آپ نہیں جانتیں کیونکہ جاذب کا رشتہ ہم نے غیروں میں کیا تھا۔ یہ غیروں میں سے ہیں۔'' ساس نے نحیف سی آواز میں جس شان کے ساتھ اس کا تعارف کروایا اس نے ایک آن میں اسے عرش سے فرش پر لا پٹخا۔

وہ ایک لمحے میں ہی بیگانی ہوگئی...... صرف ایک جملے نے اسے اجنبی بنا کر بہت پیچھے دھکیل دیا...... اتنا عرصہ وہ جس اپنائیت کے لیے اپنا آپ ختم کرکے جیے جارہی تھی، آج وہ اپنائیت صرف ایک جملے سے کسی سلیٹ پر لکھی تحریر کی طرح مٹ گئی تھی۔ اس نے دکھ اور حیرت سے اپنی ساس کو دیکھا جو اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی دیورانی سے باتیں کررہی تھیں اور قرینہ کے کانوں میں صرف ایک ہی جملہ گونج رہا تھا...... ''یہ غیروں میں سے ہے۔''

www.Paksociety.com

ناولٹ

کوئی شہر ایسا بساؤ جن میں

نگہت سیما

سیمل نے نظروں سے اوجھل ہوتے پوائنٹ کو دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہ اسٹاپ پر تنہا کھڑی تھی۔ چادر کے پلو سے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پھر اپنے اطراف نظر دوڑائی۔ سڑک دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ اسٹاپ خالی تھا لیکن دائیں طرف درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑے دو لڑکے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تنگ جینز اور دھاری دار شرٹس میں ملبوس یہ لڑکے اسٹوڈنٹ تو ہرگز نہیں لگ رہے تھے۔ ایک لڑکا بڑے لوفرانہ انداز میں سگریٹ پیتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے بنا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر فوراً نظریں ان پر سے ہٹالیں اور سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔

ایک تو آج حمنہ بھی نہیں آئی تھی دوسرے لائبریری میں ناول پڑھتے ہوئے اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا اور آخری پوائنٹ بھی نکل گیا تھا اور اب خوف سے اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی ہر وقت ڈری ڈری اور سہمی سہمی سی رہنے والی۔ یونیورسٹی میں پڑھنے کے باوجود اس میں خود اعتمادی کی بے حد کمی تھی اگر جو حمنہ اس کے ساتھ نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی بھی یونیورسٹی میں پڑھنے کی ہمت نہ کر پاتی بلکہ اس نے تو گریجویشن کے بعد تعلیم کو اپنی طرف سے خیر باد کہہ دیا تھا۔ یہ تو حمنہ تھی جو اسے گھسیٹ کر یونیورسٹی لے آئی تھی۔

دور سڑک سے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی جو اسٹاپ کے قریب آ کر آہستہ ہوئی۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا۔

''کدھر جانا ہے؟''

اس کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔

''ٹیکسی میں اکیلے کبھی نہ بیٹھنا، کبھی تنہا آنا پڑے تو بس اور ویگن سے ہی آنا بلکہ رکشے میں بھی اکیلے مت بیٹھنا۔'' اماں نے سیکڑوں بار ہی تو اسے منع کیا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دائیں طرف دیکھا۔ سگریٹ پینے والے لڑکے نے سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے تلے مسلا اور دوسرے لڑکے کی طرف دیکھا۔ دونوں زور سے ہنس پڑے اور دونوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اب وہ شاید اسی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ بالکل ناک کی سیدھ میں سامنے دیکھ رہی تھی۔ لیکن پسینہ ایک بار پھر اس کے مساموں سے پھوٹ پڑا تھا اور اس نے اپنی ٹانگوں میں واضح لرزش محسوس کی تھی۔ ایک رکشا شور مچاتا ہوا سڑک پر سے گزر گیا۔ رکشے کے پیچھے

کہیں سے ایک تانگا بھی آرہا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اس کے کانوں میں بہت زور سے آرہی تھی۔ تانگا اسٹاپ پر رکے بغیر گزر گیا۔ اس میں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ افراد بھرے ہوئے تھے۔ تانگا جا چکا تھا اور روڈ کراس کر کے دو لڑکیاں اسی طرف آرہی تھیں۔ لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی ہمت تھوڑی بحال ہوئی تھی۔ دوپٹے گلے میں ڈالے کندھوں پر شولڈر بیگ لٹکائے بڑے اعتماد سے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے وہ سڑک کراس کر کے اس کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔ وہ اس سے بے نیاز ایک دوسرے سے باتوں میں مگن تھیں۔ ان کا موضوعِ گفتگو ان کا باس تھا جو کسی فلمی ہیرو کی طرح تھا لیکن وہ اپنی ورکر لڑکیوں کو ذرا بھی لفٹ نہیں کرواتا تھا اور ذرا سی غلطی پر بے عزتی کر کے رکھ دیتا تھا۔

''کاش زندگی کوئی افسانہ یا ڈراما ہوتی۔'' ایک لڑکی نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

''اور اس افسانے میں باس آپ پر دل و جان سے فدا ہو جاتے۔'' دوسری لڑکی نے تبصرہ کیا۔

اس سے پہلے کہ پہلی لڑکی کوئی جواب دیتی پھٹ پھٹ کرتا ہوا رکشا آیا اور دونوں لڑکیاں اس میں سوار ہو کر چل دیں۔ لڑکیوں کی باتوں میں کھو کر کچھ دیر کے لیے وہ اردگرد کے ماحول سے غافل ہو گئی تھی۔ لڑکے پھر درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے تھے اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں انہیں دیکھا ایک بار پھر وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اس کی طرف آرہے تھے۔ قلفی بیچنے والا ایک لڑکا کہیں سے آ کر بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنا تھرموس اپنے پاؤں کے پاس رکھا تھا اور اب کندھے پر پڑے رومال سے اپنا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس کی نظریں لڑکے کے پاؤں پر تھیں۔ مٹی اور دھول سے اٹے پاؤں میں ایک ہوائی چپل تھی جس کے دائیں پیر میں ایک طرف چمڑے کا ننھا سا ٹکڑا تھا۔ گویا چپل کو موچی سے مرمت کروایا گیا تھا۔ لڑکے کے آنے سے شاید اسے ڈھارس ملی تھی کہ ایک بار پھر وہ اردگرد سے بے خبر ہو گئی تھی۔ اس کی نظریں کبھی لڑکے کے تھکے ہوئے چہرے کی طرف اٹھتیں اور کبھی اس کے ہوائی چپل میں قید پاؤں کی طرف اور اماں کی آواز ایک بار پھر اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

''سیمل چندا ناشکری نہ کیا کر...... ناراض مت ہوا کر اللہ سے۔ وہ تو بڑا مہربان ہے۔ میری جان جس نے تمہیں چھت دی ہے، باپ اور بھائی کا سائبان دیا ہے، یہ محفوظ چار دیواری دی ہے۔ تمہیں سب کچھ بن مانگے مل جاتا ہے، کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑتا۔ مشقت نہیں کرنا پڑتی۔ وہ بھی تو ہیں میری جان جنہیں دو وقت پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔''

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' پتا نہیں کتنے سالوں بعد یہاں اس سڑک پر کھڑے کھڑے اس نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا ورنہ اسے تو اللہ سے بے حد بے حساب شکوے تھے۔

اور یہ لڑکا بے چارہ کتنی عمر ہو گی اس کی حد سے حد گیارہ سال اور اس تپتی دوپہر میں یہ قلفیاں بیچ کر پیٹ کے رزق کا بندوبست کر رہا ہے اور پتا نہیں یہ اتنا کما بھی لیتا ہو گا کہ اس کا اور اس کے خاندان والوں کا پیٹ بھر سکے اور دوسری ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

''تمہاری قلفیاں بک گئیں ساری......؟''

''نہیں، آپ لیں گی۔'' اس کی آنکھوں میں یکدم چمک پیدا ہوئی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ لڑکا یکدم اس سے بے نیاز ہو کر اپنے رومال سے اپنا تھرماس صاف کرنے لگا تو اسے افسوس ہوا کہ کم از کم وہ اس سے ایک قلفی تو خرید ہی لیتی بھلے نہ کھاتی۔ وہ اتنا مایوس نہ ہوتا لیکن اس کا ارادہ تو محض اس سے باتیں کرنے کا

تھا۔ وہ اس سے اس کی اس محنت مشقت کے متعلق اور اس کی فیملی کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی۔ لڑکا جیسے اس کے قلفی نہ خریدنے پر ناراض سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے دائیں کندھے پر لٹکا شولڈر بیگ کندھے سے اتارا اور اس کی زپ کھول کر کاغذات کے انبار سے دس روپے کا نوٹ تلاش کر کے سر اونچا کیا تو لڑکا تھرماس اٹھائے سڑک کراس کر رہا تھا اور درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑے لڑکے اب اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خباثت تھی اور ہونٹوں پر بڑی لوفرانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور اب بالکل بینچ کے ساتھ جڑی کھڑی تھی اور دل ہی دل میں آیت الکرسی اور جتنی بھی قرآنی آیات یاد تھیں پڑھ رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اس کی نظریں زمین پر تھیں اور وہ دعا کر رہی تھی۔

''یا اللہ کوئی وین کوئی بس آجائے یا پھر کوئی مسافر ہی آجائے۔'' اسے ان دونوں لڑکوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ لڑکوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا تھا اور پھر ایک لڑکا پیچھے ہٹ کر بالکل اس کے ساتھ جڑ کر یوں کھڑا ہوا تھا کہ اس کا بازو اس کے شولڈر بیگ سے ٹکرایا تھا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر لڑکے کو گھورا۔

''پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو۔'' لیکن اپنی آواز کی لرزش خود اس سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔

''کیوں جی، یہ جگہ آپ کے ابا جان نے الاٹ کرا رکھی ہے۔'' لڑکے کی آنکھوں میں خباثت تھی اور سیمل کو اس کے سوا اور کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ یہاں سے دوسرے اسٹاپ پر جا کر بس یا وین کا انتظار کر لے۔

''یہ خیال مجھے پہلے ہی آجانا چاہیے تھا۔'' خود کو ڈانٹتے ہوئے اس نے بائیں طرف رخ موڑا اور تیزی سے چلنے لگی لیکن ابھی چند ہی قدم چلی تھی کہ ایک لڑکے نے تیزی سے اس کے پیچھے آ کر اس کی چادر کھینچی۔

''اے کبوتری کہاں چلی ہو، کیا کسی اور کا انتظار تھا۔''

''شٹ اپ۔'' غصے سے اس کا رنگ سرخ ہوا لیکن اس کی آواز حلق سے باہر نہیں نکلی تھی۔

''جب تم اکیلی گھر سے نکلو گی تو راہ میں کئی آوازے کسنے والے ملیں گے۔ تم انہیں جواب دینے کے لیے مت رک جانا۔ کتوں کو تو بھونکنے کی عادت ہوتی ہے گڑیا۔'' اماں نے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

''میرا پلو چھوڑو۔'' اس نے لہجہ مضبوط بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اس میں بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔

''اور اگر نہ چھوڑوں تو۔'' اب دوسرا لڑکا بھی قریب آ گیا تھا اور بڑے بے ہودہ انداز میں ہنس رہا تھا۔

''تو......!'' اس نے ہراساں نظروں سے سامنے سڑک کی طرف دیکھا۔ تب ہی کسی بائیک کے بریک سڑک پر چرچرائے تھے اور کوئی بائیک سے اتر کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

''ہے سیم یہاں کیوں کھڑی ہو۔'' اس نے قدرے فاصلے سے ہی چلا کر پوچھا تھا اور اس نے بے حد گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ دراز قد تھا، رنگت سانولی تھی، بال فوجی کٹ تھے اور آنکھیں...... ہاں آنکھیں بہت خوابناک تھیں اور ان خوابناک آنکھوں پر پہرا دیتی بے حد گھنی اور مڑی ہوئی پلکیں۔

وہ تھوڑے سے ہونٹ وا کیے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی یادداشت میں کہیں بھی اس جیسے حلیے اور شکل و صورت والا کوئی شخص نہیں تھا بلکہ اس کی یادداشت کے خانے میں کوئی اجنبی مرد تھا ہی نہیں پھر

www.Paksociety.com

یہ کون تھا اور اسے اتنی بے تکلفی سے کیوں بلا رہا تھا لیکن نہیں اس نے سیم کہا تھا...... اور میرا نام تو سیمل ہے، یقیناً اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن یہ ان کا ساتھی بھی تو ہوسکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ پھر گھبرا کر سہمی ہوئی سی سڑک کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اتنے میں وہ قریب آچکا تھا۔ اسے قریب آتے دیکھ کر لڑکے نے اس کی چادر کا پلو چھوڑ دیا تھا لیکن اس نے شاید دیکھ لیا تھا اس لیے اس نے ڈپٹ کر لڑکے سے پوچھا۔

''اے یہاں کیا کر رہے ہو تم؟''

''وہ سر...... اپنی وین کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''بکواس مت کرو۔'' اس نے ایک الٹا ہاتھ لڑکے کے چہرے پر مارا۔

''دیکھ چکا ہوں میں تمہاری حرکت...... جی تو یہی چاہتا ہے کہ ابھی پکڑ کر تھانے میں بند کروا دوں لیکن...... بھاگو یہاں سے۔'' وہ دونوں لمحوں میں غائب ہوگئے تھے۔ اب وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''آپ نے غالباً گھر جانا ہے۔''

''جی......'' اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اب یہ پتا نہیں کون تھا اور کیوں......

''آئیں میں آپ کو گھر پہنچا دیتا ہوں۔''

''نہیں۔'' وہ یکدم سہم کر پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کی کشادہ آنکھیں کچھ اور کشادہ ہوگئی تھیں اور ان سیاہ پتلیوں میں تیرتا خوف صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ یوں جیسے شکاریوں کے خوف سے بھاگی ہوئی ہرنی...... اس کی غزال آنکھوں میں ٹھہرا سہم ایسا ہی تھا۔

''آپ نے غالباً مجھے پہچانا نہیں۔'' اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

اس نے فوراً ہی نفی میں سر ہلایا۔

''میں نوشیرواں ہوں۔''

سیمل کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ وہ تو اس نام کے کسی بندے کو نہیں جانتی تھی۔

''نوشیرواں عادل......'' اس نے دہرایا۔

وہ تو صرف ایک ہی نوشیرواں کو جانتی تھی جو اپنے عدل کی وجہ سے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہوگیا تھا۔ اور یہ کہاں تاریخ کے صفحوں سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

''آپ کا پڑوسی...... میراں اماں کا نواسا۔''

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔

سیمل کو لگا جیسے اس کی ٹانگوں نے لرزنا بند کر دیا ہو...... تو یہ میراں اماں کا نواسا تھا۔ میراں اماں کو ان کے پڑوس میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا یہی کچھ چھ سات ماہ ہوئے تھے لیکن ان چھ سات ماہ میں وہ محلے کی ہر دلعزیز شخصیت بن چکی تھیں۔ ہر ایک سے محبت سے پیش آتی تھیں۔ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھیں۔ ہر ایک کی ہمدرد تھیں اور یہ ان کا نواسا...... اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً نظریں جھکالیں۔ اس نے ایک دو بار گلی میں سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور اسے صرف اس کا دراز قد یاد تھا بس......

''پہچانا......؟''

اس نے سر ہلا دیا۔

''تو پھر چلیں؟''

''نہیں۔'' اسی تیزی کے ساتھ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''کیوں، آپ کو اعتماد نہیں ہے مجھ پر؟''

اس نے پہلے نفی میں سر ہلایا پھر فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ یک دم ہنس دیا اور سیمل نے دیکھا کہ اس کے دانت بہت خوب صورت تھے ایک دم ہموار ذرا ذرا سے وقفے پر۔

اور اماں کہتی تھیں جس شخص کے دانتوں میں یہ ذرا ذرا سا خلا ہو وہ بڑا خوش نصیب ہوتا ہے۔ اب پتا نہیں وہ خوش قسمت تھا یا نہیں لیکن ان دانتوں نے اس کی مسکراہٹ کو بہت خوب صورت بنا دیا تھا۔

''ایک بات کہیں ناسیم ہاں یا نہیں۔''

''میرا نام سیم نہیں ہے۔'' وہ اب قدرے اعتماد سے کھڑی تھی۔

''اچھا میں سمجھا سیم ہے، اس روز میراں اماں آپ کو دیوار سے آواز دے رہی تھیں اور میں اندر کمرے میں ایف ایم ہنڈرڈ سے پرانے گانے سن رہا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے آپ کو سیم کہہ کر بلایا ہو۔ کیونکہ کچھ دیر بعد آپ ہی دیوار پر نمودار ہوئی تھیں۔''

''یہ شخص کس قدر باتونی ہے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ کمرے میں بیٹھا ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔''

''میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟'' اسے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''نہیں...... لیکن میرا نام آپ نے غلط سنا تھا۔ میرا نام سیمل ہے۔''

''سیمل۔'' اس نے دہرایا۔ ''کتنا خوب صورت نام ہے لیکن اگر میں آپ کو سیم کہہ کر بلایا کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

''لیکن کیا ضروری ہے کہ میری اور آپ کی پھر کبھی ملاقات ہو۔'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''امکانات تو ہوسکتے ہیں سیم...... ایک محلے میں رہتے ہیں بلکہ دیوار سے دیوار ملی ہے اور پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کسی روز پھر آپ کا پوائنٹ چھوٹ جائے۔''

ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن اگر اس وقت کوئی بس یا وین آجاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس نے سڑک پر نظر دوڑائی۔ اب رکشے، کاریں اور بائیک تو گزر رہے تھے لیکن کسی بس یا وین کا نشان تک نہیں تھا۔

''تو پھر کیا خیال ہے۔'' اس نے اسے سڑک پر نظر دوڑاتے دیکھ کر پوچھا تو وہ چونکی۔

''کیسا خیال؟''

''میرے ساتھ چلنے کا۔''

''میں اسے مناسب نہیں سمجھتی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔

''یوں تو میں گھر ہی جا رہا تھا لیکن خیر آپ نہیں جانا چاہتیں تو۔'' وہ اس سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔ اس اثنا میں ایک بوڑھا بھی آکر بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے دو تین بار اس کی طرف دیکھا، وہ اس سے بے نیاز سا کھڑا سامنے سڑک پر دیکھ رہا تھا اور اگر اس نے اس بات پر برا مان لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر گھر نہیں گئی تو مانتا رہے برا۔ وہ تو زندگی بھر کبھی بائیک پر نہیں بیٹھی تھی، مروان اور ابا کے ساتھ بھی نہیں حالانکہ جب مروان نے نئی نئی بائیک لی تھی تو اس نے کتنا کہا تھا اس سے کہ وہ اسے بائیک کی سیر کروا لائے لیکن اس نے تو صاف منع کر دیا تھا اور یہ تو اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ غیر اور نامحرم ابا دیکھ لیتے تو اسے زمانہ جاہلیت کی طرح زندہ گاڑ دیتے۔ اس نے ایک جھرجھری سی لے کر اس کی طرف دیکھا اور عین اس لمحے اس نے بھی اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

''سیم تمہاری وین آرہی ہے۔'' اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک پر دیکھا لیکن کوئی وین نہیں آئی تھی۔

''کیا اسے الہام ہوا ہے۔'' وہ جھنجلائی اور اس نے سوچا۔ اب کوئی بھی خالی رکشا نظر آیا تو میں اس میں بیٹھ جاؤں گی۔ اب ضروری تو نہیں کہ وہ مجھے بھگا کر لے جائے۔ آخر یہ روز سیکڑوں لڑکیاں اور عورتیں

www.Paksociety.com

رکشے میں تنہا سفر کرتی ہیں۔ یہ اماں نے بھی مجھے ڈرا ڈرا کر بالکل ہی بزدل بنا دیا ہے۔" اور جونہی اس نے ایک قدم آگے بڑھایا دور سے اسے وین آتی نظر آئی۔ وہ بے اختیار روڈ کی طرف لپکی۔ چند لمحوں میں وین وہاں کھڑی تھی اور یہ اس کی مطلوبہ وین تھی آٹھ نمبر جو سیدھی اس کے گھر کے نزدیک ترین اسٹاپ پر رکتی تھی۔ وین کے پائدان پر قدم رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر اسے دیکھا وہ اپنی بائیک کی طرف جا رہا تھا جو ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ ایک پاؤں پر زور دے کر چل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اس کی طرف دیکھتی وہ بائیک پر بیٹھ چکا تھا اور پائدان پر کھڑا کنڈیکٹر کہہ رہا تھا۔

"اندر جاؤ باجی...... سیٹ آگے خالی ہے۔" وہ جلدی سے خالی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کھڑکی میں سے اس نے دیکھا۔ وہ بائیک پر بیٹھا شاید وین کے چلنے کا انتظار کر رہا تھا جو بوڑھے کے لیے رکی ہوئی تھی اور وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا وین کی طرف آ رہا تھا۔ بوڑھے کے وین میں بیٹھتے ہی وین چل پڑی اور اس نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے شولڈر بیگ کندھے سے اتار کر گود میں رکھا اور کرایہ نکالنے لگی۔

☆☆☆

وہ لاؤنج سے اوپر جاتی سیڑھیوں کے نیچے بنی الماری کے ساتھ چپکی کھڑی تھی۔ سیڑھیوں کے نیچے موجود خلا کے تقریباً ایک تہائی حصے پر یہ الماری بنی ہوئی تھی جس میں بستر کی چادریں اور کمبل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی سی خالی جگہ پر وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی۔ اس کی خوب صورت سیاہ آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ یکایک کوئی چیز اڑتی ہوئی الماری سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتی ہوئی اس کے پاؤں کے پاس گری۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے پاؤں پیچھے کیے اور سہمی سہمی نظروں سے نیچے گرنے والی چیز کو دیکھا۔ یہ اسٹیل کی وہ پلیٹ تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے لاؤنج میں سینٹر ٹیبل پر رکھی تھی۔

اماں صوفے پر بیٹھی آلو کاٹ رہی تھیں اور آلوؤں کے چھلکے اس میں ڈال رہی تھیں۔ وہ پاس بیٹھی انہیں آلو کاٹتے دیکھ رہی تھی کیونکہ اماں اس کی فرمائش پر ہی آلو کاٹ رہی تھیں۔ فرنچ فرائز اسے پسند تھے۔ اس نے کبھی ضد نہیں کی تھی۔ اسے ضد کرنا نہیں آتا تھا۔ آج پتا نہیں کیوں وہ اماں سے کہہ بیٹھی کہ وہ فرنچ فرائز کھائے گی اور اماں جو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں انہوں نے وہیں اس سے آلو منگوا لیے اور آلو کاٹتے ہوئے وہ اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس کے اسکول کی باتیں، اس کی سہیلیوں کی باتیں اور وہ خوش خوش ان سے باتیں کر رہی تھی اور انہیں آلو کاٹتے دیکھ رہی تھی کہ ابا آ گئے۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی تھی۔ اسے ابا سے بہت ڈر لگتا تھا حالانکہ وہ کوئی بدصورت اور بدشکل آدمی نہیں تھے بلکہ بہت وجیہہ، بہت خوب صورت اور بہت پڑھے لکھے تھے۔ کئی بار جب وہ اپنے آپ میں مگن کچھ پڑھ رہے ہوتے تھے تو وہ چپکے چپکے انہیں دیکھا کرتی تھی اور سوچتی تھی ابا کتنے خوب صورت ہیں بالکل شہزادوں جیسے...... اور انہوں نے کبھی اسے ڈانٹا بھی نہیں تھا پھر بھی وہ ان سے ڈرتی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی۔ ابا نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر اس پر اور اماں پر ڈالی اور پھر دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگے۔

اماں نے اسے کٹے ہوئے آلوؤں والا باؤل دیا۔

"گڑیا یہ کچن میں نازو کو دے دو وہ تمہیں فرائی کر دے گی۔" وہ باؤل نازو کو دے کر لاؤنج میں آئی تو ابا دھاڑ رہے تھے۔ اور اماں سہمی ہوئی صوفے پر بیٹھی اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھیں۔ وہ ڈر کر سیڑھیوں کے نیچے موجود خلا میں چھپ گئی۔ یہاں سے وہ ابا اور اماں کو نہیں دیکھ رہی تھی لیکن ابا کی آواز اسے آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیا بات ہوئی تھی جو ابا کو غصہ آ گیا تھا اور اسے کبھی بھی یہ پتا نہیں چلا تھا کہ ابا کو غصہ کیوں آ جاتا ہے۔

"جاہل عورت...... ان پڑھ...... نکمی......" ابا دھاڑے تھے۔

اب پتا نہیں جاہل کون تھا ابا جو ڈھیروں ڈگریاں حاصل کرنے کے باوجود اس وقت لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑے پوری آواز سے چلا رہے تھے یا اماں جو صوفے پر ساکت بیٹھی تھیں اور جن کے لبوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ پھر کسی چیز کے دھپ سے کارپٹ پر گرنے کی آواز آئی تھی۔ وہ مزید سکڑ گئی۔ ابا جب بھی غصے میں ہوتے یونہی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکا کرتے تھے۔ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے کھڑے وہ تھک گئی تو آہستہ آہستہ نیچے بیٹھتی گئی۔ اس نے دونوں گھٹنے جوڑے ہوئے تھے اور سمٹ کر بیٹھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ابا کی آواز پھر اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

"اب یہاں بیٹھی کیا میرا منہ دیکھ رہی ہو۔ دفع ہو جاؤ احمق عورت...... میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔" اب شاید اماں اٹھ کر لاؤنج سے باہر چلی گئی ہوں گی۔ اس نے گھٹنوں سے اونچے اپنے فراک کو نیچے کھینچتے ہوئے سوچا۔

ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ اماں نے ابا کی بات نہ مانی ہو۔ اس نے چاہا کہ وہ لاؤنج میں جا کر دیکھے کہ اماں جا چکی ہیں یا نہیں...... لیکن اسے لگا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں ہے۔ وہ اب شاید کبھی کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ پتا نہیں کیوں اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔ ایک ہی زاویے میں چھوٹی سی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں سن ہو گئی تھیں۔ وہ اماں کے پاس جانا چاہتی تھی جو لاؤنج سے یقیناً جا چکی تھیں کیونکہ لاؤنج میں خاموشی تھی لیکن وہ اٹھ ہی نہیں سکی اور گھٹنوں پر چہرہ رکھے وہ ہولے ہولے رونے لگی، گھٹ گھٹ کر۔ لاؤنج سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی۔ شاید ابا نے ٹی وی لگا لیا تھا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں ہی تھے۔ اٹھ کر اماں کے پاس جانے کی خواہش خود ہی دم توڑ گئی تھی۔ اس میں ابا کے سامنے سے گزر کر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سمٹی ہوئی بیٹھی روتی رہی اور پھر پتا نہیں کب وہاں روتے روتے سو گئی۔ پھر نازو کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

"بی بی جی...... رومی بھیا...... گڑیا یہاں ہے۔"

وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ نازو کے ہاتھ میں وہی اسٹیل کی پلیٹ تھی۔ غالباً وہ پلیٹ اٹھانے آئی تھی کہ اس کی نظر گڑیا پر پڑی تھی۔ پہلے رومی اور ان کے پیچھے اماں آئی تھیں۔ رومی نے یکدم ہی اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ "گڑیا تم یہاں چھپی بیٹھی ہو اور ہم نے پورا گھر ڈھونڈ ڈالا۔" اس کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔

"گڑیا تم رو رہی ہو۔ کیا ہوا تھا تمہیں۔" رومی اسے گود میں لیے صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور اس کی پیشانی چوم رہا تھا۔ اماں مجرم سی بنی اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کے پاس ہی صوفے پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"ابا...... ابا کدھر ہیں؟" اس نے لاؤنج میں چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔

"گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے اماں کی طرف دیکھا تھا۔ سرخ سوجی ہوئی آنکھیں، ستا ہوا چہرہ...... وہ شاید بہت روئی تھیں اور ہمیشہ ہی ابا کے چیخنے

www.paksociety.com

چلّانے کے بعد وہ بہت روتی تھیں۔ چھپ چھپ کر اپنے کمرے میں۔ کچن میں کام کرتے ہوئے کہیں بھی۔

"اماں......" اس نے رومی کی گود میں بیٹھے بیٹھے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے تھے اماں تو جیسے منتظر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے یکدم ہی اسے اپنی گود میں لے لیا تھا اور اب دونوں بازوؤں میں بھینچے اسے چوم رہی تھیں۔ اس کے رخساروں کو اس کے ماتھے کو، اس کے سر کو۔ رومی سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔ اسے چومتے ہوئے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور پھر یہ آنسو ان کے رخساروں پر لڑھک آئے تھے۔

"اماں نہ روئیں۔" وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُن کے آنسو پونچھنے لگی۔ اماں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ان پر اپنے لب رکھ دیے۔ اب وہ اس کے ہاتھوں کو چوم رہی تھیں۔

"اماں، گڑیا ڈر کر وہاں چھپی تھی...... کیا ابا......" رومی کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ اماں نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

"آپ ابا کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں۔ کم از کم گڑیا کے سامنے تو وہ... یہ ابھی بہت چھوٹی ہے صرف پانچ سال کی۔ یہ ہر وقت خوف زدہ رہتی ہے۔" اماں نے بے بسی سے رومی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ آنسو ان کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

"اماں......" رومی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے کارپٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ اُن کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ "ابا ایسے کیوں ہیں، اماں وہ اس طرح کیوں بی ہیو کرتے ہیں۔ فیصل ہے، سنی ہے، عالم ہے سب کے گھروں میں کتنا سکون ہے۔ فیصل اور سنی کے ابا تو ان کے ساتھ دوستوں کی طرح ہر بات شیئر کرتے ہیں۔" اماں کیا کہتیں۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ انہیں تو خود پتا نہیں تھا کہ وہ ایسے کیوں ہیں اور کبھی کبھی تو انہیں اپنا قصور بھی پتا نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس بات پر چلا رہے ہیں۔ وہ تو جب سے اس گھر میں بیاہ کر آئی تھیں یونہی ذرا ذرا سی بات پر انہیں چلاتے برتن پھینکتے اور توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ یونہی آنسو بہاتی رہیں۔

"اماں......!" رومی نے بے چین ہو کر ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے تب ہی گیٹ کھلنے اور پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی۔

"ابا آ گئے ہیں شاید۔" رومی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں آج ابا سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں۔" انہوں نے لرز کر اپنے سترہ سالہ بیٹے کو دیکھا۔ جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں لیکن وہ اس عمر میں بھی بے حد سنجیدہ اور ذمے دار لگتا تھا۔

"تم کچھ مت کہنا۔" پھر کسی فساد سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے جلدی سے اپنے رخسار صاف کیے تھے۔

"میں بات کرلوں گی۔" رومی نے ایسی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ بات نہیں کریں گی۔ پھر گڑیا کو ان کی گود سے لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"اس نے اسکول سے آکر کچھ نہیں کھایا تھا۔ فرنچ فرائز مانگ رہی تھی اور......" ان کی آواز رندھ گئی۔ سیڑھی پر کھڑے کھڑے اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

"نازو کے ساتھ بھجوا دیں۔" اور پھر وہ اسے گود میں اٹھائے اپنے کمرے میں آ گیا۔ اوپر تین بیڈ روم تھے۔ ایک اس کا دوسرا اماں اور گڑیا کا اور تیسرا ابا کا۔ لیکن وہ کم ہی اوپر آتے تھے، ان کا مستقل ٹھکانا گیسٹ روم تھا جو گراؤنڈ فلور پر تھا۔ گڑیا کو بیڈ پر بٹھا کر وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تو ہماری گڑیا کیا کھائے گی؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ فرنچ فرائز کھانے کی خواہش دم توڑ چکی تھی۔

"آئسکریم کھانے چلیں۔"

"نہیں، کہانی سنائیں۔"

"کون سی۔"

"مرچو والی۔"

اسے "مرچو" والی کہانی بہت پسند تھی۔ وہ سب سے چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے لیکن ہر مشکل وقت میں وہی سب کی مدد کرتا ہے۔ اسے کہانیاں سننا اچھا لگتا تھا۔ حالانکہ وہ صرف پانچ سال کی تھی لیکن رومی اسے تب سے کہانیاں سنا رہا تھا جب وہ ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اسے کسی کہانی کی سمجھ آتی تھی لیکن رومی کی گود میں لیٹ کر اس سے کہانی سننا اس کی عادت بن گئی تھی۔ وہ یونہی کہانی سنتے سنتے سو جاتی تھی۔

نازو فرنچ فرائز لے آئی تھی۔ وہ اسے کہانی سناتے سناتے چپس بھی کھلاتا جا رہا تھا اور وہ اتنے اشتیاق سے مرچو والی کہانی سن رہی تھی جیسے پہلی بار سن رہی ہو۔ مرچو کی عقلمندی پر اس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔ کہانی سنتے سنتے وہ ایک بار پھر سو گئی تھی۔ رومی نے اس کو ٹھیک طرح سے بیڈ پر لٹا دیا اور پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ آج ابا سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

سیمل صحن میں کرسی پر بیٹھی کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی صحن میں آئی تھی۔ اندر کمروں میں بے حد گھٹن اور حبس ہو گیا تھا۔ دوپہر میں ذرا سی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے باہر کا موسم اچھا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ وہ عصر کی نماز پڑھ کر چائے بنانے اٹھی لیکن اماں سو رہی تھیں تو اس نے سوچا ان کے جاگنے پر ہی چائے بنائے گی چنانچہ

ادھوری خوشی

شوہر اور بیوی کی لڑائی ہوگئی۔ بیوی روتے ہوئے بولی۔

"میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں ابھی اپنی ماں کے گھر جا رہی ہوں۔"

شوہر نے فوراً چند نوٹ نکال کر اسے تھمائے اور کہا۔ "یہ لو ہوائی جہاز کا کرایہ اور فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

بیوی روتے ہوئے بولی۔ "واپسی کا کرایہ بھی تو دو۔"

سیدہ فرزانہ عرفان، حجرہ شاہ مقیم

چائے بنانے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ اندر سے میگزین اٹھا لائی اور اب صحن میں کیاریوں کے پاس کرسی بچھائے میگزین پڑھنے میں مگن تھی۔ موتیے کی خوشبو اسے پسند تھی اور موتیے کی بیل پھولوں سے بھری پڑی تھی۔

"سیمل...... سیمل۔" میگزین پڑھتے پڑھتے اس کے کانوں میں آواز آئی تو اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا۔ میراں اماں دیوار سے جھانک رہی تھیں۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ مسکرائیں۔ ان کے سرخ و سپید چہرے پر مسکراہٹ بہت بھلی لگتی تھی۔ مہربان اور شفیق سی۔

"جی۔" وہ میگزین کرسی پر رکھ کر دیوار کے پاس آئی۔ دیوار کے پاس لوہے کی کرسی پڑی تھی۔ لوہے کی یہ کرسی ان کے اس گھر میں آنے سے پہلے کی تھی جو غالباً رابطے کا ذریعہ تھی جبکہ دوسری طرف چار سیڑھیوں والی ایلومینیم کی چھوٹی سی سیڑھی ہمہ وقت دیوار سے لگی رہتی تھی۔ یہ دونوں گھر دراصل دو سگے بھائیوں کے تھے خود تو ڈیفنس چلے گئے تھے اور یہ گھر

www.paksociety.com

کرائے پردے رکھے تھے۔ لوہے کی کرسی پر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے میراں اماں کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہو؟"

"جی بالکل ٹھیک، آپ کیسی ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے، تمہاری اماں کیسی ہیں؟"

"رات کچھ بے چین تھیں لیکن اب سو رہی ہیں۔" وہ افسردہ ہوگئی۔ اماں کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ یونہی افسردہ ہو جاتی تھی۔

"اللہ انہیں صحت وزندگی دے...... یہ میں نے پکوڑے بنائے تھے شیری کے لیے۔" انہوں نے منڈیر پر رکھی پلیٹ اس کی طرف کھسکائی۔

"ذراسی بارش ہو تو پکوڑوں کی فرمائشیں کرنے لگتا ہے۔" شیری غالباً نوشیرواں کا نک نیم ہوگا۔ اس نے سوچا اور پلیٹ اٹھالی۔

"شکریہ... اماں جان۔"

"ارے۔" وہ ہنسیں...... "یہ کیا غیروں کی طرح شکریہ ادا کر رہی ہو۔"

"اماں جان...... اماں جان۔" اندر کسی کمرے سے نوشیرواں کی آواز آئی تھی۔ میراں اماں سیڑھی سے اتر گئیں۔

"اب چائے کی طلب ہو رہی ہوگی۔" وہ پھر ہولے سے ہنسی اور پلیٹ اٹھا کر کرسی سے اترتے ہوئے اس نے نوشیرواں کو کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کا دراز قد بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔ پتا نہیں اس کا قد کتنا ہوگا...... مروان کے قد سے بڑا ہی ہوگا کچھ...... مروان کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا اور نوشیرواں عادل یقیناً چھ فٹ سے بھی زیادہ ہوگا۔

پلیٹ اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے وہ نوشیرواں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ پلیٹ کاؤنٹر پر رکھ کر اس نے ایک گرما گرم پکوڑا منہ میں ڈالا اور چائے کا پانی رکھ کر وہ اماں کے کمرے میں آئی۔ وہ ابھی تک سو رہی تھیں۔ لائٹ چلی گئی تھی۔ پنکھا بند تھا اور کمرے میں بے حد حبس تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھول کر وہ اماں کے بیڈ کے قریب آئی۔ ان کا پورا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا کچھ بال پیشانی پر چپکے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کے چہرے سے پسینہ پونچھا۔ ماتھے پر آئے بال پیچھے کیے تو انہوں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں اور سیمل کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہی اجنبیت اور بیگانگی تھی جو پچھلے کئی سالوں سے وہ دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ہمیشہ کی طرح دکھی ہوگیا۔" وہ دن کب آئے گا میری زندگی میں جب اماں مجھے اسی شفقت و محبت سے دیکھیں گی جیسے پہلے دیکھا کرتی تھیں۔ جب ان کی آنکھوں میں میرے لیے پہچان کے رنگ ہوں گے جب وہ محبت سے مجھے بلائیں گی۔"

"اماں جی باہر چل کر بیٹھیں۔ باہر موسم اچھا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے بارش ہوئی تھی نا...... میراں اماں نے پکوڑے بھیجے ہیں اور میں نے چائے کا پانی رکھ دیا ہے۔ باہر ہی چائے پیتے ہیں۔"

انہوں نے حسبِ معمول کچھ نہیں کہا تھا اور یونہی خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی انہوں نے کچھ نہیں کہنا۔ وہ بھی کچھ نہیں کہتی تھیں بس ٹکر ٹکر دیکھا کرتی تھیں لیکن پھر بھی جب وہ ان کے پاس بیٹھتی تو ہر بات اُن سے کرتی...... بھلے وہ سنتی سمجھتی ہوں یا نہیں سیمل کو تو ہر بات اُن سے شیئر کرنا ہوتی تھی۔ کیا پتا اماں کسی روز اس کی کسی بات پر چونک جائیں... کبھی کوئی لفظ ان کی زبان سے نکلے۔ اس نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔ بیڈ کے پاس ان کے چپل رکھے اور جھک کر ان کے پاؤں میں پہنائے، تکیے کے پاس پڑا دوپٹا انہیں اوڑھایا۔

"چلیں اماں۔" وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی

تھیں۔ وہ انہیں لے کر باہر آئی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ برآمدے میں پڑے تخت پر انہیں بٹھا کر وہ تیزی سے صحن کی طرف لپکی۔ کرسی پر اوندھا پڑا میگزین تھوڑا بھیگ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے میگزین اٹھا کر دوپٹے سے پونچھا پھر کرسی اٹھا کر برآمدے میں رکھی اور تخت پر پڑا گول تکیہ اٹھا کر اماں کے پیچھے رکھا۔

"اماں آرام سے بیٹھ جائیں ٹیک لگا کر، میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔" اماں اب اِدھر اُدھر کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ تین سال پہلے ان میں یہ تبدیلی آئی تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ کسے کھوجتی ہیں لیکن وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ہر بار کی طرح اس نے آج بھی ان سے پوچھا تھا۔ "اماں جی آپ کسے کھوجتی ہیں، کسے ڈھونڈ رہی ہیں؟" وہ ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مروان کو نا...... مروان نہیں ہے اماں...... وہ......" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے اس کا دل کٹ کر گر جائے گا۔ اماں کی ساکت نظروں سے گھبرا کر وہ جلدی سے کچن میں چلی گئی۔ کبھی کبھی اماں کی ان ساکت نظروں سے بہت خوف آتا تھا۔

"میں ایسا کیا کروں کہ اماں ہوش وحواس کی طرف لوٹ آئیں۔" اس نے آنکھوں میں آجانے والے آنسو پونچھے اور چائے بنانے لگی۔ چائے بنا کر اس نے ٹرے میں رکھی اور پھر پکوڑوں کی پلیٹ اٹھائی۔ وہ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ اس کی نظریں مائیکرو کی طرف اٹھیں لیکن پھر مایوس ہو کر اس نے ٹھنڈے پکوڑے ہی پلیٹ میں رکھے اور کچن سے نکل آئی۔

اماں سامنے کیاریوں کے پاس پھدکتی ہوئی چڑیا کو دیکھ رہی تھیں جو اپنی چونچ سے کیاری کے پاس جمع ہونے والے پانی کے چھینٹے اڑا رہی تھی۔ اس نے ٹرے تخت پر رکھی اور اماں کی نظروں کے تعاقب میں پانی کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی چڑیا کو دیکھا اور پھر کپ اٹھا کر اماں کو دیا۔

"اماں چائے لے لیں۔" انہوں نے چائے پکڑلی تو سیمل نے پکوڑوں کی پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔

"اماں لیں نا...... بہت مزے کے بنے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈے ہو چکے ہیں پھر بھی اچھے لگ رہے ہیں۔" اماں نے پکوڑا اٹھالیا تھا۔

"میری اماں ہیں نا، یہ انہوں نے بنائے ہیں۔ یہ ادھر ساتھ والے گھر میں رہتی ہیں۔ یہ لوگ کچھ عرصے پہلے ہی آئے ہیں لیکن میراں اماں بہت اچھی ہیں بالکل آپ جیسی...... پتا ہے ان کا بیٹا ہے نا وہ نوشیرواں عادل۔ پتا نہیں اصل والا نوشیرواں عادل کیسا ہوگا لیکن یہ تو خوب لمبا تڑنگا ہے اور شکل سے فوجی لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ کوئی فوجی ہے...... ہوسکتا ہے نہ ہو، کچھ لوگ تو ویسے بھی فوجی کٹ بالوں کو پسند کرتے ہیں۔" وہ چائے پیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اُن سے باتیں کیے جا رہی تھی۔

"اور یہ جو نوشیرواں ہے نا اماں یہ بھی اپنی اماں جان کی طرح ہے۔ مہربان اور ہمدرد۔ پتا ہے اس روز میں اسٹاپ پر اکیلی تھی تو وہ صرف میرے لیے دھوپ میں کھڑا رہا اور جب میری وین آگئی تب گیا۔ اس روز حمنہ نے کی چھٹی کی تھی اور پوائنٹ بھی نکل گیا تھا۔ وہاں اکیلے مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ وہاں سے گزرا تو پتا نہیں کیسے اس نے مجھے پہچان لیا ورنہ میں تو اسے بھی دیکھ کر ڈر گئی تھی۔" اس نے خالی کپ ٹرے میں رکھ کر اُن کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں کپ تھا اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ پتا نہیں انہیں کیا یاد آیا تھا۔ وہ ماضی کا کون سا منظر دیکھ رہی تھیں حالانکہ ان کی زندگی میں خوش کن منظر تو تھے ہی نہیں یا بہت کم لیکن وہ بھی اداسی میں لپٹے ہوئے۔

www.paksociety.com

''اماں۔'' اس نے بہت ہولے سے اُن کا ہاتھ چھوا۔ ''کیا سوچ رہی ہیں؟'' انہوں نے نظریں گھما کر اسے دیکھا۔ لبوں پر بکھری مسکراہٹ معدوم ہوگئی اور انہوں نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگالیا اور چند گھونٹوں میں ٹھنڈی چائے حلق سے نیچے اتارلی۔

سیمل کو پچھتاوے نے گھیر لیا۔ اماں اس طرح تو کبھی ہفتوں مہینوں بعد مسکراتی تھیں اور اس نے انہیں ٹوک دیا۔ کچھ دیر تو وہ یونہی پچھتاوے میں گھری اماں کو محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی پھر ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ کر رسالہ پڑھنے لگی۔ اماں کی نظریں پھر اِدھر اُدھر کسی کو کھوج رہی تھیں لیکن اب اس کا دھیان کہانی کی طرف تھا۔ کہانی ہمیشہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتی تھی اور وہ اس میں کھو کر اردگرد سے بے نیاز ہوجاتی تھی۔ کہانیاں پڑھنے کا چسکا اسے مروان نے لگایا تھا۔ وہ اس کے لیے ڈھیروں کتابیں خرید کر لاتا تھا اور کبھی جب ان کے پاس پیسوں کی کمی ہوتی تھی تو وہ دونوں انار کلی اور اردو بازاروں میں پرانی کتابیں کھوجتے پھرتے تھے۔ کتنی ہی شاندار کتابیں انہوں نے فٹ پاتھ پر بیٹھے حامو چاچا سے خریدی تھیں۔

حامو چاچا چھ دن گلی گلی پھر کر پرانی کتابیں خریدتا پھر ان میں سے اچھی اور پڑھنے کے قابل کتابیں چھانٹ کر الگ کرتا۔ پھٹی پرانی اور بیکار کتابیں ردی میں فروخت ہوجاتیں۔ ہر اتوار کو کتابیں سجا کر فروخت کرتا تھا۔ مروان اور سیمل کو تو وہ اتنا جاننے لگا تھا کہ کئی بار وہ کوئی اچھی کتاب ان کے لیے الگ سے رکھ دیتا۔ تب مروان اس کا بے حد ممنون ہوتا۔

''چاچا آپ نے ہم غریبوں کا خیال کیا ورنہ یہ اتنی قیمتی کتاب ہم کبھی بھی نئی نہیں خرید پاتے......'' اور حامو چاچا مسکرا دیتا۔ وہ بہت زیادہ گفتگو نہیں کرتا تھا نہ ہی کوئی مول تول۔ اچھی حالت والی کتابیں ہاف قیمت پر مل جاتی تھیں اور ذرا کم بہتر ایک چوتھائی قیمت پر۔

اب کتنے دن ہوگئے تھے کہ وہ اتوار کو انارکلی نہیں گئی تھی بلکہ دن کہاں سال ہی گزر گئے تھے شاید آخری بار وہ تقریباً چھ سال پہلے مروان کے ساتھ گئی تھی۔ جب مروان سیاچن سے آیا تھا، اس کی پوسٹنگ وہاں ہوگئی تھی اور وہ ہفتہ بھر رہنے کے لیے آیا تھا اس ایک ہفتے میں اس نے کتنا انجوائے کیا تھا۔ مروان نے اسے ڈھیروں کتابیں خرید کردی تھیں۔ فیروزسنز سے واپسی پر وہ انارکلی ہی گئے تھے، حامو چاچا نے ان کے لیے دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کتابیں لے کر اس روز مروان نے ان سے بہت ساری باتیں کی تھیں اور اس روز پہلی بار حامو چاچا نے بتایا تھا کہ ان کا ایک بیٹا ہے ایم اے پاس لیکن نوکری نہیں ملتی۔

''اس نے ڈھونڈی نہیں ہوگی آپ جو اس عمر میں کما رہے ہیں۔'' اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا تب اس پر ایک سرزنش بھری نظر ڈال کر مروان اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ حامو چاچا ہمیشہ صاف ستھرے دھلے ہوئے لباس میں ہوتا۔ اس کے سر پر صاف ستھری پگڑی بندھی ہوتی اور آنکھوں میں سرمہ لگا ہوتا۔ ایک بار اس نے مروان سے کہا تھا۔

''مجھے حامو چاچا اشفاق احمد کا کوئی بابا لگتا ہے کیا آپ کو بھی ایسا لگتا ہے؟'' تب مروان بہت ہنسا تھا۔

''ہر وقت کتابوں کی دنیا میں نہ رہا کرو۔ کوئی بابا وابا نہیں ہے بس رزقِ حلال کمانے والا اللہ کا بندہ ہے۔''

''اور رزقِ حلال کمانے والے اللہ کے بندے ہی تو اللہ کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں۔'' یہ اس کا خیال تھا اور اس کے دل میں حامو چاچا کے لیے بڑی عقیدت تھی اس نے سوچا تھا کہ کبھی وہ ضرور اکیلی جا کر حامو چاچا سے کچھ ایسی باتیں ضرور کرے گی کہ اشفاق احمد کی طرح اسے کھوج سکے کہ وہ تصوف کے کس مقام پر ہے۔

لیکن مروان نہیں تھا تو وہ اکیلی کیسے جاتی۔ وہ تو کبھی کہیں اکیلی گئی ہی نہیں تھی۔ ''مروان آجائے تو پھر ہی جاؤں گی۔'' اس نے بے خیالی میں سوچا اور ہاتھ پلیٹ کی طرف بڑھایا لیکن پلیٹ خالی ہوچکی تھی۔ کہانی پڑھتے پڑھتے اسے پتا ہی نہیں چلا اور اس نے سارے پکوڑے ختم کردیے تھے۔

اس نے پلیٹ کی طرف دیکھا اور پھر اماں کی طرف، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظریں اس کے ہاتھ میں پکڑے میگزین پر تھیں۔ بوندا باندی اب بھی ہورہی تھی۔ سورج غروب ہونے کو تھا اور اماں کی نظریں رسالے پر تھیں۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ سمجھ گئی تھی کہ اماں چاہتی ہیں وہ پڑھنا چھوڑ دے۔ انہوں نے ہمیشہ ہی اسے مغرب کے وقت پڑھنے سے منع کیا تھا۔ کبھی جو وہ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ مغرب کے وقت دیکھتیں تو فوراً ٹوکتی تھیں۔

''سیمی بیٹا بند کرو پڑھنا۔ دونوں وقت مل رہے ہوتے ہیں ایسے میں تو بہتے دریا بھی رک جاتے ہیں......'' اور اس نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ دور کہیں کسی مسجد میں اذان شروع ہوئی تھی اور اماں مضطرب سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اب وہ پڑھ نہیں رہی تھی صرف ورق گردانی کررہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اماں اسے زبان سے منع کریں۔ کتنے سارے دن ہوگئے تھے اسے اماں کی آواز سنے۔ حالانکہ وہ ان کی ہر بات بن کہے ہی سمجھ جاتی تھی لیکن کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ اماں بولیں تو وہ یونہی انجان بن جاتی تھی۔ بے چینی سے

پہلو بدلتے ہوئے انہوں نے اس کے ہاتھ سے رسالہ پکڑ لیا تھا۔

''کیا ہے اماں پڑھنے دیں نا!'' اس نے مصنوعی جھنجلاہٹ سے کہا اور رسالہ ان کے ہاتھ سے لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ انہوں نے ہاتھ پیچھے کرلیا۔

''نہیں...... مغرب کی اذان ہورہی ہے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔'' اس کا جی چاہا وہ خوشی سے ناچنے لگے۔ کتنے دنوں بعد اماں نے یوں پورا ایک جملہ بولا تھا۔ اس کے کانوں میں جیسے اب بھی ان کی آواز گونج رہی تھی۔ بے اختیار اس نے ان کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے ان کی پیشانی چوم لی۔

''سوسویٹ مام، میں وضو کرنے جارہی ہوں، آپ نماز پڑھیں گی؟''

''میں۔'' ان کے لب ہلے تھے اور انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا تھا۔ ''میں کیسے پڑھوں؟'' انہوں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''جیسے میں پڑھوں گی، میں بتاؤں گی آپ کو...... آئیں میں آپ کو وضو کے لیے لے جاؤں۔'' وہ تخت سے اتری اور پاؤں میں چپل پہن کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر پہلی کیفیت میں ساکت سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھیں۔ یہاں وہاں کچھ دیر پہلے چڑیا پھدک رہی تھی لیکن اب وہ جگہ خالی تھی۔ اس نے چڑیا کی تلاش میں نظر دوڑائی وہ اب جامن کے درخت پر بیٹھی تھی۔ ان کے چہرے پر خوف تھا اور کبھی کبھی وہ یوں ہی خوف زدہ ہوجاتی تھیں۔

''اور یہ اچھی بات ہے اماں کا اس طرح ری ایکٹ کرنا، کل ڈاکٹر عرفان کو بتاؤں گی اور مروان کو بھی۔ کتنا خوش ہوگا مروان جب اسے پتا چلے گا کہ آج اماں نے مجھ سے بات کی مجھے ٹوکا...... رسالہ

پڑھنے سے منع کیا۔'' وہ خوشی خوشی سوچتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

رومی ان کے سامنے بیٹھا تھا اور انہیں بغور دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ ٹی وی سے نظریں ہٹا کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ان جیسا تھا شاید جب وہ اس کی عمر کے ہوں گے تو وہ بھی ایسے ہی ہوں گے دبلے پتلے اسمارٹ...... ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی شکر ہے اس عورت نے اپنے جیسے بچے پیدا نہیں کیے ورنہ۔

''کیا بات ہے کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''جی۔'' رومی نے اضطراب سے انگلیاں مروڑیں۔ ''ابا جی مجھے یہ کہنا تھا کہ گڑیا اب بڑی ہو رہی ہے، وہ آپ دونوں کی لڑائی سے بہت ڈسٹرب ہوتی ہے، ڈر جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں نا وہ بہت حساس ہے۔ آج بھی......'' وہ انہیں تفصیل بتانے لگا۔

''یعنی دو گھنٹے تک وہ وہاں سیڑھیوں کے نیچے خوف زدہ ہو کر چھپی رہی اور اس جاہل عورت کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔'' وہ یکدم ہی لال سرخ ہو کر دہاڑے تھے۔ ''کل کلاں کو کوئی اسے اٹھا کر لے جائے تو اس احمق، بے وقوف عورت کو پتا ہی نہیں چلے گا۔''

''ابا جی پلیز......'' رومی نے پریشان ہو کر التجا کی۔ ''وہ آپ اس کے اس طرح چیخنے چلانے سے ڈر جاتی ہے۔ آپ کو اگر کوئی بات اماں سے کرنی ہے تو آہستہ آواز میں بھی کر سکتے ہیں، جو بھی آپ کے اختلافات ہیں ان سے پلیز انہیں ختم کر لیں۔ میرے لیے گڑیا کے لیے۔''

''اختلافات۔'' ان کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ ابھری۔ ''مجھے بھلا اس عورت سے کیا اختلافات ہو سکتے ہیں۔'' رومی نے اپنے دل میں بے حد تکلیف محسوس کی۔ ابا نے کبھی اماں کو ان کا نام لے کر نہیں بلایا تھا بلکہ وہ ہمیشہ انہیں عورت کہہ کر بلاتے تھے۔

''اختلافات تو برابر کے لوگوں میں ہوتے ہیں اور وہ عورت میرے برابر ہو سکتی ہے۔'' رومی کو لگا جیسے اُن کی گردن اکڑ گئی ہو، انہوں نے بڑے فخر سے رومی کو دیکھا۔

''کیا وہ عورت اس قابل تھی کہ میری بیوی بنتی۔ چوہدری حبیب خان کی، بتاؤ؟'' رومی کا دل جیسے پھٹ جانے کو ہوا۔ بھلا اماں میں کیا کمی تھی۔ ان کے سانولے رنگ میں کتنی ملاحت تھی۔ ان کا دلکش سراپا، ان کے خوب صورت تیکھے نقوش اور ان کی ہرنی ایسی آنکھیں جن میں ہر وقت ایک ہراس چھایا رہتا...... گڑیا کی آنکھیں بالکل ان جیسی تھیں۔

''چپ کیوں ہو گئے ہو، بتاؤ نا ہے وہ عورت اس قابل؟'' رومی نے دکھ سے انہیں دیکھا۔

''کون کہہ سکتا ہے کہ اس شخص نے آکسفورڈ اور ایڈنبرا سے تعلیم حاصل کی ہے۔''

''وہ عورت میرے قابل نہیں ہے۔ جاہل، بے وقوف عورت......'' اسے خاموش دیکھ کر وہ بڑبڑائے تھے۔

''یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا شادی سے پہلے، آپ پر جبر تو نہیں کیا گیا ہوگا۔'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''براہِ راست جبر نہیں تھا میاں لیکن بالواسطہ جبر ہی تھا۔ میں نے اپنی ماں کو خود اپنے لیے دلہن کے چناؤ کا اختیار دیا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میرے لیے ایسی لڑکی پسند کریں گی جیسے ساتھ لے کر چلتے ہوئے مجھے شرم آئے گی۔ ان پڑھ جاہل۔''

''اماں دس جماعت پاس تھیں اور شاید دادی کے نزدیک ان کی اتنی تعلیم کافی تھی۔'' رومی نے تاسف سے انہیں دیکھا اور بے حد تحمل سے بولا۔

''اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ گھر کو کیوں جہنم بنا رکھا ہے آپ نے۔ انہیں اس قصور کی سزا کیوں دے رہے ہیں جو انہوں نے نہیں کیا۔

''میں نے۔'' انہوں نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گھر کو جہنم بنا رکھا ہے یا اس عورت نے جسے نہ پہننے کا سلیقہ ہے نہ اوڑھنے کا نہ اس بڑے گھر میں رہنے کا۔ کبھی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی بھنڈیاں کاٹ رہی ہوتی ہے تو کبھی آلو اور کبھی......''

''ابا جی پلیز......'' رومی نے ایک بار پھر التجا کی۔ ''آپ اماں سے جھگڑا مت کیا کریں۔ ملازم بھی ہنستے ہیں اور ہم...... میں اور گڑیا مینٹلی بہت ڈسٹرب ہو جاتے ہیں۔''

''کس کی جرأت ہے جو مجھ پر ہنسے۔'' انہوں نے غصے سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا۔ ''اور تم......'' اب وہ اسے گھور رہے تھے۔ ''میں جانتا ہوں تم کس کے کہنے پر یوں میرے سامنے کھڑے مجھ سے باز پرس کر رہے ہو...... جوان ہو گئے ہو تم، کالج میں پہنچ گئے ہو تو میرے باپ بن گئے ہو۔ فرسٹ ایئر فول......'' وہ کھڑے ہو گئے۔

''اور اس سے تو میں پوچھتا ہوں ابھی...... اس عورت سے کہ میری اولاد کو میرے خلاف کرتی ہے۔''

''ایسا نہیں ہے ابا جی۔ اماں نے تو کچھ نہیں کہا میں تو گڑیا کی وجہ سے خود ہی......'' رومی نے دوڑ کر ان کا ہاتھ پکڑا لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر تیزی سے باہر نکل گئے۔ رومی ان کے پیچھے بھاگا لیکن انہوں نے گیسٹ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا جہاں اماں ان کے بیڈ کی چادر تبدیل کر رہی تھیں اور اب ایک نیا محاذ کھل گیا تھا۔ اندر سے ان کے چیخنے چلانے اور چیزیں پھینکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رومی ننگے پاؤں

پریشان سا کھڑا بے بسی سے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی شاید اپنی ماں کی طرح بے بس تھا۔ وہ اس شخص جو اس کا باپ بھی تھا کی باتوں سے اپنی ماں کو نہیں بچا سکتا تھا۔ ان باتوں سے جو نہ صرف اس کی ماں کی بلکہ اس کی عزتِ نفس کو بھی مجروح کرتی تھیں۔ وہ بے بسی سے پلٹا۔ کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھے نازو کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ چڑاتی ہوئی غصہ دلاتی ہوئی۔

''شٹ......'' اس نے غصیلی نظر نازو پر ڈالی اور تقریباً دوڑتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں سے ہوتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا گیا اور اپنے بیڈ روم میں بیڈ پر اوندھا گر کر رونے لگا۔ وہ سترہ سال کا بھیگتی مسوں والا لڑکا آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد اس کے آنسو آپ ہی آپ تھم گئے تھے لیکن وہ یونہی لیٹا رہا...... پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی۔ وہ یونہی چپ چاپ لیٹا سوچتا رہا کہ وہ کسی قابل ہوا تو وہ اماں اور گڑیا کو لے کر نکل جائے گا۔ بلا سے کوئی چھوٹا سا گھر ہوگا لیکن وہاں سکون تو ہوگا۔ وہ دل ہی دل میں عہد کرتا رہا اور پلان بناتا رہا جب کمرے میں سوئچ آن کرنے کی آواز آئی۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ سوئچ بورڈ کے پاس اماں کھڑی تھیں۔

''اماں جی۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا رومی......'' انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر اس کی بھیگی پلکوں کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔

''تم روئے ہو رومی...... تم تو کبھی نہیں روتے تھے۔'' وہ ایسا ہی تو تھا، کتنی ہی سخت چوٹ لگتی وہ ذرا نہیں روتا تھا۔ اس لیے کہ اسے فوجی بننا تھا اور فوجی تو بہادر

www.paksociety.com

ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں روتے۔ یہ دادا جان نے اس سے کہا تھا جب وہ گاؤں میں چھت سے گر گیا تھا اور اس کے سر پر بہت گہرا زخم آیا تھا۔ پھر وہ اسٹیچز لگتے ہوئے بھی نہیں رویا تھا۔

لیکن فوجی بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی تو ہوتے ہیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا اور کبھی کبھی ایسے زاویے سے چوٹ لگتی ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں لیکن وہ کوئی چوٹ لگنے پر تو نہیں رویا تھا بلکہ اپنی بے بسی پر رویا تھا۔ یکایک اس کی نگاہ اماں کے رخسار پر پڑی تھی۔ پانچوں انگلیوں کے نشان اس پر ثبت تھے۔

''انہوں نے آپ کو مارا ہے؟'' یکدم ان کے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھڑا کر اس نے ان کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا۔ اماں نے نگاہیں جھکا لیں جیسے یہ بھی ان کا جرم تھا۔

''اماں...... یہ...... یہ میری وجہ سے ہوا۔'' وہ ان سے لپٹ کر بلک پڑا۔ وہ ہولے ہولے اسے تھپک رہی تھیں اور وہ ان سے لپٹا رو رہا تھا۔

''بس کر رومی مت رو...... میرا دل پھٹ جائے گا بیٹا...... تیری بہن جاگ جائے گی۔'' ہولے ہولے وہ سنبھل گیا۔ اماں اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

''اماں جی......'' وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا اور اپنے ہاتھ اُن کے رخسار پر پھیر رہا تھا۔

''یہ ابا ایسے کیوں کرتے ہیں؟'' کتنی بار کا پوچھا ہوا سوال اس نے پھر پوچھا تھا۔

''پتا نہیں بیٹا...... میں تو خود بھی سمجھ نہیں پائی کہ وہ ایسے کیوں ہیں۔ کتنی کوشش کرتی ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جو انہیں غصہ دلائے لیکن پھر بھی...... مجھے معاف کر دو بیٹا۔''

''اماں جی......'' وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ''آپ ایسا کہہ کر مجھے گناہ گار کر رہی ہیں۔ انہیں غصہ دلانے کے لیے کسی بات کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ تو ہمہ وقت ہی غصے میں رہتے ہیں۔'' اور بات کرتے کرتے اس کی نظر گڑیا پر پڑی جو اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''ارے میری گڑیا جاگ گئی۔'' رومی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اماں پر تھیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے اماں کی طرف کھسکی تھی۔

''اماں درد ہو رہا ہے؟'' اس نے ہاتھ سے رخسار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ رومی اور اماں کی آنکھوں میں بیک وقت حیرت اتری تھی۔

''نہ...... نہیں تو بیٹا۔'' وہ مسکرائی تھیں لیکن گڑیا کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

''اماں بہت درد ہو رہا ہے آپ کو' مجھے پتا ہے۔'' پھر وہ چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتری اور بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز کھینچ کر پونستان کا پتا نکالا۔

''یہ کھالیں' درد ٹھیک ہو جائے گا۔ ہیں نا رومی بھائی۔'' رومی مسکرایا تھا۔

''اماں جی ہماری گڑیا بہت عقلمند ہے۔''

''لیکن بیٹا یہ دوائیاں اس طرح نہیں رکھا کرو، بچی ہے کسی دن کھا نہ بیٹھے۔''

''جی' آئندہ احتیاط کروں گا۔'' رومی نے گڑیا کے ہاتھ سے ٹیبلیٹ لے کر اماں کو دیں۔

''بیٹا تمہارے لیے کھانا لے آؤں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''نہیں، نہیں اماں جی۔'' اماں کی تکلیف کے خیال سے رومی تڑپ اٹھا۔ ''ہم خود نیچے آکر کھالیں گے آپ تکلیف نہیں کریں...... ابا کھا چکے......؟''

''ہاں' وہ سونے کے لیے چلے گئے ہیں۔'' اور ان کے پیچھے پیچھے گڑیا کی انگلی تھامے چلتے ہوئے وہ

خود سے عہد کر رہا تھا کہ پہلی اور آخری بار تھی جو اس نے ابا سے بات کی تھی۔ اب اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ کیا کوئی بھی ایسا نہیں جو ابا کو سمجھا سکے۔ نرمی سے، سختی سے۔ اس گھر میں کوئی بزرگ بھی تو نہیں ہے۔ دادا جان، دادی جان کوئی تو ہوتا جس کا لحاظ وہ کرتے۔ اس نے ہوش اسی گھر میں سنبھالا تھا اور اپنی ساری زندگی میں اس نے دادا جان یا دادی جان کو یہاں آتے کم ہی دیکھا تھا۔ بس دو یا تین بار ہی وہ آئے ہوں گے۔ گڑیا کی پیدائش پر، اس کے اور گڑیا کے عقیقے پر یا پھر ایک بار جب دادی جان بیمار تھیں اور یہاں اسپتال میں داخل تھیں۔ اماں، دادی جان کے پاس اسپتال میں رہتی تھیں اور وہ دادا جان کے ساتھ شام کو انہیں ملنے اسپتال جاتا تھا دادا جان کتنے مزے کی باتیں کرتے تھے' وہ ان کے ساتھ بہت خوش تھا۔ پھر دادی جان ٹھیک ہو کر گاؤں چلی گئیں اور پھر اس کے بعد وہ کبھی یہاں نہیں آئی تھیں نہ ہی دادا جان' اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ یہاں ان کے پاس رہیں۔ جب بھی ان کا فون آتا وہ انہیں اپنے ہاں آ کے رہنے کی دعوت ضرور دیتا تھا اور وہ ہنس کر ٹال دیتے۔

ان دنوں وہ عید پر گاؤں جایا کرتے تھے اور یہ دن بھی اس کے لیے یادگار دن ہوتے تھے۔ وہ دادا جان کے ساتھ پورے گاؤں میں گھومتا، پھرتا کھیتوں میں جاتا۔ گنے توڑ کر کھاتا...... مکئی کے بھٹے ماسی ہاجراں سے آگ پر بھنوا کر ان پر لیموں اور نمک مرچ چھڑک کر کھاتا۔ یہ سب اسے بہت فیسی نیٹ کرتا تھا پھر دادی جان فوت ہو گئیں۔ وہ بہت رویا تھا، اسے یاد تھا جب وہ لوگ واپس آرہے تھے تو اماں نے ابا سے التجا کی تھی۔

''ابا اب اکیلے رہ گئے ہیں۔ ہم انہیں ساتھ نہ لے جائیں۔''

''ہم نے کوئی عمر بھر کی خدمتوں کا ٹھیکا نہیں لے رکھا احمق عورت، کبھی جو عقل کی بات کی ہو۔'' ان کا وہی طرزِ تخاطب تھا۔

''اولاد آخر کس دن کے لیے ہوتی ہے؟''

''ہوں، اولاد......'' انہوں نے کتنی نفرت سے کہا تھا۔ اور دادا ابا کی انگلی پکڑے اندر آتے ہوئے اس نے دادا ابا کی طرف دیکھا تھا جن کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ اندر جانے کے بجائے وہاں سے واپس مڑ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ صرف ایک بار گاؤں گئے تھے دادی جان کی برسی پر تین سال پہلے...... تب گڑیا صرف دو سال کی تھی۔

تین سال ہو گئے تھے اس نے دادا جان کو نہیں دیکھا تھا اور تین سال سے وہ گاؤں نہیں گئے تھے۔ اماں نے ایک دو بار کہا بھی تھا تو ابا نے منع کر دیا تھا۔

''تمہیں بہت شوق ہے دھول مٹی کھانے کا تو چلی جاؤ۔ میں بھی دو چار روز سکھ سے رہ لوں گا لیکن میرے بچوں کو مت لے کر جانا وہاں۔'' اور اماں نے تو کبھی اپنی مرضی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ابا کی مرضی پر سر جھکا دیتی تھیں لیکن وہ تو اپنی مرضی کر سکتا تھا نا...... اس نے آخری نوالہ منہ میں ڈال کر پلیٹ کھسکا دی۔

''ارے بیٹا بس یہ فرائی چکن لے لو نا تمہیں تو بہت پسند ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی پلیٹ خالی تھی اور وہ گڑیا کو لقمے بنا بنا کر کھلا رہی تھیں۔ اپنے ہی دھیان اور سوچوں میں گم اس نے دیکھا ہی نہیں تھا کہ اماں نے اپنی پلیٹ میں کچھ ڈالا ہی نہیں تھا۔

''اماں جی......'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آبیٹھا پھر اپنے ہاتھوں سے ان کی پلیٹ میں چکن ڈالا۔

''ارے ارے بیٹا، مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔''

''بھوک نہیں ہے تو پھر بھی تھوڑا سا کھالیں۔'' اس نے نوالہ بنایا۔ ''منہ کھولیں۔''

''رومی!'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور ان کے رخساروں پر بہنے لگے۔

''اماں جی نہ روئیں ...... نہیں تو گڑیا بھی روئے گی۔'' گڑیا نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھے۔

''میں نہیں روتی چندا ...... جس ماں کا رومی جیسا بیٹا اور گڑیا جیسی بیٹی ہو وہ بھلا کیوں روئے گی، میری جان۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا لیکن آنسو تھے کہ بہے چلے آرہے تھے اور رومی ایک بار پھر عہد کررہا تھا کہ وہ اماں کو ایک روز ضرور ایسی زندگی دے گا جس میں آنسو نہیں ہوں گے صرف مسکراہٹیں ہوں گی۔

اگلے روز وہ کالج جانے کے بجائے سیدھا بادامی باغ گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی اکیلا گاؤں نہیں گیا تھا۔ ہمیشہ ابا اماں کے ساتھ گاڑی پر جاتا تھا۔ آج پہلی بار وہ اکیلا گاؤں جارہا تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے گاؤں میں کون سی بس جاتی ہے اور کہاں سے جاتی ہے۔ دو چار لوگوں سے پوچھنے کے بعد وہ بالآخر مطلوبہ بس تک پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے اس کے گاؤں کا رستہ صرف گھنٹے بھر کا تھا۔ اس نے صبح کالج آتے ہوئے اماں کو بتادیا تھا کہ اسے ایک دوست کے ساتھ کہیں جانا ہے اس لیے دیر ہوجائے گی۔ اسے دادا جان سے ملنا تھا وہی تھے جو ابا کو سمجھا سکتے تھے۔ اور تین سال بعد وہ دادا کے سامنے کھڑا تھا۔ ان تین سالوں میں وہ بے حد کمزور ہوگئے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے اور پھر کتنی ہی دیر تک اسے اپنے کمزور بازوؤں میں لیے کھڑے رہے تھے۔

''تمہارے ابا سے کچھ دیر پہلے ہی بات ہوئی تھی لیکن انہوں نے تمہارے آنے کا نہیں بتایا۔'' دادا اسے یونہی بازو کے حلقے میں لیے اندر بڑے کمرے میں آئے تھے۔

''میں انہیں بتا کر نہیں آیا۔''

''ارے کیوں ......؟'' دادا پھر حیران ہوئے تھے۔

''مجھے آپ سے ملنا تھا۔''

''خیریت ہے نا بیٹا؟'' وہ پریشان سے ہوگئے تھے۔

''دادا جان آپ میرے ساتھ چلیں، ہمارے ساتھ ہمارے گھر رہیں۔ ہمیں آپ کی سخت ضرورت ہے ...... آپ ہوں گے تو شاید ایسا نہ ہو جیسا تماشا ہر روز ہوتا ہے۔''

''کیسا تماشا بچے ......؟'' دادا جان ابھی تک حیران تھے۔

''آپ نہیں جانتے دادا جان، ابا ہر روز کس بری طرح اماں کی بے عزتی کرتے ہیں۔'' وہ ہولے ہولے بتاتا چلا گیا۔ دادا جان نے بڑی خاموشی سے اس کی ساری بات سنی تھی اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔

''میرے جانے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا بیٹا۔ بلکہ شاید وہ مجھے سنانے کے لیے اور زیادہ ری ایکٹ کرے ...... میں اس لیے تو وہاں نہیں جاتا۔ نہیں دیکھ پاتا میں مینا کی یہ حالت ...... مرتی ہوئی بہن سے وعدہ کیا تھا میں نے کہ مینا کا ہمیشہ خیال رکھوں گا لیکن وعدہ نہیں نبھا پایا۔ اس سے تو اچھا تھا وہ ددھیال میں ہی رہتی اور کسی چاچے تائے کے بیٹے سے اس کی شادی ہوجاتی۔ پر میں نے سوچا تھا کہ میرا حبیب اتنا پڑھا لکھا ہے اتنا بڑا افسر ہے اور اس کے گھر میں آکر کوئی غیر کیوں عیش کرے میری مینا کیوں نہیں۔ پر مجھ سے بڑی بھول ہوئی پتر۔''

''ابا ایسے کیوں ہیں دادا جان؟'' اس نے وہی

سوال کیا جو وہ اماں سے کیا کرتا تھا۔

''ہماری غلطی ہے بیٹا، ہم نے اسے بہت لاڈ دیا، سر پر چڑھایا، ہمہ وقت اس کی تعریفیں کر کر کے اسے خود پسند بنادیا۔ تمہاری دادی تو اس کے گرد پروانے کی طرح چکراتی تھی۔ ہماری اولاد نہیں تھی۔ ہم ترسے ہوئے تھے اولاد کی محبت کے لیے اس لیے جب میں اسے لے کر آیا تو تمہاری دادی تو مانو پاگل ہوگئی تھی۔ میری گود میں تو مانو چاند کا ٹکڑا آگیا ہے۔ وہ ہر ایک سے کہتی پھرتی تھی۔''

''کہاں سے لائے تھے انہیں آپ؟'' رومی نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک یتیم خانے سے۔ وہ ہماری اولاد نہیں تھی لیکن ہم نے اسے اولاد سے بڑھ کر چاہا ...... ہم نے اپنی ساری توانیاں اور دولت اس کی پرورش پہ خرچ کردی اور اپنی دانست میں اس کے لیے ایسی لڑکی کا انتخاب کیا جو لاکھوں میں ایک تھی لیکن اس نے کہا ہم اس کے سگے ماں باپ نہیں تھے اس لیے ایسی لڑکی ڈھونڈی جو اس کے قابل نہیں تھی۔ اس نے ہماری برسوں کی ریاضت لمحوں میں ضائع کردی۔'' رومی نے جو اس انکشاف سے حیرت زدہ سا تھا بیٹھا تھا چونک کر انہیں دیکھا۔

''آپ نے شادی سے پہلے ان سے پوچھ لیا تھا دادا جان؟''

''پوچھا تھا بیٹا لیکن اس نے انتخاب کا حق ہمیں دے دیا تھا۔ ہم تو اس کی فرمانبرادی پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ وہ مینا کو ناپسند کردے گا۔ پتا نہیں کس نے اس کے دل میں یہ خناس پیدا کردیا تھا کہ مینا کا اس کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں ہے۔'' تمہاری ماں دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ہے رومی پتر۔''

''میں جانتا ہوں دادا جان لیکن ابا تو ہر لمحہ انہیں ڈی گریڈ کرتے رہتے ہیں اور ان کی عزتِ نفس مجروح کرتے ہیں جیسے وہ کوئی بہت حقیر مخلوق ہوں۔''

''میں سمجھاؤں گا بات کروں حبیب سے۔ دو چار روز تک چکر لگاؤں گا میں۔'' انہوں نے وعدہ کیا تھا لیکن وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکے تھے۔ رومی کے گاؤں سے واپس آنے کے دو دن بعد ان کا انتقال ہوگیا تھا۔

''نہیں۔'' اسے یقین نہیں آرہا۔ وہ اماں کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کتنے پلان بنا ڈالے تھے۔ دادا جان آئیں گے تو وہ انہیں کچھ دنوں کے لیے روک لے گا۔ جتنی دیر وہ وہاں رہا تھا کتنا تحفظ کا احساس ہوا تھا اسے جیسے وہ کسی گھنے درخت کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں تلے بیٹھا ہو اور کتنا بدنصیب تھا اس کا باپ جس نے خود کو اس چھاؤں سے محروم کر رکھا تھا۔ اس نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ اگر ابا نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو وہ اماں اور گڑیا کو لے کر گاؤں چلا جائے گا دادا جان کے پاس۔ آخر ابا نے بھی تو اسی گاؤں میں رہ کر اتنا زیادہ پڑھ لیا تھا وہ بھی پڑھ لے گا۔

''احمق عورت خود بھی روئے چلی جارہی ہے اور اسے بھی رُلا رہی ہے۔ بتاؤ اسے کہ کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا اس کا اس سے کچھ نہیں لگتا تھا وہ اس کا۔'' تب اماں نے رومی کو الگ کرتے ہوئے ایک شکایتی نظر ان پر ڈالی تھی۔ وہ جو کبھی نہیں بولی تھیں آج چپ نہیں رہ سکی تھیں۔

''آپ کے حوالے سے نہ سہی میرے حوالے سے تو اس کا رشتہ ہے۔ دادا نہ سہی نانا تو لگتے ہیں، سگے ماموں ہیں میرے۔''

''اوہ ہاں، بھول گیا تھا تمہیں ہی تو میرے سر منڈھنے کے لیے انہوں نے پالا تھا مجھے۔'' وہ تلخی سے کہتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے تھے اور رومی اماں کو

گلے لگا کر تسلی دینے لگا تھا۔

☆☆☆

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' سیمل برآمدے میں تخت کے پاس کھڑی تھی اور نوشیرواں ذرا فاصلے پر کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برآمدے میں پیلی روشنی کا بلبل جل رہا تھا اور اس کی روشنی سیمل کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ بڑا سا سفید دوپٹا نماز کے انداز میں لپیٹے ہوئے تھی اور نوشیرواں کو وہ اس وقت کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف یوں دیکھتے پا کر وہ گھبرائی اور پیچھے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا تو نوشیرواں نے چونک کر اس سے نظریں ہٹالیں اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''شکریہ کیسا سیمل...... میں نے ایسا کیا کیا ہے۔ پڑوسی ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا تھا کہ...... اور ویسے بھی۔'' اس نے پھر اس پر ایک نظر ڈالی۔ ''مجھے تو اماں جان نے ڈاکٹر کو لانے کے لیے کہا تھا آپ نے نہیں...... سو آپ اماں جان کا شکریہ ادا کریں۔''

''جی ان کا بھی شکریہ ادا کروں گی۔'' وہ دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹتے ہوئے سادگی سے کہہ رہی تھی اور نوشیرواں عادل کا دل زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے لیے یوں دھڑکا تھا کہ وہ خود حیران سا رہ گیا تھا۔

''لیکن آپ کا شکریہ ادا کرنا بھی تو میرا فرض بنتا ہے سر۔''

''سر۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''آپ اتنی فارمل کیوں ہیں سیمل بی بی؟''

''اور آپ اتنے بے تکلف کیوں ہیں۔'' سیمل نے سوچا تھا لیکن کہا نہیں...... یہ دوسری بار تھی جب وہ اس سے مل رہی تھی اور دونوں بار ہی اس نے سیمل کی مدد کی تھی۔ اماں کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ یکدم ہی ان کی سانس رکنے لگی تھی۔ وہ گہری گہری سانس لے رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر میراں اماں کو آواز دی تھی۔

''اماں جان...... اماں جان پلیز آجائیں۔ اماں کو کچھ ہوگیا ہے۔'' روتے ہوئے اس نے کرسی پر چڑھ کر انہیں آواز دی تھی اور پھر بھاگ کر اماں کے پاس آئی تھی جو تخت پر لیٹی یونہی منہ کھولے گھٹی گھٹی سانس لے رہی تھیں۔

''اماں...... اماں...... اماں مجھے چھوڑ کر مت جائیے گا۔ اماں میں آپ کے بغیر اکیلی کیسے زندہ رہوں گی، مر جاؤں گی۔'' وہ ان کا ہاتھ پکڑے رو رہی تھی جب میراں اماں نے صحن کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تھا اور ان کے پیچھے نوشیرواں بھی تھا۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے اس کے قریب آئی تھیں۔

''نہ رو بچے نہ اللہ خیر کرے گا۔'' اور اماں نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اماں کو دیکھ رہی تھی جب میراں اماں نے مڑ کر نوشیرواں سے کہا تھا۔

''شیری بچہ جلدی سے گاڑی نکالو۔ امینہ بیٹی کو اسپتال لے کر جانا ہے، جلدی بیٹا۔'' نوشیرواں وہاں سے واپس مڑ گیا تھا اور پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

''دعا کرو بچے اللہ تمہاری ماں کو صحت اور زندگی دے گا۔'' وہ تو بس خالی خالی نظروں سے اماں کو دیکھ رہی تھی جو بند آنکھیں کیے ساکت پڑی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز آتی جیسے اندر کہیں سانس رک رہی ہو۔ میراں اماں پتا نہیں کیا کہہ رہی تھیں۔ اسے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ تب میراں اماں نے خود ہی دروازے لاک کیے تھے، اسے چادر دی تھی اور نوشیرواں عادل دبلی پتلی کمزور سی اماں کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ وہ اور میراں اماں اس کے ساتھ تھیں۔ اماں نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں لیکن ان کی سانس اسی

طرح آرہی تھی رک رک کر۔ اس نے بہت احتیاط سے اماں کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا تھا ساتھ وہ بیٹھی تھی اماں کو سہارا دیے اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

اس وقت مروان اسے بے حد یاد آرہا تھا۔ میراں اماں آگے بیٹھی تھیں نوشیرواں کے ساتھ اور پھر اسپتال میں نوشیرواں ہی انہیں یونہی بازوؤں میں اٹھائے تیز تیز ایمرجنسی کی طرف چلا تھا اور وہ اس کے پیچھے تقریباً بھاگ رہی تھی۔ اماں کو دمے کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا۔ دو تین گھنٹے اسپتال میں گزارنے کے بعد وہ گھر آئے تھے۔

'' اگر نوشیرواں اور میراں اماں نہ ہوتیں تو......''

اس نے جھرجھری لے کر نوشیرواں کو دیکھا۔

''میں سچ مچ آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ مروان کو بتاؤں گی تو وہ بھی آپ کا ممنون ہوگا۔ اگر آپ نہ ہوتے تو پتا نہیں اماں کو کیا ہوجاتا۔'' اس کی آواز بھرا گئی اور پلکیں بھیگنے لگیں۔

''اوں ہوں...... اب مزید برسات نہیں ہو گی۔ میں نے آپ کا اور مروان کا شکریہ قبول کرلیا خوش......'' سیمل نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''مروان کو اماں سے بہت محبت ہے مجھ سے بھی زیادہ...... وہ تو آپ کا بہت احسان مند ہوگا۔''

''میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔'' نوشیرواں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاں، بہت دیر ہوگئی ہے آپ جائیں۔'' وہ جلدی سے بولی اور نوشیرواں نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہرے اور یہ بات اس نے اسی وقت محسوس کرلی تھی جب میراں اماں نے کہا تھا۔

''بچہ تم گھر جاؤ آرام کرو۔ میں رات سیمل بچی کے پاس ہی رہوں گی۔ رات خدانخواستہ امینہ کی طبیعت خراب ہوئی تو اکیلے گھبرا جائے گی۔'' سیمل جو اماں کی چارپائی پر بیٹھی ان کے بازو دبا رہی تھی یکدم کھڑی ہوگئی تھی۔

''آئیں میں دروازہ بند کرلیتی ہوں۔''

''اس منافقت بھری دنیا میں رہتی اس لڑکی میں رتی بھر منافقت نہیں ہے۔ کتنی خالص لڑکی ہے۔'' بیرونی گیٹ کی طرف جاتے ہوئے نوشیرواں نے سوچا تھا۔ ''کیا یہ لڑکی واقعی اسی دنیا کی باسی ہے۔'' اور مڑ کر اسے دیکھا تھا جو دیوار پر پڑتے اس کے سائے پر نظریں جمائے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ گیٹ لاک کر کے وہ کھوئی کھوئی سی واپس آئی۔ نوشیرواں عادل آج اسے کئی بار مروان کی طرح لگا تھا۔ اس میں کچھ ایسا تھا ضرور جو مروان کی طرح تھا۔ شاید اس کے بالوں کا کٹ...... اس کے چلنے کا انداز اور...... اور پتا نہیں کیا۔

وہ کمرے میں آئی تو اماں دوائیوں کے زیرِ اثر پُرسکون نیند سو رہی تھیں۔ ان کی سانس بھی اب ٹھیک آرہی تھی۔ اور میراں اماں کرسی بیڈ کے نزدیک رکھے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے بیڈ جھاڑ اتکیہ درست کر کے رکھا۔

''اماں جان آپ اِدھر بیڈ پر آکر لیٹ جائیں...... میں اماں کے پاس بیٹھتی ہوں۔''

''تم نے کھانا کھالیا بیٹا؟''

''اوہ...... آپ کے لیے کھانا لاؤں؟''

''نہ بیٹا، میں نے تو مغرب کے بعد کھانا کھالیا تھا۔ اب تو عشا کی نماز پڑھ رہی تھی جب تم نے آواز دی۔ چلو تم اٹھو شاباش پہلے کھانا کھالو پھر آکر لیٹ جاؤ۔ تمہاری اماں سکون سے سو رہی ہیں۔'' انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ سے اٹھایا۔

''اچھا آپ تو لیٹ جائیں، بہت دیر ہوگئی ہے۔ آپ تو بہت سویرے جاگتی ہیں۔'' وہ سر ہلا کر

بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ سیمل ایک نظر اماں پر ڈال کر باہر چلی گئی پھر کچن میں جا کر دودھ گرم کر کے دو کپ لے کر کمرے میں آئی۔

''اماں جان یہ دودھ لے لیں۔''

''ارے بیٹی' یہ تم نے کیوں تکلف کیا۔ شیری بھی ایسے ہی کرتا ہے۔ جی چاہے یا نہ چاہے وہ رات کو سونے سے پہلے ضرور میرے لیے دودھ گرم کر کے لے آتا ہے۔'' وہ محبت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سیمل نے اسٹور سے میٹرس نکال کر اماں کے بیڈ کے پاس نیچے کارپٹ پر بچھایا اور میٹرس پر بیڈ شیٹ بچھا کر تکیہ رکھ کر اماں کی طرف دیکھا۔ وہ اسی سکون سے سو رہی تھیں۔ تب میراں اماں کو چادر اوڑھا کر لیٹنے سے پہلے اس نے میراں اماں سے کہا۔

''آپ کو دبا دوں اماں جان۔''

''ارے نہیں بچہ سو جاؤ تم۔'' انہوں نے شفقت بھری نظر اس پر ڈالی اور مسکرائیں۔

''تم بالکل زینبے کی طرح ہو۔ وہ بھی رات کو سونے سے پہلے ضرور میرے کمرے میں آتی تھی اور پوچھتی تھی۔ آپ کو دبا دوں بڑی اماں......''

''زینبے کون تھی؟'' سیمل نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میری پوتی تھی۔ بہت پیاری بہت خوب صورت، شکل کی بھی دل کی بھی...... صرف سترہ سال کی عمر تھی اس کی تب......''

''کیا وہ بھی......؟'' سیمل کا دل کانپ گیا۔

''ہاں وہ بھی بچے...... پورے سترہ بندے تھے۔''

سیمل کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ یہ میراں اماں کا دل تھا کہ بچھڑ کر چھوڑ کر جانے والوں کا غم، اور ان کا حوصلہ۔ اس کا دل جیسے پانی ہو کر بہنے لگا۔ وہ سیمل تھی جسے کہانیوں کے دکھ رُلاتے تھے اور یہ تو کہانی نہیں تھی۔ سامنے جیتی جاگتی میراں اماں تھیں جن کا سینہ چھلنی تھا لیکن جو اس کے لیے چھپر چھاؤں بنی ہوئی تھیں۔ سرخ وسپید رنگت اور سفید بالوں والی میراں اماں کا دل کیسا سمندر تھا۔ اس نے عقیدت سے انہیں دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔

''اماں جان......'' اور آنسو اس کی آنکھوں سے چشموں کی طرح پھوٹ نکلے۔

''ارے...... ارے میرا بچہ مت روؤ۔'' وہ اسے ہولے ہولے تھپکنے لگیں لیکن ایسا کرتے ہوئے خود ان کی آنکھیں برس پڑی تھیں اور کتنے سارے دنوں بعد وہ یوں روئی تھیں۔

''یا اللہ میرے شیری کو سلامت رکھنا۔ میرے گل کو صحت وزندگی دینا، وہ جہاں بھی ہو۔ میرے خاندان کے یہ نام لیوا زندہ رہیں، میرے خاندان کی نسل باقی رہے مولا۔'' دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے انہوں نے اپنے اور اس کے آنسو پونچھے۔

''بس میرا بچہ بس جا منہ ہاتھ دھو کر سو جا۔ کیسا سونے سے ترشا دل ہے تیرا...... بس تو جانے والوں کے لیے ان کے حق میں دعا کیا کر۔ اللہ انہیں جنت کی ہوائیں دے، ان کی قبریں کشادہ کرے۔'' اور منہ ہاتھ دھو کر جب وہ میٹرس پر آ کر لیٹی تو میراں اماں چہرے پر دوپٹا ڈالے کروٹ کے بل لیٹی تھیں۔

''شاید انہیں روشنی میں نیند نہیں آتی ہو گی۔'' اس نے سوچا اور اٹھ کر لائٹ آف کر کے نائٹ بلب جلا دیا لیکن سونے سے پہلے اس نے اماں کو دیکھا تھا وہ اسی طرح گہری اور پُرسکون نیند سو رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ میٹرس پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ حالانکہ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ ابھی مروان کو بتائے کہ میراں اماں کتنی دکھی ہیں۔ پہاڑ سے غم کا بوجھ سینے پر دھرے سب کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہیں۔ اسے تو بچپن سے عادت تھی اپنی ہر بات مروان کو بتانے کی۔ لیکن میراں اماں لائٹ جلنے سے شاید ڈسٹرب ہو جاتیں۔ وہ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ میراں اماں اور ان کے خاندان کے ان سترہ بندوں کے متعلق سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ آج بہت دنوں بعد اس نے پھر وہی خواب دیکھے تھے جو اکثر بچپن میں دیکھتی تھی اور مروان ان خوابوں پر ہنستا تھا۔

اس نے ''ایک مکان دو دیواروں'' کے امجد کو دیکھا تھا۔ بوڑھی چالاک نانی نے صحن کے بیچوں بیچ دیوار کھڑی کر دی تھی اور دیوار کے اس طرف تنہا کھڑا امجد جو اپنی شرارتوں سے سب کو زچ کر دیتا تھا رو رہا تھا وہ بند مٹھیوں سے آنسو پونچھتا جاتا تھا اور آنسو تھے کہ بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اس نے قریب جا کر امجد کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے تھے۔ اسے تسلی دی تھی۔ تم اکیلے نہیں ہو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ اور امجد مسکرا دیا تھا پھر اس نے سینڈریلا کو تسلی دی تھی جس پر سوتیلی ماں ظلم کر رہی تھی۔ اس نے سنو وائٹ کو زہر ملا سیب کھانے سے منع کیا تھا اور پتا نہیں صبح تک اس نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے اور پھر اس نے مروان کو دیکھا تھا وہ دوڑ کر مروان سے لپٹ گئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹائے مسکرا رہا تھا پھر اس نے پیچھے مڑ کر کسی کو بلایا تھا۔

''عادل...... اس سے ملو میری چھوٹی بہن سیمل''

اور سر پر دوپٹا درست کر کے وہ جلدی سے مروان سے الگ ہوئی تھی اور اُدھر دیکھا تھا۔ وہ نوشیرواں عادل تھا جو مسکراتے ہوئے ایک ٹانگ پر تھوڑا سا دباؤ ڈالتا چلتا ہوا مروان کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ اور وہ جو نوشیرواں کو دیکھ کر اکثر سوچتی تھی کہ بھلا اس میں اور مروان میں کیا ایک جیسا ہے...... دونوں کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر یکدم چونکی تھی۔ دونوں کے بالوں کا کٹ ایک جیسا تھا۔

''عادل یار اس کا خیال رکھنا، میری یہ بہن بہت

تم کیوں چلے گئے

یہ غزل میں اپنی پیاری کزن رابعہ تبسم کے نام کرتی ہوں جو صرف 22 سال کی عمر میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

سوچوں پہ غم کی شال ہے تم کیوں چلے گئے
ہر سمت ایک جال ہے تم کیوں چلے گئے

تازہ تمام زخم بہاروں نے کر دیے
ہر پھول کا سوال ہے تم کیوں چلے گئے

ہنسنا تو خیر اپنا مقدر نہ تھا کبھی
رونا بھی اب محال ہے تم کیوں چلے گئے

کیوں ہاتھ میں نہیں ہے میری جاں تمہارا ہاتھ
کتنا برا یہ حال ہے تم کیوں چلے گئے

تم نے تو جاتے جاتے ملاقات تک نہ کی
اب تک یہی ملال ہے تم کیوں چلے گئے

مرسلہ: صبا، لیہ

غلطی

مالک نوکر سے۔ ''اس قدر مہنگائی اور پراٹھے میں اس قدر گھی؟''
نوکر: ہچکچاتے ہوئے۔ ''وہ معاف کیجیے گا غلطی سے میرا پراٹھا آپ کے پاس آ گیا ہے۔''
سیدہ فرزانہ عرفان، حجرہ شاہ مقیم

نازک دل ہے۔ کہانیاں پڑھ کر روتی اور ہنستی ہے۔"
پھر اس نے سیمل کا ہاتھ پکڑ کر عادل کی طرف بڑھایا تھا کہ یکدم کسی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر میٹرس پر بیٹھ گئی۔ میراں اماں واش روم سے نکل رہی تھیں۔ شاید یہ دروازہ کھلنے کی آواز تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا پھر کمرے میں نظر دوڑائی، اسے لگا جیسے ابھی ابھی مردان اور نوشیرواں کمرے سے باہر گئے ہوں۔ اماں اس کی طرف کروٹ کیے سو رہی تھیں۔ ساری رات وہ سکون سے سوتی رہی تھیں۔ بس ایک بار شروع رات میں پانی مانگا تھا۔ اس نے میراں اماں کی طرف دیکھا جو اب جا نماز پر بیٹھ چکی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ماتھے پر آئے بالوں کو پیچھے کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
"جلدی سے وضو کرلو بیٹا وقت کم ہے۔ میری آنکھ بھی آج دیر سے کھلی۔"
"جی۔" وہ تیزی سے واش روم کی طرف بڑھ گئی لیکن جاتے جاتے اس نے دیکھ لیا تھا کہ میراں اماں کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور چہرہ ستا ہوا تھا۔
"کبھی کبھی یوں اچانک بچھڑ جانے والوں کا دکھ کتنا ستاتا ہے۔" منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے بھی وہ مسلسل میراں اماں کے متعلق سوچ رہی تھی۔
"اگر میراں اماں یہاں پڑوس میں آکر نہ رہتیں تو میں کیا کرتی میراں اماں نے کتنا ساتھ دیا ہے میرا جب جب اماں بیمار ہوئی ہیں تب تب۔ شکر ہے اللہ کا میراں اماں یہاں آکر رہنے لگیں۔ نہیں، یہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔" اس نے ہولے سے اپنے رخسار پر تھپڑ مارا۔ کاش میراں اماں کو کبھی یہاں نہ آنا پڑتا۔ کبھی نہیں، وہ ہمیشہ وہاں رہتیں اپنے گھر میں اپنے لوگوں کے ساتھ۔" وضو کر کے وہ بہت افسردہ دلی کے ساتھ باہر آئی تھی۔ میراں اماں نماز پڑھ کر فارغ ہو چکی تھیں اور اب تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ وہ جا کر جا نماز پر کھڑی ہو گئی۔ نماز پڑھ کر اس نے جلدی جلدی چائے بنائی تھی اور جب ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے وہ کمرے میں آئی تو میراں اماں، اماں کے بیڈ پر بیٹھی تھیں اور اماں کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لیے ہولے ہولے کچھ کہہ رہی تھیں۔ ٹرے میز پر رکھ کر اس نے مسکرا کر اماں کی طرف دیکھا۔
"آپ جاگ گئیں اماں جی، طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" اماں نے سر ہلایا تھا۔
"آپ چائے لے لیں نا اماں جان۔"
"شیری بھی جب صبح صبح میں نماز پڑھ کر فارغ ہوتی ہوں تو چائے بنا کر لے آتا ہے۔" میراں اماں مسکرائی تھیں۔
میراں اماں کو چائے دے کر وہ اماں کو واش روم لے گئی۔ اماں چپ چاپ کسی روبوٹ کی طرح اس کے ساتھ چلتی ہوئی واش روم گئی تھیں اور جب وہ ان کا منہ ہاتھ دھلا کر انہیں باہر لائی تو میراں اماں چادر اوڑھے کھڑی تھیں۔
"ارے، آپ جا رہی ہیں اماں جان...... نہیں آپ ناشتا کر کے جائیں گی۔ آپ ناشتے میں کیا لیں گی پراٹھا آملیٹ یا......"
"نہیں، میں ابھی ناشتا نہیں کروں گی۔ چائے پی ہے ابھی تو...... اب نو دس بجے تک ناشتا کروں گی۔"
"تو ٹھیک ہے میں دس بجے ناشتا بنا دوں گی آپ کا۔"
"نہیں بچہ شیری نے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے۔ وہ ناشتے پر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"
"میں بنا دیتی ہوں ان کے لیے ناشتا۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ میراں اماں مسکرائی تھیں اور یہ مدھم سی مسکراہٹ ان کے سرخ و سپید چہرے پر کتنی سجتی تھی۔

"نہیں سیمل بچہ۔ اس نے ناشتا تو بنا ہی لیا ہوگا۔ جب یہاں ہوتا ہے تو مجھے ناشتا کب بنانے دیتا ہے، میں تو ابھی تلاوت سے فارغ بھی نہیں ہوتی وہ ناشتا رتیار کر کے لے آتا ہے۔ پریشان مت ہونا میں شیری کے جانے کے بعد چکر لگاؤں گی۔"
"وہ اسلام آباد کیوں جا رہے ہیں، جاب کرتے ہیں وہاں؟"
"نہ بچہ......" ان کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی تھی اور آنکھوں سے جیسے کوئی گہرا درد جھلکنے لگا تھا۔
"وہ تو گل کے لیے جا رہا ہے، اس کا پتا کرنے...... میرا پوتا گل، ریحان گل نام ہے اس کا...... ادھر پشاور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ گیارہ ماہ ہو گئے ہیں کچھ پتا نہیں اس کا۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی اور سیمل جیسے وہیں منجمد ہو گئی تھی۔ بھرے خاندن کے بچ جانے والے تین بندے اور اس میں سے بھی......
"اور پتا نہیں ریحان گل زندہ بھی ہوگا یا کسی نے اسے......"
"نہیں۔" اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور میراں اماں کی طرف دیکھا جو چادر اوڑھے دروازے کی طرف مڑ چکی تھیں۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل دی۔

☆☆☆

دادا جان کی اس طرح اچانک موت نے رومی کو بالکل خاموش کر دیا تھا۔ بہت سے دن وہ بالکل چپ رہا۔ گڑیا اور اماں سے بھی کم باتیں کیں لیکن پھر ہولے ہولے سنبھل گیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ ابا سے کچھ کہنا فضول ہے۔ وہ ایک خود پسند اور مغرور شخص ہیں جنہیں اپنے سامنے سب حقیر لگتے ہیں، کمتر اور چھوٹے۔ حالانکہ وہ خود کیا تھے، اگر دادا جان انہیں یتیم خانے سے نہ لاتے تو آج پتا نہیں کہاں گلیوں میں رُل رہے ہوتے۔ اس روز وہ کالج سے جلدی آ گیا تھا اس نے گڑیا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج اسے آئسکریم کھلانے لے جائے گا۔ اور جب اماں کو گڑیا کو تیار کروانے کا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں گیا تو کچھ ہی دیر بعد اس نے ابا کی دہاڑتی آواز سنی تھی۔
"احمق عورت کیا کہا تھا صبح میں نے تم سے۔"
اماں نے پتا نہیں کیا کہا تھا۔ ان کی مدھم آواز اس کے کانوں تک نہیں آئی تھی لیکن ابا کی آواز پھر آئی تھی۔
"لے جاؤ انہیں اور آگ میں جھونک دو اور وہ بلیک پینٹ اور پنک دھاری والی شرٹ استری کروا کے لاؤ۔"
"اماں گڑیا کو تیار کر رہی تھیں۔" یکدم ہی اسے خیال آیا اور وہ تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ گڑیا صوفے کے پیچھے چھپکی کھڑی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں خوف سے مزید پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا جو زمین پر پڑے ابا کے کپڑے اٹھا رہی تھیں۔ وہ سیدھا گڑیا کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے کے پیچھے سے باہر لایا۔ صوفے پر پڑا اس کا ریڈ کیچر اور برش اٹھایا اور ابا کی طرف دیکھے بغیر گڑیا کا ہاتھ پکڑے واپس سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اماں ابا کے کپڑے لیے لاؤنج سے نکل رہی تھیں جب آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور عین اسی وقت ابا نے ایش ٹرے اٹھا کر غصے سے لاؤنج سے نکلتی اماں پر پھینکی۔ کرسٹل کی ایش ٹرے ایک چھناکے سے ٹوٹی تھی۔ وہ بغیر رکے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ گڑیا پنک فراک میں پری لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں کا خوف اسے اندر سے رُلا رہا تھا لیکن وہ تیار کرتے ہوئے گڑیا سے باتیں کرتا رہا اس کے بالوں میں برش کر کے کیچر لگا کر وہ نیچے آیا تو ابا بڑے

اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ دھرے ٹی وی پر کوئی انڈین شو نہایت انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر اماں کی طرف متوجہ ہوا تھا جو خود ہی ٹرالی دھکیلتی آ رہی تھیں۔

''اماں جی۔'' اسے غصہ آیا۔ ''نازو کہاں مر گئی ہے، وہ چائے لے آتی، آپ تیار ہو جاتیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا۔''

''وہ بیٹا۔'' انہوں نے گھبرا کر حبیب خان کی طرف دیکھا۔ ''میں جا کر کیا کروں گی بیٹا تم گڑیا کو لے جاؤ۔'' ٹرالی ابا کے سامنے کھڑی کر کے انہوں نے جلدی سے پلیٹ انہیں پکڑائی تھی۔ جسے انہوں نے نہایت نخوت سے پکڑ لیا اور اب تنقیدی نظروں سے ٹرالی کا جائزہ لے رہے تھے۔ نگٹس، چکن پیٹیز، شامی کباب، رول سب کچھ ہی ان کی پسند کا تھا۔ وہ آفس سے آ کر اکثر کھانا نہیں کھاتے تھے اس لیے اماں چائے پر خاصا تردد کرتی تھیں۔ کھانا وہ رات کو ہی کھاتے تھے اور اچھے کھانے کے شوقین تھے۔

''نہیں اماں جی، آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔'' اس نے گڑیا کا ہاتھ چھوڑ کر قریب آ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''آئیں، ایسے ہی ٹھیک ہے بس چادر لے لیں۔'' اماں نے سوالیہ نظروں سے حبیب خان کی طرف دیکھا۔

''وہ گڑیا آئسکریم کھانے کی ضد کر رہی تھی اور کہتی ہے اماں بھی ساتھ چلیں۔''

''تو جاؤ مرو یہاں کیوں کھڑی ہو گئی ہو اسٹیچو بن کر۔'' انہوں نے ایک تمسخر بھری نظر اُن پر ڈالی تھی۔ جب اماں چادر لینے باہر چلی گئی تھیں اس نے بغیر ابا سے پوچھے گاڑی کی چابی اٹھائی تھی تو اسی تمسخر بھری نظروں سے رومی کو دیکھتے ہوئے ہنسے تھے۔

''یہ اپنی اماں کو تو لے کر جا رہے ہو کوئی دوست وغیرہ مل گیا تو کیا کرو گے؟'' رومی کی آنکھوں میں پہلے حیرت اتری تھی پھر اس کا گندمی رنگ غصے کی اور غم کی زیادتی سے سرخ ہو گیا تھا۔

''مجھے اپنی اماں کے ساتھ چلتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے، مجھے اپنی ماں دنیا کی ساری عورتوں سے زیادہ خوب صورت لگتی ہے اور میں ہمیشہ اس بات پر غرور کرتا ہوں کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔'' پھر ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر گڑیا کا ہاتھ پکڑے تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس روز اس نے پہلی بار اماں کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ وہ ہنسی تھیں اور وہ مبہوت سا ہو کر انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ آئسکریم کھاتے ہوئے، کے ایف سی میں چکن پیسز کھاتے اور پھر کافی ہاؤس میں آئس کافی پیتے ہوئے اس نے اماں کی آنکھوں میں خوشی کے جو ستارے دمکتے دیکھے تھے وہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور وہاں ہی کافی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ اب اپنی ماں اور بہن کا اسے خود خیال رکھنا ہے۔ گڑیا جو گھر میں ڈری سہمی رہتی تھی اس وقت چہک رہی تھی اور اماں کی آنکھوں کا خوف اور چہرے پر چھائی بے بسی اور بے چارگی اس وقت کہیں نہیں تھی۔

''اماں جی......'' ان کا ہاتھ اپنے توانا ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تھی۔

''اب ہم ہر ویک اینڈ پر باہر آیا کریں گے۔''

''نہیں۔'' اماں ایک بار پھر سہم گئی تھیں۔

''تمہارے ابا بہت ناراض ہوں گے رومی، بہت خفا ہوں گے۔''

''ہوتے رہیں اماں جی۔'' اس نے بے پروائی سے کہا تھا۔ ''یہ چند گھنٹے جو ہم نے آپ نے اور گڑیا نے گھر سے باہر گزارے ہیں، یہ ہماری زندگی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ یہ تازہ ہوا کے جھونکے ہیں جو اس گھر میں نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے لیے خوشیوں کے چند لمحے تلاش کرنے کا حق ہے اور میں یہی حق استعمال

کروں گا آپ ابا کی پروا نہیں کریں۔''

اور وہ کیسے پروا نہیں کرتیں...... وہ رات جو انہوں نے گزاری تھی اس کی اذیت انہوں نے کیسے برداشت کی تھی یہ وہی جانتی تھیں۔ اس رات بڑے دنوں بعد وہ ان کے کمرے میں آئے تھے۔ آج انہوں نے بچوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارہ تھا۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ یوں خوش ہوئی تھیں۔ بچوں کی خوشی کے خیال سے ان کی آنکھیں دمک رہی تھیں اور رخساروں پر جیسے رنگ سے بکھرے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھیں اور ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ عشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں اور مگن سی نگاہیں جھکائے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی حبیب خان کی نظر اُن کے چہرے پر پڑی تھی اور وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

یہ امینہ تھی ان کی بیوی اتنی دلکش، ایک لحۂ حیرت تھا جس سے گزر کر وہ ان کے قریب آئے تھے اور پھر اپنی انگلیاں ان کے بازو میں چبھو دی تھیں۔ اذیت سے ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا لیکن حبیب خان کے ناخن ان کی کھال ادھیڑ چکے تھے۔

''یہ رومی کو کیا سبق پڑھاتی رہتی ہو تم؟'' انہوں نے ہونٹ بھینچ کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔ تب ان کی ٹھوڑی کے نیچے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا رکھ کر ان کا چہرہ اونچا کیا تھا۔

''بغاوت یہ اکسا رہی ہو میرے خلاف، میرے مقابلے پر کھڑا کرو گی اسے۔'' انہوں نے انگوٹھا ہٹا کر ایک تھپڑ ان کے رخسار پر مارا تھا۔

''اب تو تڑی (زبان) بند ہو گئی ہے تیری۔ بول کیا کہا ہے تو نے اسے۔'' دایاں ہاتھ رخسار پر رکھتے ہوئے امینہ کا دل جیسے ہزاروں کرچیوں میں تقسیم ہوا تھا۔

''میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود ہی...... گڑیا کی وجہ سے......''

''اچھا......!'' انہوں نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی انگلیاں ان کے بازوؤں میں چبھوئی تھیں۔

''بکواس کرتی ہو میرے ساتھ...... وہ میرا بیٹا ہے اگر آئندہ کوئی پلاننگ کی تو طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا اور بچے چھین لوں گا تم سے۔''

''نہیں...... نہیں پلیز......'' امینہ نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''میں منع کر دوں گی، نہیں جاؤں گی پھر کبھی۔''

اور ان کے بازو سے ہاتھ ہٹا کر وہ ان کے بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ اور اب دوسری طرح کی اذیت شروع ہوئی تھی۔ ان کے گداز بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے ان کے ہونٹوں سے زہر نکلا تھا۔

''یہ آدھی آستین والی قمیص پہن کر کیا باہر مردوں کو دکھانے گئی تھیں۔ کوئی نہیں ریجھتا تم پر۔''

''نہیں...... وہ میں نے تو چادر پہنی ہوئی تھی۔'' انہوں نے بہ مشکل سسکی کو ہونٹوں میں ہی دبایا تھا۔

''میری تو مجبوری ہے کہ تم میری بیوی ہو اور مجھے ایک دن اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے ورنہ تم جیسی عورت پر میرے جیسا کوئی مرد تھوکتا بھی نہیں۔'' اور ان کا جی چاہا کہ وہ کہیں پھر آپ مجھے فارغ کیوں نہیں کر دیتے اور کسی من پسند عورت سے شادی کیوں نہیں کر لیتے لیکن ہمیشہ کی طرح وہ کچھ نہیں کہہ سکی تھیں اور بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی تھیں۔ اور صبح انہوں نے رومی سے بازوؤں کے نیل اور کھرنڈ چھپانے کے لیے فل آستین کی شرٹ پہن لی تھی لیکن پھر بھی ناشتے کی ٹیبل پر رومی انہیں کھوجتی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔

''ابا نے کچھ کہا؟'' چودھری حبیب خان جب ناشتا کر کے اٹھ گئے تو رومی نے پوچھا۔

www.PakSociety.com

''نہیں تو انہوں نے تو کچھ نہیں کہا۔'' انہوں نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ باپ بیٹا مقابل آجائیں۔

''اچھا۔'' رومی کی گہری نظریں انہیں اندر تک اترتی محسوس ہوئی تھیں۔

''اگر وہ کچھ کہیں تو آپ بھی جواب دیا کریں، یوں چپ سادھ کر نہ بیٹھا کریں، وہ اور بھی شیر ہوتے ہیں۔ بلاوجہ آپ پر ہاتھ اٹھائیں تو آپ ان کا ہاتھ پکڑ لیں۔ لوگ ہم پر اس لیے زیادتی کرتے ہیں کہ ہم انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کرتے۔ ہم انہیں اپنے ساتھ زیادتی کرنے دیتے ہیں۔'' وہ آج انہیں نیا سبق پڑھا رہا تھا۔ انہیں یکدم رومی پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ ایسا کچھ کبھی بھی نہیں کر سکیں گی۔

ماموں ممانی اور ماں کی لاڈلی امینہ جو ہر وقت چہکتی رہتی تھی اور ماموں پیار سے اسے مینا کہا کرتے تھے۔ حبیب کی زندگی میں آکر ایسی چپ ہوئی تھی کہ کوئی بات کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچتی تھی۔ حبیب خان نے پہلے روز ہی اسے ریجیکٹ کر دیا تھا۔

''تم میرے قابل ہرگز نہیں تھیں۔ دراصل ابا نے مجھے پال کر جو احسان مجھ پر کیا تھا اس کا بدلہ لے لیا ہے مجھ سے۔ اور میں نے بھی تمہیں قبول کر کے وہ احسان چکا دیا ہے۔'' وہ حیران سی حبیب کو دیکھتی رہ گئی تھی جس نے نظر بھر کر اسے دیکھا بھی نہیں تھا حالانکہ اس کی سہیلیوں نے کتنی ہی بار اسے بتایا تھا کہ آج اس کے روپ پر نظر نہیں ٹھہر رہی۔ آج تو حبیب بھائی چاروں شانے چت گر جائیں گے۔ تاب نہیں لاسکیں گے اس ملیح حسن کی۔ اس روز اور اس کے بعد کتنی ہی بار انہوں نے سوچا تھا وہ کتنی بد نصیب ہیں لیکن آج انہیں رومی کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ نہیں وہ تو بڑی خوش نصیب ہیں ...... ان کا بیٹا کتنا سجیلا اور کتنا بانکا تھا۔ ''یا اللہ رومی کو نظرِ بد سے بچانا۔'' انہوں نے فوراً ہی اس کے چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں۔

رومی سے وعدہ کر لینے کے باوجود وہ اپنے اندر ہمت پیدا نہ کر سکی تھیں اور جب اگلے ویک اینڈ پر رومی نے انہیں باہر چلنے کو کہا تو وہ سہم گئی تھیں۔ اس رات کی اذیت رگ وپے میں زندہ ہو گئی تھی۔ بازوؤں میں جلن ہونے لگی تھی جہاں اب بھی ناخنوں کے کھرنڈ موجود تھے۔

''نہ بیٹا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا؟'' وہ پریشان ہوا تھا۔

''بس طبیعت اچھی نہیں ہے تم اور گڑیا چلے جاؤ لیکن ان کے بغیر دونوں کو زیادہ مزہ نہیں آیا تھا اور وہ دونوں ہی جلدی واپس آگئے تھے۔ اور پھر جب اگلی بار بھی انہوں نے جانے سے انکار کیا تو رومی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اماں ابا سے خوف زدہ ہیں۔ اس روز وہ گڑیا کو باہر سے گھما کر لے آیا تھا لیکن دوسرے روز شام کی چائے پیتے ہوئے اس نے اماں سے کہا تھا۔

''اماں آج رات باہر کھانا کھانے چلیں گے۔ آپ تیار ہو جائیے گا۔'' اور ابا کے حسد سے بگڑتے نقوش کو دیکھ کر وہ بے حد محظوظ ہوا تھا۔ اور بہت دنوں بعد اس نے حبیب خان کو مخاطب کیا تھا۔

''آپ بھی چلیں۔''

''میں۔'' انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا اور نخوت سے ان کی گردن اکڑ گئی۔ ''میں اس عورت کے ساتھ باہر کسی ہوٹل میں کھانا کھانے جاؤں۔''

''یہ عورت آپ کی بیوی ہے۔'' رومی کی آنکھوں میں غصہ ..... بل کھا رہا تھا۔ ''اور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کہیں باہر جا کر کھانا کھانا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔''

''تمہیں لگتا ہے کہ یہ عورت میری بیوی بننے کے قابل تھی ؟'' ان کے نتھنوں سے جیسے دھواں نکل رہا تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ آپ میری ماں کے قابل نہیں تھے۔'' اماں کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو گیا اور ان کے ہاتھوں کی لرزش رومی سے چھپی نہ رہ سکی تھی جبکہ وہ غصے سے ٹرالی کو ٹھوکر مارتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔ ٹرالی الٹ گئی اور چیزیں نیچے کارپٹ پر بکھر گئی تھیں۔

''میں اس عورت کے قابل نہیں۔'' انہوں نے اماں کو دھکا دینے کے لیے بازو آگے بڑھایا تھا لیکن رومی نے آہستگی سے ان کا ہاتھ پیچھے کر دیا اور اماں جو زمین پر گری ٹرالی سیدھا کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تھیں انہیں ایک ہاتھ سے اپنے پیچھے کیا اور خود جیسے ڈھال بن کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''میں۔'' وہ دہاڑے تھے۔ ''میرے جیسا وجیہہ اور خوب صورت مرد اتنا اعلیٰ تعلیم یافتہ اس عورت کے قابل نہیں تھا۔'' انہوں نے قہقہہ لگایا۔

''تمہارا دماغ اس عورت نے خراب کر دیا ہے رومی، ورنہ تم اس بات پر فخر کرتے کہ تمہارا باپ دنیا کا خوب صورت ترین اور بہترین شخص ہے۔'' رومی نے ایک گہری سانس لی تھی۔

''اور مجھے لگتا ہے جیسے میرا باپ دنیا کا بد صورت ترین مرد ہے۔ خوب صورت وہ نہیں ہوتا ابا جی جس کا ظاہر خوب صورت ہو اصل خوب صورت وہ ہوتا ہے جس کا اندر بھی خوب صورت ہو۔'' وہ اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا تھا اور حبیب خان وہیں کھڑے تلملاتے رہے۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے نازو کو آواز دی تھی۔

''نازو، یہ سب سمیٹ لو۔'' اور نازو تو جیسے کہیں آس پاس ہی کھڑی ہوئی تھی کہ ایک دم لاؤنج میں آگئی۔

اس رات اس نے اماں کو اپنے کمرے میں جانے نہیں دیا تھا۔ وہ جانتا تھا رات اگر اماں اپنے کمرے میں اکیلی ہوئیں تو ابا نے انہیں اذیت دینی ہے۔

''تم ایسا کیوں کرتے ہو رومی ...... وہ تمہارے باپ ہیں۔'' آنے والے کسی لمحے کے خوف سے... تھر تھر کانپتے ہوئے انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''ہاں، مجھے اس رشتے کا احترام ہے لیکن میں انہیں آپ پر ظلم کرنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی میں یہ سب دیکھ رہا ہوں اماں جی لیکن اب برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔''

''پر بیٹا اس طرح ان کا غصہ اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ......''

''آج تک انہیں کسی نے ایسا کرنے سے منع نہیں کیا۔ دادا جان اور دادی جان یہاں نہیں تھے، وہ اپنی من مانی کرتے رہے لیکن اب میں انہیں من مانی نہیں کرنے دوں گا۔ میں روز روز آپ کی عزتِ نفس مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتا اماں جی۔ ابا جی کو خود کو بدلنا ہوگا۔'' لیکن شاید اس سے وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ انہیں بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

اس رات اماں اور گڑیا اس کے بیڈ پر سوئی تھیں اور وہ کارپٹ پر تکیہ رکھ کر سو گیا تھا۔ رات کو اچانک اس کی آنکھ کھلی تھی وہ پانی پینے کے لیے اٹھا تو نائٹ بلب کی روشنی میں اس کی نظر اماں کے بازو پر پڑی تھی۔ وہ گڑیا کے گرد بازو رکھے گہری نیند سو رہی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر ساکت کھڑا ان کے بازو کو دیکھتا رہا تھا۔ جگہ جگہ پڑے ہوئے نیل۔ اور پھر بازو پر سے ہوتی اس کی نگاہ ذرا کی ذرا اماں کی گردن پر پڑی تھی۔ وہاں بھی کئی ایسے ہی نیل تھے۔ وہ سارا دن فل آستین کی قمیص پہنے اچھی طرح دوپٹا اپنے گرد لپیٹے رکھتی تھیں۔

''نہیں۔'' اس نے نظریں ان پر سے ہٹالی تھیں اور پھر وہ پوری رات نہیں سو سکا تھا۔ ایک بار پھر اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اماں کو بہت جلد اس

عقوبت خانے سے لے جائے گا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے۔ اس رات اس نے کارپٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک لائحۂ عمل بنایا تھا۔ ابھی وہ فرسٹ ائیر میں تھا۔ اماں صحیح کہتی تھیں اس کا غصہ اور ابا سے بحث اماں کے لیے زندگی کو مزید مشکل بنا رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ اب ان سے کچھ نہیں کہے گا لیکن اماں اور گڑیا کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھے گا۔ وہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا اور اس نے اگلے دو سالوں میں ایسا ہی کیا تھا۔

وہ کالج سے آتے ہی اماں کے ساتھ ساتھ رہنے لگا تھا خاص طور پر جب ابا گھر پر ہوتے۔ وہ گڑیا کو ڈھیروں کہانیاں سناتا۔ اس کا ہوم ورک کرواتا، اسے گھمانے لے جاتا، اس کے لیے اپنے جیب خرچ سے ڈھیروں چیزیں لاتا۔ اماں کے لیے شاپنگ کرتا، خوب صورت زمانے کے مطابق ڈریس خریدتا، سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی اس کی سوچ ایک میچور شخص کی سی تھی۔

''میں آرمی جوائن کروں گا۔'' اس نے اماں کو بتایا۔ ''میری ٹریننگ کے چند سال آپ تنہا ہوں گی یہاں...... آپ کو اپنا اور گڑیا کا خود خیال رکھنا ہے۔ پھر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔'' یہ اس کا فیصلہ تھا۔

وہ اماں کا سایہ بنا ہوا تھا پھر بھی ابا کو کسی نہ کسی وقت اماں پر ہاتھ اٹھانے اور چیخنے چلّانے کا موقع مل ہی جاتا تھا۔ اس نے کئی بار اماں کی پیشانی پر گومڑ ابھرا دیکھا تھا اور نظر انداز کیا تھا۔ کئی بار ان کے رخساروں پر انگلیوں کے نشان ثبت دیکھے تھے اور دل خون کے آنسو رویا تھا لیکن اس نے ابا سے باز پرس کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی باز پرس اماں کو مزید اذیت دیتی ہے۔ اس روز جب وہ اپنا ایف ایس سی کا آخری پریکٹیکل دے کر گھر آیا تو ابا کی دہاڑ لاؤنج سے باہر تک آ رہی تھی اور نازو لاؤنج کی دیوار کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نازو پر ایک غصیلی نظر ڈال کر وہ تیزی سے لاؤنج کی طرف بڑھا۔ اماں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

''میں...... مجھے کچھ علم نہیں۔'' رومی وہیں ساکت کھڑا ہوگیا۔

''بکواس کرتی ہے، وہ بڈھا ساری جائداد تیرے نام لکھ گیا۔ گاؤں کی ساری زمینیں، حویلی، سرگودھا کے مربعے سب کچھ اور تو کہتی ہے تجھے علم نہیں۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پشاوری جوتا ان کی پیٹھ پر مارا تو وہ جو بت بنا کھڑا تھا تڑپ کر آگے بڑھا۔

''ابا جی......!'' وہ زور سے بولا۔ ''خبردار اب اگر میری ماں کو ہاتھ لگایا تو۔''

''تو......'' انہوں نے مڑ کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور ایک لات اماں کو ماری۔ اماں لڑکھڑائی تھیں۔ رومی نے تیر کی طرح آگے بڑھ کر انہیں اپنے بازوؤں میں سنبھالا لیکن وہ بھربھری مٹی کی طرح اس کے بازوؤں میں ڈھیر ہوگئی تھیں۔

''اماں جی...... اماں جی۔'' اس نے انہیں آرام سے صوفے پر لٹاتے ہوئے پکارا تھا۔ ہولے ہولے ان کے رخساروں کو تھپتھپایا پھر ان کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اسے لگا جیسے ان کی نبض ڈوب رہی تھی اور ایک خوفناک سی ٹھنڈک پورے وجود میں سرائیت کرتی جا رہی تھی۔

''میری ماں کو اگر کچھ ہوگیا تو میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے روتے ہوئے چیخ کر کہا اور پھر دونوں بازوؤں میں انہیں اٹھائے تیزی سے لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے اس نے نازو سے گاڑی کی چابی لانے کو کہا اور خود تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

ایکس اسٹوڈنٹ

تابندہ جبیں

سرآذر کی شخصیت میں عجیب طلسماتی کشش تھی۔ وہ جب پہلی بار ان کی اکیڈمی آئی تب ہی ان کی شخصیت سے مرعوب ہوگئی تھی۔ عظمیٰ اس کی کلاس فیلو تھی۔ پہلی بار اس نے عظمیٰ کے منہ سے سرآذر اور ان کی اکیڈمی کے بارے میں سنا تھا۔ ابا کا اس شہر میں نیا نیا تبادلہ ہوا تھا۔ اس کی سابقہ تعلیمی پوزیشن کی وجہ سے شہر کے بہترین کالج میں اس کا ایڈمیشن آسانی سے ہوگیا تھا پھر بھی کوچنگ کا مسئلہ تو برقرار تھا۔ بی ایس سی

www.Paksociety.com

کے مضامین کی خود سے تیاری کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ بے شک اس کا اکیڈمک ریکارڈ شاندار تھا لیکن اس کے پیچھے اس کی ذہانت کے ساتھ ساتھ بہترین کوچنگ اور اچھے ٹیوشن سینٹروں کا بھی دخل تھا اب بھی اس نے ابا کے کان کھالیے تھے کہ کسی اچھے سے ٹیوشن سینٹر کا پتا کردیں لیکن ابا کی اپنی مصروفیات تھیں۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی ہوم ٹیوشن کا بندوبست تو ہوگیا بس اس کا مسئلہ ہنوز برقرار تھا۔ نیا کالج، مشکل پڑھائی، پرانے دوستوں کا ساتھ چھوٹنے کا غم، اس کے ساتھ آج کل کوئی ایک مسئلہ تھوڑی تھا۔ کلاس میں لڑکیوں کے اپنی اپنی دوستوں کے گروپ تھے۔ بلاوجہ کسی کے گروپ میں گھس کر لڑکیوں سے دوستی گانٹھنے کی کوشش کرنا...... اس کا ایسا مزاج ہی نہ تھا پھر شاید خود لڑکیاں بھی اس کی ذہانت اور خوب صورتی سے کچھ ایسی مرعوب تھیں کہ کسی نے خود سے اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوشش ہی نہیں کی۔

کالج میں اپنے پہلے دن جب اس نے کلاس ٹیچر کے کہنے پر اپنا تعارف کروایا تو اس کے سابقہ تعلیمی ریکارڈ کے متعلق جان کر ٹیچر نے توصیفی کلمات سے نوازا۔ ساری کلاس بھی اس کی شستہ اور انتہائی رواں انگریزی سن کر مرعوب ہوگئی تھی۔

ذہانت کے ساتھ ساتھ خوب صورتی بھی اسے ورثے میں ملی تھی سو لڑکیوں کا متاثر ہونا فطری سی بات تھی۔ ایسے لوگوں کے متعلق خود سے مفروضہ گھڑ لیا جاتا ہے کہ وہ مغرور ہوں گے سو وہ اسی غلط فہمی کا شکار ہوکر کالج میں لڑکیوں کے ہجوم کے باوجود تنہائی کا شکار تھی۔ آہستہ آہستہ لڑکیوں کو اندازہ ہوا کہ انہوں نے اس کے متعلق اندازہ لگانے میں جلد بازی سے کام لیا ہے سو مسکراہٹوں کے تبادلے کے ساتھ اکثر لڑکیاں اس سے علیک سلیک کرنے لگی تھیں، وہ بھی اسی کو غنیمت جان کر انتہائی خوش دلی سے لڑکیوں سے ملنے لگی۔

اس کالج میں جانے بیسٹ فرینڈ تو کب جاکر بنی تھی مگر اکثر لڑکیوں سے خاصی اچھی سلام دعا ہوگئی تھی۔ عظمیٰ بھی اس کی ایسی ہی کلاس فیلو تھی جو شروع میں اس کی شخصیت سے قدرے خائف تھی مگر اب بہت تپاک سے خود سلام میں پہل کرتی اور ایک دن فری پیریڈ میں جب عظمیٰ کی اپنی سہیلی چھٹی پر تھی وہ اس کے پاس آ... بیٹھی اور اسی نشست میں اس کو آج کل درپیش سب سے بڑے مسئلے کا حل مل گیا تھا۔

سر آذر کی اکیڈمی جو اتفاق سے اس کے گھر سے کچھ زیادہ فاصلے پر بھی نہ تھی کلاس کی اکثر لڑکیاں وہیں پڑھنے جارہی تھیں۔ وہ امی ابا سے اجازت لے کر پہلے دن عظمیٰ کے ساتھ ہی اکیڈمی گئی تھی۔ عظمیٰ نے اس کا سر آذر سے تعارف کروایا اور پہلی بار اپنے اکیڈمک ریکارڈ سے مدِ مقابل کو متاثر کرنے کے بجائے وہ خود ان کے متاثرین میں شامل ہوگئی تھی۔ پینتیس، چھتیس سالہ سر آذر مردانہ وجاہت کا شاہکار تھے۔ ان کی پرسنیلٹی، رکھ رکھاؤ، بولنے کا انداز اور سب سے بڑھ کر ان کی ڈارک براؤن چمکدار آنکھیں جو کبھی کبھار شرارتی انداز میں مسکرانے لگتیں اور مدِ مقابل کنفیوز سا ہوجاتا کہ کہیں کوئی احمقانہ بات تو سرزد نہیں ہوگئی ہے۔ ان کے پڑھانے کا انداز بھی بہت دلکش تھا بظاہر کوئی سختی اور رعب نہیں تھا پھر بھی اسٹوڈنٹس بہت دلجمعی سے پڑھتے تھے، ان کے اسٹوڈنٹس میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی لیکن اسے دو چار دن پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ سر آذر اپنے اسٹوڈنٹس میں کوئی خاص فرق روا نہیں رکھتے تھے بلکہ لڑکیوں کو تو خصوصی احترام دیتے تھے۔ اکثر لڑکیاں بے تکلف ہونے کی کوشش کرتیں لیکن سر آذر لڑکیوں کی ایسی شوخیوں کو نظر انداز کردیتے، وہ کسی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن وہ ”کسی“ کے زمرے میں نہیں آتی تھی۔ وہ

علیزہ شبیر خان تھی، بہت جلد اس کا شمار سر آذر کی فیورٹ اسٹوڈنٹس میں ہونے لگا تھا۔ سر آذر اس کے لیے کیا اہمیت رکھتے تھے اس کا اندازہ اسے خود نہیں تھا بس اسے یہ پتا تھا کہ وہ کالج جاکر بہت بے چینی سے چھٹی کا انتظار کرنے لگتی تھی۔ وہ اور عظمیٰ کالج کے بعد ڈائریکٹ اکیڈمی جاتے تھے اور اکیڈمی میں گزارے گئے ڈھائی تین گھنٹے اسے اپنی زندگی کا حاصل لگتے تھے۔

☆☆☆

ٹیوشن پڑھ کر گھر واپس آنے کے بعد بھی اس کا سارا دھیان گزرے وقت کی جانب لگا رہتا۔ بہت مشکل سے دھیان جھٹک کر وہ پڑھائی کی جانب متوجہ ہوتی اور پھر رات گئے تک پڑھائی میں جتی رہتی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ ٹیوشن ٹائم میں کوئی اسٹوڈنٹ پڑھائی میں اس سے آگے نکل جائے، اس کی محنت رنگ لارہی تھی۔ سر آذر اکثر و بیشتر اسے توصیفی کلمات سے نوازتے، دوسرے اسٹوڈنٹس کو اس کی مثال دیتے اور ایسے کسی بھی موقع پر اس کا سر فخر سے بلند ہوجاتا۔ اسے کسی دوسرے کی تعریف و توصیف سے کوئی غرض نہیں تھی .... سر آذر کی نگاہوں میں اس کی اہمیت بڑھ جائے اس کی منشا بس یہی تھی حالانکہ وہ پہلے بھی کوایجوکیشن میں پڑھی تھی خصوصاً ٹیوشن سینٹر میں تو ہمیشہ کوایجوکیشن ہی ہوتی تھی جہاں فی میل ٹیچر کے مقابلے میں میل ٹیچر سے پڑھنے کا زیادہ اتفاق ہوتا تھا لیکن اس کے دل کی حالت کبھی ایسے نہیں ہوئی تھی جیسے آج کل ہورہی تھی۔ حالانکہ وہ سر آذر کے مقابلے میں بہت کم عمر تھی۔ عمروں کے تفاوت سے وہ بخوبی آگاہ تھی خود کو وہ بارہا سمجھاتی تھی کہ یہ پسندیدگی محض استاد اور شاگرد کے مابین رشتے والی پسندیدگی ہے لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی جو سر آذر کو دیکھ کر دھڑک دھڑک جاتا۔ وہ لیکچر دیتے اور وہ مسحور سی ہوکر انہیں سنتی رہتی۔ وہ مشکل سے مشکل ٹاپک کو بھی ایسے سہل انداز میں روزمرہ زندگی کی مثالیں دے کر بیان کرتے کہ مشکل ترین ٹاپک آسان لگنے لگتا۔ دورانِ گفتگو برجستہ اور برمحل اشعار کا استعمال کرتے شعروشاعری سے علیزہ کو خود بھی خاصا لگاؤ تھا وہ ایک مصرعہ پڑھ کر اسٹوڈنٹس کو دیکھتے کہ شاید کوئی شعر مکمل کردے اور ہر بار علیزہ دوسروں پر سبقت لے جاتی۔

”میرا اپنی زندگی میں پہلی بار کسی ایسی لڑکی سے پالا پڑا ہے جو تعلیمی قابلیت سے ہٹ کر ایسا اچھا ادبی ذوق رکھتی ہے۔“ ایک دن سر آذر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور سر آذر کا یہ فقرہ کتنے ہی دنوں تک اس کے کان میں گونجتا رہا۔ ایک دن جب وہ طبیعت خرابی کی وجہ سے اکیڈمی نہیں جاپائی تھی۔

”آپ نے کل کی چھٹی کرکے خوب مزے کیے اور یہاں ہم سب بہت بور ہوئے۔ اتنا انٹرسٹنگ ٹاپک تھا آپ کے سوالوں کے بغیر بالکل بورنگ بن گیا۔“ سر آذر نے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔

وہ جھینپ کر ہنس دی تھی۔

تھوڑے دنوں بعد اس نے دانستہ دو، تین دن کی اکٹھی چھٹی کی محض یہ جاننے کے لیے کہ وہ اس کی غیر موجودگی کا نوٹس لیتے بھی ہیں یا نہیں اور چوتھے دن وہ اکیڈمی گئی تو سر آذر نے کتنی خفگی سے اسے ٹوکا تھا۔

”آئندہ آپ نے کوئی چھٹی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا مس خان۔“

علیزہ اس بار بھی سر جھکا کر رہ گئی۔ ان کی ڈارک براؤن آنکھوں میں دیکھنے کی وہ خود میں تاب نہیں پاتی تھی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی کتنی ہی باتیں تھیں جو علیزہ خان اپنی یادوں کے کشکول میں سکوں کی طرح سینت سینت کر محفوظ کرتی رہی اور پھر وہ ہوگیا جس کا علیزہ شبیر خان نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔

ابا کے ایک بار پھر ٹرانسفر آرڈر آگئے۔ ابا جیسے اصول پسند اور ایماندار افسر کے لیے یکے بعد دیگرے یہ ٹرانسفر کچھ اچنبھے کی بات نہیں تھی اور اس بار تو انہیں ترقی کا پروانہ بھی ساتھ تھمایا گیا تھا۔ نئے شہر میں نسبتاً بڑی رہائش گاہ کے ساتھ دوسری سہولیات بھی ملنے کا امکان تھا سو اس بار ابا کے ٹرانسفر پر ان کا پورا گھرانا خوش اور پُرجوش تھا سوائے اس کے۔ اس کا جی جیسے دنیا کی ہر شے سے اچاٹ ہوگیا تھا اور شومیٔ قسمت ان دنوں سر آذر بھی اپنے کسی بھائی یا بہن کی شادی کی وجہ سے چھٹی پر تھے، ان کی جگہ ایک عمر رسیدہ پروفیسر صاحب ان کی کلاس لے رہے تھے۔ وہ ہر روز اس امید پر اکیڈمی جاتی کہ آج سر آذر آئے ہوں گے مگر ہر بار امید مایوسی میں ڈھل جاتی۔

☆☆☆

پھر وہ دن بھی آگیا جب انہوں نے اس شہر کو بھی الوداع کہہ دینا تھا۔ وہ عظمیٰ کا ٹیلی فون نمبر لے کر دکھے دل کے ساتھ نئے شہر سدھاری۔ گھر والے اس کی افسردگی کو کالج اور دوست چھوٹنے پر محمول کر رہے تھے مگر وہ کسی کو کیا بتاتی کہ نہ تو کالج سے اس کی کچھ ایسی وابستگی ہو پائی تھی نہ ہی نئی دوستوں سے اس قدر گاڑھی چھننے لگی تھی کہ وہ ان کا ساتھ چھوٹنے کا غم مناتی۔ اپنے بے نام غم کو وہ کسی سے شیئر ہی نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ دن گزرنے کے بعد اس نے عظمیٰ کو فون کیا۔ اس کے پاس بہت سی لایعنی باتیں اور بے مقصد قصے تھے۔ علیزہ کوفت زدہ ہو کر اس کی باتیں سنتی رہی پھر آخر میں لہجے کو سرسری سا بناتے ہوئے اس نے اکیڈمی اور سر آذر کے بارے میں پوچھا۔

''ہاں سر آذر! یار وہ تو تمہارے جانے کے دو دن بعد ہی واپس آگئے تھے۔ شکر ہے ان بابا پروفیسر جی سے ہماری جان چھوٹی۔ سچ ان کا پڑھایا ہوا تو ایک لفظ بھی پلّے نہیں پڑتا۔'' عظمیٰ ہنسی تھی۔

''تم نے میرے بارے میں بتادیا کہ میں شہر چھوڑ کر جاچکی ہوں۔'' علیزہ نے لہجے کو اس بار بھی نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''ہاں یار، دو، تین دن تک تو سر آذر اسی گمان میں رہے کہ تم بیماری وغیرہ کی وجہ سے چھٹی پر ہوگی مگر پھر انہوں نے پوچھ ہی لیا اور جب میں نے تمہارے ابا کے ٹرانسفر کے بارے میں بتایا تو چپ سے ہوگئے پھر کہنے لگے' میں بھی کہوں مس خان مجھے بتائے بغیر اتنی لمبی چھٹی پر تو جا نہیں سکتیں۔''

''اچھا بس یہی کہا؟'' علیزہ نے ہولے سے پوچھا۔

''ہاں، یہ بھی پوچھا کہ آخر علیزہ کے ابا ہیں کس محکمے میں جو یوں آنا فاناً ان کا ٹرانسفر ہوجاتا ہے۔'' عظمیٰ نے بتایا تو علیزہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی' وہ تصور میں سر آذر کا جھنجلایا ہوا چہرہ دیکھ سکتی تھی۔

''اچھا اور سناؤ پڑھائی کیسی ہورہی ہے آج کل؟'' اس نے قصداً موضوع بدلا ورنہ عظمیٰ کھٹک سکتی تھی۔

''پڑھائی اچھی ہی ہورہی ہے یار بلکہ آج کل تو سر آذر ٹیسٹ پر ٹیسٹ لے رہے ہیں۔ کسی سے کوئی رعایت نہیں کرتے، جانے آج کل انہیں اتنا غصہ کیوں چڑھا رہتا ہے لیکن خیر ہمارے لیے تو اچھا ہے بے عزتی کے ڈر سے تیاری کر کے ٹیسٹ دیتے ہیں ورنہ پہلے تو سر آذر اتنے نرم مزاج سے تھے کہ آنسر شیٹ خالی بھی چھوڑ آتے تو کوئی ڈر نہیں ہوتا تھا مگر اب کچھ چڑچڑے سے ہورہے ہیں' کل بھی عرفان موٹو کی وہ کلاس لی کہ الامان الحفیظ...... ساری کلاس کو سانپ سونگھ گیا تھا اور آج شاید اسی لیے عرفان موٹو پڑھنے ہی نہیں آیا، امیر باپ کا بیٹا ہے نا اسی لیے نخرے آسمانوں کو چھوتے ہیں بلکہ میں تو کہہ رہی تھی ......'' عظمیٰ جانے کیا رام کتھا سنانے لگی' اس نے کریڈل پر انگلی

رکھ کر رابطہ منقطع کردیا۔ دل و دماغ پر سرخوشی کا عالم طاری ہورہا تھا۔

بکھرے بکھرے، الجھے الجھے، چڑچڑے سے سر آذر...... عظمیٰ ان کے غصے کی وجہ نہیں جانتی تھی مگر وہ جانتی تھی۔ عظمیٰ کی باتوں سے اسے سر آذر کی زندگی میں اپنی حیثیت کا تعین ہو چلا تھا۔ وہ اب قدرے مطمئن تھی لیکن یہ اطمینان عارضی تھا' کچھ دن بعد اس نے عظمیٰ کو فون کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ واجبات کی عدم ادائیگی کی وجہ سے ان کا فون کٹ چکا ہے، اس کے پاس عظمیٰ کا کوئی اور نمبر موجود نہیں تھا۔ موبائل بھی ان دنوں اتنے عام نہیں تھے' وہ بار بار عظمیٰ کے گھر فون کرتی مگر مسلسل مشینی آواز سے ہی واسطہ پڑتا تو جھنجلا کر ریسیور پٹخ دیتی۔ اسے افسوس ہوا کہ اکیڈمی میں کسی اور لڑکی سے رابطہ نمبر کیوں نہیں لیا۔ اس کے پاس تو عظمیٰ کا دوسرا نمبر بےشک نہ تھا لیکن وہ یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتی کہ عظمیٰ کے پاس تو اس کا نمبر موجود ہے۔ وہ کبھی نہ کبھی تو اسے فون کرے گی' مگر یہ انتظار انتظار ہی رہا اور پھر عظمیٰ سے اس کا کوئی اتنا گہرا یارانہ بھی نہیں تھا سو اسے دل کو سمجھانا ہی پڑا کہ یہ انتظار لاحاصل ہے اور دل جس چیز کی تمنا کرنے لگا تھا وہ لاحاصل ترین ہے۔ کچھ وقت تو لگا مگر آخر کار دل و دماغ نے یہ حقیقت تسلیم کر ہی لی کہ اب کچھ ہونا ممکن نہیں۔

سر آذر اس کے دل میں ایک یاد بن کر ہمیشہ کے لیے امر ہوگئے لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس کے بعد اس کے دل کو پھر کوئی جچا ہی نہیں۔ وہ ہر کسی کو سر آذر کی شخصیت کے پیمانے پر پرکھنے لگی تھی۔ ان کی ڈریسنگ، بولنے کا انداز، لڑکیوں کو احترام دینے کا طریقہ، ادبی ذوق..... انتہائی ویل مینرڈ اسٹائلش، کول پرسنیلٹی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ علیزہ کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ اس کی ایک دن کی غیر حاضری کا بھی سخت نوٹس لیتے۔

درجنوں طالبات آتی تھیں وہاں مگر سر آذر کو سوائے علیزہ کے کسی کے آنے یا نہ آنے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا، وہ محض اپنا لیکچر ڈیلیور کرتے تھے مگر علیزہ کو باقی طالبات سے الگ مقام دیتے تھے۔ وہ اب بھی اپنے اور سر آذر کے مابین رشتے کو محبت کا نام دینے سے ہچکچاتی تھی کہ استاد، شاگرد کے رشتے کا تقدس آڑے آتا تھا مگر یہ محض استاد، شاگرد کے مابین پروان چڑھنے والی پسندیدگی بھی نہیں تھی۔ یہ بے نام سا جذبہ علیزہ خان کی پوری زندگی پر محیط ہوگیا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ بھی سر آذر کے سینے میں جگمگاتی یاد بن کر زندہ رہے گی۔

☆☆☆

زندگی یونہی گزرتی رہی بی ایس سی کے بعد ایم ایس سی اور پھر ایم فل۔ وہ تعلیمی قابلیت کے میدان میں جھنڈے گاڑتی رہی اور تعلیم کا سلسلہ مکمل ہونے کے بعد روایتی مشرقی لڑکیوں کی طرح پیا دیس سدھار گئی۔ شہریار اچھا لائف پارٹنر ثابت ہوا تھا مگر اس کی شخصیت میں پھر بھی وہ تمام خوبیاں یکجا نہ تھیں جن کی وہ متمنی تھی، وہ خوبیاں صرف سر آذر کی ذات میں جمع تھیں۔ سر آذر کو اب بھی وہ ٹین ایج کی پسندیدگی کا نام نہیں دیتی تھی، وہ اس کے آئیڈیل کے سنگھاسن پر ایسے براجمان ہوئے تھے کہ پھر اترنے کا نام نہیں لیا۔ کچھ وقت مزید آگے سرکا تو اس کی گود میں ایک بچہ بھی آگیا۔ آسودہ زندگی میں کبھی کبھار بے نام سی تشنگی محسوس ہونے لگتی۔ پھر ایک عجیب اتفاق ہوا' اسے اپنے سسرالی رشتے داروں کے گھر ایک شادی اٹینڈ کرنے اسی شہر جانا پڑ گیا جہاں برسوں پہلے قلیل مدت کے قیام کے باوجود دل نے مستقل پڑاؤ ڈال لیا تھا۔

ماضی کے جن جذبوں کو وہ تھپک تھپک کر سلاتی آئی تھی وہ انگڑائی لے کر بیدار ہوگئے۔ وہ صرف ایک

بار سر آذر کو دیکھنا، ان سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے علم تھا کہ وہ برسوں پہلے اس کے اچانک شہر چھوڑ دینے کے فیصلے پر اس سے شکوہ کریں گے اور اس کے بعد قدرے سنبھلتے ہوئے اس سے موجودہ زندگی کے متعلق سوال جواب اور نیک خواہشات کا اظہار کریں گے۔

ان کی اکیڈمی اب بھی پوری شان سے اسی جگہ اِستادہ تھی۔ شادی کے ہنگاموں سے نمٹ کر اس نے میزبانوں سے رخصت چاہی کہ وہ اس شہر میں اپنی پرانی سہیلی سے ملنے جارہی ہے۔ وہ گاڑی کی آفر ٹھکراتے ہوئے ٹیکسی کر کے وہاں پہنچی تھی۔ اب وہ انیس بیس سالہ علیزہ شبیر خان نہیں تھی ایک شادی شدہ اور میچور عورت تھی مگر اس کا دل آج بھی اسی انداز سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سیدھی چلتی ہوئی کلاس روم میں داخل ہوئی تھی۔ سر آذر اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھے۔ ایک اجنبی شکل کو کلاس میں داخل ہوتے دیکھ کر سب اسٹوڈنٹس چونکے تھے۔ سر آذر نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ علیزہ بس انہیں دیکھتی رہ گئی...... لگتا تھا ماہ و سال نے ان کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں ڈالا بلکہ کنپٹی پر کچھ سفید بالوں کی موجودگی نے انہیں مزید جاذبیت اور وقار بخش دیا تھا۔ اس کے پاس بولنے کے لیے الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے، وہ سر آذر کی جانب سے بولنے کی منتظر تھی، انہوں نے ہی اسے مخاطب کیا تھا۔

''فرمائیے محترمہ کس بچے کی پروگریس معلوم کرنے آئی ہیں۔ ویسے آپ کو آفس میں بیٹھ کر میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ ابھی یہ پیریڈ آف ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں ...'' انہوں نے شائستگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ لہجہ جس کو سننے کے لیے کبھی اس کی سماعتیں بے چین رہا کرتی تھیں مگر ان کی نگاہوں میں شناسائی کی کوئی رمق نہ پا کر وہ ششدر رہ گئی تھی۔

''میں آپ سے ملنے آئی تھی سر۔'' اس کے منہ سے سرسراتی سی آواز نکلی اور وہ کچھ ٹھٹکے گویا پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''میں علیزہ شبیر خان۔'' اس نے گویا ان کی مشکل آسان کرنا چاہی مگر ان کے چہرے پر ہنوز وہی تاثرات تھے۔

''کچھ سال پہلے میں آپ کے پاس پڑھتی تھی پھر اچانک ہمیں یہ شہر چھوڑ کر جانا پڑا۔'' وہ ایک نئی امید سے انہیں یاد دلانے لگی۔

''آپ صحیح کہہ رہی ہوں گی بیٹا مگر گزشتہ برسوں میں سیکڑوں اسٹوڈنٹس مجھ سے پڑھ کر جا چکے ہیں۔ اس لیے نام اور شکلیں یاد کرنا اتنا آسان نہیں رہتا۔ شاگرد چونکہ ایک ہی استاد سے پڑھتے ہیں سو وہ استاد کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں... مگر استاد کے لیے یہ ممکن نہیں۔'' انہوں نے مربیانہ اور مشفقانہ سا انداز اختیار کیا تھا۔ وہ جیسے بدک کر پیچھے ہٹی۔ ''بیٹا'' کہہ کر انہوں نے جب بھی مخاطب نہیں کیا تھا جب وہ انیس سالہ لڑکی تھی، اب جب وہ ''عورت'' بن چکی تھی تو کتنی فراخدلی سے انہوں نے اسے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ شاید وہ اسے بھول چکے تھے۔ اس کے چہرے پر برسوں کی تھکن اتر آئی۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں سر! آج اتفاقاً میں یہاں سے گزر رہی تھی تو اکیڈمی کے بورڈ پر نگاہ پڑی سوچا آپ کو سلام کرتی چلوں۔'' اس نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

''بہت خوشی کی بات ہے یہ تو...... جب مجھ سے پرانے اسٹوڈنٹس آ کر ملتے ہیں تو مجھے واقعی خوشی ہوتی ہے، آپ آفس میں چل کر بیٹھیں، میں دس پندرہ منٹ تک آتا ہوں پھر آپ کی تواضع کرتے ہیں۔'' وہ خوش دلی سے مخاطب ہوئے مگر ایک ''اجنبی'' کی خوشدلی سے اسے کیا لینا دینا تھا، اس نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلائی۔

''میں چلتی ہوں سر دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے الوداعی سلام کر کے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

''سر کون تھیں یہ؟'' ایک کھنکتی ہوئی فریش سی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کے قدم کچھ سست پڑے۔

''تھیں ایک ایکس اسٹوڈنٹ، مجھ سے ملنے آئی تھیں۔'' سر آذر نے ملائمت سے جواب دیا۔

''ہماری ڈسکشن تو وہیں درمیان میں رہ گئی تھی سر، پھر آپ کیا کہتے ہیں کہ موجودہ جمہوریت ہمارے مسائل کا حل ہے یا نہیں۔''

شاید پڑھائی کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور سر آذر اپنے معمول کے مطابق آخری دس پندرہ منٹ میں کلاس میں غیر رسمی باتیں کر رہے تھے۔ اس نے یونہی سر موڑ کر پیچھے دیکھا۔ انیس بیس سالہ خوش شکل لڑکی جس کے چہرے سے ہی ذہانت ٹپکتی تھی اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے بہت دلجمعی سے سر آذر کو تک رہی تھی گویا ان کے جواب کی شدت سے منتظر ہو۔ اس کی آنکھوں کی چمک علیزہ کو اس کے دل کا حال بتا رہی تھی۔ وہ بھی یقیناً سامنے بیٹھے شخص کو اپنے آئیڈیل کے سنگھاسن پر بٹھا چکی تھی۔

''بات یہ ہے مس حیات کہ جمہوریت بذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن ہر خطے نے......'' سر آذر اپنے دل موہ لینے والے انداز میں اسے کچھ سمجھانے میں لگے تھے۔ علیزہ کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے تھکے تھکے قدموں سے اکیڈمی کا گیٹ عبور کر لیا۔ ٹیکسی والا بھی اس کا منتظر تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور وہ معمول کے انداز میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ٹیکسی کا دروازہ بند ہوا اور شاید زندگی کا ایک باب بھی۔

آہ...... بیگم اختر بیگانہ

شاعرہ، افسانہ نگار...... سچی کہانیوں کی خالق چل بسیں۔ جون کے پاکیزہ میں ان کی کتاب امر کہانی، کی تقریب کے بارے میں، میں نے لکھا تھا کہ گھر میں گر جانے کے باعث ان کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ آپریشن کے مراحل سے بھی وہ گزریں اور یوں تصویری رپورٹ نہیں لگ سکی تھی۔ اختر بیگانہ ماہنامہ پاکیزہ کی بے حد سینئر افسانہ نگار تھیں، آج سے بیس، بائیس سال پہلے ان کے افسانے پاکیزہ اور دیگر جرائد میں باقاعدگی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ اختر آپا کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آخری مجموعے امر کہانی کی تقریب میں نہ صرف میں نے شرکت کی تھی بلکہ عذرا رسول، رضوانہ پرنس، یاسمین رشید اور دیگر رائٹرز بھی موجود تھیں۔

ایک وضع دار خاتون تھیں، سب سے محبت کرنے والی جن کی باتوں میں ایک اپنا پن سا تھا اور جن سے مل کر ہر ایک کو ہی خوشی ہوا کرتی تھی۔ فی زمانہ ایسے لوگ بے حد کم ہیں۔ اب تو اکثر لوگ کسی دوسرے کو دعا بھی اس لیے نہیں دیا کرتے کہ خدشہ ہوتا کہ کہیں لگ نہ جاتے۔ ہم اختر بیگانہ کی شاعری، افسانوں یا کہانیوں کا مطالعہ کریں تو ان میں جو مماثلت ہمیں نظر آئے گی وہ سچائی ہے۔ اختر آپا کی ہر تحریر سچ کے گرد ہی گھومتی ہے۔ آج کا یہ دور کہ کامل اور کھرا سچ اپنی پوری توانائی صرف جھوٹ بولنے پر لگاتا نظر آتا ہے۔ جی ہاں آج کل لوگ جھوٹ ایسے بولتے ہیں جیسے سچ کہہ رہے ہوں۔ ایسے دور میں سچ کو پوری سچائی کے ساتھ لکھنے والے لوگ کم تو ضرور ہیں مگر موجود ہیں اور ان میں بیگم اختر بیگانہ کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کے اہلِ خانہ اور آپ کے چاہنے والوں کو یہ صدمہ جھیلنے کی ہمت عطا فرمائے، آمین۔

انجم انصار

www.Paksociety.com

قسط 7

زندگی

ناہید سلطانہ اختر

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں
...وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی
خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ
رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے
لوگ، بہت سے مواقع ایسے
ضرور ملتے ہیں... جب
محبت دستک دیتی ہے
...اور اس کی خوشبو
میں روشنی کی تابناکی
بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے
ساتھ ساتھ... مکر وفریب
... سفاکی اور تنگ نظری کے
سائے ...ازل سے محبت کرنے والوں
کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی
کبھی ترپ کی دگی بھی حکم کے اکے کو کاٹ دیا کرتی ہے...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول

جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی

www.Paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

دولت خان آفریدی تھے اور ماہتاب شنواری...... دولت خان کی پہلی منکوحہ بی بی جان تھیں۔ بی بی جان کی پہلی شادی دولت خان کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی۔ رحمت خان اپنے ساتھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے ان کے بعد پانچ بہنیں اور پھر دولت خان تھے۔ رحمت خان سے بی بی جان کے دو بیٹے ایاز خان اور ارباز خان تھے۔ دولت خان اپنے بڑے بھتیجے ایاز خان کے ہم عمر تھے۔ رحمت خان کو دل کا دورہ پڑا تو بی بی جان کی عدت کے بعد روایت کے مطابق ان کا عقد ثانی دولت خان سے کر دیا گیا۔ دولت خان کو اس نئے رشتے سے ایسی شرم آئی کہ وہ بغیر بتائے کراچی آ گئے اور آٹھ نو سال ایک پلمبرنگ کے استاد کے پاس رہے۔ پھر ایک ریکروٹنگ ایجنسی کے توسط سے کویت جانے کا موقع مل گیا۔ استاد کے کہنے پر ان کی بیٹی ماہتاب سے شادی کر لی۔ ماہتاب نے پرائمری اسکول میں نوکری کی اور بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر دولت خان کا ہاتھ بٹایا۔ دولت خان پردیس میں راہی ملک عدم ہو گئے مگر ماہتاب نے انتہائی حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا۔ بڑی بیٹی نایاب کو ڈاکٹر بنایا اور اچھا رشتہ آنے پر اس کی شادی کر دی۔ بہجت خان الیکٹریکل انجینئر تھا اور ایک پرائیوٹ ادارے سے وابستہ تھا۔ بہجت کی بیوی ارم، ماہتاب کی ایک کولیگ کی بھتیجی تھی۔ حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا اور وہ ایک محکمہ تعلیم میں سولہ گریڈ کی آفیسر تھی پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ مسٹریس کی اسامی کا اہل ثابت کیا۔ ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں حجاب کا تقرر کیا گیا۔ رباب انجینئر بننے جا رہی تھی۔ نایاب کے دو بیٹے تھے اور بہجت کی ایک بیٹی تھی انعم۔ ماہتاب اب چاہتی تھیں کہ حجاب کی شادی ہو جائے۔ تقدیم کی اماں سولہ سال سے معذور تھیں اور ابا کینٹ بورڈ میں ملازم تھے۔ تقدیم، تمہید، تسنیم، تعظیم اور تقدیس پانچ بہنیں اور ایک بھائی مونس تھا۔ اماں کی معذوری کی وجہ سے تمہید نے پڑھائی چھوڑ دی اور ان کے ساتھ گھر میں رہتی۔ تقدیم ابلاغ عامہ میں ماسٹر کرنے کے بعد ایک این جی او سے وابستہ تھی۔ تسنیم یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات کی طالبہ تھی مونس فوج میں تھا۔ اپنی نند حمیرا کی بیٹی خوش بخت سے مونس کی شادی کرنے کا ارادہ تھا اماں کا...... بیٹیوں کے جوڑ کے رشتے نہ آنے کی وجہ سے کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ تسنیم یونیورسٹی میں ایک سال جونیئر مدثر میں انوالو تھی۔ عبادالرحمٰن پانچ سال کا تھا جب ابو کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ تایا جی نے چالاکی سے آبائی گھر سے بے دخل کر کے انہیں گھر بھیج دیا۔ حجاب امی کے لیے جوتے لینے جاتی ہے تو وہاں الطاف کو وہ پسند آ جاتی ہے اور وہ اپنی بہنوں کو حجاب کے گھر رشتے کے لیے بھیجتا ہے۔ مونس کے بیچ میٹ عقیل ہمدانی کے ماموں صبور احمد اسلام آباد میں مقیم تھے۔ عقیل کے ساتھ مونس کا ان کے گھر جانا ہوتا ہے۔ صبور احمد اور طاہرہ کے دو بیٹے منصور اور طہور اور بیٹی عائزہ تھی۔ مدثر اور تسنیم کا عشق شدت اختیار کر رہا ہے۔ عبادالرحمٰن کے سیٹل ہونے کے بعد ننھیال ددھیال والے اپنی بیٹیوں کے لیے عباد کی آس لگا رہے تھے لیکن عباد خاندان میں کسی سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حجاب اپنے لیے آنے رشتے کے لیے استخارہ کرتی لیکن اس کے خواب سے امی مطمئن نہیں ہوتیں اور رشتہ طے کر دیتی ہیں۔ مدثر، تسنیم کو کورٹ میرج کے لیے زور دیتا ہے، عقیل چھوٹی پر جاتا ہے تو صبور احمد مونس کو عائزہ کی برتھ ڈے کے لیے بلاتے ہیں، تقدیم، تسنیم کے موبائل پر مدثر کے میسج پڑھ لیتی ہے اور سب کچھ ابا کو بتا دیتی ہے، تسنیم یونیورسٹی کے بہانے مدثر کے ساتھ جا کر کورٹ میرج کر لیتی ہے، مدثر اسے اپنے دوست نادر کے گھر لے جاتا ہے نادر کی بیوی ثریا بڑے عجیب انداز میں ان کا استقبال کرتی ہے۔ تسنیم، تقدیم کو میسج کر دیتی ہے کہ اس نے کورٹ میرج کر لی ہے۔ حجاب، تقدیم کے آفس آ کر اسے اپنے نکاح میں انوائٹ کرتی ہے۔ تقدیم ابا کو بتاتی ہے کہ تسنیم نے کورٹ میرج کر لی ہے۔ مدثر یونیورسٹی جانے سے پہلے تسنیم سے مل کر جاتا ہے تو یونیورسٹی میں تقدیم کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ تقدیم، مدثر سے کہتی ہے کہ اگر وہ تسنیم کو بھیج دے تو وہ لوگ اپنی عزت بچانے کی خاطر کچھ لوگوں کو بلا کر اس کی رخصتی کر دیں گے۔ حجاب کے نکاح کی تقریب گھر کے بجائے الطاف کے کہنے پر فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوتی ہے۔ تقدیم آنے سے معذرت کر لیتی ہے۔ مدثر، تسنیم سے گھر جانے کی کہتا ہے تو وہ انکار کر دیتی ہے۔ الطاف نکاح کی تصویریں لے کر آتا ہے تو حجاب یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ کچھ تصویروں میں الطاف کا سر غائب تھا جیسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ نکاح کے بعد الطاف دبئی جانے سے پہلے حجاب سے کہتا ہے کہ اس کے جانے کے بعد اگر لوگ کچھ الٹی سیدھی اڑانے کی کوشش کریں تو اس پر یقین نہ کرنا حجاب اس بات پر پریشان ہو جاتی ہے۔ تقدیم کے گھر میں مدثر کی کال کا انتظار ہوتا ہے۔ مدثر، تسنیم کو بھیجنے کی حامی بھر لیتا ہے اور پھر اپنی والدہ کو اپنی کورٹ میرج کے بارے میں بتاتا ہے۔ زیتون نے تقدیم کے لیے عباد کا رشتہ بتایا تو اماں رضامند ہو گئیں کہ وہ لوگ لڑکی کو دیکھنے آ جائیں۔ حجاب اسکول سے واپس آتی ہے تو بیل بجتی ہے اور دو عورتیں ایک بچے کے ساتھ آتی ہیں

جن میں سے ایک خود کو الطاف کی بیوی بتاتی ہے۔

حجاب بسمہ سے کہتی ہے کہ وہ الطاف سے اپنا رشتہ ختم کر دے گی، گھر والے حجاب کو سمجھاتے ہیں لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہتی ہے۔ تسنیم گھر واپس آ کر اپنے کمرے میں رہ رہی ہے لیکن کوئی اس سے بات چیت نہیں کرتا بس اس کو کھانا دے دیتے ہیں، رات میں اسے پیاس لگتی ہے تو وہ دروازہ کھولنا چاہتی ہے لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ حجاب کا فون بند ہونے پر الطاف امی کے فون پر کال کرتا ہے لیکن حجاب بات نہیں کرتی۔ تسنیم مدثر سے کہتی ہے کہ وہ اپنی امی کو بھیجے۔ حجاب کی امی الطاف کی بہن سے بات کرتی ہیں تو وہ سب لوگ ان کے گھر آ جاتے ہیں اور بسمہ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اکیڈمی میں پاسنگ آؤٹ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مونس کو آؤٹ پاس نہیں ملتا تو صبور احمد پوری فیملی کے ساتھ کاکول آ گئے۔ زیتون امی کو عباد کے لیے جو لڑکی دکھاتی ہے وہ انہیں بہت پسند آتی ہے لیکن عباد کو ان کی غربت پر اعتراض ہوتا ہے۔ امی اسے منع کرنے سے انکار کرتی ہیں تو عباد جہیز کی لسٹ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔

اب آگے پڑھیں

”بیٹھو۔“ الطاف نے کہا۔

وہ اسے نظر انداز کر کے آگے چلنے لگی۔ گاڑی دھیرے سے رینگتی ہوئی پھر اس کے نزدیک آ رکی۔ صبح کا وقت تھا ہر شخص اپنی رواروی میں تھا لیکن پھر بھی سڑک کے کنارے سواریوں کا انتظار کرتے لوگوں کی نظروں میں تماشا بن جانے کا احتمال تھا سو وہ رک گئی۔

”بیٹھو۔“ اس نے دوبارہ کہا۔

حجاب نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولی۔ ”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”میں چھوڑ دیتا ہوں۔“

”نو تھینکس...... میں خود چلی جاؤں گی۔“

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ گاڑی سے اترا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”مگر میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”پلیز!“ وہ گڑگڑایا۔

”مجھے تماشا نہ بنائیں...... یہ میرا روزانہ کا راستہ ہے۔ لوگ دیکھ رہیں۔“ اس نے کن انکھیوں سے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھنے دو۔“

”آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”تم سے بات کرنا۔“

”کیا بات کریں گے؟“ اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے کہتی ہو منہ ہے تمہارا بات کرنے کا۔

”گاڑی میں بیٹھو گی تو بات کروں گا نا!“

”مجھے نہیں بیٹھنا گاڑی میں۔“

”زبردستی بٹھا لوں گا...... ہاتھ پکڑ کر۔“

”ہاتھ تو آپ تب پکڑیں گے جب میں پکڑنے دوں گی۔“

”پکڑنے کیوں نہیں دو گی...... بیوی ہو میری۔“

"بیوی تو وہ بھی ہے جس کی موجودگی کو آپ نے چھپایا اور جو آپ کے ایک بچے کی ماں بھی ہے۔"

"میں اپنی مجبوری تمہارے گھر والوں کو بتا چکا ہوں اور تم سے بھی اسی سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کی مجبوریوں کی تفصیل سن چکی ہوں، مزید نہیں سننا چاہتی۔"

"کیوں' ترس نہیں آتا مجھ پر؟"

"ترس!" اس نے الطاف کو ناگواری سے دیکھا۔ "آپ نے غلط بیانی کی، دھوکا دیا، اعتماد مجروح کیا..... کیا اس کے بعد کوئی گنجائش رہ جاتی ہے۔"

"معافی سرکار۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"معذرت کہ میرے دل میں اپنے اور آپ کے درمیان قسمت کی خرابی سے قائم ہو جانے والے اس رشتے کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"میں اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

"نو۔" وہ شدومد سے بولا۔

"یس۔"

وہ چند ثانیے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "کسی اور عورت کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ مجھ سے اس طرح اور ایسی بات کر سکتی مگر تمہیں رعایت دے رہا ہوں...... جانتی ہو کیوں؟"

"مجھے جاننے کی ضرورت نہیں۔"

"بہرحال بتائے دیتا ہوں...... محبت ہے تم سے مجھے۔"

"مگر میرے دل میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ نفرت بھی نہیں۔ بس یوں لگتا ہے کہ میری زندگی کو ایک جذباتی حادثے سے دوچار کرنے کے لیے آپ کے نام کو میری زندگی میں آنا تھا اور بس...... آپ کی مجھے دی ہوئی تمام چیزیں گھر میں امانت پڑی ہیں آپ جب چاہیں لے سکتے ہیں۔"

وہ چند ثانیے اسے ایک صدمے کی کیفیت میں دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "ایسا نہیں ہوگا حجاب۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

"دیکھتے ہیں۔" اس نے توقف کیا، چہار اطراف نظر دوڑائی اور بولا۔ "میں گاڑی میں بیٹھ کر ایک اچھے شوہر کی طرح تمہارا غصہ اتر جانے کا انتظار کرتا ہوں، غصہ کم ہو جائے تو گاڑی میں بیٹھ جانا، اطمینان سے بات کریں گے۔" وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔ حجاب کے رخ پر گاڑی کا اگلا دروازہ بدستور کھلا رہا۔ دور سے ایک رکشا خالی آتے دیکھ کر حجاب آگے بڑھی اور رکشا رکنے کا اشارہ دیا۔ الطاف نے گردن موڑ کر دیکھا، وہ رکشا میں بیٹھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ الطاف کو عورت کی طاقت اور دولت کی بے وقعتی کا احساس ہوا۔ اس کی بیش قیمت گاڑی کا اگلا دروازہ کھلا رہ گیا تھا اور حجاب پھٹ پھٹ کرتے رکشے میں پورے کروفر سے روانہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"اے آپا تمہارے بیٹے نے تو حد ہی کر دی۔" زیتون جان بوجھ کر چھٹی والے دن عباد کے گھر آئی تھی۔

امی دل ہی دل میں خفیف ہوئیں۔ خدا جانے عباد نے بند لفافے میں اپنا انکار کن الفاظ میں لڑکی والوں کے ہاں بھجوایا ہوگا جو زیتون اتنی ناگواری سے گلہ کر رہی تھی۔ تاہم بظاہر انہوں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے زیتون سے پوچھا۔

"کیا ہوا زیتون؟"

"اے لو مجھ سے پوچھ رہی ہو...... بیٹے نے تم سے مشورہ کر کے ہی بنائی ہوگی نا اتنی لمبی چوڑی فہرست......"

"فہرست!" امی چونکیں۔ "کیسی فہرست زیتون؟"

"ایمان سے آپا اب اتی بھولی، اتی انجان بھی مت بنو۔" زیتون مزید اظہارِ ناراضی کو ذرا ترچھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"کچھ بتاؤ گی بھی......" امی نے زیتون کی کلائی اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"کھاؤ قسم کہ تمہیں نہیں معلوم۔" زیتون نے امی کو شک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ جانتا ہے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"عباد کہاں ہے؟" زیتون امی کو مسلسل شک بھری نظروں سے دیکھتی سیدھی ہو بیٹھی۔

"غسل خانے میں ہے، نہا رہا ہے۔"

"نکل آئے اس سے پوچھنا وہ خود بتائے گا۔"

"اتنی دیر میں میرا دل نہ جانے کہاں سے کہاں جا نکلے گا۔" امی نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

زیتون نے اپنا بایاں بازو پھیلایا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں کہنی کے اندرونی جوڑ پر دھرتے ہوئے بولی۔ "آپا اتی لمبی فہرست بھجوائی ہے تمہارے بیٹے نے جہیز کی۔"

"جہیز کی!"

"ہاں جی سبھی کچھ مانگ لیا۔ چمٹے، توے سے لے کر گاڑی تک۔ اتنا سامان اگر لڑکی والے دے بھی دیں تو تم رکھو گی کہاں...... بیٹے سے تم اپنے یہ پوچھو کہ گھر کیوں بھول گیا۔ جب سبھی کچھ مانگ لیا تو گھر بھی مانگ لیا ہوتا اللہ کے بندے نے۔" زیتون کا لہجہ طنز و تحقیر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"زیتون! مجھ سے تو تم جیسی مرضی آئے قسم لے لو...... مجھے یہ نہیں پتا۔" امی نے کہا۔ "ہاں اتنا ضرور معلوم تھا مجھے کہ لڑکی والوں کا رہن سہن اسے پسند نہیں آیا انکار لکھ کر بھجوائے گا اور اس کا بھی مجھے ڈر تھا کہ اللہ جانے انکار میں کیا لکھ کر بھجوائے گا۔"

"تم نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا تو میں وہ لفافہ نہ لے جاتی۔ عباد سے کہتی جو دینا ہے کھلے لفافے میں دے۔ ایمان سے میں تو ان لوگوں کے سامنے ایسی شرمندہ ہوئی کہ چور بن گئی۔ شریف لوگوں کے ساتھ کوئی اس طرح کیا جاتا ہے۔ اور بھئی لڑکی والوں کے رہن سہن میں آخر کیا برائی نظر آئی تمہارے بیٹے کو۔"

"بس زیتون......" امی نے شرمندگی سے کہا۔ "آج کل کے لڑکے اونچے گھرانوں میں شادیاں کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپا ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگا لینے سے ٹاٹ کی اوقات تھوڑی بدل جاتی ہے۔ اونچے گھرانوں کی لڑکیاں

جب ہم تم جیسے گھروں میں آتی ہیں تو صرف میاں سے نہیں پوری سسرال سے اپنی جوتیاں سیدھی کرواتی ہیں۔''

''بہت سمجھایا زیتون مگر وہ کہتا ہے میں کسی کھاتے پیتے گھرانے میں ہی شادی کروں گا۔''

''اللہ اس کی مراد پوری کرے۔'' زیتون نے پھر طنز و تحقیر میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

''کس کی مراد پوری ہونے کی دعا کر رہی ہیں خالہ؟'' عباد جو تولیے سے اپنے سر کے بالوں کو خشک کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تھا زیتون کی بات سن کر بولا۔

''تمہاری اور کس کی۔'' زیتون نے عباد کو ناگواری سے دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اللہ کرے ایسے گھرانے میں ہو تمہارا رشتہ جو بیٹی کو جہیز میں گھر بھی دیں۔''

''آمین! جیتی رہو جیتی رہو خالہ دل خوش کر دیا۔'' عباد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے تم نے دل بہت ناخوش کیا۔''

''کس کا؟'' عباد چونکا۔

''میرا...... اور لڑکی والوں کا...... اے بیٹا تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ لفافے میں بند تم اپنے مطالبوں کی فہرست بھجوا رہے ہو۔ اتنے عرصے سے رشتے کروا رہی ہوں، لڑکے زبانی کلامی فرمائش کر دیتے ہیں کہ ہمیں سلامی میں اسکوٹر چاہیے، گاڑی چاہیے مگر اس طرح فہرست بنا کر کسی نے نہیں بھجوائی لڑکی والوں کے ہاں۔''

''خالہ تمیز، تہذیب بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ پڑھا لکھا ہوں، جاہلوں کی طرح فرمائش کیوں کروں، قلم آخر کس لیے بنایا ہے اللہ نے۔''

''اے بھیا! کیوں اپنے کرتوت قلم کے سر منڈھ رہے ہو۔ قلم تو بڑی اعلیٰ چیز ہے۔ قرآن شریف میں یونہی تو اللہ نے قلم کی قسم نہیں کھائی۔ بڑا اونچا رتبہ ہے قلم کا۔ استعمال کرنے والے کو چاہیے کہ بہت دیکھ بھال کر استعمال کرے، اسی قلم سے ڈاکٹر اگر نسخے میں ذرا سی گڑبڑ کر دے تو مریض جان سے جائے، جج اگر غلط فیصلہ لکھ دے تو بے قصور سولی پر چڑھ جائے۔''

''واہ، واہ، واہ خالہ آپ تو بڑی اچھی تقریر کر لیتی ہو۔'' عباد نے اپنی دانست میں زیتون کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔

''فہرست تم بھی خوب اچھی بنا لیتے ہو۔'' زیتون نے بلا جھجک کرارا حملہ کیا۔

عباد کے تیور یک لخت بدل گئے۔ ''میرا حق ہے خالہ۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''ہاں۔'' زیتون بڑے آرام سے بولی۔ ''مجھ سمیت ہر شخص اپنے حق پر ہی اتراتا ہے۔ تمہارا حق تھا تم نے مانگا، لڑکی والوں کا حق تھا کہ انہوں نے انکار کر دیا۔''

''انکار کر دیا۔'' امی چونکیں۔

''ہاں تو اور کیا۔'' عباد کو دیکھتے ہوئے زیتون کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور اس نے کہا ''آدمی اپنی جیب دیکھ کر اور پسند کی چیز خریدتا ہے یا تو ان کی جیب اجازت نہیں دے رہی ہوگی یا پھر...... انہیں چیز پسند نہ آنے کا مسئلہ ہوگا۔''

''کیا...... کیا کہا۔'' اب کی بار عباد چونکا پھر استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''چیز پسند نہ آنے کا مسئلہ! ان کی حیثیت

ہے مجھ جیسی چیز کو پسند کرنے کی۔''

''کانوں کو ہاتھ لگاؤ بھیا...... توبہ کرو توبہ۔ اللہ تعالیٰ کو غرور پسند نہیں، ان کی لڑکی بھی لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ہے۔''

''سنبھال کر رکھیں اپنی لڑکی۔''

''عباد! بس کرو بیٹا...... کیا قینچی کی طرح زبان چلا رکھی ہے تم نے۔'' امی نے عباد کو ڈانٹا۔

''معاف کرنا آپا......'' زیتون نے اٹھنے کا قصد کرتے ہوئے اپنی چادر سنبھالی۔ ''میں تو تمہارے بیٹے کی سات گھروں میں تعریف کیا کرتی تھی مگر اب میری توبہ جو میں کسی گھر میں تمہارے بیٹے کا نام بھی اپنی زبان پر لاؤں۔''

''کہاں چل دیں، بیٹھو۔'' امی نے زیتون کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ جانتی تھیں زیتون کے ذریعے عباد کی اس حماقت کا چرچا چار گھروں میں ہونا لازم تھا۔ زیتون کو ٹھنڈا کر کے بھیجنا ضروری تھا تاکہ وہ لوگوں کو ایک کی چار چار نہ جا لگائے۔

''بس اب چلتی ہوں۔ اس طرف آئی ہوں تو محلے کے دو تین گھروں میں اور حاضری دیتی جاؤں۔''

''چلی جانا چلی جانا زیتون۔ چائے کا وقت ہے چائے پی کر جانا۔''

''کوئی خاص ضرورت نہیں آپا۔''

''ہاں ہاں مجھے معلوم ہے تمہاری آؤ بھگت کرنے والوں کی کمی تھوڑی ہے۔ نیک کام کرتی ہو دعائیں سمیٹتی ہو۔ عباد کا تو دماغ خراب ہے جو اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکال دی۔ مجھے تو لوگ بہت پسند آئے تھے۔ بتاؤ تو کیا کہا انہوں نے؟''

''انہوں نے کیا کہنا تھا لڑکی کو پتا چلا تو اس نے خود ہی انکار کر دیا۔''

''اچھا!'' امی نے استعجاب ظاہر کیا۔

''ہاں جی...... اس نے کہا مجھے نہیں کرنی ایسے گھر میں شادی جہاں مجھے بھاری جہیز کے بدلے قبول کیا جائے۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ نہیں ہوتی نہ ہو ساری زندگی شادی۔ لالچی لوگوں میں نہیں جاؤں گی۔''

''خدا کی قسم زیتون مجھے ایک سوئی کی بھی جو طلب ہو۔ مجھے تو بس اچھی لڑکی چاہیے تھی۔ خدا جانے عباد کے دماغ میں یہ خناس کہاں سے گھس گیا۔'' امی شرمندہ سی دکھائی دینے لگیں۔

''دماغ نہیں دل کہو آپا۔ دماغ تو انسان کا دوست ہوتا ہے۔ صحیح صلاح دیتا ہے، یہ دل ہوتا ہے جو انسان کو غلط راستے پر بھٹکاتا ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو زیتون۔'' امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھتے ہوئے بولیں۔ ''جانا مت بس پانچ منٹ لگیں گے چائے بننے میں۔''

''رہنے دیتیں کسی اور کے ہاں پی لوں گی۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا زیتون کہ میں تمہیں ایسے جانے دوں۔ عباد کا رشتہ ہوا یا نہیں ہوا وہ علیحدہ بات ہے۔ میرا اور تمہارا تعلق تو چھوٹی بڑی بہنوں کا سا ہے۔''

www.Paksociety.com

''بے شک۔''

''اور اس ناتے عباد تمہارا بھانجا ہوا۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔''

امی چائے کے ساتھ بسکٹ، پاپڑ اور فریج میں رکھی مٹھائی بھی لے کر پلٹیں۔ چائے کے دوران انہوں نے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ زیتون کے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ لو اور ہاں عباد کی بے وقوفی کا ذکر نہیں کرنا کسی سے۔''

''میرا اپنا بچہ ہے آپا۔ اپنے بچے کی ذلت بھلا کوئی کرتا ہے۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے زیتون۔''

''کھاتے پیتے گھرانے بھی کئی ہیں میری نظر میں۔'' زیتون بولی۔

''اللہ کی قسم زیتون مجھے ذرہ بھر کسی چیز کا لالچ نہیں۔ مجھے تو عباد پر غصہ بھی ہے اور افسوس بھی۔''

''مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے آپا تم ایسی نہیں ہو۔''

زیتون کے جانے کے بعد امی نے عباد کی جی بھر کر خبر لی۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ امی کا غصہ کچھ کم ہوا اور وہ چپ ہوئیں تو عباد نے ان کے گلے اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر میں بھی غلط نہیں۔''

''دس گھروں میں اشتہار بانٹے گی زیتون تمہارے کارنامے کے۔'' امی نے اسے گھور کر دیکھا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔''

امی نے اسے آنکھیں دکھائیں اور بولیں۔ ''دنیا تھوکے گی ہم پر۔''

''دنیا!'' وہ دھیرے سے ہنسا۔ ''کون سی دنیا کی بات کر رہی ہیں آپ، میرے لیے آپ میری دنیا ہیں اور آپ کے لیے میں...... اس سے آگے ہم دونوں ہی کے لیے دنیا ختم...... آپ کے علاوہ میں کسی کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا چاہتا۔ جس کی جو مرضی آئے کہے۔''

''میری خاطر ہی تم ایسا نہ کرتے۔''

''آپ کی خاطر ہی تو ایسا کرنا پڑا۔ میری خواہش ہے کہ آپ کو بہت آرام دوں، میرا خواب ہے کہ نوکر چاکر آپ کی خدمت کریں۔ میں آپ کے دکھوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں امی۔''

''میں نے تو اب کہیں تمہاری شادی کی بات کرنے سے کان پکڑے۔'' امی نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

عباد ہنس دیا پھر بولا۔ ''فکر نہ کریں، میں خود ہی کافی ہوں اپنی مدد کو بس آپ دعائیں دیتی رہیں۔''

''وہ تو میں ہر حال میں دیتی رہوں گی، ماں جو ہوں۔''

☆☆☆

اس روز اماں کو تسنیم کی ایک جھلک دکھائی دی۔ صبح کوئی ساڑھے دس کا وقت تھا۔ ابا اور تقدیم اپنے اپنے دفتر اور تعظیم اور تقدیس کالج گئی ہوئی تھیں۔ تمہید حسبِ معمول گھر کے کاموں میں مصروف تھی۔ لائٹ صبح نو بجے کی

گئی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کمرے کی گھٹن سے گھبرا کر اماں اپنی وہیل چیئر پر کمرے سے نکل آئیں۔ تسنیم کے کمرے کی کھڑکی پر پڑے پردے سرکے ہوئے تھے اور وہ مسہری کی آڑ میں فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد باندھے سر گھٹنوں پر اوندھائے، بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کا اندازِ نشست اس کی قلبی کیفیت کا غماز تھا۔ حزن و ملال اور مایوسی کی ایک تصویر تھی جو اماں نے دیکھی اور ان کا دل تڑپ اٹھا۔ اس واقعے سے پہلے وہ گھر میں کتنی ہی بدتمیزی کر لیتی اماں اسے بددعا کبھی نہ دیتیں لیکن اس واقعے نے اماں کو اتنا آزار پہنچایا تھا کہ انہوں نے بلک بلک کر اس کے لیے بددعا کی تھی۔

''جا تسنیم تجھے کبھی چین نہ ملے۔ جیسے تو نے ہمارا دل دکھایا تیرا دل بھی اسی طرح دکھے۔ جس کے لیے تو نے ہمیں بدنامی دی وہ کبھی تیرا نہ بنے۔'' تسنیم کو یوں لٹی پٹی بیٹھے دیکھ کر اماں کو سخت ملال ہوا۔ کاش اس نے اتنی بڑی غلطی نہ کی ہوتی کہ اسے تسلی دینے کا خیال بھی جرم محسوس ہوتا۔ اماں ٹھنڈی سانس بھرتی وہیل چیئر چلاتی دوبارہ اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئیں۔ مگر وہ تصویرِ حزن و یاس جیسے ان کے دھیان میں اٹک سی گئی تھی۔ اماں کے دل میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مدثر سے انہیں انتہائی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ بدبخت ایک شریف گھرانے کی عزت سے کھیل گیا تھا۔ بیاہی بیٹیاں کوئی اس طرح سے ہوتی ہیں جیسے اس وقت تسنیم دکھائی دی تھی۔ وہ تو بیوگی کی حدوں سے بھی پرے ایک درماندہ حال دکھائی دیتی تھی۔ بیٹیاں غلطی تو کر لیتی ہیں یہ نہیں سوچتیں کہ ایک غلطی کی خود انہیں ہی نہیں ان کے گھر والوں کو بھی ساری زندگی قیمت چکانی پڑے گی۔

''وہ اپنے گھر والوں کو لایا کیوں نہیں اب تک؟''

شام کو ابا نے اماں کے نزدیک بیٹھ کر بڑی فکر مندی سے کہا۔

''اللہ ہی جانے۔'' اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر ابا کو تسلی دینے کو بولیں۔ ''تقدیم سے فون کرواتی ہوں آج پھر۔''

''تقدیم کیوں، میں خود بات کرتا ہوں۔ ضرورت پڑی تو اس کے گھر جا کر ماں باپ سے بھی بات کروں گا۔ اب ہمت آ گئی ہے مجھ میں...... پہلی رات مشکل سے گزرتی ہے تقدیم کی ماں پھر تو دل اپنے کسی بہت پیارے کی موت کا صدمہ بھی سہار لیتا ہے۔ تسنیم تو ابھی زندہ ہے۔''

''تقدیم کو آ لینے دیں، نمبر اسی کے پاس ہے۔'' تقدیم گھر آئی تو اماں نے مدثر کا نمبر ملانے کو کہا، بیل بجتی رہی پھر نمبر بند کر دیا گیا۔

☆☆☆

مدثر پریشان تھا۔ ڈیڈی نے تسنیم کے گھر جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ممی کی منت سماجت بھی انہیں منانے میں ناکام رہی تھی۔

''میں اسی لیے رہ گیا ہوں کہ تمہارے لاڈلوں کا گند سمیٹتا پھروں۔'' ڈیڈی نے غصے سے کہا تھا۔

''میرے لاڈلے آپ کے بھی کچھ لگتے ہیں۔''

''میری بدقسمتی ہے۔''

''خدا کا خوف کریں۔ منتیں مان مان کر لیے ہیں میں نے یہ بچے اللہ سے۔''

www.paksociety.com

''پتا ہوتا کہ بڑے ہو کر یہ کریں گے تو نہ خود مانتا منتیں نہ تمہیں ماننے دیتا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں، توبہ کریں توبہ۔'' ممی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تھا پھر ڈیڈی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہمیں کمپرومائز کرنا پڑے گا۔''

''مائی فٹ! کسی قیمت پر بھی نہیں۔''

''ابھی تو لڑکی کے گھر والے یہ چاہ رہے ہیں کہ ہم اسے رخصت کرا کے اپنے گھر لے آئیں۔ ہمارے انکار پر انہوں نے کوئی نئی مصیبت کھڑی کر دی تو؟''

''تو کیا!'' ڈیڈی بھڑکے۔ ''زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ تمہارے بیٹے کے نام لڑکی کے اغوا، حبس بے جا اور زبردستی کورٹ میرج کا پرچہ کٹوا دیں گے...... بھلے کٹوا دیں۔''

''پریشانی آپ ہی کو ہوگی۔''

''کیوں! مجھے کیوں ہوگی؟''

''منعم کی دفعہ بھی ساری پریشانی آپ ہی کو ہوئی تھی۔''

''وہ بات اور تھی، میں پہلی غلطی سمجھ کر برداشت کر گیا تھا۔ یہ تھوڑی کہ اب ان کی ہر غلطی سر پر لیتا چلا جاؤں...... مدثر خود بھگتے۔''

''خاک بھگتے گا۔ اپنے چھوٹے چھوٹے خرچوں کے لیے تو وہ آپ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اتنی بڑی بات کیسے بھگتے گا خود...... جگ ہنسائی ہوگی اور کچھ نہیں۔''

''مجھے پروا نہیں۔''

''بیٹی کی سسرال تک خبر پہنچے گی اور وہاں سے داماد کو۔''

''پہنچے...... پہلے بھی تو پہنچی، کون سی کوئی قیامت آ گئی۔''

''سوچ لیں۔''

''سوچنا تھا اس خبیث کو...... پیٹ بھر کر کھانے کی مستیاں ہیں ساری، خود کھودنا خود کمانا پڑے تو چودہ طبق روشن ہو جائیں۔''

''وہ بہت شرمندہ ہے۔ کہتا ہے بس یہ ایک غلطی معاف کر دیں۔ ساری زندگی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''دیکھو میرا دماغ مت کھاؤ، میں نے کہہ دیا میں اس معاملے میں نہیں پڑوں گا اور نہ وہ لڑکی اس گھر میں آئے گی۔''

''آپ......'' ڈیڈی نے ممی کو اس بری طرح گھورا کہ وہ مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ کر پائیں۔

''اپنا سامان اٹھا کر چلا جاؤں گا میں اس گھر سے اور اخبار میں اشتہار دے دوں گا تمہارے بیٹوں کے کرتوتوں سے لاتعلقی اور انہیں اپنی تمام جائداد سے عاق کرنے کا۔'' ممی لرز کر رہ گئیں۔ ڈیڈی کی اس بات کو محض دھمکی سمجھنا ڈیڈی کی رکھیل کی صورت برسوں سے سر پر لٹکی تلوار کو گویا اپنی ہلاکت خیزی دکھانے کا موقع دینا تھا۔ دا تو انہیں ہمہ وقت ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار رہتی تھی۔

ممی کی زبانی مدثر کو یہ سب کچھ معلوم ہوا تو وہ بہت بھنایا۔ ''منعم آپ لوگوں کا زیادہ سگا ہے نا اس کے لیے تو تھانہ کچہری سب جگہ گئے۔''

''مجھ پر آنکھیں کیوں نکال رہے ہو، اپنے باپ کو دکھاؤ یہ آنکھیں۔'' ممی روہانسی ہو گئیں۔

''وہ کیا عاق کریں گے، میں خود ہی چلا جاؤں گا اس گھر سے۔'' مدثر نے پاؤں پٹختے ہوئے دھمکی دی۔

''کہاں چلے جاؤ گے۔ ہے کوئی ٹھکانا تمہارے پاس، گاڑی میں پٹرول ڈلوانے کے لیے تو تم اپنے باپ کے محتاج ہو۔''

مدثر نے میز کو زور سے لات ماری اور باہر نکل گیا۔ میز تو لڑکھڑا کر رہ گئی۔ اس کے پاؤں کو زور کی چوٹ لگی۔ ممتا کی ماری ممی کو اس کے منہ سے نکلی سسکار اپنے دل پر ایک ضرب کی صورت محسوس ہوئی۔ وہ اٹھیں اور اس کے پیچھے لپکیں مگر منعم کی بیوی کالی بلی کی طرح ان کے راستے میں آ گئی۔

''کیا ہوا ممی؟''

''کچھ نہیں۔''

''مدثر بھائی بہت غصے میں گئے ہیں۔''

''ہاں...... بس ایسے ہی...... اسے تو ذرا ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا ہے۔'' ممی نے بہو سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''غصہ تو منعم کو آتا ہے ممی۔'' بہو نے ساس کی گویا غلطی پکڑی۔ ''مدثر بھائی تو ان کے مقابلے میں بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔''

باہر پورچ سے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز سنائی دی اور مدثر اتنی تیزی سے گاڑی باہر نکال لے گیا کہ ممی کا دل کانپ کر رہ گیا۔ منعم کی بیوی پر انہیں دل ہی دل میں سخت غصہ آیا کہ اس وقت اگر وہ ان کے راستے میں نہ آ گئی ہوتی تو وہ مدثر کو روکنے کی کوشش تو کرتیں یا کم از کم اتنا تو پوچھ لیتیں اس سے کہ وہ جا کہاں رہا ہے۔

☆☆☆

اسے جانا کہاں تھا، کچھ دیر بے مقصد گاڑی اِدھر اُدھر دوڑاتا رہا پھر احساس ہوا کہ پٹرول بے مقصد جلانے سے کوئی فائدہ نہیں، گھر واپسی جوگا بھی نہیں رہے گا۔ گاڑی ایک جگہ روکی اور حال کی بے حالی اور مستقبل کی بے یقینی پر غور و فکر کرنے لگا۔ تسنیم اپنے گھر کے کمرے میں محصور بیٹھی تھی۔ نہ گھر والوں سے بات چیت تھی نہ گھر سے باہر آنے جانے کا کوئی ساں تھا۔ اس سے رابطہ بھی موبائل فون کے ذریعے تھا بس۔ تسنیم کا موبائل بیلنس شیئرنگ پر چل رہا تھا۔ وہ اپنے موبائل سے اس کے موبائل پر بیلنس بھجوا دیتا۔ ورنہ وہ اسے فون بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چند ہی دنوں میں تسنیم کی آواز کا زیروبم اور لہجہ کس قدر تبدیل ہو گیا تھا۔ پہلے وہ طرارے سے پوچھا کرتی تھی۔ ''کب بھیج رہے ہو، ممی ڈیڈی کو؟'' پھر وہ یہی بات غصے سے پوچھنے لگی تھی۔ اب اس کے لہجے میں لجاجت ہوتی۔

''پلیز مدثر رحم کرو مجھ پر، سارا دن ایک کمرے میں بند دیواروں کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ تمہید باجی یا تقدیم آپی کھانا رکھ جاتی ہیں بس یا بہت ہوا تو اٹیچڈ باتھ کے لیے صابن یا کپڑے دھونے کے لیے واشنگ پاؤڈر۔ کمرا صاف کرنے کے لیے میں نے ایک جھاڑو کمرے میں رکھ لی ہے، کوڑا پھینکنے کو ایسے وقت

www.paksociety.com

کمرے سے نکلتی ہوں جب سب کے بارے میں یہ یقین ہوتا ہے کہ اِدھر اُدھر ہوں گے۔ پلیز جلدی بھیجو نا اپنے گھر والوں کو۔'' اب وہ گڑگڑانے لگی تھی۔

''یار ڈیڈی کو منانا ذرا مشکل کام ہے، ممی موقع دیکھ کر بات کریں گی۔'' ڈیڈی سے بات بھی ہوگئی تھی، اب...... اب کیا کہتا وہ تسنیم سے۔ فون بے تابی سے بج رہا تھا۔ تسنیم کو تسلی دینے کے لیے اس کے پاس کیا تھا جو وہ اسے کوئی امید دلاتا۔ فون وقفے وقفے سے بجتا رہا اور وہ چاہتے ہوئے بھی کال ریسیو نہ کر سکا۔ موبائل پر تسنیم کے پیغامات آنے لگے۔

ہبی جی کہاں ہو؟

میری کال کیوں ریسیو نہیں کر رہے؟

پلیز میری کال اٹینڈ کرو نا۔

میں بہت پریشان ہو رہی ہوں، کال کیوں نہیں سن رہے؟

مدثر گاڈز سیک فون پک کرو۔ بالآخر اسے تسنیم سے بات کرنی ہی پڑی۔

''اوہ مدثر...... تھینکس گاڈ! تمہاری آواز تو سنائی دی۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔''

''کہ کہیں مدثر مر نہ گیا ہو۔'' وہ بھبک کر بولا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو مدثر۔'' وہ شاکڈ رہ گئی۔

''انسان کہیں مصروف بھی ہو سکتا ہے۔ تم تو مزے سے گھر میں بیٹھی ہو مجھے سو کام ہوتے ہیں۔ بندہ کال ریسیو نہ کرے تو اگلے بندے کو خود سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی ایسی صورتِ حال ہوگی جس میں کال ریسیو کرنے کا سین نہیں ہوگا۔ تنگ آ گیا بیل سن سن کر۔'' وہ برس پڑا۔

''سوری مدثر! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مصروف ہوگے۔'' تسنیم روہانسی ہو رہی تھی۔

''بولو اب کیا بات ہے؟'' اس کا لہجہ اب دھیما تھا۔

''تم فون آف کر دیتے نا۔'' تسنیم ہنوز اسی صدمے میں تھی۔

''پھر تمہیں گلہ ہوتا کہ فون بند کر دیا۔''

''تم بعد میں بتا دیتے مجھے کہ میں کہیں مصروف تھا۔'' صدمہ بڑی حد تک کم ہو چکا تھا۔

''دفع کرو۔'' اس کے لہجے سے بیزاری جھلک اٹھی۔

''کیا بات ہے مدثر؟'' تسنیم تشویش سے بولی۔

''تم میری بات چھوڑو اپنی بات کرو...... ہاں بولو، کیوں کیا تھا فون؟'' تسنیم کو پھر صدمے نے آ گھیرا۔ تشویش بڑھ گئی۔

''کیا اب مجھے فون کرنے کے لیے بھی کسی جواز کسی ریزن کی ضرورت ہوگی؟''

''ظاہر ہے کوئی سبب تو ہوتا ہے نا۔'' اس نے تڑخ کر کہا۔ تسنیم نے کسی بحث میں الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور دبی زبان سے عرضِ مدعا پر آ گئی۔

''ڈیڈی سے بات ہوئی؟''

www.Paksociety.com

مجھ سے ملیے

آج ہم اپنا تعارف خود کرا رہے ہیں میرا نام 28 دسمبر 1995ء تک تو انجم پروین تھا مگر 29 دسمبر 1995ء کی شام تین بار کی ہاں نے انجم مشیر میں بدل دیا۔ ایک ادارے میں جو کہ سرکاری ہے ڈپٹی ڈائریکٹر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ (ادارہ سماجی ملازمین سے) عمرِ عزیز کی کمائی نیک نامی ہی ہے۔ بہت عرصہ اخبارات اور رسالوں میں افسانے، مضامین، اقتباسات وغیرہ لکھتے رہے اور پھر اچانک ہی سب کچھ چھٹ گیا لیکن کہتے ہیں عادت بدل جاتی ہے فطرت نہیں بدلتی تو خود کو دوبارہ لکھنے پر مائل کر رہے ہیں۔ تعلیم، ہاں یہ تو، ہم بتانا ہی بھول گئے، ارے بھئی ایم اے سیاسیات کے ساتھ ساتھ ایل ایل بی بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے بس ہماری زندگی میں ایک کمی ہے اولاد کی، خدا کی کوئی مصلحت ہوگی اس میں۔ گزشتہ سال جولائی کے آخر میں عمرے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ رمضان کا ایک عشرہ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں اللہ اور اس کے نبیؐ کے مہمان رہے۔ اللہ دوبارہ توفیق عطا کرے۔ (آمین) صاف ستھرا گھر اور صاف بات کرنے والے ہم کو پسند ہیں۔ خود بھی ہم بات بالکل صاف کرتے ہیں دوستوں کی دوستی میں کئی بار بے وقوف بنے ہیں مگر ہر بار اعتبار کرتے ہیں یا پھر ہم میں مروت ہی زیادہ ہے۔ فوٹو گراف گزشتہ سال اپریل میں ایک مضافاتی علاقے میں کھلنے والے اسکول کی تقریبِ تقسیم انعامات میں مہمان خصوصی تھے وہی تصویر بھیج دی، اسکول کا نام ایم، وائی ایجوکیشنل اکیڈمی ہے جو کورنگی نمبر 1 میں ہے۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ پاکیزہ کو اور ترقی دے اور اس میں کام کرنے والوں کو اپنی نعمتوں سے نوازے، آمین۔

انجم مشیر، کراچی

''ابھی نہیں۔''

اس نے جھوٹ بولا۔

''پلیز مدثر۔'' وہ گڑگڑائی۔ ''مجھے اس برزخ سے نکال لو۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلی ہوئی تھی۔

''تم سمجھتی ہو میں جنت میں مزے لوٹ رہا ہوں۔''

''نہیں، نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں۔ میں جانتی ہوں ہم دونوں ہی ایک جیسی مشکل میں ہیں۔''

''جانتی ہو تو بار بار پوچھ کر زچ مت کیا کرو۔'' وہ اپنا سارا غصہ جیسے اسی پر نکال لینے کے درپے تھا۔

''یہ ہماری زندگی، ہمارے مستقبل کا معاملہ ہے مدثر۔''

''پتا ہے، پتا ہے مجھے۔''

''آج مجھے تم کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو۔ مدثر اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ، ہم دونوں ہی کو تو شیئر کرنا ہے اب۔''

''کیا شیئر کرو گی، بولو کیا شیئر کرو گی؟''

www.Paksociety.com

''ہر دکھ، ہر سکھ مدثر۔''

''سکھ! اونہہ!'' وہ بنا دیکھے اس کے تاثرات، اس کی حرکات وسکنات اپنی چشمِ تصور سے دیکھ سکتی تھی۔

''اچھا چلو کچھ نہیں پوچھتی تم سے۔ نہ ممی، ڈیڈی کو بھجوانے کی بات کرتی ہوں...... فیل ریلیکسڈ...... میرے لیے اب سب سے اہم چیز تم ہو...... تم ہی جی...... یو آر مائی لو...... یو آر مائی لائف۔''

تسنیم کے چند رومانی فقروں نے کام کر دکھایا۔ ''کیا کر رہی تھیں؟''

''کیا کر سکتی ہوں، وہی بے جان در و دیوار وہی تنہائی، وہی خاموشی اور جان لیوا سناٹا۔'' اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ مدثر کو مزید بر مانے کے لیے اسے دفعتاً ایک مذاق سوجھا۔ ''شاہزادہ محترم! ظلِ الٰہی تک کسی طرح ہماری یہ التجا پہنچا دیجیے کہ ہمیں اس زندان سے رہا کروا دیں۔''

''وہ شاہزادہ سلیم کے باپ سے بھی زیادہ سنگدل آدمی ہیں۔'' مدثر تلخی سے بولا۔

''تم تو میرے ساتھ ہو نا مدثر؟''

''کیا فرق پڑتا ہے۔''

''کیوں فرق نہیں پڑتا، تم میرے شوہر ہو، میری زندگی کے ساتھی ہو، میری محبت ہو، میرا عشق ہو۔''

''جب پیٹ میں روٹی اور گاڑی میں فیول نہ ہو تو عشق کے غبارے کی ساری ہوا نکل جاتی ہے۔ بے چارہ پھس پھسا ہو کر زمین پر آ گرتا ہے۔''

''تو کیا تم اسے گرنے دو گے؟ گرنے سے پہلے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی مٹھی میں نہیں تھام لو گے مدثر؟''

''کبھی کبھی ہاتھ پھیلا ہونے کے باوجود مٹھی خالی رہ جاتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''غبارہ اپنا راستہ خود بناتے ہوئے مٹھی میں آنے کے بجائے کسی اور طرف نکل جاتا ہے۔''

''عشق سچا ہو تو ایسا نہیں ہوتا مدثر...... تمہیں مجھ سے محبت ہے نا؟''

''محبت کے بغیر تو اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا بیٹھا ہوں۔''

''انشاء اللہ اگلی منزلیں بھی آسان ہوں گی...... مجھے یقین ہے مدثر۔'' وہ جذب کی کیفیت میں تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ ظلِ الٰہی فیصلہ صادر فرما چکے تھے۔

☆☆☆

الطاف اس کے اسکول پہنچنے اور اس کے روبرو آبیٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسکول ایک عوامی تعلیمی ادارہ تھا۔ ملاقاتیوں کا مختلف معاملات کے سلسلے میں آنا جانا اور اس سے ملنا لگا ہی رہتا تھا۔ گو ان دنوں وہ ملاقاتیوں سے ملنے میں قدرے احتیاط برت رہی تھی لیکن کہاں تک۔ سرکاری ادارہ تھا اور وہ ادارے کی سربراہ! اس احتیاط کے باوجود لوگوں سے ملنا تو پڑتا تھا۔ وہ بھی دروازے پر متعین چپراسی کو اپنا غلط نام بتا کر اسکول میں داخلے کی خواہشمند کسی بچی کا سرپرست ہونے کے بہانے اس کے روبرو آبیٹھا۔

''اس روز تو تم رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی تھیں، اب کہاں جاؤ گی؟'' اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حجاب کو گہری نظروں سے دیکھا۔

www.Paksociety.com

حجاب جس کی اسے اپنے دفتر میں دیکھتے ہی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''سرکار!'' وہ مسکرایا اور اس نے موبائل فون کا ایک ڈبا اس کے سامنے رکھ دیا۔ حجاب اس کی منکوحہ پر میڈم پرنسپل کو غالب کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

''اس جگہ سے زیادہ مضبوط اور محفوظ میں اپنے آپ کو کسی دوسری جگہ نہیں پاتی۔''

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکا۔

''آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں مجھے کسی دباؤ میں لینے میں کامیاب ہو جائیں گے تو یہ آپ کی بھول ہے۔''

''مطلب یہ کہ تم گھنٹی بجاؤ گی۔ اپنے چپراسی، چوکیدار، کلرک وغیرہ کو بلاؤ گی اور ان سے کہو گی اس شخص کو دھکے مار کر نکال باہر کریں۔'' وہ مسکرایا۔

''اتنی کمزور نہیں ہوں میں۔''

''تو پھر مجھ سے اپنے آفس سے نکل جانے کو کہو گی؟''

''کام کی بات کیجیے۔ میں یہاں مصروف ہوتی ہوں۔''

''دیکھ رہا ہوں کتنی مصروف ہوتی ہو۔'' اس نے طنزیہ کہا۔

''پلیز!'' حجاب کے لہجے میں تنبیہ تھی جیسے اسے دخل در معقولات سے گریز کی تلقین کر رہی ہو۔

''میں اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ اپنا وقت ضائع کریں گے۔''

''دیکھو۔'' وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی میز پر رکھ کر کرسی پر ذرا آگے کو سرک گیا۔ ''وہ عورت جس کی وجہ سے تم مجھ سے ناراض ہو میری زندگی سے نکل چکی ہے۔ مجھے کبھی اس سے محبت تھی نہ ہے۔ طلاق میں نے اس لیے نہیں دی کہ برادری کا معاملہ ہے۔ تم چاہتی ہو تو طلاق بھی لکھ دیتا ہوں۔ لیکن پلیز مجھ سے یوں ناراض مت رہو۔''

''آپ کے بچے کی ماں ہے وہ۔''

''بچہ جہاں رہے میرا ہی رہے گا۔ میں ابھی لینا بھی نہیں چاہتا اسے۔ بڑا ہو کر آپ ہی آئے گا میرے پاس......'' اس نے توقف کیا اور حجاب کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ بھی اگر تم نے اجازت دی کہ وہ میرے پاس آسکتا ہے تو۔''

''میں بھلا کون ہوتی ہوں اجازت دینے والی؟''

''میری بیوی اور کون۔''

''میرا خیال ہے میری والدہ آپ کو بتا چکی ہوں گی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔''

''مجھے صرف تمہاری ناراضی کے بارے میں بتایا گیا ہے اور میں تمہاری ناراضی دور کرنے کے لیے سوری کہنے آیا ہوں۔ یقین کرو کوئی اور مقصد نہیں تھا پہلی شادی کو چھپانے سے سوائے اس کے کہ میں تمہارے لیے تمہارے گھر والوں سے انکار نہیں سننا چاہتا تھا۔''

www.Paksociety.com

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

''مگر میں اب انکار کر رہی ہوں۔''

اس نے ہڑبڑا کر حجاب کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''انکار کر سکتی ہو؟''

''کیوں نہیں...... میں اس تعلق، اس رشتے کو قائم نہیں رکھنا چاہتی۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''بات اتنی غیر واضح تو نہیں کہ آپ وضاحت کی ضرورت محسوس کریں۔''

''جانتا ہوں تم بہت پڑھی لکھی ہو اور میں جاہل...... مجھ سے آسان لفظوں میں بات کرو۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ سکتے میں رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''اتنی چھوٹی سی بات پر۔''

''آپ کے لیے چھوٹی ہو سکتی ہے میرے لیے نہیں۔''

''میں...... میں اسے آج ہی طلاق لکھ دیتا ہوں۔ ابھی جاتا ہوں کورٹ طلاق نامہ بنوانے کے لیے۔''

''الطاف صاحب! ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجیے آپ نے اسے طلاق دے بھی دی تو میرا فیصلہ تبدیل نہیں ہوگا۔''

''مگر کیوں؟'' اس نے میز پر ہاتھ مارا۔

''ذرا خیال سے سرکاری اثاثہ ہے۔''

''سوری!'' وہ کچھ شرمندہ ہو کر بولا۔

''آپ کی تمام چیزیں آپ کو بحفاظت مل جائیں گی۔ زمین کی واپسی کے لیے جو بھی طریقۂ کار ہوگا اگر کہیں میرے سگنیچر کی ضرورت ہوئی تو میں جب اور جہاں بھی ضرورت ہوئی حاضر ہوں گی۔''

''اتنی سخت مت بنو۔'' اس نے حجاب کو تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

''میں جب کوئی فیصلہ کر لیتی ہوں تو اس پر قائم بھی رہتی ہوں۔ اپنے کسی فیصلے پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔''

''لیکن اس پر تم بہت پچھتاؤ گی۔'' وہ اسے گھورتے ہوئے قدرے درشتی سے بولا۔

''کبھی کسی سے گلہ نہیں کروں گی۔ فیصلہ میرا ہے دوش کبھی دینا بھی پڑا تو خود کو دوں گی کسی اور کو نہیں۔''

''عقل سے کام لو۔''

''کبھی کبھی بے عقلی سے بھی کام لینا چاہیے۔''

''تمہیں کسی ہمدرد دوست کی ضرورت ہے جو تمہیں سمجھا بجھا سکے۔''

''میں اپنی دوست آپ ہوں۔''

''مجھے تم سے اتنی بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔''

''تھینکس فار دی کمپلیمنٹ۔''

''مذاق میں مت لو۔''

''کس نے کہہ دیا، میں بالکل سیریس ہوں۔''

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر درشت لہجے میں بولا۔ ”کیا آواز لگا کر بلاؤں تمہارے ساتھیوں کو اور انہیں بتاؤں کہ میں تمہاری پرنسپل صاحبہ کا شوہر ہوں جو رخصتی سے پہلے ہی مجھ سے علیحدگی کا مطالبہ کر رہی ہے۔“

”بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔“ حجاب نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔ ”کرلیں اپنا شوق پورا لیکن آپ کا کوئی حربہ، کوئی حکمت عملی مجھے اپنے فیصلے سے نہیں ہٹا سکے گی۔“

وہ چند ثانیے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا پھر گڑگڑا کر بولا۔ ”خدا کے واسطے کچھ عقل پکڑو حجاب...... لوگ ہنسیں گے۔“

”مجھے پروا نہیں ہے۔“

”دیکھو میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ جاتے ہی دوبارہ آنا پڑا...... بزنس خراب ہوتا ہے۔ تم اپنا غصہ تھوک دو تو رخصتی کا پروگرام طے کیا جائے۔“

”اگر ایسا کیا گیا تو آپ ہی نہیں میرے گھر والے بھی اپنے رسک پر کریں گے۔“

”اس کا مطلب ہے تم میرے ساتھ ہی نہیں اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی بے رحم ہو۔“

”یونہی سہی۔“ اس نے لحہ بھر کو توقف کیا پھر دیوار گیر گھڑیال پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ”آئی ایم سوری...... میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکوں گی آپ کو، مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”گھر جا کر اچھی طرح سوچنا۔“ اس نے حجاب کے چہرے پر اپنی نظریں اس قدر سختی سے مرکوز کیں کہ اسے کوفت ہونے لگی۔

”میں بہت اچھی طرح سوچ چکی ہوں، میرے اور آپ کے راستے مختلف ہیں۔“

اس نے حجاب کو تنبیہی تیوروں سے دیکھا اور کہا۔ ”اتنی آسانی سے راستہ نہیں بدل سکتا۔“ وہ جانے کو مڑا۔

”ایک منٹ...... یہ لیتے جائیں۔“ حجاب نے موبائل فون کا ڈبا اپنے سامنے سے اٹھا کر میز کے اگلے کنارے پر رکھ دیا۔ اس نے پھر اسے اسی سختی سے گھورا اور ڈبا اٹھائے بنا لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازے سے باہر نکل گیا۔

حجاب نے اسکول سے گھر واپسی پر امی کو یہ سارا قصہ سنایا تو وہ سخت فکر مند ہوگئیں۔ ”حجاب! میرا بچہ آج وہ تمہارے اسکول پہنچا ہے، کل کہیں اور مل سکتا ہے تمہیں۔ آج اس نے تمیز سے بات کی ہے کل بدتمیزی بھی کر سکتا ہے۔ وہ مرد ہے بیٹا۔ شرعاً اور قانوناً تمہارا شوہر بھی۔ زبردستی تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں اپنی گاڑی میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا تو۔“

”اتنی کمزور نہیں ہوں امی۔“ اس نے امی کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ حالانکہ امی کی باتوں نے اسے ڈرا دیا تھا۔

”عورت پیدائشی کمزور ہے بیٹا۔ تم کیا کرلو گی۔ میں تو کہتی ہوں خاک ڈالو اس کی بیوی اور بچے کے قصے پر اور جاؤ عزت سے اپنے گھر۔“

”خودکشی حرام ہے لیکن اگر آپ لوگوں نے مجھے اس کے گھر بھیجنے کی کوشش کی تو میں حرام موت کو گلے لگا لوں گی۔“

”بیٹا! پیسے والے لوگ ہیں۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ خود سامنے آنے کے بجائے کرائے کے

غنڈے بدمعاشوں کو پیچھے لگا دیتے ہیں لوگ...... میرا بچہ تمہارا ایک ہی بھائی ہے۔ خدانخواستہ اسے کوئی نقصان پہنچوا دیا تو؟“

”آپ تو اللہ پر بھروسا رکھنے والوں میں سے ہیں امی۔“

”جب اولاد کا معاملہ آتا ہے تو انسان کا ایمان متزلزل ہونے لگتا ہے۔“

”یہ ایمان تو نہ ہوا۔ ایمان تو یہ ہے کہ حالات کچھ ہوں، کیسے ہوں، کہیں ہوں آپ مگر اللہ پر آپ کا یقین سرمو متاثر نہ ہو۔“

”ماں بنو گی تو پوچھوں گی۔“

”میں تو سمجھتی تھی میری ماں بہت مضبوط عورت ہیں۔“

”نہیں ہوں مضبوط...... کمزور ہوں...... بالکل بودی...... بہجت کے معاملے میں تو ریت کی طرح بھربھری۔“

”مگر میں بہجت بھائی کی ماں نہیں ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”بہجت بھائی کی خاطر بھی میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”ہوئی نہ خود غرضی۔“ امی کے لہجے میں نشتر کی سی کاٹ تھی۔

”مجھے اپنے ایمان کو آزمانے دیں۔“ اس نے کہا۔

”استغفراللہ!“ امی نے ناگواری سے کہا۔ ”اب یہ ایمان کو آزمائے گی۔“

”ایمان کو تو ہم قدم قدم پر آزماتے ہیں امی اور یہ آزمائش ہی اللہ پر ہمارے یقین کو قوی سے قوی تر کرتی ہے۔“

”پرنسپل بن کر تو خود کو افلاطون ہی سمجھنے لگی ہے۔“ امی غصے سے بڑبڑائیں۔

☆☆☆

ممی نے موقع دیکھ کر ڈیڈی سے پھر بات کی۔ ”لڑکی تو راضی نہیں تھی آپ کا بیٹا اسے زبردستی کورٹ لے گیا اور وہاں جا کر اس سے بیان دلوا دیا کہ بالغ ہوں اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ ڈیڈی نے یوں ظاہر کیا جیسے سنا ہی نہ ہو لیکن ان کے جبڑوں کا تناؤ ان کے جذباتی تلاطم کا غماز تھا۔

”سن رہے ہیں۔“ ممی نے کہا۔

”سن رہا ہوں۔“ ڈیڈی غصے سے بولے۔

”ابھی تو اس کے ماں باپ نے یہ شرط رکھ دی ہے کہ آئیں اور اسے عزت سے رخصت کرا کے لے جائیں اور اسی امید پر وہ خاموش بھی بیٹھے ہیں۔ ہم نہ گئے اور وہ لڑکی کو لے کر جا پہنچے... پولیس تھانے اور وہاں لڑکی نے یہ بیان دے دیا کہ فلاں لڑکا، مجھے زبردستی کورٹ لے گیا اور زبردستی مجھ سے کورٹ میرج کر لی تو؟“

”تو کیا...... خود بھگتے گا وہ۔“

”وہ کیا ہم سب بھگتیں گے۔“

”میرے کان کیوں کھا رہی ہو تم!“

”کچھ کریں......اس پریشانی سے نکلنے کے لیے۔“

”جن قدموں سے وہ کورٹ گیا تھا لڑکی سے کورٹ میرج کرنے کے لیے انہی قدموں سے پھر کورٹ جائے اور اسے طلاق لکھ کر بھیج دے۔“

ممی نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا۔ ڈیڈی پر ان کی ہڑبڑاہٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

”یہ آسان ترین طریقہ ہے، پریشانی سے نکلنے کا۔“ ڈیڈی بڑے اطمینان سے بولے۔

”خدا کا خوف کریں کچھ......ہم خود بھی بیٹی والے ہیں۔“ ممی بولیں۔

”ہماری بیٹی نے کسی کو اپنی طرف دیکھنے کا بھی موقع نہیں دیا کبھی اسی لیے عزت سے اپنے گھر چلی گئی۔“ ڈیڈی کے لہجے میں غرور تھا۔ لحظہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ تحقیر سے بولے۔ ”یہ چلتی پھرتی لڑکیاں ہوتی ہیں جنہیں لڑکے کورٹ میرج کے لیے کورٹ لے جاتے ہیں۔ لڑکی کوئی دودھ پیتی بچی تو نہیں ہوگی۔ وہ اگر یہ کہتی ہے کہ لڑکے نے زبردستی کی تو اس سے یہ بھی تو کہا جاسکتا ہے کہ جج کے سامنے اس نے یہ کیوں نہیں کہا کہ اس کے ساتھ زبردستی کی جارہی تھی۔“ ڈیڈی کی بات ممی کے دل کو لگی۔

”ہاں بات تو ٹھیک ہے آپ کی۔“ انہوں نے تائید کی۔ بیوی کی جانب سے اپنی بات کی تائید پر ہر مرد کی مردانگی تسکین پاتی ہے سو ڈیڈی کا موڈ بھی بدل گیا۔

”لڑکی کے ماں باپ اپنی عزت بچانے کی خاطر ہی تو اسے اپنے گھر سے رخصت کرنا چاہ رہے ہیں نا۔ مدثر ان سے کہے میں نے کورٹ جاکر شادی کی ہے کورٹ ہی سے چپ چاپ طلاق نامہ بنا کر بھجوا دیتا ہوں پھر ان کی مرضی لڑکی کا جو چاہیں حشر کریں جس سے چاہیں دوبارہ اس کا نکاح پڑھائیں۔“

”ایسی باتیں کوئی چھپتی ہیں۔“ ممی بولیں۔

”ہاں۔“ ڈیڈی بھڑک اٹھے۔ ”جب چھپتیں نہیں تو کیوں وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم جائیں اور دنیا والوں پر یہ ظاہر کرکے لڑکی کو اپنے گھر لے آئیں جیسے اس میں ہماری اپنی مرضی بھی ہے۔“

”کسی دوسرے گھر کی عزت بچانے کو......اور خود اپنے گھر کو بے عزتی اور بیٹے کو بدنامی سے بچانے کی خاطر ایسا کرلینے میں کیا ہرج ہے۔“

”بہت ہرج ہے......اس بدمعاش، لفنگے کی آوارگی کی قیمت میں کیوں چکاؤں۔“

”آخر منعم کی دفعہ بھی تو......“

”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں تم سے وہ پہلی غلطی تھی۔“ ڈیڈی نے توقف کے بعد مزید کہا۔ ”غلطی کو روایت بنالینا اس سے بڑی غلطی ہے اور بڑی غلطی کے آگے جھک جانا اس سے بھی بڑی غلطی......میں کسی قیمت پر اس لڑکی کو اپنے گھر نہیں لاؤں گا نہ اور کسی کو لانے دوں گا۔“ ممی شدید مایوس اور متفکر دکھائی دینے لگیں۔ ڈیڈی کے آخری جملے نے تو اس معاملے میں ہر امید ختم کردی تھی۔

☆☆☆

اکیڈمی میں پاسنگ آؤٹ کی تیاریاں روایتی جوش وخروش سے جاری تھیں۔ مدعوئین کے نام دعوت نامے جاری کیے جارہے تھے، مونس نے اپنے سات مہمانوں کے لیے کارڈز حاصل کرلیے تھے۔ کراچی سے ابا اور تقدیم آپی اور اسلام آباد سے صبور احمد، ان کی بیگم اور تینوں بچے، عائزہ بہت ایکسائٹڈ تھی۔ اس تقریب میں شرکت

کے لیے صبور احمد کے اہلِ خانہ میں خصوصی جوش وخروش دیکھنے میں آرہا تھا، صبور احمد کی بیگم اور بچوں نے اس تقریب کے لیے نئے کپڑے خریدے تھے۔ گو صبور احمد نے خود اپنے لیے کسی خصوصی اہتمام سے گریز کیا تھا مگر ان کی بیگم پھر بھی ان کے لیے نئے کپڑے خرید لائی تھیں۔ بہترین سوٹ مع برانڈڈ شرٹ اور نکٹائی......مونس کو صبور احمد کے گھرانے کا ہر فرد اپنی جانب سے علیحدہ علیحدہ تحفہ دینے جارہا تھا۔ صبور احمد نے اس کے لیے تھری پیس سوٹ سلوایا تھا۔ درزی کو سوٹ کا ناپ دینے کے لیے انہوں نے ایک روز مونس کو اس کے ہزار تردد کے باوجود اصرار کرکے اسلام آباد بلایا تھا اور اپنے ساتھ پنڈی لے جاکر ایک معروف دکان پر اس کا سوٹ سلنے کو دیا تھا۔ صبور احمد کی بیگم نے اس کے لیے برانڈڈ شرٹ، نکٹائی اور کف لنکس کا سیٹ خریدا تھا۔ منصور اسے امپورٹڈ شیونگ سیٹ دے رہا تھا۔ طہور کی طرف سے خوشبویات کا قیمتی سیٹ تھا اور عائزہ کی طرف سے دینے کے لیے مسز صبور احمد ایک قیمتی گھڑی خرید کر لائی تھیں۔

”یہ تم دینا اسے اپنی طرف سے۔“ انہوں نے عائزہ کو ڈبے میں آراستہ کلائی گھڑی دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

”آپ کتنی سوئٹ ہیں ماما......ہمیں پتا بھی نہیں چلنے دیتیں اور گھر بیٹھے ہمیں سب کچھ لا دیتی ہیں۔ واؤ......“ گھڑی دیکھ کر عائزہ اتنی مسرور ہوئی کہ اس نے بے اختیار ماں کا گال چوم لیا۔

”اس سے کہنا یہ گھڑی تمہیں میری یاد دلاتی رہے گی۔“ مسز صبور احمد نے بیٹی کو سمجھایا۔

”ہاؤ سوئٹ ماما! آپ مجھے کتنی بہت سی کام کی باتیں بتا دیتی ہیں۔“ عائزہ نے اپنی بانہیں ماں کے گلے میں حمائل کردیں۔

”بیٹا! اب پرانا زمانہ نہیں رہا۔ لڑکیوں کو مناسب رشتوں کے حصول میں ماں باپ کی مدد کرنا پڑتی ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”مگر اس کیس میں تو آپ اور پاپا میری مدد کر رہے ہیں۔“

”خدا کرے کوئی رکاوٹ آڑے نہ آئے۔ بھری پری فیملی کا لڑکا ہے بعض دفعہ والدین اور بہن بھائی اس بری طرح گھیراؤ کرتے ہیں کہ لڑکا بے بس ہوجاتا ہے۔ بیٹا ہم نے تو اسے صرف تمہاری خاطر اتنی اہمیت دی۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ عائزہ نے ماں کو اطمینان دلایا۔ انہوں نے عائزہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے اس کا گال تھپتھپایا۔

عائزہ بلاناغہ ہر شب مونس کو فون کرتی۔ مونس فون کرتا تو وہ کہتی۔ ”بچت کی عادت ڈالیں لفٹین صاحب جب میں فون کرلیتی ہوں تو آپ کو کیا ضرورت ہے اپنا بیلنس ضائع کرنے کی؟“

”تمہارا فون فری چلتا ہے کیا؟“ ایک روز اس نے کہا۔

”ویسے تو خیر میں نے پیکج لے رکھا ہے لیکن اگر پیکج کی سہولت نہ بھی ہو تو تم سے بات کرکے تو میرا ایک ایک پیسا وصول ہوجاتا ہے جیسے۔“ پھر اچانک اس کے لہجے میں اداسی اتر آئی۔ ”جب تم پاسنگ آؤٹ کے بعد کراچی چلے جاؤ گے تو کیا ہوگا؟“

”ہمیشہ کے لیے تھوڑی جاؤں گا۔ واپس آنا ہے دیکھو پوسٹنگ کہاں ملتی ہے۔“

”تمہارے بغیر میں بہت اداس ہوجاؤں گی آفیسر۔“

”اور میں تو جیسے بہت خوش رہوں گا۔ بائی دی وے تمہارا لاسٹ سیمسٹر کب ختم ہو رہا ہے؟“

”دو ماہ بعد۔“

"بس تمہارے فائنلز ہوتے ہی میں اپنے گھر والوں سے بات کروں گا۔ تمہارے ماما، پاپا کو تو کوئی بچ نہیں ہوگی؟"

"پہلی بات تو ہوگی نہیں اور خدانخواستہ ہوئی بھی تو تم مجھے اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گے۔" عائزہ نے اپنی ماں کی طرح ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنا پلڑا بھاری رکھنے کی کوشش کی۔ "ایک بات بتاؤ اگر تمہارے گھر والوں نے کہا ہمیں تمہاری شادی اس لڑکی سے نہیں کسی اور لڑکی سے کرنی ہے تو؟"

"تو؟" وہ دھیرے سے ہنسا۔ اسے خوش بخت کا خیال آیا۔ "میں اس لڑکی کو قتل کردوں گا۔" اس نے شگفتگی سے کہا۔

"ماما، پاپا تمہاری پاسنگ آؤٹ کے بعد تمہیں اور تمہارے کلوز سٹ بیچ میٹس کو گرینڈ ریسپشن دینا چاہ رہے ہیں۔"

"ارے نہیں یار! سب بوریا بستر باندھے بیٹھے ہیں۔ پاسنگ آؤٹ کی خوشی جو ہے سو ہے گھر جانے کی خوشی الگ ہے۔ گھر سے حکم ملا ہے کہ اسی شام کراچی واپسی کی سیٹیں بک کرا کے رکھوں۔"

"آئی ول مس یو۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"اس کا تو عادی ہونا پڑے گا تمہیں، کیا پتا کہاں کہاں پوسٹنگ ہو۔"

"میں ہر محاذ پر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے گریجویشن کے بعد کمیشن کے لیے اپلائی کروں گی۔"

"گریٹ!" اس نے بے ساختہ کہا۔

☆☆☆

حجاب ان دنوں سخت ٹینشن میں تھی۔ مگر ٹینشن کے باوجود وہ انتہائی ثابت قدمی سے اپنے محاذ پر بھی ڈٹی ہوئی تھی۔ حریفِ مقابل ہر اعتبار سے مضبوط تھا۔ ستم یہ تھا کہ حجاب کے اپنے گھر والے بھی اسی کے ساتھ تھے۔ اور تو اور ہمیشہ ہر معاملے میں اس کا ساتھ دینے والی رباب بھی۔ سب اسی حق میں تھے کہ اسے اپنی ضد چھوڑ کر رخصتی پر آمادہ ہو جانا چاہیے۔"

"یہ ضد نہیں ہے رباب۔" اس نے کہا۔

"ضد نہیں تو پھر کیا ہے؟"

"تم نہیں سمجھو گی۔"

"ہاں، آپ جیسی عقل مند جو نہیں ہوں۔" رباب کے لہجے میں طنز تھا۔

اس نے چونک کر رباب کی طرف دیکھا۔ "تم بھی میرے خلاف ہوگئیں؟"

"بات خلاف ہونے کی نہیں۔"

"تو پھر؟"

"ذرا سوچیں تو امی کتنی پریشان ہیں۔ سب لوگوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ مہینے بھر بعد رخصتی ہو جائے گی، اب جسے دیکھو یہی سوال کرتا ہے کب ہو رہی ہے رخصتی؟"

"تو کیا میں لوگوں کی خاطر......"

www.Paksociety.com

"ہاں ہاں بولیں......رک کیوں گئیں۔" رباب نے اسے ناراضی سے دیکھا اور بولی "اصل میں آپ کے پاس کوئی معقول وجہ ہی نہیں ہے انکار کی۔"

"تمہارے خیال میں، میں بلا سبب ایسا کر رہی ہوں؟" اس نے رباب کو شاکی نظروں سے دیکھا۔

"تو پھر کوئی سبب بتائیں جو ہم سب کے دل کو بھی لگے۔" رباب شانے اچکا کر بولی۔

"کیا یہ وجہ کافی نہیں کہ وہ شخص جھوٹا ہے دھوکے باز ہے۔ اس نے خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا۔"

"یہ کوئی ایسا ریزن نہیں جو آپ کو اتنا بڑا اسٹیپ لینے پر مجبور کرے۔ نکاح ہو چکا ہے۔ امی کو سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو یہاں سے پشاور تک سارے رشتے دار ہنسیں گے۔ مجھے تو اپنی دوستوں کی فکر لگی ہوئی ہے، میں نے ان سے کہا تھا میں تم سب کو انوائٹ کروں گی۔ وہ روز پوچھتی ہیں کب ہو رہی ہے تمہاری باجی کی رخصتی۔ اب تو مجھے شرم آنے لگی ہے۔"

"کہہ دو نہیں ہو رہی رخصتی۔"

"جی!" رباب نے پھر اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔ "سب کو آپ کے نکاح کی تصویریں دکھا رکھی ہیں میں نے، پوچھیں گی نہیں وہ سب کہ کیوں نہیں ہو رہی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں انہیں تصویریں ہی نہ دکھاتی۔"

"اسی لیے تو عقل مند کہتے ہیں کہ اپنی ذاتی زندگی کو راز ہی رکھنا چاہیے۔"

"وہ عقل مند آپ ہی ہو سکتی ہیں۔" رباب نے لحظہ بھر کو توقف کیا پھر بولی۔ "قرنطینہ میں تو رہتے نہیں ہیں ہم جو ذاتی زندگی راز رکھ سکیں۔ بندہ اپنا دکھ سکھ دوستوں کے ساتھ شیئر کرتا ہی ہے۔"

"تو پھر رنج کس بات کا۔ شیئر کرلو یہ بات بھی کہ وہ شخص شادی شدہ نکلا لہٰذا رخصتی منسوخ اور رشتہ ختم۔"

امی جو ان دونوں کی باتیں سن رہی تھیں زچ ہو کر بولیں۔ "یہ جو تم بار بار رشتہ ختم کرنے کی بات لاتی ہو نا زبان پر بھائی تمہارا پٹھان بچہ ہے۔ غیرت میں آگیا تو قتل کردے گا تمہیں۔"

"کتنی مرتبہ یہ دھمکی دیں گی آپ مجھے......اچھا ہے قتل کردیں قصہ تو ختم ہوگا۔"

"قصہ ختم نہیں ہوگا۔ کہانیوں پہ کہانیاں بنیں گی۔ کچھ کہیں گے لڑکی عیب دار ہوگی جو بھائی نے قتل کردیا اور میرا بچہ اللہ نہ کرے سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔ اخباروں میں خبریں لگیں گی تصویریں چھپیں گی۔"

"امی میں نے اس کی بیوی کو زبان دی ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اس کا شوہر کسی اور سے دوسری شادی کر کے اسے اپنے گھر لائے تو لائے میں اس کے گھر بہر حال نہیں جاؤں گی۔ وہ اس گھر کی مالکہ ہے امی، میں اس کے گھر پر کیسے قبضہ کرلوں؟" حجاب نے بے بسی سے کہا۔

"جب الطاف اسے رکھنا ہی نہ چاہے تو؟"

"یہ اس کا اور الطاف کا معاملہ ہے۔ میں اس عورت کے ساتھ الطاف کی زیادتی کو اپنے سر کیوں لے لوں......کیوں کسی دوسری عورت کے مقبرے پر اپنا محل تعمیر کروں۔ آپ ہی تو کہتی ہیں امی کہ مرد کی دوسری شادی عورت کے لیے موت سے کم نہیں ہوتی۔"

"تقریر مت جھاڑو۔"

"واہ امی! اگر میں اپنا مؤقف بیان کرتی ہوں تو آپ اسے تقریر کہہ کر رد کردیتی ہیں یہ تو انصاف نہ ہوا۔"

www.Paksociety.com

''ایک بار اس کے گھر چلی جاؤ پھر مختار ہوگی جو مرضی آئے کرنا۔''
''اچھا! داغ دار کرلوں اپنی زندگی کو؟''
''داغ دار تو ایسے بھی ہوگی۔'' امی نے ترت کہا۔
وہ امی کا منہ تکتی رہ گئی۔
''غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ اللہ نہ کرے جو ایسا ہو، طلاق کا داغ تو داغ ہی ہوتا ہے۔''
الطاف نے بھی مشکیں کس لیں۔ ''ساری زندگی وہ یونہی بیٹھی رہے نہیں دوں گا میں اسے طلاق۔''
بہجت بھائی نے ہمنوائی کی۔ ''ہم بھی یہ نہیں چاہتے کہ آپ ایسا کچھ کریں۔ ہمارے لیے بھی یہ بے عزتی کی بات ہوگی۔''
''وہ تمہیں کسی قیمت پر طلاق دینے کو تیار نہیں۔'' نایاب باجی نے کہا۔
''خلع تو میرا حق ہے۔'' حجاب نے بے جھجک کہا۔ ''میں کورٹ جاؤں گی۔''
''میرے خدا! یہ کیا بک رہی ہے۔'' امی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
''میں خلع کا دعویٰ دائر کروں گی۔'' اس نے دوٹوک کہا۔
''دیکھو حجاب! میری خاموشی کو کمزوری نہ سمجھا جائے۔ یہ لحاظ ہے جس نے مجھے اب تک تم سے یوں آمنے سامنے بات کرنے سے روکے رکھا۔ فیصلے مرد کرتے ہیں عورتیں نہیں۔ ہمارے خاندان میں عورت کا مقدر جس کے ساتھ لکھ دیا جاتا ہے وہ اسی کے نام پر مرتی ہے۔ شوہر سے علیحدگی کے لیے آج تک ہماری کسی عورت نے عدالت کی سیڑھیاں نہیں چڑھیں۔'' بہجت بھائی طیش میں آکر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ امی کا خیال تھا وہ بہجت بھائی کے سامنے چپ رہے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔
''بھائی! مجھے آپ سے اتنا ہی پیار ہے جتنا کوئی بہن اپنے بھائی سے کرسکتی ہے۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ زندگی میں اگر کبھی کوئی ایسا موقع آئے کہ مجھے آپ کے لیے اپنی جان دینے کی ضرورت پیش آئے تو میں دریغ نہیں کروں گی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس مسئلے کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ اگر میری مدد نہیں کرسکتے تو مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔''
''اکیلا چھوڑ دیں۔'' بہجت بھائی نے پاؤں زور سے زمین پر مارا اور بولے۔ ''اکیلا چھوڑ دیں! کس لیے اکیلا چھوڑ دیں؟ خاندان کی عزت سے کھیلنے کے لیے...... جاؤ دیکھو اس دنیا میں عورتیں کیسے کیسے مردوں کے ساتھ گزارہ کررہی ہیں...... مرد کا دوسری شادی کرنا کوئی جرم تو نہیں۔ وہ اعتراف کرتا ہے شرمندہ ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ پہلی بیوی کو بہرصورت فارغ کرے گا اور کیا چاہتی ہو تم؟''
''پہلی بیوی کو میری وجہ سے فارغ نہ کرے۔'' بہجت بھائی کے لحاظ میں وہ دبی زبان سے بولی۔
''یہ تم کہہ سکتی ہو اس سے۔'' بہجت بھائی کا لہجہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔
''میں اس سے کچھ نہیں کہنا چاہتی...... نہ کوئی تعلق رکھنا چاہتی ہوں۔''
بہجت بھائی نے اسے گھورا، دوبارہ زور سے پاؤں زمین پر مارا اور غصے میں کمرے سے نکل گئے۔
''تو چاہتی کیا ہے آخر؟'' امی نے اس پر آنکھیں نکالیں۔
''کتنی مرتبہ آپ یہ سوال کرچکی ہیں اور کتنی مرتبہ میں اس سوال کا جواب دے چکی ہوں...... آج آخری

مرتبہ میرا جواب سن لیجیے۔ وہ شخص اگر سونے کا بن کر ہیرے جڑوا کر بھی آجائے تو مجھے اس کا ساتھ منظور نہیں۔'' اس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔
''اس سے تو اچھا تھا کہ میں نے تجھے جنم ہی نہ دیا ہوتا۔'' امی بولیں۔
''کاش!'' اس نے فقط اتنا ہی کہا۔

☆☆☆

ہفتے وار تعطیل تھی۔ عباد اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کرسی ڈالے بڑے انہماک سے اخبار میں ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات دیکھ رہا تھا۔ امی کے ساتھ باقی معاملات تو حسبِ معمول جاری وساری تھے مگر اس کی شادی کے مسئلے پر وہ ان دنوں کچھ خفا تھیں۔ انہوں نے اس سے کہہ دیا تھا۔ ''تم اپنے لیے اب خود کوئی لڑکی دیکھو۔ پسند آجائے تو بتا دینا۔ تمہاری شادی پورے ارمان سے کروں گی مگر رشتہ تم خود ہی دیکھو گے۔''
عباد نے زیتون کے بتائے ہوئے رشتے سے اپنے طرزِ انکار پر امی کی خفگی دور کرنے کے لیے معذرت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا خیال تھا معذرت کبھی کبھی بات کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیتی ہے۔ وہ ان دنوں انتہائی سنجیدگی سے ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات کھنگال رہا تھا۔ اس کے ایک کولیگ کی شادی اخبار میں ضرورتِ رشتہ کے ایک اشتہار کے ذریعے ہوئی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔
''ملا کوئی کام کا اشتہار؟'' امی نے خربوزے کی پلیٹ اس کے سامنے پڑی پلاسٹک کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
''دیکھ رہا ہوں امی۔''
''خیال رکھنا آج کل دھوکا بھی بہت ہوتا ہے۔''
اپنی نظریں اخبار پر مرکوز رکھتے ہوئے اس نے ہاتھ پلیٹ کی طرف بڑھایا اور کانٹا ہاتھ میں لے کر اسے خربوزے کے ایک چوکور ٹکڑے میں کھوبتے ہوئے بولا۔ ''فکر نہ کریں امی، آپ کا بیٹا دھوکا کھانے والا نہیں۔''
''خدا نہ کرے جو تم کبھی دھوکا کھاؤ۔'' امی کے لہجے میں خشیت تھی۔ زیتون کے بتائے ہوئے رشتے کے سلسلے میں امی کی اس سے خفگی اپنی جگہ مگر عباد سے ان کی محبت ایسی سدابہار حقیقت تھی جس پر خزاں کا سایہ پڑنا بھی محال تھا۔ عباد سے وہ کسی بات پر ناراض بھی ہوتیں تو یہ ناراضی عباد سے ان کی محبت کا بال بھی بیکا نہ کرپاتی۔
''بہت میٹھا خربوزہ ہے امی۔'' عباد نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔''
''آپ کیوں نہیں لے رہیں؟''
''بلڈ پریشر کی گولی لی ہے ابھی، تم کھاؤ میں کھالوں گی۔''
دفعتاً عباد سیدھا ہو بیٹھا اور اس نے ایک اشتہار بہ آوازِ بلند پڑھنا شروع کردیا۔ ''متمول گھرانے کی اکلوتی صاحب زادی کے لیے ایک پڑھے لکھے اور برسرِ روزگار ہینڈسم نوجوان کا رشتہ درکار ہے۔ لڑکی کے نام پر ایک پوش علاقے میں کوٹھی موجود ہے۔ لڑکے کو مالی تعاون اور بہتر روزگار کی پیشکش بھی ممکن ہے۔'' اشتہار پڑھنے کے بعد عباد نے امی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کیوں امی کیا خیال ہے؟''
''بیٹا تم جانو۔''

www.Paksociety.com

"فون نمبرز بھی دیے ہیں، گڈ!" عباد نے اخبار پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔
امی نے ایک گہری سانس کھینچی۔ کس چکر میں پڑ گیا تھا ان کا لال۔ انہیں تو اس کے لیے ایک سلیقہ مند، وفا شعار اور خدمت گزار شریکِ سفر کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

تقدیم اور ابا مونس کی پاسنگ آؤٹ تقریب میں جانے کی تیاری کر چکے تھے۔ تقدیم نے ٹرین پر اپنی اور ابا کی نشستیں بھی محفوظ کرالی تھیں۔ تسنیم گھر آئی تو اماں چاہتی تھیں گھڑی کی چوتھائی میں وہ ان کے گھر سے رخصت ہو لیکن اسے لے جانے والوں کی کسلمندی سے اماں اب اس پر بھی قانع ہوگئی تھیں کہ یہ مسئلہ مونس کے گھر آنے سے پہلے پہلے سیٹ ہو جائے یا جب اتنی تاخیر ہوئی ہی ہے تو کچھ اور سہی رخصتی مونس کے آتے ہی کر دی جائے۔ مونس کو اعتماد میں لے کر یہ سمجھایا جاسکتا تھا کہ تسنیم کی اپنے یونیورسٹی فیلو سے انڈراسٹینڈنگ ہوگئی تھی لہٰذا اسے عزت سے رخصت کر دینا ضروری ہوگیا تھا۔ کیا ضرورت تھی مونس کو ساری رام کہانی سنانے کی۔ بھائی تھا کیسا شرمندہ ہوتا بہن کے کارنامے پر، شریف لڑکیاں باپ بھائی کی عزت کوئی یوں اچھالتی ہیں جیسے تسنیم نے اچھالی تھی۔
اماں چاہتی تھیں مونس کے آنے سے پہلے تمام معاملات طے ہوں اور اس کے آتے ہی ایک دو روز میں تسنیم اس گھر سے رخصت ہو جائے تاکہ مونس کو اس حبس زدہ ماحول کا سامنا نہ ہو جیسا کہ گھر کا ان دنوں ہو رہا تھا۔
مدثر سے اماں کا اپنا جی تو چاہتا نہ تھا بات کرنے کو تقدیم ہی سے بات کرواتیں۔ وہ ہر مرتبہ یہی کہتا کہ بہت جلد اس کے گھر والے ان کے گھر آ رہے ہیں لیکن اب مزید تاخیر گوارا نہ تھی۔ اس روز بھی تقدیم کے بات کرنے پر جب مدثر نے وہی بات دُہرائی تو اماں نے تقدیم سے کہا۔
"اس سے کہو اپنی والدہ کا نمبر دے میں خود بات کروں گی۔"
"والدہ تمہاری مدر سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" تقدیم نے مدثر سے کہا۔
"کیا بات کریں گی؟" وہ چونک کر قدرے ناگواری سے بولا۔
"ظاہر ہے اسی سلسلے میں۔"
"دیکھیں جی میں نہیں چاہتا کہ میری مدر زیادہ پریشان ہوں۔ جب مناسب ہوگا آ جائیں گی۔" مدثر کا لہجہ یک لخت بدل گیا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"ویٹ اینڈ سی۔"
"ویٹ اینڈ سی۔" تقدیم نے اِک شاک کی کیفیت میں اس کے الفاظ دُہرائے۔
"تنگ آ گیا ہوں میں اسی ایک سوال سے۔ تسنیم کو فون کرتا ہوں تو وہ یہی بات کرتی ہے۔ آپ فون کرتی ہیں تو یہی ایک سوال کب بھیج رہے ہو، کب بھیج رہے ہو۔"
"ہاں تو اس ایک سوال کے سوا اور ہے کیا ہمارے اور تمہارے درمیان؟" تقدیم کو بھی غصہ آ گیا۔
"میں نے جواب دے دیا ہے آپ کو۔"
مصلحتِ وقت نے تقدیم کو اپنا لہجہ دھیما کرنے پر مجبور کردیا۔ "دیکھو بات یہ ہے کہ...... تسنیم کی وجہ سے ہمارا پورا گھر پریشان ہے۔ اس کا جلد از جلد سیٹل ہونا ضروری ہے۔"

"ان فیکٹ ہمارے بھی کچھ مسائل ہیں۔"
"تو میرے بھائی نکالو نا مسائل کا کچھ حل۔"
"کیا آپ کے خیال میں، میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔" اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔
"نو، نو، نو...... میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔"
"تو پھر کیا مطلب ہے آپ کا۔"
"میرا خیال ہے اس مسئلے کا حل نکالنے کے لیے تمہارے اور ہمارے بڑوں کا ملنا ضروری ہے۔ بیٹھیں گے بات کریں گے، ایک دوسرے کی سنیں گے تو انشاء اللہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔" تقدیم جیسے اماں کی طویل علالت کے باعث سر آ پڑنے والی بعض ذمے داریوں اور این جی او کی ملازمت کے سلسلے میں قسم قسم کے لوگوں سے ہمہ وقت رابطے نے موقع محل کے لحاظ سے گفتگو کا ڈھنگ سکھا دیا تھا۔ مدثر سے انتہائی حلیم انداز سے بولی۔
"دیکھتے ہیں۔" مدثر کا انداز بہت سرسری اور ٹالنے والا تھا۔ اماں جو لاؤڈ اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے مدثر کی باتیں سن رہی تھیں انتہائی متفکر دکھائی دینے لگیں۔

☆☆☆

حجاب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زندگی کبھی اسے ایسے موڑ پر لا کھڑا کرے گی جہاں اس کے عزیز از جان لوگ مدِمقابل ہوں گے۔ اک سرد سی جنگ چھڑ گئی تھی اس کے اور اس کے گھر والوں کے درمیان۔ ہر ایک اس سے نالاں، ہر ایک اس سے بیزار اور صورت نہ دیکھنے کا روادار۔ امی اول تو اس کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں اور جو کبھی بے دھیانی میں اس پر نظر پڑ بھی جاتی تو اسے دیکھتے ہی ان کے چہرے کے خطوط بگڑ جاتے اور آنکھوں سے ناگواری جھانکنے لگتی۔ نایاب باجی آتیں تو یوں اجنبی بنی گزر جاتیں جیسے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ بہجت بھائی آتے تو اسے یوں نظرانداز کرتے جیسے وہ انہیں نظر ہی نہ آئی ہو۔ ان کی اطاعت گزاری میں ارم بھابی بھی بس ایک آدھ رسمی فقرہ ادا کر کے اپنی راہ پکڑتیں۔ ہمہ وقت جان کو آئی رہنے والی رباب بھی دور دور رہتی اور ناراضی کا تاثر دیتی۔
حجاب بہت اداس تھی۔ اپنوں کی ناراضی نے اسے نکو بنا دیا تھا۔ اسکول سے گھر آتی تو سرد مہری کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسکول میں بھی گھر والوں کی غیریت کا احساس رہ رہ کر اس کا دل دکھاتا۔ سب نے اس شدت سے اس کا مقاطعہ کر رکھا تھا کہ تنہائی کا احساس اس کے رگ و پے میں اتر گیا تھا۔ بھائی بہنوں کی ناراضی جو دکھ دیتی تھی سو دیتی تھی امی کی لاتعلقی اس کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ ایسے تو وہ پہلے کبھی ناراض نہ ہوئی تھیں اس سے۔
"میڈم! آج کل آپ کا چہرہ کافی اترا اترا ہے۔ خیریت تو ہے؟" اسکول میں ٹیچرز کہتیں۔
"ہاں...... الحمدللہ۔" وہ نظریں چرا کر جواب دیتی۔
"فریش نہیں دکھائی دے رہیں آج کل آپ۔"
"اوور ورکڈ ہوں۔" وہ کام کی زیادتی کو بہانہ بناتی۔
"تیاریاں ہو رہی ہوں گی؟" اس کا اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے رہ جاتی۔ وہ گول مول جواب دیتے یا بات کا رخ کسی اور طرف موڑنے کی کوشش کرتی مگر یہ خیال اس کے دل کو کچوکے لگاتا کہ حقیقت کو ایک نہ ایک دن تو آشکار ہونا ہی تھا۔
گھر میں ہوتی تو امی کی بے رخی اسے ڈپریسڈ کر دیتی۔ جس ماں کو وہ دیوانہ وار چاہتی تھی اس کی بے رخی

زندگی کا سب سے بڑا عذاب محسوس ہوتا۔ خدا جانے لوگ اپنے پیاروں کو ناراض کر کے کیسے جی لیتے ہیں وہ تو جیسے جانکنی کے عالم میں تھی۔ سارے شوق جیسے ہوا ہو گئے تھے۔ نہ شاپنگ، نہ میک اپ، نہ دکانوں پر لگی کپڑوں، جوتوں اور ہینڈ بیگز کی سیل کی پروا، ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی مجسم تفسیر بنی ہوئی تھی ان دنوں وہ۔ رات کو بستر پر لیٹتی تو روح میں اترا سناٹا تھکن بن کر اس کے وجود میں پھیل جاتا۔

الطاف کے بارے میں اسے کچھ خبر نہ تھی۔ کہاں تھا کیا کر رہا تھا کیا چاہتا تھا کیا سوچ رہا تھا۔ گھر میں بھی کوئی اس کا نام نہ لیتا اور اگر لیتا بھی تو وہ سن کہاں پاتی۔ اسے دیکھتے ہی گھر والوں کی چلتی زبانوں کو یک بیک بریک لگ جاتا تھا۔

دن رات کی کڑھن نے اس کے چہرے کی شادابی کو پژمردگی میں تبدیل کر دیا تھا۔ آئینے کے سامنے ہوتی تو اسے اپنا آپ اجنبی لگتا۔ آنکھوں میں خمار کی جگہ ویرانی دکھائی دیتی۔ ہونٹوں کے گلاب مرجھائے نظر آتے۔ نہ اس کی مسکراہٹ میں پہلے کی سی لپک رہی تھی نہ چال میں وہ پہلی سی تمکنت۔ ہر اگلے دن وہ پچھلے دن سے زیادہ بھی زیادہ ٹوٹی ہوئی دکھائی دیتی۔ مگر اپنے فیصلے پر وہ ہر اگلے دن ہر پچھلے دن سے زیادہ پُرعزم اور راسخ ہوتی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ڈیڈی نے مدثر کو بڑی شاندار آفر دی تھی۔ اور وہ یہ کہ اگر وہ اس لڑکی کو جس سے اس نے نادانی میں کورٹ میرج کی تھی اپنے گھر لانے کا خیال دل سے نکال دے تو وہ یونیورسٹی میں اس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد اسے بہن کے پاس اسکاٹ لینڈ بھیج دیں گے۔

”تمہاری مرضی چاہے آگے پڑھنا چاہے زرینہ کے شوہر کے ساتھ اس کے بزنس میں لگ جانا۔ میری طرف سے تمہیں پوری اور ہر طرح کی سپورٹ حاصل ہوگی۔“

مدثر اسکاٹ لینڈ جا چکا تھا۔ وہاں جانے کا خیال اسے ہمیشہ مسرت بخشتا۔ اس کی بہن زرینہ جو شادی کے بعد اسکاٹ لینڈ میں مقیم تھی کہا کرتی تھی۔ ”دنیا بھر میں اگر کوئی جگہ ہے رہنے کی تو وہ اسکاٹ لینڈ ہے۔“

اسکاٹ لینڈ میں مستقل قیام مدثر کی بھی دلی آرزو تھی اور اس کی دو وجوہات تھیں اول اسکاٹ لینڈ کی خوب صورتی اور سکون دوم بہن، بہنوئی اور ان کے بچوں کی وہاں موجودگی۔ ڈیڈی کی آفر پر وہ جھوم ہی تو گیا۔

”ڈیڈی سے کہیں ہم دونوں ہی کو بھجوا دیں۔“ اس نے ممی سے سفارش کروانے کی کوشش کی۔

”ہم دونوں سے مراد؟“ ممی نے تجاہل سے کام لیا۔

”سمجھا کریں نا...... میں اور وہ۔“

”تمہارا مطلب ہے وہ لڑکی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ممی کی خوشامد میں ان کے پاؤں دبانے لگا۔

”اچھا بابا، اچھا کہہ دوں گی۔“ ممی نے کہا اور ڈیڈی کے اچھے موڈ میں ان سے بات کی۔

”دونوں اکٹھے باہر چلے جائیں تو لڑکی کے گھر والوں کی بھی عزت رہ جائے گی ہماری بھی۔“

مگر ڈیڈی کی طرف سے بہت سخت اور کورا جواب سننے کو ملا۔ ”مدثر کو سمجھا دو کہ کسی خوش فہمی میں نہ رہے۔ اسکاٹ لینڈ بھی میں اسے اسی وقت بھیجوں گا جب وہ اس گند سے اپنا پیچھا چھڑا لے ورنہ ایک دمڑی نہیں دوں گا اسے...... اس لڑکی کے نام پر تو میں اسے مورل سپورٹ بھی نہیں دوں گا۔“

”آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ غلطی اس کی نہیں ہمارے بیٹے کی ہے اسی نے مجبور کیا اسے کورٹ میرج پر۔“

”دودھ پیتی بچی تھی نا وہ۔“ ڈیڈی نے ممی کو گھورا۔ ”یونیورسٹی پڑھنے والی لڑکی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی اپنی مرضی نہ ہو۔ جس لڑکی کو اپنی عزت پیاری نہیں، اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال نہیں وہ ہماری عزت کی کیا پروا کرے گی۔ اسکاٹ لینڈ پہنچ کر تو وہ تمہارے بیٹے کو تگنی کا ناچ نچادے گی۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا۔“

”میں جانتی ہوں آپ یہ سب کچھ کس لیے کر رہے ہیں۔“ ممی نے کہا۔

”کس لیے؟“ ڈیڈی نے چونک کر ممی کی طرف دیکھا۔

”نا ہا کے لیے۔“

”ہاں تو کیا غلط کر رہا ہوں۔“ ڈیڈی بلبلائے۔ ”بھانجی ہے میری۔ غیروں کی بیٹیاں میری محنت کی کمائی پر کیوں عیش کریں۔“

”لیکن یہ ظلم ہوگا کہ اپنی کو آباد کرنے کے لیے کسی غیر کی بیٹی کو برباد کر دیا جائے۔“ ممی نے کہا۔

”تو پھر بیٹے کے گلے میں پٹا ڈال کر رکھنا تھا نا۔“ ڈیڈی نے بھڑک کر ممی پر آنکھیں نکالیں۔

”سوچ لیں اچھی طرح۔“ ممی بولیں۔

”میں سوچتا نہیں فیصلہ کرتا ہوں۔“

ممی چپ ہو رہیں۔ ڈیڈی سے بحث میں الجھنا فضول تھا۔ زندگی میں پہلے کبھی سنی تھی انہوں نے ان کی جو وہ اب سنتے۔ انہیں اپنی بات دوسرے کے مقابلے میں ہمیشہ درست محسوس ہوتی۔ اپنی معاشی برتری کے زور پر وہ اہلِ خانہ کو اکثر معاملات میں اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ تازہ ترین معاملے میں ان کی فراخدلانہ پیشکش نے مدثر کو پس وپیش میں ڈال دیا تھا۔ فی زمانہ اس کی عمر کے اکثر نوجوان انگلینڈ اور امریکا میں جا بسنے کو نعمتِ عظمیٰ تصور کرتے ہیں چاہے وہاں جا کر انہیں گوروں کی مغلظات ہی کیوں نہ سننی پڑیں۔ مدثر کے لیے اسکاٹ لینڈ جا کر رہنا ایک ایسا خواب تھا جس کی حسبِ منشا تعبیر پانے کی قیمت ادا کرنے کے لیے اسے اگر کوئی واردات بھی کرنی پڑتی تو وہ دریغ نہ کرتا۔

☆☆☆

بہت روشن اور توانا صبح تھی۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں اپنی تربیت مکمل کرنے والے نوجوان پاس آؤٹ ہو رہے تھے۔ اس دستے میں مونس اور عقیل بھی شامل تھے۔ پاس آؤٹ ہونے والے افسروں کے متعلقین اس پُروقار تقریب میں شریک تھے۔ ان کے چہرے فخر وانبساط سے تمتما رہے تھے۔ ابا اور تقدیم بھی خوش تھے مگر اماں کے بنا یہ خوشی ادھوری تھی اور تسنیم والے واقعے کے باعث کچھ بجھی بجھی بھی۔

تقریب بہت پُروقار رہی۔ تقدیم مہمان گاہ میں بیٹھی مستعدی اور وقار سے مارچ پاسٹ کرتے نوجوان افسروں کے تازہ دم دستے میں بیتابانہ نگاہوں سے بھائی کو ڈھونڈتی رہی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ تقریب کے اختتام پر جب واپس پلٹ کر جانے والے نوجوان افسروں نے اپنی فوجی ٹوپیاں سروں سے اتار کر فضا میں اچھالیں تو تقدیم کا بے ساختہ جی بھر آیا۔ اس نے کن انکھیوں سے ابا کی طرف دیکھا، وہ اپنے تہ شدہ رومال کا دبیز کنارہ اپنی آنکھ کے حاشیے پر پھیر رہے تھے۔

www.paksociety.com

"مبارک ہو ابا۔" اس نے انہیں مونس کے افسر بن جانے کی مبارک باد دی۔

ابا دھیرے سے مسکرا دیے اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "ہاں، بیٹی تمہیں بھی مبارک ہو۔"

مہمانوں کے لیے چائے کا اہتمام اکیڈمی کی دیرینہ روایت تھی۔ چائے کے دوران مونس نے ابا اور تقدیم کو صبور احمد، ان کے اہلِ خانہ اور اپنے بیچ میٹ عقیل اور اس کے گھر والوں سے متعارف کرایا۔

"جناب! بہت خوش قسمت ہیں آپ۔ اللہ نے آپ کو بہت پیارا بیٹا دیا ہے۔" صبور احمد نے ابا کو مبارک باد دینے کے بعد کہا۔

"اللہ کا مال ہے۔" ابا دونوں ہاتھ بلند کر کے عجز و انکساری سے اوپر دیکھتے ہوئے بولے۔

"میں بھی ہوں ماموں تھوڑی بہت تعریف میری بھی کر دیں۔" عقیل چہکا۔

"بیٹے تم بھی اللہ ہی کا مال ہو۔" صبور احمد نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے پھوکے منہ سے کہا۔

سب ہنس پڑے۔

"ابا، انکل اور آنٹی نے مجھے گھر سے دوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔" مونس نے صبور احمد اور ان کی بیگم کی بابت ابا کو بتایا۔

"خدا انہیں جزا دے۔"

ابا اور تقدیم دونوں اپنی اپنی جگہ حیران تھے کہ اس سے پہلے مونس نے کبھی بھولے سے بھی صبور احمد اور ان کے اہلِ خانہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ صبور احمد اور ان کے اہلِ خانہ کی مونس پر غیر معمولی وارفتگی بھی انہیں معنی خیز لگ رہی تھی۔ تقدیم نے عائزہ اور مونس کو بارہا میٹھی میٹھی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے پایا لیکن اس نے اپنے وہم کو دل سے جھٹک دیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا۔ مونس اچھی طرح جانتا تھا کہ اماں اور ابا بہت عرصے سے خوش بخت کو اس کے لیے پسند کیے بیٹھے تھے۔ مونس ایسا غیر مؤدب اور نافرمان نہیں تھا کہ والدین کی خواہش کا احترام نہ کرتا۔

چائے کے بعد پاس آؤٹ ہونے والے افسروں نے ہاسٹل سے اپنا اسباب اٹھانا شروع کیا۔ مونس اور عقیل دونوں ہی اپنا سامان باندھے ہوئے تھے۔ صبور احمد اپنی گاڑی نہیں لائے تھے۔ عقیل کے گھر والے انہی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ سواریوں کی تعداد دیکھتے ہوئے انہوں نے اسلام آباد سے کاکول تک آنے جانے کے لیے ٹویوٹا ہائی ایس بک کرائی تھی جس میں عقیل کا سامان بھی رکھا جا سکتا تھا۔ عقیل کے گھر والوں کو ابھی دو دن اور صبور احمد کے ہاں رکنا تھا۔ مونس نے رات آٹھ بجے بذریعہ ٹرین کراچی روانگی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ صبور احمد نے اس کا اسباب بھی زبردستی ہائی ایس میں رکھ لیا اور بڑی اپنائیت سے ابا، تقدیم اور مونس کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔

"جناب! میں آپ کو خود پنڈی اسٹیشن سے ٹرین میں سوار کراؤں گا۔" صبور احمد نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرتے ہوئے قدرے نیم خم ہو کر انتہائی نیازمندی سے ابا سے کہا۔ جس خلوص کا وہ اظہار کر رہے تھے وہ انکار کی جا ہی نہ چھوڑ رہا تھا۔

اسلام آباد پہنچنے پر صبور احمد سب کو دوپہر کے کھانے کے لیے فوڈ پارک لے گئے۔ صبور احمد اور ان کی بیگم کے اخلاص، ان کے بچوں کی دلچسپ باتوں اور عقیل کے چٹکلوں نے کھانے کا مزہ دوبالا کر دیا۔ ابا کو وہ لوگ بہت اچھے لگے۔

شام کو مسز صبور نے ایک ہنگامی پارٹی کر ڈالی۔ مونس اور عقیل کے ساتھ ابا اور تقدیم کو بھی تحائف دیے گئے۔ مونس کے باقی گھر والوں کے لیے بھی صبور احمد اور ان کی بیگم ڈرائی فروٹ بطورِ سوغات خرید لائے۔ اماں کے لیے مسز صبور نے ایک خوب صورت شال بطور تحفہ دی۔ غرض اتنا زیرِ بار کر دیا کہ رات کو ٹرین پر سوار ہوتے وقت ابا ان سے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "آپ بھی کراچی ضرور آئیے گا۔"

"انشاء اللہ انشاء اللہ! اب تو ملنا جلنا رہے گا جناب۔" صبور احمد نے گرم جوشی سے کہا۔

گاڑی چھوٹی تھی ورنہ شاید صبور احمد کے بچے اور عقیل اور اس کے گھر والے بھی ابا، تقدیم اور مونس کو سی آف کرنے پنڈی آتے۔

ٹرین روانہ ہوئی تو ابا نے پہلی بات یہ کہی۔ "بہت اچھے لوگ ہیں بھئی۔ انہوں نے تو اپنوں سے بڑھ کر عزت دی۔"

☆☆☆

مونس کی گھر آمد نے گھر کے مردہ ماحول میں اِک زندگی سی پھونک دی۔ تمہید، تعظیم، تقدیس سب جی اٹھیں۔ قریبی رشتے دار ایک ایک کر کے مبارک باد دینے آئے۔ البتہ تسنیم اپنے کمرے ہی میں محصور رہی۔ مونس کے پوچھنے پر اماں نے بہانہ کیا۔

"بہنوں سے لڑائی کر کے بیٹھی ہوئی ہے۔"

"کس سے؟"

"چاروں سے۔"

مونس نے اس سے ملنے کے لیے کمرے میں جانا چاہا تو اماں نے منع کر دیا۔ "کوئی ضرورت نہیں، تمہیں بھی کچھ الٹا سیدھا کہہ دیا تو تمہارا بھی دل برا ہو گا۔ خوشی خوشی آئے ہو خوشی خوشی رہو۔"

"یونیورسٹی جانا بھی چھوڑ رکھا ہے کیا؟"

"چھٹیاں ہیں۔" مونس بے چارے نے کون سا کوئی یونیورسٹی جا کر تصدیق کرنی تھی۔

خاندان میں سب کو تسنیم کے مزاج کا پتا تھا لیکن عام حالات میں اماں، بھائی بہنوں سے اس کے لڑائی جھگڑوں پر خاندان والوں سے پردے ڈالا کرتی تھیں مگر اب کی بار اس کے اصل کرتوت پر پردہ ڈالنے کو اماں نے ہر آئے گئے کو بہنوں سے تسنیم کے لڑائی جھگڑے کا فرضی قصہ سنانے میں رو رعایت سے کام نہ لیا۔

"ارے اس کی تو عادت ہی ہے لڑ جھگڑ کر کمرے میں بند ہو جاتی ہے۔"

"اماں کیا ضرورت ہے ایک ایک کو یہ بتانے کی۔" مونس معترض ہوا۔

"ارے بیٹا اس سے پہلے کہ لوگ پوچھیں میں خود ہی نہ بتا دوں۔" اماں نے کہا۔ "سوچا تھا تم گھر آؤ گے تو قرآن خوانی کروائیں گے سب کی دعوت کریں گے مگر اس ناشدنی نے پہلے ہی نحوست پھیلا دی۔ تمہاری خوشی بھی نہ کر سکے ہم۔"

"کوئی بات نہیں اماں۔"

مونس کو گھر آئے تیسرا چوتھا دن تھا۔ شام کے وقت اماں ابا کے پاس بیٹھا وہ کچھ ان کی سن رہا تھا کچھ اپنی باتیں کر رہا تھا۔ یکا یک اماں نے ابا سے کہا۔ "تقدیم کے ابا خیر سے بیٹا گھر آیا ہوا ہے۔ اس کے آنے کی خوشی تو نہ

www.paksociety.com

کر سکے ہم۔ ایک چھوٹی سی خوشی تو کر ہی لیں۔ آپ کی بہن سے بات کر کے مونس کے جانے سے پہلے خوش بخت کو انگوٹھی پہنا آتے ہیں۔''

مونس دم بخود رہ گیا کہ اچانک اماں نے خوش بخت کا ذکر کیوں چھیڑ دیا تھا۔

''ان لوگوں نے بھی جواباً کوئی رسم کرنے کو کہا تو؟'' ابا نے بین السطور تسنیم کے حوالے سے اپنی تشویش ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''کہہ دیں گے گھر کی بات ہے کسی تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں انہیں جو رسم کرنی ہو اپنے گھر کی تقریب میں ہی کرلیں۔'' اماں بولیں۔

مونس نے پہلو بدلا اور کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔ ''ابھی ایسی کوئی بات نہ کریں۔''

''کیوں؟'' اماں چونکیں۔

''بس۔'' مونس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''بس کا کیا مطلب؟''

''اماں مجھے ابھی سیٹ ہونا ہے۔''

''ہاں ہاں ہوتے رہنا سیٹ۔ ہم کون سا کوئی ابھی شادی کی بات کر رہے ہیں۔ کرلیں گے دو چار سال انتظار۔ میں تو بس بات پکی کرنا چاہتی ہوں تاکہ تمہاری پھپو خوش بخت کی کہیں اور نہ کر دیں۔''

''خوشی سے کریں۔'' مونس بولا۔

''ہیں! کیسی بات کر رہے ہو۔ خوش بخت پر تو میں نہ جانے کب سے نظریں گاڑے بیٹھی ہوں۔ چھوٹی سی تھی وہ میں نے تبھی سوچ لیا تھا اسے تمہاری دلہن بناؤں گی۔''

مونس نے اماں سے تو مزید کچھ نہ کہا سنا لیکن اسی شام اس نے تقدیم کی دفتر سے واپسی پر موقع ملتے ہی اس سے کہا۔ ''آپی! اماں چھوٹی پھپو کے ہاں میری منگنی شگنی کی بات کر رہی تھیں انہیں منع کر دیں۔''

''کیوں بھئی؟'' تقدیم چونکی۔

''بس۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''اماں نے تو انگوٹھی بھی بنوالی ہے خوش بخت کے لیے۔'' تقدیم نے بھائی کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں کسی اور کے کام آجائے گی۔''

تقدیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کس کے؟'' اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''کسی کے بھی۔''

''عائزہ؟'' تقدیم نے اپنا اندیشہ مونس پر ظاہر کرنے میں دیر نہیں کی۔

اب کی بار وہ چونکا پھر دھیرے سے مسکرا کر بولا۔ ''آپ کو کیسے پتا؟''

تقدیم کو اپنے قیاس کی درستگی پر حیرت ہوئی۔ صرف چند گھنٹوں کی ملاقات میں وہ مونس پر صبور احمد اور ان کے اہلِ خانہ کے غیر معمولی التفات پر کھٹک گئی تھی۔ مونس کی مسکراہٹ اور اس کے سوال نے اس کے اندازے کی توثیق کر دی تھی۔ اسے دکھ ہوا کہ اماں سنیں گی تو بہت ملول ہوں گی۔ مگر مونس بڑی بے نیازی سے مسکرا رہا تھا۔

(باقی آئندہ)..

سچ تو یہ ہے

قرۃ العین رائے

ایک پل کو اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ چند سیکنڈ پیشتر جو کچھ اس کے گوش گزار کیا گیا ہے وہ سچ ہے یا اسے سننے اور سمجھنے میں اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے

''کیا...... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' اسے اپنی سماعت پر شک گزرا تھا اور شاید مقابل کے انکشاف پر اس کی ذہنی حالت بھی مشکوک لگی تھی حالانکہ جس تلخ حقیقت کو اس پر آشکار کیا گیا تھا اس کے بعد یقینی طور پر اس کی ذہنی حالت مشکوک ہو سکتی تھی۔

www.paksociety.com

''آئی انڈر اسٹینڈ بٹ......''

''مم...... مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہی آپ کیا کہہ رہے ہیں...... یہ...... یہ کیسے ممکن ہے ایک بار پھر غور سے پڑھیں، کہیں رپورٹ تو نہیں بدل گئی۔ میرا نام ایمان اختر ہے۔ پلیز دیکھیں کہیں رپورٹس تبدیل نہ ہوگئی ہوں...... یہ...... یہ ناممکن ہے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس نے مقابل کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا ذہنی طور پر وہ ایک شدید دھچکے سے دوچار ہوا تھا جس نے اس کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا اسی لیے گھبرائے اور انکاری لہجے میں اس نے اصل حقیقت سے نظریں چراتے اپنی تسلی کے لیے ایک نقطہ اٹھانا چاہا تھا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے جو سچ ہے میں نے وہی بیان کیا، رپورٹس آپ ہی کی ہیں، ان پر ایمان اختر کا ہی نام لکھا ہوا ہے اور نہ ہی یہ تبدیل ہوئی ہیں۔ میں آپ کے احساسات کو سمجھ سکتا ہوں۔ میں محسوس کرسکتا ہوں کہ آپ کو ان رپورٹس کے انکشاف سے کس قدر تکلیف، دکھ اور غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا ہے مگر ایمان صاحب خدا کی قدرت اپنے رازوں سے بہ خوبی آگاہ ہے، کس کام میں کیا مصلحت ہے یہ صرف وہی جانتا ہے اور آپ دنیا کے واحد شخص نہیں جسے ایسی صورتِ حال کا سامنا ہے وہ قادرِ مطلق بہتر جانتا ہے کہ کسے نوازتا ہے اور کسے نہیں، پلیز خود کو سنبھالیں اور یہ جاننے کے بعد کہ یہ ایک تلخ سچائی ہے اسے قبول کیجیے مگر اس کے ساتھ یہ بھی شکر کیجیے کہ اللہ نے آپ کو کسی موذی مرض میں مبتلا نہیں کیا آپ ایک صحت مند شخص ہیں۔'' ڈاکٹر نے ہمدردانہ اور اپنے پیشہ ورانہ لہجے میں اسے تسلی دینی چاہی۔

وہ ایک ہارے ہوئے جواری کے مانند ان رپورٹس کو اپنے لرزتے ہاتھوں میں تھامے کلینک سے باہر نکل آیا۔ اب اس کی گاڑی کا رخ شہر کے ایک اور مشہور اور قابل ڈاکٹر کی کلینک کی جانب تھا۔ وہ ذاتی طور پر ڈاکٹر ندیم کی قابلیت سے واقف تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ ان رپورٹس کو غلط قرار دیتے ہوئے اسے اس تکلیف دہ کرب سے نجات دلا دیں گے۔ سارے راستے وہ اپنی امید کے پورے ہونے کی دعا کرتا ہوا گیا۔ ایک مضبوط اعصاب اور بلند قامت سراپے کا حامل وجیہہ مرد اس وقت جس طرح سے بکھرا ہوا ٹوٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا اس کے جاننے والے شاید ہی یقین کر پاتے کہ وہ ایمان اختر کو ہی دیکھ اور مل رہے ہیں مگر قدرت نے اس کی زندگی میں جو بساط بچھائی تھی اس میں اسے کھلی واضح اور شدید مات دی گئی تھی، وہ ہارا ہوا تھا، گھبرایا ہوا تھا، بکھرا ہوا تھا۔ جس سچائی کا اسے سامنا تھا وہ سچائی اس کی زندگی ہی نہیں بلکہ دو اور زندگیوں کے بھی پرخچے اڑانے والی تھی اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

''شکر......؟ کس بات کا شکر ادا کروں کہ میں کسی خطرناک بیماری سے دوچار نہیں لیکن جس خطرناک سچائی سے دوچار ہوں وہ کسی بھی موذی مرض سے بڑھ کر ہے۔ یہ سچائی صرف میری ذات تک تو محدود نہیں یہ تو...... اس سے...... اس سے تو تین فرد متاثر ہوں گے بلکہ سبھی کچھ ختم ہوگیا، فنا ہوگیا، برباد ہوگیا۔ کیسے جی پاؤں گا اس ظالم حقیقت کے بعد...... میں کیسے اس پری وش کا سامنا کروں گا وہ ایسی نہیں ہوسکتی، یہ سچ نہیں ہوسکتا...... اوہ میرے خدا تو نے مجھے کس عذاب میں مبتلا کر ڈالا۔'' آخر کار خود سے لڑتے اس کے اعصاب چٹخ گئے تھے اور ایک سنسان سڑک پر گاڑی کو ایک سائڈ پر روک کر اسٹیئرنگ پر سر جھکائے کب کے روکے آنسو بہا ڈالے تھے اس نے۔ اس کا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا وہ بلک بلک کر تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا۔

ڈاکٹر ندیم کو اپنی رپورٹس تھماتے ہوئے وہ آس کو تھامے رکھنا چاہتا تھا جو ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے اس کی سختی سے بند کی گئی مٹھی سے ریت کی طرح پھسلتی جارہی تھی اور پھر ڈاکٹر ندیم نے بھی پہلے والے ڈاکٹر کی طرح من وعن وہی سچائی بیان کردی تھی جسے وہ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ہر آس ٹوٹ گئی تھی اسے حقیقت کا تلخ آئینہ دکھایا گیا تھا جس میں اس کی صورت بدصورت نہیں بلکہ اس کے بے حد قریبی ہستی کی صورت بھیانک نظر آرہی تھی۔

ایک دو روز ہونے والے معمولی سے درد کو کاش وہ اتنی اہمیت نہ دیتا، بے پروائی برت جاتا، نظر انداز کرڈالتا مگر اس کی قسمت اسے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ یہ درد اسے پہلے بھی محسوس ہوتا تھا لیکن قابل برداشت ہونے کے باعث وہ کوئی پین کلر لے کر دور کرلیا کرتا تھا مگر آفس میں بیٹھے اچانک ہی ناف کے نیچے مخصوص درد اٹھا تھا اور اس نے اب کی بار نظر انداز کرنے کے بجائے ڈاکٹر کے پاس جانے کا فیصلہ کرڈالا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے جن کی رپورٹس وہ آج ان کے کلینک سے لینے آیا تھا۔ ڈاکٹرز نے تقریباً سبھی رپورٹس نارمل بتائی تھیں اور وہ پُرسکون ہوگیا لیکن آخری رپورٹ کا انکشاف اس کے سکون کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے خارج کرگیا تھا۔ ڈاکٹر کے یہ الفاظ کہ وہ باپ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اسے گنگ کرگئے تھے۔ ڈاکٹر نے تفصیلاً بیان کیا تھا کہ گو وہ ایک نارمل مرد ہے مگر پیدائشی طور پر باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ جو درد اسے کبھی کبھار ہوتا تھا اس کا مداوا تو چند ادویات کے ذریعے ان کے پاس موجود تھا مگر وہ اسے اس کی اصل صلاحیت کبھی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہ پیدائشی نقص تھا جس کا علاج ناممکن تھا۔ وہ کبھی بھی، کسی بھی صورت باپ نہیں بن سکتا تھا یہ بالکل واضح تھا۔

قدرت کے اس مذاق پر وہ نڈھال ہوکر رہ گیا تھا۔ ''اگر وہ باپ نہیں بن سکتا تو جو ڈھائی سالہ اس کا بیٹا تھا وہ کون تھا، کس کا تھا، کیا اس کی بیوی جو اس کی شدید محبت، اولین چاہت اور جس کی من موہنی، پاکیزہ صورت کا وہ گرویدہ تھا وہ اصل میں......'' نہیں نہیں اس سے آگے اس سے سوچا ہی نہ گیا تھا، وہ آنکھیں میچے زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

عفان میں اس کی جان تھی، وہ اس کے دل کا ٹکڑا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا وہ اپنے بیٹے سے شدید محبت کرتا تھا، اس کی معمولی سی تکلیف اس کی برداشت سے باہر ہوتی تھی، اس کا رونا اس کی روح تک کو بے چین کرڈالتا تھا، وہ تڑپ اٹھتا تھا ساری ساری رات گود میں اٹھائے اسے بہلائے جاتا، سینہ کتنا کہتی کہ وہ آرام کرلے مگر وہ اپنے سینے کی پدرانہ گرمی سے ایک پل کو بھی اسے دور نہ کرتا۔ اس کی قلقاری اس کے من کو شانت کرڈالتی، اس کی معصوم ہنسی اس کے دن بھر کی تھکن کا مداوا تھی۔ عفان بھی اس سے بے حد اٹیچ تھا۔ سینہ مصنوعی لہجے میں خفگی کا اظہار کرتی۔

''سارا دن جناب کو سنبھالتی میں ہوں اور باپ کے آنے پر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے۔''

عفان نے پہلے لفظ ''بابا'' کہا تھا اور اب وہ پیاری گول مٹول معصوم صورت کے ساتھ جب اسے ''بابا دی'' کہہ کر پکارتا تو وہ کھلکھلا اٹھتا، باپ بیٹا ایک دوسرے میں مگن ہوجاتے۔ وہ اسے بیڈ پر لٹا کر اس کے ساتھ ریسلنگ کرتا اور اس کی معصوم شرارتوں سے خوب لطف اٹھاتا اور سینہ اس تمام منظر میں ان کے ساتھ شریک مسکراتی رہتی۔ لیکن آج ڈاکٹر کے انکشاف نے اس کی جنت کو آگ لگا دی تھی، اس کا سکون غارت کردیا تھا اور اس کی روح کو کچل کر رکھ دیا تھا۔

''نہیں، یہ سچ نہیں ہوسکتا کہ عفان میرا بیٹا نہیں،

سینہ مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتی، نہیں یہ سچ نہیں تو پھر سچ کیا ہے؟ میرے مولا سچ کیا ہے۔'' وہ ایک بار پھر بلک اٹھا تھا، کرب سے، دکھ سے اور آنے والے لمحات کا سامنا کرنے کے احساس سے۔

☆☆☆

گاڑی کے ہارن کی آواز پر سینہ بھاگتے ہوئے پورچ تک پہنچی۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا اور ایمان بلیک کرولا کو پورچ میں ہی روک کر اندر کی جانب بڑھا۔

''بہت دیر کر دی آج۔'' سینہ نے اس کے ہم قدم ہونا چاہا۔ وہ اس کی صورت دیکھ کر مزید پریشان ہوگئی۔

''کتنی بار سیل پر ٹرائی کر چکی ہوں مگر آپ کا موبائل آف جا رہا تھا۔ عفان بھی انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ میں تو بے حد پریشان ہوگئی تھی، کیا بات ہے سب خیر تو ہے؟'' ایک ہی سانس میں اپنی پریشانی بیان کرتی وہ اس کی سنجیدہ صورت کو دیکھ کر سوال کر بیٹھی۔

''ہوں...... میرے ایک دوست کی مدر کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اسپتال میں تھا اس کے ساتھ۔'' اس نے بہ مشکل خود کو یہ الفاظ ادا کرنے پر راضی کیا تھا۔

''کون سے دوست؟'' سینہ نے اس سے کوٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس کے سبھی دوستوں کے ناموں اور کچھ کی شکلوں سے اچھی طرح واقف تھی۔

''پلیز سینہ اس وقت بے حد تھکا ہوا ہوں، بہت ٹینشن میں رہ کر آیا ہوں، یہ انکوائری نامہ پھر کسی ٹائم شروع کر لینا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''او کے...... سوری...... کھانا کھائیں گے؟'' پہلی بار سینہ کو ایمان کے اس رویے کا سامنا تھا سمجھتے ہوئے بھی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی لہجے کو ہلکا پھلکا بناتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''نہیں...... میں لائبریری جا رہا ہوں، اکرم سے کہو مجھے کافی بنا کر وہیں دے جائے اور پلیز جا کر سو جاؤ مجھے کچھ کام ہے۔'' ایمان نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے لائبریری کی جانب قدم بڑھائے اور پیچھے کھڑی سینہ سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

پیچھے کھڑی سینہ ایک پل کو ساکت و صامت بت میں ڈھل گئی۔ وہ یک دم حیرت اور دکھ کی کیفیات میں گھری تھی۔ آج پہلی بار ایمان نے نہ عفان کا پوچھا نہ بیڈروم جا کر سوئے ہوئے عفان کی پیشانی کو چوما۔ وہ کتنا بھی تھکا ہوا ہو، ٹینشن میں ہو عفان کو تو کبھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ سینہ کے دل میں کچھ انہونی ہونے کا خیال جاں گزیں ہوا تھا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر کم از کم ایمان سے یہی پوچھ لے کہ وہ کس اسپتال گیا تھا، اس کی چھٹی حس کچھ بہت غلط ہونے کا گرین سگنل دے رہی تھی لیکن ایمان کے قطعی رویے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ پریشان سی اکرم کو جگانے مڑ گئی اور اسے صاحب کو کافی بنا کر لائبریری دے آؤ کہہ کر اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ گئی۔ اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ محسوس کی جا سکتی تھی۔

لائبریری میں بیٹھا وہ کب سے سلگ رہا تھا۔ جس طرح قطرہ قطرہ موم بتی کی طرح پگھلتی رات بیت رہی تھی ویسے ہی وہ بھی قطرہ قطرہ سلگ رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب اسے عفان کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بے چین ہو کر کرسی سے یک دم اٹھا، اس نے اپنے بیٹے کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بڑھنا چاہا لیکن وہ پھر کرسی پر ڈھے گیا۔ دونوں کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر وہ ایک بار پھر سسک اٹھا تھا۔ عفان کو دیکھنے کے لیے اس کا دل بے چین ہوا تھا لیکن وہ خود اذیتی کے سفر پر تھا جس میں اس کی روح

آبلہ پا اور خار زار سوچوں کی خراشوں سے زخمی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

''نہیں، یہ سچ نہیں ہو سکتا، سینہ کو مجھ سے بڑھ کر کون جانتا ہے وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ تو بہت معصوم اور پاکیزہ تھی (تھی کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا) میں اسے کب سے جانتا ہوں، اس کی معصوم صورت اور نیک سیرت نے ہی تو مجھے دیوانہ بنا ڈالا تھا پھر یہ سب کیا ہے...... میرے خدا...... سینہ ایک دغا باز...... بے وفا اور بدکار...... نہیں...... نہیں...... اُف کیا کروں میں کیا کروں، میں۔'' تھک ہار کر اپنی سوچوں سے گھبرا کر اس نے ٹیبل پر اپنا سر رکھ دیا تھا جواب بھی ہلکے ہلکے نفی کے انداز میں ہل رہا تھا۔

☆☆☆

ماضی کا سفر بند آنکھوں نے سہ بار طے کرنا شروع کیا تھا۔ سینہ اس کے بے حد قریبی دوست عدنان کی بہن اور بے حد محترم پروفیسر اکرام اللہ کی بیٹی تھی۔ ایمان اختر کا کافی عرصے سے ان کے گھر آنا جانا تھا مگر براہِ راست سینہ سے کبھی ملاقات نہ ہوئی پھر عدنان امریکا چلا گیا یہ چند سال پہلے کی بات ہے گو ایمان کے آنے جانے میں کمی واقع ہوگئی مگر اسے اپنے محترم استاد سے مل کر دلی تسکین حاصل ہوتی تھی پھر ان کی محفل میں ان کے دھیمے نفیس لہجے میں کوئی نہ کوئی اچھی بات سننے کو مل جاتی تھی۔ یونہی آتے جاتے دو تین بار سینہ نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ پہلی نظر میں ہی اس کی معصوم اور کومل صورت پر فریفتہ ہوگیا تھا مگر سینہ نے کبھی اسے نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ اب دل کوچۂ جاناں میں جانے کو دیدار کرنے کو بے تاب رہنے لگا تھا۔

ایک بار جب وہ پروفیسر صاحب کے گھر کی جانب جا رہا تھا۔ گلی کا موڑ مڑا تو دور سے ہی دو لڑکے کالج سے واپس آتی لڑکی کے اردگرد چلتے ہوئے اسے نظر آئے۔ انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اسے تنگ کر رہے ہیں اور وہ بے چاری گھبرائی سی جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جانا چاہتی ہے، بھری دوپہر تھی گلی بالکل سنسان تھی۔

پھر ایک لڑکے نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کمزور سی مزاحمت کرنے لگی۔ ایمان نے یہ سب دیکھا تو گاڑی کو وہیں بریک لگایا اور نہایت ہی جارحانہ تیور لیے ان آوارہ اور لوفر لڑکوں کی جانب بڑھا، قریب آنے پر اس کے غصے میں تندی نمایاں ہوگئی کیونکہ وہ گھبرائی ہوئی سینہ کو پہچان چکا تھا۔ لڑکے اس کے انداز اور تیور بھانپ کر وہاں سے رفوچکر ہوگئے۔ مزید تماشا نہ بنے وہ جلدی سے سینہ کی جانب بڑھا جو پیلا چہرہ لیے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

''پلیز گاڑی میں بیٹھیے چل کر۔'' اپنے غصے پر قابو پاتے ایمان نے نرم لہجہ اختیار کیا۔ ''میں ایمان ہوں، عدنان کا بہت پرانا قریبی دوست اور پروفیسر صاحب کا شاگرد آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں ویسے بھی ابھی آپ کا گھر دور ہے یوں انجان جگہ پر خوامخواہ تماشا مناسب نہیں، آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں، میں آپ کے گھر ہی جا رہا تھا، سر سے ایک ضروری کام تھا۔'' ایمان نے تفصیلاً سینہ کو سمجھایا اور تسلی دی۔

سینہ کو بھی صورتِ حال کا اندازہ ہو چکا تھا ویسے بھی اب وہ اکیلے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی نہ جانے وہ بدبخت پھر کس کونے سے نکل آئیں لہٰذا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ ایمان کے ساتھ اس کی گاڑی میں آن بیٹھی۔ رونا اب بھی اسے بہت شدت سے آ رہا تھا۔ ایسی بدترین صورتِ حال کا سامنا اسے زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔

”کون تھے یہ خبیث؟“ ایمان نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”میں...... میں نہیں جانتی بس اکیلی اور سنسان گلی دیکھ کر خوامخواہ پیچھے لگ گئے۔“ سبینہ نے لب کاٹتے ہوئے نظریں جھکائے جواب دیا۔

”وہ اصل میں وین تھوڑے فاصلے پر خراب ہو گئی تھی۔ کچھ لڑکیوں کے گھر قریب تھے وہ پیدل ہی چل پڑیں، میں نے سوچا کچھ گلیوں کے بعد میرا گھر بھی آجائے گا لہٰذا اتنی گرمی اور دوپہر میں یہاں کھڑے ہو کر وین کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرنے سے بہتر ہے ان کے ساتھ میں بھی چل پڑوں بس آخری اسٹاپ میرا تھا تو اس لیے تنہا رہ گئی۔“ سبینہ نے ایمان کی خاموشی میں اس کے سوال کو سن لیا تھا جو وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اتنی دوپہر میں کالج سے اکیلے آنے کی کیا وجہ تھی۔

”ہوں لیکن آئندہ احتیاط کیجیے گا ایسی صورتِ حال کا ڈٹ کر سامنا کرتے ہیں۔ آپ شور مچا دیتیں تو کسی نہ کسی گھر سے کوئی بھلا مانس مدد کے لیے نکل آتا۔ آپ کا خوف زدہ ہونا ان بدبختوں کو شہ دے رہا تھا وہ تو شکر ہے کہ مجھے یہ چند ضروری کتابیں سرکو دینی تھیں لنچ ٹائم تھا آفس میں، سوچا دیتا ہوا گھر چلا جاؤں گا۔“ ایمان نے بھی تفصیلاً کہا۔

”یہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟“ اگلا موڑ سبینہ کے گھر کو جاتا تھا جسے نظر انداز کیے ایمان آگے بڑھ گیا تھا۔ سبینہ نے چونک کر پوچھا۔

”گھبرائیں مت! You can trust me آپ اتنی گھبرائی ہوئی اور چہرے سے پریشان نظر آ رہی ہیں، میں نے سوچا کسی بہترین ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کوئی کولڈ ڈرنک پی لی جائے تاکہ آپ خود کو کمپوز کر سکیں ورنہ سر پریشان ہو جائیں گے۔“ ایمان نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ اصل میں دل اس معصوم اور نازک سی گھبرائی لڑکی کی سنگت میں زیادہ سے زیادہ وقت بتانا چاہ رہا تھا۔

”نہیں پلیز بہت مہربانی، آپ مجھے گھر ہی ڈراپ کر دیجیے، میں کبھی ایسے ریسٹورنٹ نہیں گئی کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو...... مجھے اپنی ذات پر خوامخواہ انگلی اٹھوانے کا کوئی شوق نہیں اور یہ مناسب بھی نہیں۔ میں اپنے کردار کے متعلق کسی قسم کی غلط اور جھوٹی بات برداشت نہیں کر سکتی اور نہ ہی خوامخواہ کی صفائیاں دینا پسند کروں گی۔ اس لیے آپ مائنڈ مت کیجیے گا اور مجھے گھر چھوڑ دیں میں گھر جا کر بابا اور امی کو آپ کے ساتھ آنے کے متعلق سچ سچ بتا دوں گی، جو راحت اور سکون سچ بولنے میں ہے وہ ہزار جھوٹ بولنے میں بھی نہیں۔“ سبینہ نے قطعی لہجے میں ایمان سے دھیرے سے کہا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

گھر پہنچنے پر سبینہ نے خود ہی اپنے والدین کو ایمان کے ساتھ آنے کی وجہ اس کے سامنے بیان کر دی تھی۔ لازمی بات تھی وہ پریشان ہوئے لیکن ایمان کے شکر گزار بھی تھے کہ انہوں نے سبینہ کو اس سنگین صورتِ حال سے نکالا۔

”تو پھر سبینہ نے شادی کے بعد میرے ساتھ اتنی سنگین بے وفائی کیوں کر ڈالی آخر وہ کون بدذات تھا جو شادی کے بعد اس کی زندگی میں آیا، میں کیسے سچ مان لوں اس سفاک اور بے رحم حقیقت کو۔ میری سبینہ ایسی نہیں ہو سکتی، میں نے تو اسے کسی سے ملتے بھی نہیں دیکھا نہ اس کا کوئی کزن ہے اور نہ ہی میرا کوئی اتنا قریبی رشتے دار اُف...... آخر یہ معما کیا ہے کہیں میری غیر موجودگی میں کوئی زیادتی واقعہ......“ دماغ نے اسے ایک اور راہ سجھائی تھی جسے قبول کرنا اتنا ہی دشوار تھا جتنا پہلی حقیقتوں کو یہ سوچ کر اس کے دماغ میں درد سے ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ دل اور دماغ کسی

صورت بھی سبینہ کو بدفطرت سمجھنے کو تیار نہ تھے۔ وہ واضح طور پر براہِ راست سبینہ سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا آخر کیا جواز دیتا جو یہ پوچھتا کہ عفان کس کا بچہ ہے کس گناہ کی سزا ہے جو اس کے سر تھوپ دی گئی اسے ان بے ہودہ سوالات کی وجہ بیان کرنی پڑتی۔ کیا وہ یہ بتانے کا حوصلہ رکھتا تھا کہ وہ بانجھ ہے اس میں کمی ہے، نقص ہے، ایسا نقص جو پیدائشی ہے، اس سچائی کا وہ خود سامنا نہیں کر پا رہا تھا اپنی بیوی کو کیسے بتا دیتا، یہ اس کی مردانگی پر کوڑے کی طرح ضرب لگنے والی بات تھی۔ وہ اتنا حوصلہ مند ہرگز نہ تھا کہ اتنی بڑی بات اتنی بڑی سچائی خود اپنے منہ سے کہہ دیتا تو کیا رہ جاتا وہ سبینہ کے سامنے ایک نامکمل ادھورا مرد تمام عمر اپنی کمی کے ساتھ وہ سبینہ سے نظریں اٹھا کر بات نہ کر پاتا، اس سچائی کی تو وہ کسی کو بھی ہوا نہیں لگنے دینا چاہتا تھا تو پھر آخر اس الجھن کو اس تکلیف دہ گتھی کو کیونکر سلجھایا جائے اور اب وہ سبینہ کی حقیقت جان کر اس کے ساتھ کیونکر ایک ہی چھت تلے رہ سکتا تھا، اسے سبینہ کو بغیر وجہ بتائے چھوڑنا ہوگا لیکن ایسا کرنے کا وہ باقی لوگوں کو کیا جواز دے گا، کیا وہ سب کو بتا پائے گا کہ اس کی بیوی بے وفا ہے اور جو بچہ جسے وہ اپنا سمجھتا رہا اس کا نہیں، ان سب باتوں کے ثبوت کہاں سے لائے گا اور پھر مما پاپا کا سامنا خاص طور پر مما کا سامنا کیونکر کر پائے گا جنہوں نے سبینہ کے ساتھ اس کی شادی کی شدید مخالفت کی تھی، کتنے دن لگ گئے تھے اسے مما کو منانے میں اور اب بھی وہ دل سے خوش نہ تھیں۔ سبینہ کو بہو بنا کر لانے کے باوجود ان کے سبینہ کے ساتھ کچھ بہت اچھے مراسم قائم نہ ہو سکے تھے، ابھی بھی وہ اس سے لیے دیے والا انداز رکھتی تھیں اب تو وہ اسے کٹہرے میں کھڑا کر دیں گی، طعنوں اور طنز کی بارش کر دیں گی کہ ماں کے فیصلے کو رد کر کے اس نے سبینہ کو اپنی شریکِ حیات چنا انجام دیکھ لیا۔ ان سب باتوں کو سوچتے ہوئے وہ کچھوے کی طرح اپنا سر خول کے اندر لیتا جا رہا تھا۔

”اوہ میرے خدا! یہ کیسا امتحان ہے؟ یہ کیسی اذیت ہے۔“ اس کے لبوں سے ایک سسکاری برآمد ہوئی تھی۔ ایمان اختر جو اپر کلاس کا نمائندہ تھا اس نے اپنی شریکِ حیات ایک مڈل کلاس لڑکی کو بنانا چاہا تھا۔ سفینہ تو حق دق کھڑی رہ گئی تھیں دراصل ایمان اپنی کلاس کی لڑکیوں کے فیشن زدہ حلیوں اور بے باک انداز سے ہمیشہ سے بھاگتا تھا شاید اس کی بنیادی وجہ بچپن میں اسے تربیت اپنی مڈل کلاس دادی سے حاصل ہوئی تھی۔ مما، پاپا کو تو ہائی کلاس پارٹیز اور اسی قسم کی سوشل ایکٹیویٹیز سے فرصت نہ ملتی تھی۔ اس کی مما پڑھی لکھی ماڈرن خاتون تھیں جو شوہر کے شانہ بشانہ ہر تقریب میں شامل ہوتی تھیں ورلڈ بزنس ٹور میں بھی وہ اختر علی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اتنی تیز رفتار زندگی میں ایک چھوٹے سے بچے کے ساتھ وہ اٹک اٹک کر چلنے سے تو رہیں لہٰذا ایک بہترین گورنس کا ایمان کے لیے انتظام ہو چکا تھا جو ان کی کلاس کا خاصہ تھا پھر دادی گھر پر ہوتی تھیں اور انہوں نے ہی ایمان کو پالا تھا، گورنس کے رحم و کرم پر کبھی نہیں چھوڑا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپر کلاس کے فیشن اور اطوار کبھی نہ اپنا سکا۔ سفینہ پچھتاتی تھیں کہ انہوں نے اسے بچپن میں دادی سے دور کیوں نہ رکھا البتہ اختر علی کو بے تحاشا اور بلا جواز کے ایمان سے گلے نہ تھے۔

وہ ذہین تھا کبھی کسی شکایت کا موقع نہ دیا تھا بزنس بھی اچھی طرح سے اور محنت سے سنبھال رہا تھا بس خیالات ذرا بیک ورڈ تھے جو اتنی بڑی بات نہ تھی۔ انہوں نے اپنی ایک برانچ جاپان میں کھولی تھی اسے سنبھالنے کے لیے وہ جاپان گئے ہوئے تھے۔ سفینہ ان کے ساتھ تھیں، پیچھے ایمان، سبینہ اور عفان تھے اور ان کی غیر موجودگی میں ایمان کو اتنی سفاک اور

تلخ صورتِ حال کا سامنا تھا۔ اس وقت وہ سینہ کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا اگر ایسی ہی بیوی چاہیے تھی تو اس کی کلاس میں ایک ہی وقت میں کئی بوائے فرینڈز رکھنے والی لڑکیاں بھری پڑی تھیں۔ اس کا انتخاب غلط ثابت ہوا تھا کیونکر وہ اس کا اعتراف سب کے سامنے کر پائے گا۔ اپنی ضد منوانے کے لیے اسے مما کے سامنے اچھی خاصی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ اگر پاپا اس کا ساتھ نہ دیتے تو شاید ہی وہ سینہ سے شادی کر پاتا اور اب کیسے وہ مما کا سامنا کرے گا، کیا وجہ بتائے گا کہ اس نے سینہ کو کیوں چھوڑ دیا۔

☆☆☆

ایک بار پھر اس کے کانوں میں ساتھ والے کمرے سے عفان کے رونے کی آواز ٹکرائی۔ یقیناً وہ نیند میں اپنے باپ (جو کہ درحقیقت اس کا باپ نہ تھا) کے وجود کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ایمان کے ساتھ لپٹ کر سوتا تھا اور ایمان کو اس کا، نرم گرم لمس بہت سرور دیتا تھا۔ ایمان کو عفان سے محبت نہیں عشق تھا شاید اس کی وجہ اس کا اکلوتا ہونا تھا، بچپن سے لے کر اب تک اس نے اپنے سے چھوٹے بہن بھائیوں کی کمی کو بے حد محسوس کیا تھا خاص طور پر اس سچویشن میں جب پپا بے حد مصروف، کامیاب بزنس مین اور مما اپنی ہی سوشل ایکٹویٹیز میں بے حد مصروف۔ اسے بچے بے حد اچھے لگتے تھے وہ بہ بانگِ دہل سینہ سے کہا کرتا تھا کہ وہ چھ، سات بچے پیدا کرے گا اور یہ بات سن کر جہاں سینہ کے گال شرم سے سرخ ہوتے وہاں اس کی آنکھیں بھی پھیل جاتیں۔

”خدا کا خوف کریں ایمان، اتنے بچے۔“ سینہ کا خیال تھا کہ عفان کو کم از کم تین چار سال کا ہو جانا چاہیے تب ہی وہ اگلے بچے کے بارے میں سوچیں گے تاکہ عفان کو ماں باپ کی بھرپور توجہ اور پیار مل سکے۔ ایمان کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا اس کی زندگی تو عفان کے اردگرد ہی گھومتی تھی۔

وہ مٹھیاں بھینچے، جبڑوں پر جبڑے سختی سے جمائے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ عفان کا یوں اس کو مس کرنا اور اس کے لیے رونا اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا، وہ پہلے کی طرح لپک کر اسے اٹھا لینا چاہتا تھا بے تحاشا محبت سے اس کے بوسے لے لینا چاہتا تھا۔ اتنا رونے سے اس کے گلابی ہونٹ سرخ اور سوج چکے ہوں گے، وہ بے آرام تھا، بے چین تھا، باپ کی قربت کو ترس رہا تھا۔ سینہ یقیناً اسے چپ کراتے کراتے نڈھال ہو رہی تھی چاہے کچھ بھی ہو وہ باپ کی گود میں آکر ہمیشہ چپ ہو جایا کرتا تھا، اس کا ننھا معصوم سا دل نہ صرف باپ کی شدید محبت کو محسوس کرتا تھا بلکہ اس کا ویسا ہی ردِعمل بھی دیتا تھا مگر...... مگر وہ اس کا باپ تھا ہی کب...... اچانک اس کے مسکراتے لب سختی سے بھینچ گئے۔

”نہیں سننی مجھے تمہاری معصوم پکار...... نہیں اٹھانا مجھے تمہیں...... تم میرے کچھ نہیں لگتے...... کچھ بھی نہیں۔ آج کے بعد میں تمہاری اور تمہاری ماں کی صورت کبھی نہ دیکھوں گا...... کبھی نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتے ہوئے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور جیسے اس فیصلے پر اس کا دل رک سا گیا۔ سانس اٹک سی گئی لیکن یہ بھی تو سچ تھا کہ وہ کیسے ایک ایسی عورت کے ساتھ رہ سکتا تھا جس نے شادی کے بعد اسے دھوکا دیا تھا اور آتے جاتے عفان کی صورت میں وہ اپنی مردانگی پر پڑنے والی کاری ضرب ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا...... ہرگز نہیں۔ فیصلہ کرنے کے بعد اس کے پورے وجود میں تاریکی پھیل گئی اور اس نے ہارتے ہوئے سر میز پر پٹخ دیا، عفان کی سسکیاں کم ہوتی جا رہی تھیں جواب بھی اس کا دل چیر رہی تھیں لیکن اسے دل کی تو سننی ہی نہیں تھی یہ تو عقل کا فیصلہ تھا جو بالکل ٹھیک تھا۔ دل کے فیصلے تو ہمیشہ کمزور اور غلط ہوتے ہیں سینہ کی صورت میں یہ ثابت ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”ایمان!“

”ایمان!“ چند سیکنڈ پیشتر وہ دھیرے سے لائبریری میں داخل ہوئی، بے حد مشکل سے سلائے جانے والے عفان کو اس نے کمبل میں لپیٹ کر بڑے صوفے پر لٹا دیا تھا وہ اب گہری نیند میں تھا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا رائٹنگ ٹیبل پر سر جھکائے ایمان کو اس نے قریب آکر دھیرے سے پکارا تھا، اس کے وجود میں اپنی آواز کا کسی قسم کا ردِعمل نہ پا کر اس نے ڈرتے ہوئے اس کے شانے کو ہلکے سے ہلا کر اپنے وجود کی موجودگی کا احساس دلانا چاہا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ ایمان جاگ رہا ہے اس کی سرخ ہوتی آنکھیں اس کے رت جگے کی واضح علامت تھیں۔

ایمان نے اپنے وجود سے اٹھنے والی نفرت، غم اور غصے کی لہروں کو دباتے ہوئے سینہ سے منہ پھیر لیا تھا۔ اپنے چہرے پر ابھرنے والے نفرت کے تاثرات کو نہ جانے کیوں وہ اس سے چھپا لینا چاہتا تھا اور سامنے صوفے پر سوئے عفان کو دیکھنے سے گریز برتنے کے لیے اسے اندر سے اچھی خاصی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ اس کا پدرانہ جذبہ بے تاب و بے قرار ہو گیا تھا اس کی سوئی ہوئی من موہنی صورت دیکھنے کو۔

”ایمان پلیز! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ سینہ ملتجی ہوئی تھی۔

”پلیز! اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ بدقت وہ یہ الفاظ ادا کر پایا تھا۔

”اگر اس وقت آپ کو تنہا چھوڑ دیا تو شاید تمام عمر مجھے آپ سے جدائی اور تنہائی کا عذاب سہنا ہوگا اگر آج میں نے وہ سچائی بیان نہ کی تو...... تو ہو سکتا ہے......“ سینہ نے کسی متوقع خوف کے زیرِ اثر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ ایمان کو توقع نہ تھی کہ سینہ اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنا گھٹیا جرم اس کے روبرو قبول کرنے چلی آئے گی۔ غم و غصے کا ایک لاوا سا پھوٹنے کو بے تاب ہوا تھا اس کے سینے سے، وہ کچھ بے حد سخت جملے سنانے کو بے تاب ہوا تھا لیکن اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی اور لہجے کو سرسری بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سینہ سے منہ موڑے پوچھا تھا۔

”کیسی سچائی؟“ سینہ دھیرے سے قالین پر اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی تھی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے تھے جنہیں وہ جھٹک دینا چاہتا تھا۔

”پلیز ایمان! آپ میری ایک التجا قبول کر لیں، آپ میری بات پوری سنیں گے پوری توجہ کے ساتھ۔ پلیز ایمان آپ کو اللہ کا واسطہ آپ میری پوری بات سنیں گے۔“ سینہ اتنا کہہ کر سسک اٹھی تھی۔

”جلدی بولو، میں سن رہا ہوں۔“ وہ اس ڈرامے بازی سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ سینہ کے اعترافِ جرم کے بعد اس پر دو حرف بھیجنا اس کے لیے آسان ہو جاتا۔ اس کے گھٹیا اقرارِ جرم کے بعد وہ آسانی اور جواز کے ساتھ اسے طلاق دے سکتا تھا پھر کم از کم سینہ اس سے اس کی وجہ ہرگز نہ پوچھتی اسی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کی بات سننے کو تیار ہوا تھا۔

”ایمان! یہ بچہ ہمارا نہیں ہے۔“ سینہ نے گویا اپنی طرف سے اس کے سر پر بم پھوڑا تھا اور وہ لفظ ”ہمارا“ پر چونک اٹھا تھا۔

”اس حقیقت کا آغاز شاید میری شادی سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ میں نے اتنے آپ عرصے سے یہ بات چھپائی لیکن پرسوں ایک تقریب میں ڈاکٹر شائستہ کو دیکھ کر میں چونک گئی۔ مجھے ڈر ہے کہ نہ صرف وہ مجھے پہچان چکی ہیں بلکہ یقیناً آج اسپتال میں اپنے دوست کی مدر کی عیادت کے وقت انہوں نے آپ کو تمام حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے، تبھی تو آپ اتنے

الجھے الجھے اور خفا سے ہیں۔ عفان کو آج پہلی دفعہ اتنی بری طرح یونہی تو آپ نے نظر انداز نہیں کر دیا، مجھ سے بھی صحیح طرح سے بات......"

"اصل بات کی طرف آؤ سبینہ۔" ایمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے قدرے ترش لہجے میں ٹوکا تھا۔

"اصل بات...... اصل بات تو یہی ہے ایمان کہ عفان ہمارا بچہ نہیں ہے۔ میں اس سچائی کو اتنے عرصے بے حد آرام سے چھپا سکی لیکن ہمیشہ انجانے خوف اور وسوسے کا شکار رہی۔ میں نے کبھی آپ سے جھوٹ نہیں بولا کوئی بات نہیں چھپائی، آپ کا عفان کو بے حد چاہنا بھی مجھے گلٹ کا شکار کر دیتا تھا اور پرسوں ڈاکٹر شائستہ کو دیکھ کر تو میرا دل اندر سے گھبرایا ہوا تھا اور آج آپ کا رویہ دیکھ کر میں تمام رات سو نہیں پائی، اسی کشمکش کا شکار رہی کہ آپ کو اس حقیقت سے آگاہ کروں یا چھپا جاؤں مگر مجھے لگتا ہے کہ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہیے۔ میرا جرم اتنا بڑا نہیں جتنا شاید اسے چھپا کر بڑا بنا رہی ہوں۔ لیکن ایمان پلیز میری پوری بات سن کر مجھے سزا ضرور سنائیے گا لیکن اپنا نام مجھ سے کبھی مت چھینیے گا، میں آپ کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی......"

"سبینہ میرے دماغ کی رگیں کھنچ رہی ہیں، میں پہلے ہی بہت ٹینس ہوں بہتر ہوگا کہ تم بالکل سیدھی اور صاف بات کرو۔" ایمان نے بے ربط انداز میں بات کرتی سبینہ کو اب کی بار کافی سختی سے ٹوکا تھا۔ ایمان کا یہ انداز دیکھ کر اس کے نین کٹورے بھر آئے تھے۔ ایسے لہجے میں ایمان نے پہلی بار اس سے بات کی تھی۔

"ہماری شادی کو چھ ماہ سے اوپر کا عرصہ گزر چکا تھا آپ کی مما نے اکیلے میں آتے جاتے مجھے اولاد کی خوشی ابھی تک نہ سنانے پر باتیں سنانا شروع کر دی تھیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے یہ باور کراتی تھیں کہ اتنی بڑی جائداد کا وارث اب آ جانا چاہیے، ایمان ان کا اکلوتا بیٹا ہے اور وہ اپنے بیٹے کی اولاد ہر صورت دیکھنا چاہتی ہیں چاہے اس کے لیے وہ آپ کی دوسری شادی ہی کیوں نہ کروائیں اور وہ ایسا کر گزریں گی، وہ مجھے واضح دھمکی دے چکی تھیں۔ میں ماں بیٹے کے درمیان لڑائی اور رنجش کا سبب نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے آپ کو بھی ان کے ارادوں سے آگاہ نہ کیا۔ میں اچھی طرح سے جانتی تھی کہ ابھی ہماری شادی کو عرصہ ہی کتنا گزرا ہے اللہ ہمیں ضرور اس نعمت سے نوازے گا لیکن مما کے ہاتھ تو مجھے تنگ کرنے کا بہانہ آ گیا تھا۔ میں ان کے رویے سے گھبرا گئی تھی اس لیے ایک روز اپنی امی کے ساتھ ڈاکٹر شائستہ سے چیک اپ کرانے چلی گئی تا کہ خفیہ طریقے سے علاج کرا سکوں اگر کوئی گڑبڑ ہو تو اس بات کی میں آپ لوگوں کو بھنک بھی پڑنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

ڈاکٹر شائستہ نے تفصیلی چیک اپ کے بعد مجھے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دے دیے تھے جن کی رپورٹس آنے پر وہ حتمی رائے دے سکتی تھیں۔ ٹیسٹ کروا کر ہم لوگ گھر چلے آئے۔ شام کو آپ مجھے لینے آ گئے اور میں آپ کے ساتھ چلی آئی۔ تیسرے روز جب مجھے رپورٹس لینے جانا تھا میں آپ کے ساتھ ہی صبح امی کے گھر چلی آئی اس بہانے کہ امی کا فون آیا تھا بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں اور ساتھ ہی ایک دو روز رہنے کا بھی آپ سے کہہ ڈالا۔ آپ ان دنوں اپنے بزنس میں بے حد مصروف تھے لہٰذا آپ نے بخوشی مجھے اجازت دے دی۔ رپورٹس لے کر میں امی کے ساتھ ڈاکٹر شائستہ کے کلینک جانے کو نکلنے والی تھی ہماری بہت پرانی کام والی سکینہ خالہ اپنی سانولی سلونی بیٹی کے ساتھ امی کو ملنے چلی آئیں۔ ہم لوگ پہلے جس جگہ رہتے تھے یہ وہاں پر ہمارے گھر آ کر کام کرتی تھیں بعد میں ہم لوگ موجودہ گھر میں شفٹ ہو گئے جو کہ سکینہ خالہ کے گھر سے کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا لہٰذا اب

وہ ہماری نوکری جاری نہیں رکھ سکتی تھیں۔ امی کا ان کے ساتھ رویہ ہمیشہ بے حد شفیق اور نرم خو رہا تھا اسی لیے خالہ سکینہ کی ہمارے ساتھ دلی وابستگی ابھی تک موجود تھی۔ وہ بہت قابلِ اعتبار عورت تھیں، ہم دونوں بہن بھائی تقریباً ان کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ اس روز وہ امی سے کوئی بے حد خاص بات کرنے آئی تھیں۔ امی نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور کہا بس تھوڑی دیر میں ڈاکٹر کے پاس سے ہو کر آتے ہیں پھر تفصیل سے بات ہوگی۔ یہ کہہ کر امی میرے ساتھ ڈاکٹر شائستہ کی جانب چلی آئیں۔ بابا بھی اس وقت گھر پر موجود نہ تھے لیکن ہم خالہ سکینہ کی نیک فطرت اور اچھی عادات سے بخوبی آگاہ تھے۔ پرانے گھر میں بھی امی پورا گھر خالہ سکینہ پر چھوڑ جایا کرتی تھیں اور وہ مین کمروں کو تالا لگوا کر برآمدے میں بیٹھ جایا کرتی تھیں اور ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ "نہ جی اعتبار اندھا نہیں ہونا چاہیے جو اندھا ہوگا دیکھے گا کیا؟" آج بھی انہوں نے یہی کیا تھا ہم مطمئن ڈاکٹر شائستہ کے کلینک چلے گئے، میں نے اپنی رپورٹس ان کو تھما دی تھیں جن کا وہ بغور خاموشی سے مطالعہ کرنے لگیں اور میں بے چین ان کے بولنے کی منتظر آس و نراس میں گھری انہیں دیکھ رہی تھی اُن کے انداز سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"ہوں...... تو میرا شک درست نکلا۔" انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

"سبینہ یہ رپورٹس بتاتی ہیں کہ کسی اندرونی چوٹ کی وجہ سے تمہارے اندر ایک ایسا نقص پیدا ہو گیا ہے جس کے سبب تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔" یہ خبر میرے اعصاب پر بم کی طرح گری تھی مجھے اتنا دکھ اپنے ماں بننے کا سن کر نہیں ہوا تھا جتنا شدید خوف تمہیں کھونے کا پیدا ہوا تھا۔ امی اندرونی چوٹ کا سن کر پریشان ہو اٹھی تھیں۔

"خدانخواستہ ڈاکٹر صاحبہ یہ کبھی گری نہیں نہ ہی اللہ نہ کرے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے پھر یہ کیسی بات۔" امی نے بے یقینی اور اچنبھے سے پوچھا تھا مگر مجھے سب کچھ یاد آ چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ تفصیلاً امی کو رپورٹ کے بارے میں بتا رہی تھیں اور میں ماضی میں ہونے والے اس چھوٹے سے حادثے کو یاد کر رہی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں فرسٹ ایئر میں تھی۔ میری دوستی انیلا سے ہوئی، ہنس مکھ اور ذہین انیلا ہم بہت جلد بیسٹ فرینڈ بن گئے اس کے پاپا نے اسے ایک گاڑی گفٹ کی تھی جسے اس نے نیا نیا چلانا سیکھا تھا۔ کالج بھی وہ کبھی کبھار اس پر آتی تھی۔ ایک روز بارش کے بعد موسم بے حد دلفریب ہو رہا تھا انیلا نے کلاسز بنک کر کے ہلکی پھلکی ڈرائیو کا سوچا اور ساتھ میں اپنے پروگرام میں مجھے بھی گھسیٹ لیا ہم چار لڑکیوں کا گروپ اس چھوٹے سے ایڈونچر پر چل نکلا۔ انیلا کو ابھی مکمل طور پر ڈرائیونگ پر گرفت نہ تھی یا یوں کہہ لیں وہ مکمل طور پر پُراعتماد نہ تھی تبھی سامنے سے اچانک موڑ کاٹ کر آتی بس کو دیکھ کر گھبرا گئی، تیزی سے گاڑی دائیں جانب موڑی اور گیلی سڑک پر اس کی گاڑی پر گرفت ڈھیلی پڑ جانے کی صورت میں گاڑی کچے میں اتر کر سامنے درخت سے جا ٹکرائی یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا میرا وجود اچھل کر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ شکر ہے ہم سب کو معمولی چوٹیں آئی تھیں کالج نزدیک ہونے کی وجہ سے ہم چاروں لڑکیاں گھبرائی سی کالج واپس آ گئیں بعد میں انیلا نے اپنے پپا کو اس حادثے کے بارے میں بتایا جس کے بعد ڈرائیونگ پر بین لگا دیا گیا تھا۔

سر پر آئی ہلکی سی چوٹ کے بارے میں، میں نے کالج کی سیڑھیوں سے گر جانے کا کہہ کر امی کو مطمئن کر دیا مگر ساری رات میرے پیٹ میں ہلکی ہلکی درد کی ٹیسیں اٹھتی رہیں جس کے بارے میں نہ جانے کیوں ڈر کر میں نے امی کو کچھ نہ بتایا۔ میں گھبرا گئی تھی

www.paksociety.com

کہ کہیں وہ اصل وجہ نہ جان جائیں اور ویسے بھی اندر سے میں اس حادثے سے بے حد خوف زدہ ہوگئی تھی۔ کاش میں امی کو اس وقت سچ بتا دیتی۔ مجھے یقین ہے کہ وہی اندرونی چوٹ میرے لیے آج ایک خوفناک حقیقت کا روپ دھارے کھڑی تھی۔

میں ڈگمگاتے قدموں امی کے ساتھ بہ مشکل چلتی گھر پہنچی تھی۔ دروازہ کھلنے پر ایک اور تماشا ہمارا منتظر تھا جس نے ہمیں ایک پل کو حیران پریشان کر ڈالا تھا۔ خالہ سکینہ اپنی بیٹی کو گالیاں، کوسنے دے رہی تھیں اور مار بھی رہی تھیں وہ بس روئے جا رہی تھی۔ امی کے سمجھانے بجھانے کے بعد خالہ نے روتے ہوئے بتایا کہ نیلم نے ان کی غیر موجودگی میں گلی کے کسی آوارہ نوجوان سے دل لگی کر لی تھی۔ وہ بیوہ اپنے پانچ بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے تین تین گھروں میں صفائی کا کام کرتی تھیں۔ سارا دن گھر سے باہر رہتی تھیں اور باقی کی تین چھوٹی لڑکیاں اور چھوٹا لڑکا سرکاری اسکول میں مفت تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ نیلم جو گھر کے غربت زدہ ماحول سے اکتاہٹ کا شکار تھی انور کے جھانسے میں آگئی اور چند روز پیشتر خالہ نے انور کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھ لیا۔ اس روز طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ جلد گھر لوٹ آئی تھیں۔ نیلم کو دو تین ہاتھ لگانے کے بعد ہی علم ہوا کہ یہ سلسلہ تین چار ماہ سے چل رہا ہے۔ خالہ نے حالات سے مجبور ہو کر انور سے خود بات کرنے کی ٹھانی لیکن وہ سرے سے ہی مکر گیا اور سارا الزام نیلم کے سر رکھ دیا کہ وہ اسے خوامخواہ بہکا رہی ہے لہٰذا کوئی اور آسرا نہ پا کر خالہ نیلم کو ہمارے پاس نگرانی میں چھوڑنے چلی آئیں تا کہ جب تک جلد سے جلد کوئی رشتہ نہیں ملتا وہ ہمارے پاس رہے ورنہ اس کی بدنامی اور اس کا اٹھایا ہوا غلط قدم اس کی چھوٹی بہنوں کی زندگی بھی اجیرن کر سکتا تھا۔ ہمارے جانے کے بعد اچانک نیلم کو متلی آنا شروع ہوگئی اور جہاندیدہ سکینہ خالہ نے اس کی حالت سے سب کچھ بھانپ لیا۔ مار پیٹ کے بعد بہ مشکل نیلم نے اعتراف کیا کہ اس سلسلے کو تقریباً دو ماہ ہو رہے ہیں۔

''بس بی بی جی، میں نے سوچ لیا ہے میں اسے کوئی زہر دے کر مار ڈالوں گی اس کے علاوہ میرے پاس کوئی حل نہیں۔'' سکینہ نے روتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں ماں بیٹی اس نئی افتاد پر حیران پریشان بیٹھی تھیں۔

''بی بی جی...... میں تو...... میں تو کسی ایسی جگہ سے بھی واقف نہیں جہاں بچہ گرا یا......''

''نہیں آپ ایسا نہیں کریں گی سکینہ خالہ، اسے یہیں چھوڑ جائیں، اس کا بچہ میں گود لوں گی اور یہ راز بس ہم چاروں کے درمیان رہے گا۔ آپ اپنے گھر جا کر کہہ دینا کہ نیلم کو ہمارے ہاں نوکری پر رکھوا دیا ہے اور میں ایمان کو بتاؤں گی کہ میں ماں بننے والی ہوں اور پھر جس دن یہ بچہ اس دنیا میں آئے گا میں اسے گود لے لوں گی۔ آپ پھر نیلم کو واپس لے جانا اور مناسب رشتہ دیکھ کر شادی کر دینا خرچے کی فکر مت کرنا۔'' آپ سے جدا ہونے کے خوف نے نہ جانے میرے اندر یہ کیسی شاطر سوچ بھری تھی کہ میں نے کچھ ہی لمحوں میں ایک بے داغ منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ سکینہ خالہ کو بھلا کیا اعتراض ہوتا وہ تو جی جان سے راضی ہو گئیں بلا ان کے سر سے ٹل گئی تھی۔ امی بھی کچھ پس و پیش کے بعد میرا ساتھ دینے پر راضی ہوگئیں۔

اور پھر قدرت نے میرا اس منصوبے میں بھرپور ساتھ دیا۔ میری رپورٹ پوزیٹو کا سن کر جہاں آپ بے تحاشا خوش ہو گئے تھے وہیں میں نے ممی کے چہرے پر تاریک سایہ لہراتا دیکھ لیا تھا جس کے بعد میرے ارادے میں اور مضبوطی آگئی تھی۔ دو تین ماہ کے بعد جب آپ جاپان میں اپنے آفس کی برانچ اسٹیبلش کرنے جا رہے تھے، میں نے میکے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپ کی خواہش مجھے ساتھ لے جانے کی

تھی جو میرے منصوبے کا بالکل حصہ نہ تھی لہٰذا میری ضد اور سمجھانے پر آپ راضی ہو گئے۔ آپ کا ٹور تقریباً سات آٹھ ماہ کا تھا آپ مجھے ایسی حالت میں یوں چھوڑ کر جانا نہیں چاہ رہے تھے لیکن پھر میری خواہش آپ کو ماننا پڑی اور پھر میں اپنے میکے رہنے چلی آئی۔ نیلم کا میں خود سے خیال رکھ رہی تھی لیکن وہ بے حد اداس اور خاموش رہتی۔ اسے یہ دکھ اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا کہ جس کو اس نے اپنے دل کا شہزادہ سمجھا وہ ایک فریبی اور دغا باز نکلا۔ اسی دوران ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا اور پہلا اٹیک ہی جان لیوا ثابت ہوا۔

یہ ایک شدید صدمہ تھا جس سے ہم سب دوچار ہوئے تھے۔ نہ جانے میں یا امی ابھی تک ابو کو اصل بات بتانے کی ہمت کیوں پیدا نہیں کر سکے تھے شاید ہمیں معلوم تھا ابو اس جھوٹ کی شدید مخالفت کریں گے اور ہمارا ساتھ نہیں دیں گے مگر وہ کچھ جانے بغیر ہی اس دنیا سے چلے گئے اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جب نیلم نے عفان کو جنم دیا۔ اس کی ڈیلیوری ڈاکٹر شائستہ کے کلینک پر ہوئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ سوا مہینہ پورے ہونے کے بعد خالہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گی لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ وہ تو شاید اس وقت تک خود کو جینے پر بہ مشکل رضامند کیے ہوئے تھی۔ عفان کی پیدائش کے چوتھے روز وہ اپنی زندگی سے ہار گئی۔ پیدائش کے بعد اس نے ایک نظر بھی عفان کو نہیں دیکھا تھا منہ موڑے بے سدھ لیٹی رہتی تھی۔ میں نے چاہا تھا کہ وہ اسے ایک بار گود میں لے کیونکہ ایک ماں سے میں اس کا بچہ نہیں چھیننا چاہتی تھی مگر اس نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ یہ بچہ اس کا کچھ نہیں لگتا اسے دیکھ کر اس کے اندر نفرت انگیز لمحات سلگنے لگتے ہیں۔ خالہ سکینہ روتی دھوتی اس کی لاش لے گئیں اور یہ مشہور کر دیا کہ میعادی بخار نے نیلم کی جان لے لی۔ چند ہی مہینوں کے بعد خالہ سکینہ بھی دارِ فانی سے کوچ کر گئیں مجھے ایک جاننے والی کے توسط سے یہ خبر موصول ہوئی یوں میرے وہ دونوں رازداں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے تھے جن سے مجھے تھوڑا بہت اندیشہ ہو سکتا تھا۔ عفان کی پیدائش کا سن کر آپ پندرہ دنوں کے اندر واپس لوٹ آئے تھے اور پھر ہمارا گھر عفان کی قلقاریوں سے ہمیشہ کے لیے آباد ہو گیا۔ امی، عدنان بھائی کے پاس امریکا چلی گئیں اور میں آپ کی بے اندازہ محبت پا کر عفان سمیت بے حد خوش و خرم تھی لیکن کبھی کبھی یہ احساس مجھے بچھو کے ڈنک کی طرح لگانے لگتا کہ میں نے اتنا بڑا سچ آپ سے چھپا کر رکھا ہے...... مگر آج آپ کے انداز نے مجھے بوکھلا دیا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ ڈاکٹر شائستہ نے مجھے پہچان کر آپ کو کچھ بتایا ہے یا نہیں مگر مجھے سب کچھ بتانا ہے کم از کم روز دل میں اٹھنے والی کسک، احساسِ جرم اور بولے جانے والے جھوٹ کے خوف سے تو نجات حاصل ہو جائے گی۔ اب آپ کی مرضی جو مرضی چاہے سزا سنا دیں۔'' سبینہ نے سسکتے ہوئے اپنی ساری داستان ایمان کے گوش گزار کر دی تھی جو بت کے مانند ساکت حیران صورت لیے سبینہ کے انکشافات سن رہا تھا۔ دل و دماغ سے ایک بھاری بوجھ سرکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ جیسا سوچ رہا تھا ویسا کچھ نہیں تھا سبینہ آج بھی پاکیزہ اور اس کی تھی اس احساس نے اس کی روح کو ہلکا پھلکا کر ڈالا تھا۔

''سبینہ میری جان! تمہارے سچ نے میرے اعتبار کو ٹھیس تو پہنچائی ہے مگر میری محبت تم سے جدا یا تمہیں کوئی سزا سنانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ ایک پل کو میرے دل کو دھچکا لگا۔ دکھ بھی ہوا ہے کہ اتنی بڑی بات تم نے مجھ سے پوشیدہ رکھی لیکن دوسرے پل میں نے خود کو تمہاری جگہ رکھ کر سوچا.... اور مجھے تم ہر طرح سے حق بجانب لگی ہو۔ لہٰذا آج کے بعد یہ سچائی جس سے اب مجھے بھی آگاہی ہو چکی ہے

دل و دماغ سے یوں محو ہو جائے گی جیسے یہ ہوا ہی نہ ہو، عفان ہمارا بیٹا ہے اور بس۔'' ایمان نے چند لمحے توقف کے بعد اداس اور ملول سر جھکائے سبینہ کو شانوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے ٹھہرے اور نرم لہجے میں کہا۔

''تو......تو کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا...... اور رات سے جو رویہ آپ کا ہمارے ساتھ......'' سبینہ کی آواز کپکپا اٹھی تھی مگر وہ اپنی الجھن کو رفع بھی کرنا چاہتی تھی۔

''یار آج آفس کے ایک مسئلے پر بے حد ڈسٹرب تھا اوپر سے دوست کی مدر کی حالت دیکھ کر طبیعت اور مکدر ہو گئی سوچا لائبریری میں بیٹھ کر مسئلے کا حل سوچوں گا اور ہاں یہ ڈاکٹر شائستہ مجھے ملی ہے اور نہ ہی مجھے کچھ بتایا ہے۔'' ایمان نے سبینہ کو مطمئن کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور پھر آگے بڑھ کر سوئے ہوئے عفان کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اس کے کب سے بے چین و بے قرار پیاسے دل کو گویا قرار آ گیا۔

''چلیں ملکۂ عالیہ اپنے بیڈ روم میں چل کر سوئیں صبح ہونے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔'' ایمان نے اپنے ایک بازو کو سبینہ کے کندھے پر پھیلاتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا اور پُرسکون سبینہ اطمینان سے اس کی ہمراہی میں اپنے بیڈ روم کی جانب بڑھ گئی۔ چند گھڑیاں سرک جانے کے بعد ایمان نے ایک نظر پُرسکون سوئی سبینہ کے چہرے پر ڈالی اور درمیان میں سوئے ہوئے معصوم عفان کی پیشانی دھیرے سے چوم لی۔ اس لمحے اس کی آنکھیں نم تھیں پھر وہ سیدھا لیٹ گیا اور دل میں سبینہ کو مخاطب کیا۔

''سچ تو یہ ہے سبینہ کہ میں نے تمہیں معاف نہیں کیا اگر ایسا ہوتا تو میں اپنے حصے کا سچ تمہیں ضرور بتاتا جسے جان کر میں اتنی دیر سے سلگ رہا تھا اور تم سے محبت کا دعوے دار ہونے کے باوجود نہ جانے کیا کچھ تمہارے بارے میں غلط سوچ ڈالا اور اپنی خود ساختہ سوچوں میں آ کر تمہیں خود سے ہمیشہ کی علیحدگی کی سزا تک سنا ڈالی اگر تم یہ سب جان جاتیں تو نہ صرف دکھی ہوتیں بلکہ مجھ سے بھی بدگمان ہو جاتیں، اسی لیے میں نے اپنی انا کا پرچم بلند رکھنے کے لیے تم سے سب کچھ چھپا لیا تاکہ تم ہمیشہ میری ممنون رہو اور سدا میری محبت کا، میری بڑائی کا اور میرے اتنے وسیع ظرف کا دم بھرتی رہو، تم ہمیشہ مجھے خود سے بلند دیکھو۔ تم کبھی نہ جان پاؤ گی کہ عفان کو قبول کرنے کی وجہ صرف میری وہ پیاسی پدرانہ شفقت نہ تھی بلکہ مجھے ہر حال میں اپنا نام چلانے والا اپنے خاندان کا وارث چاہیے تھا جو عفان کے علاوہ اب کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے صرف تمہیں معاف کرنے اور عفان کو قبول کرنے میں اپنے محبت بھرے جذبات کا ساتھ نہیں لیا بلکہ ایک کامیاب بزنس مین کی طرح نفع کا سودا کیا ہے جس میں میرے ضمیر کو گھاٹا ہوا ہے۔ میں کبھی باپ نہیں بن سکتا اس کا اقرار اور اس کا اظہار میں تمہارے آگے کبھی نہیں کروں گا کیونکہ میں ایک بزدل مگر چالاک مرد ہوں اور ایک سچ تو یہ بھی ہے کہ اس سچائی کی پوشیدگی مجھے تمام عمر تم دونوں کے سامنے اندر سے ناآسودہ رکھے گی۔ میرے دل میں یہ سچائی ایک کانٹے کی طرح سدا پیوست رہے گی جس کی چبھن مجھے اندر سے کبھی چین نہ لینے دے گی لیکن مجھے یہ چبھن منظور ہے مگر تمہارے آگے یہ اقرار میرے حوصلے کے لیے ناممکن ہے کہ میں ایک بانجھ مرد ہوں، میری یہ کمزوری تمہارے آگے مجھے خود کو بہت کمتر محسوس کرنے پر مجبور کر دیتی۔'' ایمان نے ایک ٹھنڈی سانس سینے سے خارج کرتے ہوئے یہ سب سوچا اور پھر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا یہ جانتے ہوئے بھی کہ سچ کی چبھن اسے اتنی جلدی آرام دہ پُرسکون نیند نصیب نہ ہونے دے گی۔

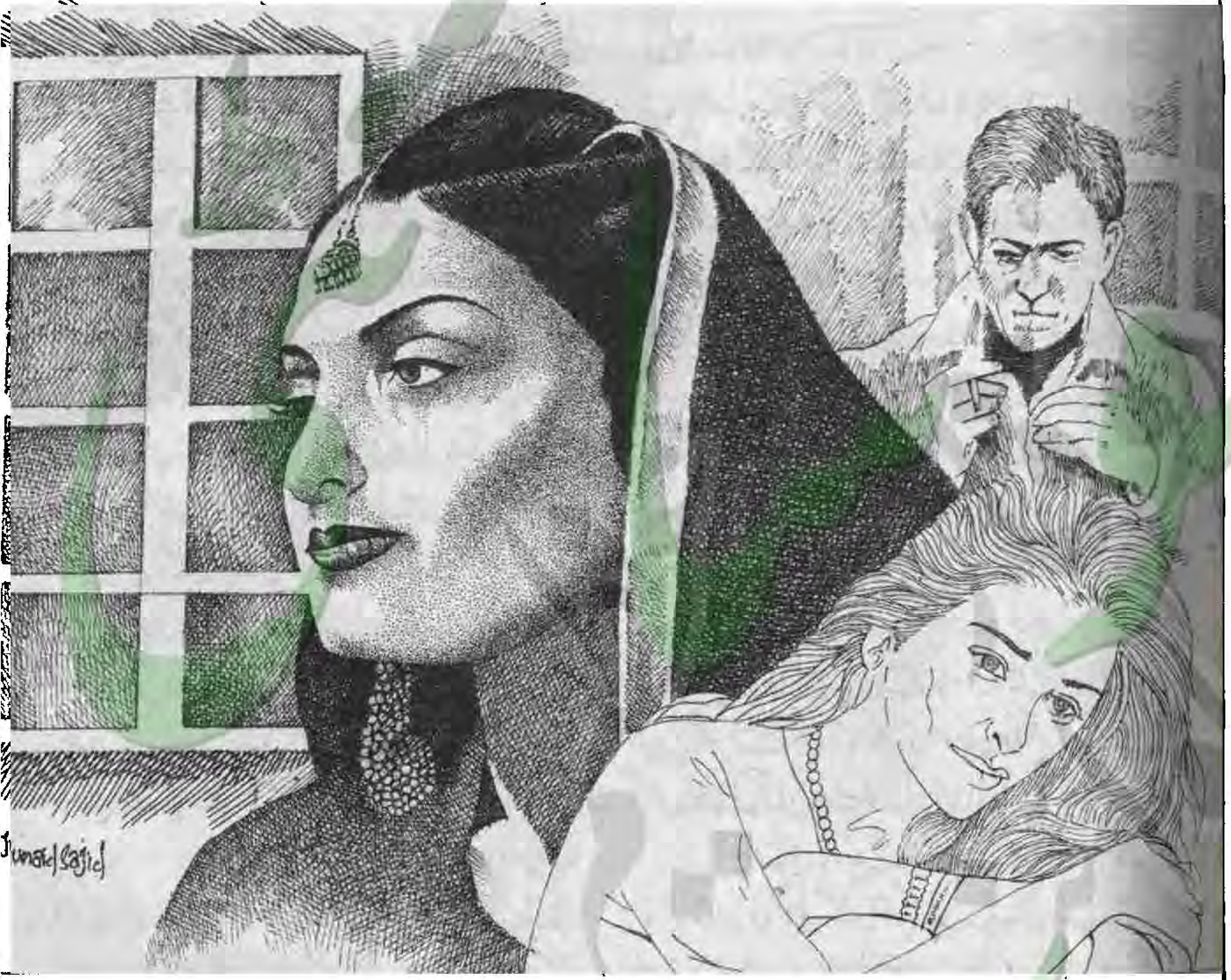

سراپا سحر

لبنیٰ عروج

آپا ایسی ہی تھیں۔ لمبی، دبلی پتلی سی، سیاہ گھنے لمبے بال، موتیے کے پھول جیسی رنگت، اس پر چہرے پر اتنی معصومیت کہ دیکھنے والے کو خوامخواہ ہی پیار آ جائے۔ بات بات پر جلدی سے رو دینے والی۔ روتے روتے یک دم ہنس دینے والی۔

ہماری اماں ڈاکٹر تھیں وہ ابھی میڈیکل میں پڑھ ہی رہی تھیں کہ نانا ابا نے ان کو بیاہ دیا۔ وہ میڈیکل کے فورتھ ائیر میں تھیں کہ آپا ان کی گود میں

آ گئیں۔ ہمارے نانا ابا بھی ڈاکٹر تھے' ہماری سگی نانی اماں کی اچانک وفات کے بعد گھر کا نظم و نسق بگڑ جانے کی وجہ سے نانا ابا نے جلد ہی دوسری شادی کر لی۔ نئی نانی اماں بہت اچھی تھیں۔ اتنی اچھی کہ آپا کو ان کی گود میں ڈال دیا گیا اور ہماری اماں کی پڑھائی بغیر کسی تعطل کے دوبارہ سے جاری ہو گئی۔

میڈیکل کا اختتام ابھی پوری طرح نہیں ہوا تھا کہ میں دنیا میں چلی آئی پھر ڈیڑھ، ڈیڑھ سال کے بعد دو اور بہنیں دنیا میں چلی آئیں۔ اماں اتنی مصروف ہو گئیں کہ انہیں ہاؤس جاب کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ ابا میاں کو یکے بعد دیگرے چلی آنے والی چار بیٹیوں کی آمد ذرا بھی بری نہیں لگی۔ ابا ایسے صابر شاکر تھے اپنے رب کی رضا میں راضی رہنے والے۔ بہت بڑی پوسٹ پر تھے۔ ہمیں بہت بڑا گھر ملا ہوا تھا۔

ابا کو ایک ہی فکر تھی، ایک ہی لگن تھی وہ ہم سب بہنوں کی بہت اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت چاہتے تھے۔ اسی لیے ہم بہنیں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ابا بہت کم اردو بولتے تھے ہمیشہ بڑے خوب صورت لہجے میں انگلش میں بات کرتے تھے۔ گھر میں خوش حالی تھی کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن ہماری اماں کے اندر وہی تھرڈ ائیر کی اسٹوڈنٹ والی ایک بچی چھپی ہوئی تھی، وہ بہت زیادہ ہنستی تھیں، قہقہے لگاتی تھیں۔ وہ اور ابا گھنٹوں انگریزی میں باتیں کیا کرتے تھے۔ ہم چاروں بہنیں بھی ہوش سنبھالنے تک انگریزی زبان اچھی طرح سمجھنے اور بولنے لگی تھیں۔

آپا سب سے بڑی تھیں جب وہ او لیول میں آئیں تو ایک دوست کا بہت زیادہ ذکر کرنے لگیں۔ گھر میں اس ذکر پر انہیں کبھی روکا یا ٹوکا نہیں گیا۔ امی بھی بڑی سہولت سے عارفین کا ذکر سن لیتی تھیں نہ کبھی استفسار نہ روک نہ ٹوک نہ کبھی جھڑکا نہ منع کیا۔

تعلیمی اداروں میں ایسا ہی ہوتا ہے، عورت مرد کی تمیز رکھے بغیر سب کلاس فیلوز ہوتے ہیں لیکن جب میں او لیول میں آئی تو میں خود ہی لڑکیوں سے دوستی رکھنے لگی، مجھے لڑکوں سے بات چیت کرنا ان سے فری ہونا سخت ناپسند تھا، میرے اپنے ہی کچھ اصول تھے میں نے خود پر خود ساختہ پابندیاں لگائی ہوئی تھیں لیکن آپا بڑی سہولت سے لڑکوں سے بات چیت کر لیتی تھیں۔ مجھے ان کے کلاس فیلو کا ذکر ان کی زبان سے بڑا شاق گزرتا لیکن اماں کو پروا کب تھی۔ شاید وہ ذہنی طور پر اتنی پختہ اور سمجھدار ہرگز نہیں تھیں کہ وہ ایسی باتوں کو نوٹس کرتیں' پتا نہیں کب اور کیسے میں نے خود ہی یہ ذمے داری اٹھا لی۔

آپا بڑی تھیں اس کے باوجود میں چھوٹی ہو کر ان پر نظر رکھنے لگی۔ آپا کی سترھویں سالگرہ پر ابا نے انہیں موبائل فون گفٹ کر دیا۔ آپا بے انتہا خوش تھیں۔

"تھینک یو ابا......" وہ بار بار کہتیں بار بار ہنستیں' بار بار ان کی کالی حسین آنکھیں بھیگ جاتیں۔ عجب دھوپ چھاؤں کا سا عالم تھا۔ میں انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ موٹی کالی لمبی چٹیا آگے آ گئی تھی، وہ خوشی سے سرخ چہرہ لیے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

صبح اٹھ کر ہم سب اسکول چلے گئے' واپسی پر آپا کا بیگ بہت بھرا ہوا تھا۔ اسکول سے آتے ہی انہوں نے سارا بیگ اپنے بیڈ پر الٹ دیا۔ بہت سارے کارڈز اور چھوٹے موٹے بہت سے گفٹس تھے۔ وہ ایک ایک کارڈ ہم سب کو دکھا رہی تھیں، یہ فلاں نے دیا ہے، یہ فلاں نے دیا ہے۔ زیادہ تر لڑکوں کے کارڈز تھے' مجھے یہ بات بہت کھل رہی تھی۔ میں چپ بیٹھی تھی تبھی امی وہاں آ گئیں' انہوں نے بڑے چاؤ سے سارے گفٹس سارے کارڈز دیکھے اور اپنی شستہ انگریزی میں کہنے لگیں۔

"یو آر سو پاپولر ان دی کلاس۔"

"اوہ یس......" آپا حسبِ معمول سرخ پڑ گئیں۔ آپا واقعی اسکول میں حد درجہ پاپولر تھیں۔ انہیں بہت زیادہ سراہا جاتا تھا، چاہا جاتا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کی مالک تھیں یہ سب بجا مگر رفتہ رفتہ ان کی باتوں میں عارفین سید کا ذکر بہت زیادہ آنے لگا تھا۔ پہلے پہل سارے گفٹس وہ ہمیں دکھایا کرتی تھیں اب جب سے وہ اے لیول میں آ گئی تھیں وہ ہمیں اس طرح سے کارڈز اور گفٹس نہیں دکھاتی تھیں جس طرح پہلے دکھایا کرتی تھیں۔ وہ ایک پہیلی جیسی ہوتی جا رہی تھیں بنا بات مسکرانا' کبھی کبھار سخت چڑ چڑی ہو جانا اور کبھی کبھی گہری سوچوں میں ڈوب جانا۔ میں ان کی حرکات و سکنات کو نوٹ کرتی رہتی تھی' اب وہ مجھ سے تھوڑا گھبرانے لگی تھیں، میں اچانک کمرے میں آ جاتی تو وہ سخت گھبرا جاتیں۔

"کیا ہوا آپا؟" میں جان کر انجان بن جاتی۔

وہ کچھ شرمندہ سی نظر آنے لگتیں۔

"کچھ بھی نہیں۔"

☆☆☆

وقت بڑی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا۔ اے لیولز کے بعد آپا نے میڈیکل جوائن کر لیا تھا۔ وہ بے انتہا پڑھا کو اور ذہین تھیں' انہوں نے بڑی آسانی سے انٹری ٹیسٹ پاس کر لیا تھا۔ میرٹ کے حساب سے وہ اپنے ہی شہر کے میڈیکل کالج میں آ گئی تھیں لیکن پھر بھی کچھ اداس سی تھیں۔ ایک دن میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"آپا آپ کو اتنی بڑی کامیابی ملی ہے، امی اور ابا بے انتہا خوش ہیں لیکن آپ بیٹھے بیٹھے اداس سی ہو جاتی ہیں آخر کیوں؟"

"نہیں تو......" انہوں نے چھپانا چاہا مگر آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"کیا ہوا بتائیں نا؟" میں نے ضد کی۔

"وہ بس میں نے اور عارفین نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ ہم میڈیکل کالج میں بھی اکٹھے ہی رہیں گے لیکن عارفین کو میرٹ کے حساب سے پنجاب کے ایک دور دراز شہر کے کالج میں ایڈمیشن ملا ہے۔"

"اوہ......تو یہ دکھ ہے۔" میں نے زیر لب کہا۔ وہ سن نہیں سکیں۔ مستفسرانہ مجھے دیکھنے لگیں۔ میں کچھ نہیں کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چل دی۔

ہم سب بہنیں تعلیمی مدارج طے کر رہی تھیں' سب سے چھوٹی عافیہ بھی اب 7th میں آ گئی تھی تب امی کو دوبارہ سے شوق چڑھا کہ وہ اپنا ہاؤس جاب مکمل کریں گی۔ دن چڑھتا تو ہم سب گھر سے نکل جاتے۔ گھر کا نظم و نسق بوا رحیمن کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ وہ صفائی والی سے صفائی کرواتیں، خانساماں کے سر پر کھڑی ہو کر لون مرچ کا حساب رکھتیں، ہمارے کمرے سیٹ کرتیں۔ کس کی چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے' ڈرائیور کو کب کس کو پک کرنے کے لیے بھیجنا ہے ساری کمان اب بوا کے ہاتھ میں تھی۔ امی اتنی مصروف ہو گئی تھیں کہ ہم سے اکثر ان کی ملاقات ہی نہیں ہو پاتی تھی۔ وقت بڑی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا۔ ایک دن آپا کالج سے گھر آئیں تو بہت خوش تھیں' چہرے پر مسکراہٹ کی دھوپ تھی۔

"کیا بات ہے آپا بہت خوش لگ رہی ہیں۔" میں حسب عادت چونک سی گئی۔

"اوہ ہاں، وہ عارفین ہے نا وہ اپ گریڈ ہو کر ہمارے کالج میں آ گیا ہے۔" ان کی سیاہ آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں، لبوں پر مسکان تھی' وہ اڑی اڑی سی پھر رہی تھیں۔ مجھے ان کا اس طرح خوش ہونا اچھا نہیں لگا۔ میرے اپنے کچھ ضابطے تھے' اصول تھے میں ذرا سخت طبیعت رکھتی تھی۔ چھوٹی ہونے کے باوجود میں ان پر بڑی بہنوں کی طرح کا رعب جمانا چاہتی تھی۔ وہ کبھی پلٹ کر مجھے جواب نہیں دیتی تھیں چپ کی چپ رہ جاتی تھیں' کبھی کبھی کچھ خجل سی ہو جاتی تھیں۔ مجھے اور شہ ملتی تھی' مجھے لگتا تھا کہ میں

www.paksociety.com

بہت پاکیزہ ہوں۔ میں کسی لڑکے سے دوستی نہیں رکھتی تھی، مجھے کسی سے محبت نہیں تھی۔ میں کسی دوسرے کے دلائل سے بہت کم متاثر ہوتی تھی۔ ہر چیز کو دیکھنے کا میرا اپنا ایک نظریہ تھا، میرا اپنا نقطہ نظر تھا۔ میں اپنے تئیں آپا پر نظر، خبر رکھتی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے گھبراتی تھیں، مجھے انہیں گھبرایا ہوا دیکھ کر عجیب سی طمانیت ملتی تھی۔

ہماری امی اتنی گہری اتنی سمجھدار نہیں تھیں، میں آپا سے اور امی سے یکسر مختلف تھی۔ میڈیکل کالج میں آکر بھی آپا اسی طرح مقبول تھیں۔ حساس، درد مند دل رکھتی تھیں۔ ہر کسی کے دکھ درد پر تڑپ اٹھتی تھیں، ہر کسی کی مدد کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔ ان کی یہی عادتیں یہی پیاری فطرت انہیں مقبولِ عام بنانے میں اہم رول ادا کرتی تھی۔ کچھ عرصے سے پاکستان میں ویلنٹائن ڈے بڑے جوش وخروش سے منایا جانے لگا تھا، آپا اتنی مقبول تھیں کہ ان کا بیگ چاکلیٹس، پھول اور کارڈز سے بھر جاتا۔ سب سے مہنگی چاکلیٹ اور خوب صورت گلاب وہ اپنی الماری کے خانے میں چھپا کر رکھ دیتیں اور باقی ساری چاکلیٹس وہ بڑی فیاضی اور فراخدلی سے ہم سب بہنوں میں بانٹ دیتیں۔ ہم بہنوں کا کمرا بھی مشترکہ تھا۔ کپڑوں کی الماریوں میں ہمارے خانے مخصوص ہوتے تھے، میں جان بوجھ کر آپا کی الماری کا خانہ کھنگال ڈالتی، کسی کپڑے کی تلاش کے بہانے اور وہ چاکلیٹس نکال کر سامنے لے آتی۔

''یہ کیوں چھپا کر رکھی ہیں آپا......؟''

''یہ عارفین نے دی تھیں۔'' کہتے کہتے وہ لال ہوجاتیں، میں انتہائی سنجیدگی سے کمرا چھوڑ دیتی۔ وہ کچھ حیران سی ہوجاتیں، میری ایسی فطرت سے وہ گھبراتی تھیں جب میں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھا جاتی تھی۔

آپا کی سالگرہ گھر میں بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھی لیکن کالج میں گھر سے بھی زیادہ جوش وخروش سے منائی جاتی تھی۔ سارے لڑکے ساری لڑکیاں کبھی بازار سے آرڈر کرواتے کبھی کوئی دوست گھر سے کیک بیک کر کے لے آتی۔ مختلف قسم کے گفٹس سے ان کا بیگ بھرا ہوتا۔ ایک تحفہ سب سے ہٹ کر سب سے جدا سب سے قیمتی ہوتا تھا جسے وہ سنبھال سنبھال کر رکھتیں۔

''یہ کیوں چھپا رہی ہیں آپا۔؟''

''چھپا تو نہیں رہی، یہ عارفین نے دیا تھا۔'' وہ سرخ ہونے لگیں۔

''یہ اتنی قیمتی رسٹ واچ۔'' میں نے کسی ماہر کاریگر کی طرح گھڑی کو اِدھر اُدھر گھما کر دیکھا۔

''عارفین کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے ہیں'' میں نے تفتیشی آفیسر کی طرح بی ہیو کیا۔

''وہ میری برتھ ڈے کے لیے کئی مہینے پہلے سے ہی اپنی پاکٹ منی جمع کرنی شروع کر دیتا ہے۔'' وہ ایک جذب کے عالم میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''اس کے پیرنٹس کو پتا ہے کہ وہ آپ کو اتنے مہنگے تحفے دیتا ہے؟'' میں نے خواہ مخواہ کریدا۔

''ہاں، اس کی چھوٹی بہن کو پتا ہے۔'' وہ پھر سے بلش کرنے لگی تھیں۔ میں نے پھر حسبِ عادت بڑی سنجیدگی اور بڑی خاموشی سے کمرا چھوڑ دیا۔ وہ الجھی ہوئی مستفسرانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کا یہ استفسار مجھے انجانی لذت سے ہمکنار کرتا تھا۔ وہ نہ کبھی مجھ سے لڑتیں، نہ کبھی غصہ دکھاتیں بس ان کی چپ کبھی ٹوٹتی نہیں تھی۔ میں چھوٹی بہنوں پر بھی نظر رکھتی تھی۔ وہ بھی مجھ سے تھوڑا دبتی تھیں اور یہ احساس مجھے انوکھی خوشی بخشتا تھا۔

آپا مجھ سے بڑی تھیں چاہتیں تو مجھ پر رعب جما سکتی تھیں مجھ پر نظر رکھ سکتی تھیں لیکن ان کی فطرت ایسی تھی ہی نہیں۔ وہ تو بس بہت ہی نرم دل رکھتی تھیں اور

بڑی ہی سہولت سے سچ بول دیتی تھیں۔ ہم چاروں بہنیں ایک دم ہی جوان ہوگئی تھیں، ایک دوسرے کے کپڑے جوتے پہن لینا ہم سب کا معمول تھا۔ ایک دفعہ میں اور ماہا انہیں ان کی دوست کی طرف چھوڑنے جارہے تھے، دوست گاڑی میں آکر بیٹھی اس نے آپا کے کپڑوں کی بے انتہا تعریف کی آپا نے جھٹ بتا دیا۔

''یار یہ سوٹ میرا نہیں زرقا کا ہے۔'' ہم آپا کو اور ان کی دوست کو ایک اور دوست کی مہندی میں چھوڑ کر گھر آگئے۔ رات کو جب آپا آئیں تو بہت خوش تھیں بار بار بتا رہی تھیں کہ ان کے لباس کو سب دوستوں نے بے حد سراہا۔ وہ بہت خوش تھیں تبھی میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''دوستوں کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ سوٹ میرا ہے۔'' وہ ایک دم چونک گئیں۔

''تو سوٹ تو تمہارا ہی تھا نا، سچ بولنے میں کیا حرج ہے۔'' ان کے اس جواب کو امی نے سراہا مگر میرا موڈ خراب ہوگیا۔

''بندے کو اتنا سچ بھی نہیں بولنا چاہیے۔''

''ہمیں بچپن سے سچ بولنا ہی تو سکھایا گیا ہے، تم اتنی اپ سیٹ کیوں ہو رہی ہو؟'' امی کی آنکھوں میں غرور تھا، فخر تھا وہ محبت پاش نظروں سے آپا کو دیکھ رہی تھیں، مجھے اپنی سخت انسلٹ فیل ہو رہی تھی۔ میں سونے کا بہانہ کر کے لاؤنج سے اپنے کمرے میں آگئی، آپا جانے کب کمرے میں آئیں تو مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ امی بھی عارفین کے ذکر میں دلچسپی لینے لگیں، وہ اب سہیلیوں کی طرح آپا کو چھیڑتیں۔ آپا سرخ پڑ جاتیں۔ ایک بار تو حد ہی ہوگئی۔

''عارفین سے کہو اپنے پیرنٹس کو بھیجے۔'' امی نے آپا سے کہا۔ آپا کے قدم مارے خوشی کے زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ وہ اڑی اڑی پھرتی تھیں۔ اگلے دن کالج سے آئیں تو سخت اپ سیٹ تھیں۔ لگتا تھا رو رو کر ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے عارفین سے بات کی تھی، اس نے کہا ابھی تو ہم اسٹوڈنٹ ہیں۔ میں اتنی بڑی بات اپنے پیرنٹس سے نہیں کہہ سکتا۔'' میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ آپا ڈر سی گئیں۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''عارفین آپ کے ساتھ سنسیئر نہیں ہے؟''

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا؟'' وہ آہستہ سے بولیں۔

''وہ آپ کے لیے کبھی اسٹینڈ نہیں لے سکے گا۔''

''لیکن یہ بھی تو سوچو زرقا ہم ابھی پڑھ رہے ہیں۔ عارفین کی کوئی جاب بھی تو نہیں ہے۔ امی نے شاید کچھ زیادہ ہی جلدی نہیں کر دی؟''

''امی کو الزام مت دیں، لوگ تو بچوں کے پیدا ہوتے ہی ان کے رشتے طے کر دیتے ہیں آپ لوگ تو پھر بھی میڈیکل کے فورتھ ایئر میں آگئے ہیں۔'' میری باتیں میرے دلائل سن کر وہ سوچوں میں ڈوب گئیں۔

''آپ عارفین سے کہیں وہ کم از کم اپنی ماں سے ایک فون ہی کروا دے، کچھ تو رابطہ ہموار ہو کچھ شناسائی بڑھے۔'' وہ جھٹ مان گئیں۔

''ہاں، وہ ایک فون تو کروا ہی سکتا ہے۔'' جیسے انہیں اندھیرے میں کوئی راہ سجھائی دے گئی ہو۔ وہ بڑے جوش سے کالج گئیں واپسی پر بہت خوش بہت پُرامید تھیں، انہیں یقین تھا عارفین ایک فون تو کروا ہی سکتا ہے۔

شام کو فون کی ہر گھنٹی پر وہ چونکتی رہیں لگتا تھا ان کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہوجاتی تھیں۔ فون تو بہت سے آئے مگر وہ ایک فون جس کا آپا کو شدت سے انتظار تھا نہیں آیا...... پھر بہت سے دن گزر گئے۔

www.paksociety.com

ہماری امی بہت لاابالی تھیں' انہوں نے پتا نہیں مذاق کیا تھا یا یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔ انہوں نے کبھی پلٹ کر پوچھا بھی نہیں کہ عارفین کی امی کا فون آیا یا نہیں۔ ویسے بھی وہ اپنے ہاؤس جاب میں بری طرح بزی تھیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے آپا بہت زیادہ اپ سیٹ تھیں فون پر اپنی کسی دوست سے کہہ رہی تھیں۔

''عارفین کے پیرنٹس بہت سخت ہیں، وہ ان سے اتنا فری ہرگز نہیں ہے کہ میرے بارے میں ان سے بات کر سکے۔'' میں نے سن لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ عارفین ایک کمزور مرد ہے' وہ اپنے ماں باپ سے اپنی خواہش پوری نہیں کروا سکتا، نہ ضد سے نہ بغاوت سے۔

وہ لوگ اب فائنل ایئر میں آگئے تھے، آپا غالباً اب عارفین سے بہت زیادہ اصرار کر رہی تھیں کیونکہ موبائل پر دونوں جانے کیا بحث کرتے رہتے تھے جیسے ہی میں کمرے میں آتی آپا فون آف کر دیتیں۔ میں بنا پوچھے ہی سمجھ جاتی کہ دوسری طرف یقیناً عارفین ہی ہوگا۔

ایک دن وہ اپنی ایک دوست کی طرف گئی تھیں کمبائنڈ اسٹڈی کے لیے۔ واپس آئیں تو بہت چپ چپ سی تھیں۔ پہلے بھی کون سا وہ کوئی بہت بولتی تھیں آج تو بالکل ہی چپ ہو گئی تھیں۔

''کیا بات ہے آپا، آپ آج اتنی چپ کیوں ہیں؟'' رات کو جب دونوں سونے کے لیے لیٹیں تو میں نے آپا سے پوچھ لیا۔

''بس ایسے ہی......'' انہوں نے ٹالنا چاہا۔

''بتائیں نا، بتانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' میرے دلائل سے وہ ہمیشہ ہی ہار جاتی تھیں۔

''آج ثنا سے عارفین کے متعلق بات ہوئی تھی۔ ثنا کہتی ہے عارفین کو بھول جاؤ۔'' کہتے کہتے وہ سسک اٹھیں۔

''وجہ کیا بتائی ثنا باجی نے؟'' میں پھر تفتیشی افسر بن بیٹھی۔

''وہ کہہ رہی تھیں عارفین ہمارا ہی ہم عمر ہے، فائنل پروف کے بعد ایک سال تک وہ ہاؤس جاب کرے گا۔ آج کے دور میں بندہ جب تک اسپیشلائزیشن نہ کرے اسے اتنی تنخواہ نہیں ملتی کہ وہ ایک فیملی پل اون کر سکے اس کے علاوہ عارفین بڑا بیٹا ہے اس کے پیرنٹس کا خیال ہے پہلے وہ بیٹی کے ہاتھ پیلے کریں گے پھر عارفین کا سوچیں گے۔''

''تب تک تو آپ بھی 26۔27 سال کی ہو جائیں گی۔'' میں نے خوانخواہ حساب لگا کر بتایا۔

''ہوں......'' وہ جیسے نحیف آواز میں اتنا ہی کہہ سکیں۔ مجھے آپا پر ترس آنے لگا وہ اور عارفین اولیول سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔ بچپن کی محبت بڑھتے بڑھتے یقیناً جنون بن چکی تھی مگر عارفین ابھی اس قابل نہیں تھا کہ وہ ماں باپ کو مجبور کر سکے۔ وہ اپنے ماں باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ مجھے عارفین سے یہی اختلاف تھا اس میں جرات نہیں تھی ہمت نہیں تھی تو وہ محبت کیوں کرنے لگا تھا ایک مجبور اور نالائق شخص۔

امی کا ہاؤس جاب ختم ہو گیا تھا۔ آپا کا فائنل ایئر چل رہا تھا۔ ان کے بیچ کی تقریباً تمام لڑکیوں کی منگنیاں ہونے لگی تھیں۔ روز ہی آپا کو نت نئے کپڑے بنانے کا جنون سا ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں...... تقریباً سب کی منگنی ہو رہی تھی۔ ایک دن یونہی جیسے امی کو کوئی بھولی بسری بات یاد آگئی۔

''ارے، وہ عارفین کی امی کا فون تو نہیں آیا تھا؟'' اچانک ہی وہ پوچھنے لگیں۔

''نہیں امی کوئی فون نہیں آیا۔'' آپا کی مشکل میں نے آسان کر دی امی کو جواب دے کر۔

''کیوں برکہ؟'' وہ براہِ راست آپا سے مخاطب ہوئیں۔

''وہ عارفین نے کہا تو تھا مگر......!''

''اس کی امی نہیں مانیں۔'' امی نے آپا کا

جواب مکمل کر دیا۔

''سنو بیٹا چھوڑو عارفین کو' ان تلوں میں تیل نہیں، بہت سے لوگ آنا چاہ رہے ہیں مگر میں انہیں ٹال رہی ہوں' اب مجھے کسی نہ کسی کو تو منتخب کرنا ہی ہوگا۔'' امی نے یک دم فیصلہ سنا دیا۔

''ابھی نہیں امی......'' آپا کی آنکھیں برسنے کو تیار ہو گئیں۔

''پھر کب؟'' امی نے استفسار کیا۔

''میں عارفین سے بات کر کے آپ کو جواب دوں گی۔''

''اوکے مگر جلدی......'' امی اٹھ کر چلی گئیں۔

آپا کے چہرے پر' ان کی آنکھوں میں ایک ان کہا سا دکھ لکھا تھا۔ میرا دل دکھ کر رہ گیا۔

آپا بہت سادہ لوح بہت سیدھی اور سچی تھیں' وہ کچھ چھپا ہی نہیں سکتی تھیں ان کا چہرہ ایک کھلی کتاب تھا۔

وہ شام بڑی اداس سی تھی۔ ابا فون پر مسلسل پھپو اماں سے بات کر رہے تھے۔ جانے وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ ابا ''جی بہتر'' ''جیسے آپ کہیں'' کہے جا رہے تھے۔ اگلے دن وہ آفس سے جلدی آگئے۔ ڈرائیور سے لینڈ کروزر کو خوب صاف کروایا پھر ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔

''ابا ائرپورٹ کسی کو لینے گئے ہیں؟'' مجھے بالخصوص تشویش تھی۔

''ان کے کوئی مہمان آرہے ہیں۔'' امی نے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا۔ رات کو گیارہ، بارہ بجے ابا لوٹے تو ان کے ساتھ ایک بہت ہی ڈیشنگ پرسنالٹی والے کوئی مہمان تھے۔ اونچے، لمبے گورے چٹے۔ بے حد خوب صورت...... ابا انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ امی بھی وہیں چلی گئیں پھر ہم سب کو بلوایا گیا۔ آخر میں جھجکتی سی حیران سی آپا اندر آئیں۔

''یہ عازب ہیں برکہ اور عازب یہ ہماری بیٹی برکہ۔'' ابا نے تعارف کروایا پھر بہانے سے باہر چلے گئے۔ عازب بھائی بڑی دلچسپی سے آپا کو دیکھ رہے تھے پھر وہ ان سے باتیں کرنے لگے۔ امی بھی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ چھوٹی نے صاف کہہ دیا۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ اب ڈرائنگ روم میں آپا، ماہا اور میں رہ گئے تھے۔ عازب بھائی مسلسل انگلش میں آپا سے باتیں کر رہے تھے تبھی ابا واپس آگئے۔ ہم تینوں وہاں سے اٹھ آئے۔ امی لاؤنج میں تھیں' ہم تینوں کو دیکھتے ہی پاس بلا لیا۔

''کیسا لگا عازب؟''

''اچھے ہیں۔'' ہم تینوں نے بیک زبان کہا۔

''یہ امریکا سے آئے ہیں، تمہاری پھوپی اماں نے انہیں یہاں بھیجا ہے۔ سوفٹ ویئر انجینئر ہیں، دو ہی بھائی ہیں، یہ بڑے ہیں ساری فیملی امریکا میں سیٹلڈ ہے اگر ہم انہیں اور وہ ہمیں پسند آگئے تو برکہ کے رشتے کی بات آگے چلے گی۔''

''امی!'' آپا کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا وہ ہولے ہولے کانپنے لگی تھیں۔ میں بغور ان کا جائزہ لے رہی تھی۔

''امی آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' میں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

''تمہاری پھوپی اماں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں آناً فاناً۔'' امی ذرا بھی پریشان نہیں تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں ہمیشہ سے جانتی تھیں کہ آپا' عارفین کے لیے بہت زیادہ سیریس تھیں۔ پھر یہ سب اتنا اچانک کیوں ہو گیا، کیسے ہو گیا، میں سخت الجھ گئی۔ پھر ابا نے امی کو ڈرائنگ روم میں بلایا۔ دونوں پورچ تک انہیں خدا حافظ کہنے گئے۔ ڈرائیور عازب بھائی کو ان کے ماموں کے یہاں ڈراپ کرنے چلا گیا...... ہم لوگ ابھی لاؤنج ہی میں تھے کہ ابا اور امی وہیں آگئے۔ ابا

کافی خوش دکھائی دے رہے تھے۔

”میں عازب کو ائر پورٹ سے سیدھا ہوٹل لے گیا تھا ڈنر کے لیے تاکہ اسے دیکھوں، بات چیت کروں اگر مناسب لگا تو گھر لاؤں گا ورنہ وہیں سے خدا حافظ کہہ دوں گا۔“ ابا نے سگریٹ سلگالی تھی۔ امی بھی عازب کی پرسنالٹی سے کافی متاثر لگتی تھیں۔ مجھے اپنی امی کی کبھی سمجھ نہیں آسکی۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے کیسے عازب کو گھر بلا بیٹھی تھیں۔ وہ ماں تھیں انہیں آپا کے دل کا حال معلوم تھا پھر یہ سب کیا تھا۔ آپا بارش میں بھیگی چڑیا کے مانند ادھر اُدھر جیسے ڈولتی ہوئی سی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”آپا، عارفین کیا کہتا ہے اب۔“ میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

”وہ روز یہی کہتا ہے کہ اپنے پیرنٹس سے بات کرے گا۔“

”پتا نہیں کب بات کرے گا اگر ابا نے کوئی فیصلہ کردیا تو......“ میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ابا اتنے ظالم نہیں ہوسکتے۔“ آپا نے انگریزی میں کہا۔

اس رات آپا بہت دیر تک کروٹیں بدلتی رہیں۔ صبح میں نے دیکھا وہ سوجی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ تیار ہو کر کالج جارہی تھیں۔ وہاں انہوں نے اپنے سارے بیچ کو بتایا کہ کوئی پروپوزل آیا ہے۔ سب نے مبارک باد دی۔

”وہ تم سے سیریس نہیں ہے برکہ وہ صرف ٹائم پاس کررہا تھا۔“ سب کی متفقہ رائے تھی۔ اس دن آپا عارفین سے سخت ناراض و نالاں تھیں۔

”برکہ تمہیں عازب کیسا لگا؟“ امی نے پوچھا۔

”اچھا ہے۔“ برکہ کا جوب تھا۔

اگلے ہی دن عازب کے ماں باپ نے، ابا کو فون کر کے رشتہ مانگ لیا۔ عازب لوگ اپنے ہی تھے۔ اپنا ہی خاندان نہ ذات پات کا مسئلہ، نہ زبان نہ فرقہ، کوئی پرابلم تھی ہی نہیں۔ پھوپی اماں نے انہیں بھیجا تھا اور عازب بھائی تو آپا کو ایک نظر دیکھتے ہی لٹو ہوگئے۔ سب کچھ اتنی جلدی اتنی تیزی سے ہورہا تھا کہ ایک خواب سا لگتا تھا۔ بہت جلد عازب بھائی کے اماں، ابا امریکا سے آگئے۔ وہ لوگ آپا کے لیے اینگیج منٹ رِنگ، جوڑے اور جوتے، ساتھ ہی ڈائمنڈ کا سیٹ لائے تھے۔ آپا کو سب کچھ بہت پسند آیا تھا۔ ہم سب کے کپڑے بن رہے تھے۔ آپا غالباً عارفین سے ناراض تھیں اب نہ تو وہ موبائل پر کسی سے میسجنگ کرتی تھیں نہ چپکے چپکے باتیں کرتی تھیں۔ عارفین نے ان کا دل توڑ دیا تھا۔ شیشے سے بھی زیادہ نازک دل...... جس پر کہیں بچپن ہی میں عارفین کی شبیہہ ابھر آئی تھی۔

میں عام طور پر آپا سے ناراض سی رہتی تھی۔ مجھے ان کی عارفین سے دوستی ناپسند تھی گوکہ میں کبھی کھل کر ان سے اس موضوع پر بات نہیں کرسکی تھی۔ وہ میری ناراضی سے میری خاموشی سے میری سنجیدگی سے خائف سی رہتی تھیں۔ اب مجھے ان سے ہمدردی ہورہی تھی، ترس آرہا تھا، دکھ ہورہا تھا وہ عارفین سے ناراض تھیں اس حد تک ناراض کہ ابا نے عازب بھائی کو ہاں کردی اور انہوں نے کوئی احتجاج نہیں کیا چپ چاپ سب کچھ سہہ گئیں۔ وہ ابا کی انتہائی لاڈلی تھیں اگر عارفین کے والدین کی طرف سے کوئی پیش رفت ہوتی تو شاید ابا، آپا کی یہ فرمائش بھی پوری کردیتے۔

بہت دھوم دھام سے منگنی کی رسم ادا ہوئی۔ دلہن بن کر وہ اس قدر حسین لگ رہی تھیں کہ میں نے نظر ہٹالی کہیں پیاری سی آپا کو نظر نہ لگ جائے میری۔

بہت سی تصویریں بنیں کھانا ہوا رشتے دار احباب سب آئے آپا کو بہت سراہا گیا بہت سی دعائیں دی گئیں۔ آپا بظاہر ہنس رہی تھیں، مسکرا رہی تھیں مگر آنکھوں میں ایک انجانا سا دکھ ایک ان کہی غم کی کہانی

لکھی تھی، جانے کیوں میرا دل بھر آیا۔ عارفین پر سخت غصہ آیا۔ اسے میں نے آپا کے کالج کے ایک فنکشن میں دیکھا تھا درمیانہ سا قد، سانولا رنگ، مجھے وہ ذرا بھی امپریسو نہیں لگا تھا اس کے مقابلے میں عازب بھائی حد درجہ حسین تھے۔ آپا کے مقابلے کے تھے مگر آپا اداس تھیں میرا دل بھی اداس تھا۔ ہماری امی تو شاید جذبات اور احساسات سے عاری تھیں یا پھر انہوں نے آپا اور عارفین کی دوستی جو یقیناً پیار میں بدل چکی تھی اسے سیریس لیا ہی نہیں تھا۔ ہماری امی ذرا بھی گہری نہیں تھیں، بہت ہنسوڑ، بہت بے پرواسی تھیں۔ انہوں نے آپا سے خود کہا تھا کہ عارفین سے کہو اپنے پیرنٹس کو بھیجے۔ اس کے بعد پھر کبھی انہوں نے پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ وہ کیوں نہیں آئے یا کوئی اور بات۔ انہوں نے اس بات کو یکسر ذہن و دل سے جھٹک دیا تھا وہ بات جو آپا کے دل پر لکھی تھی لیکن آپا نے بھی تو کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔ نہ روئیں نہ پیٹیں بس چپ کرکے اماں، ابا کا فیصلہ مان لیا۔

رسم منگنی کے بعد عازب بھائی اور ان کے پیرنٹس واپس امریکا سدھار گئے۔ بہت دن تک اسی شاندار فنکشن کی دھوم رہی آہستہ آہستہ سب کچھ معمول پر آگیا۔ آپا بہت کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھیں۔ ان کی چپ سے مجھے ہول آتا تھا۔ ایک دن وہ کالج سے آئیں تو بہت زیادہ اپ سیٹ لگ رہی تھیں میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

”وہ عارفین نے اپنے پیرنٹس سے بات کرلی ہے فائنل پروف کے بعد وہ انہیں بھیجے گا۔“

”اب...... جبکہ آپ کی منگنی ہوچکی ہے۔“ میں کانپ سی گئی۔

”ہاں، وہ کہتا ہے میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا تھوڑی دیر ہوگئی تو کیا۔“

”آپ نے اسے بتایا نہیں کہ آپ اب انگیجڈ ہیں۔“

”وہ جانتا ہے۔ اس کے باوجود......“ آپا چپ ہوگئیں مگر آنکھیں برستی جارہی تھیں وہ انگلی میں جگمگاتی ہیرے کی انگوٹھی کو بے قراری سے گھماتی جارہی تھیں، آنسو برستے جارہے تھے۔

اس دن ہم سب شام کی چائے پر اکٹھے تھے۔ خانساماں نے ماہا کی فرمائش پر پزا بیک کیا تھا۔ ابا شام کی چائے پر کبھی کبھار ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ ہم چاروں بہنیں اور امی...... امی کے قہقہے حسب معمول عروج پر تھے۔ کوئی انجان شخص ہم سب کو اکٹھا ہنستے بولتے دیکھ کر ہرگز نہیں سمجھ سکتا تھا کہ امی ہماری ماں ہیں۔ وہ یہی سمجھتا کہ شاید ہماری بڑی بہن ہیں۔ اچانک ہی امی نے آپا کا ہاتھ تھام لیا۔

”یہ ڈائمنڈ رنگ کتنی خوب صورت ہے نا، عارفین بھلا ایسی انگوٹھی لاسکتا تھا۔“ عارفین کے اس بے وقت ذکر پر میں بری طرح چونکی آپا کی حیرت اس سے سوا تھی۔ امی کو قطعاً احساس نہیں تھا وہ کیا کہہ گئی

آمد بہار

پھر کسی نے مجھے یاد کیا ہے شاید
میرے آنگن کی بیلوں پر بہار آئی ہے

ہر دریچے میں میرے رات کی رانی مہکی
تم اگر آؤ تو جانوں کہ بہار آئی ہے

میری سیڑھی پہ رکھے گملوں میں مہک جاگی ہے
پھر در و بام پہ چپکے سے بہار آئی ہے

میرے دل میں بھی شگوفے سے مہک اٹھے ہیں
تم چلے آؤ کہ گلشن میں بہار آئی ہے

شاعرہ: نزہت جبیں ضیا، کراچی

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

ہیں۔ آپا کی سیاہ آنکھیں برسنے لگی تھیں۔

''کیا ہوا برکہ؟'' امی حیران ہوئیں۔

''آپ جانتی تھیں، ہمیشہ سے جانتی تھیں پھر آپ نے ابا سے عارفین کا ذکر تک نہیں کیا۔ آپ نے بہت برا کیا امی، بہت برا کیا۔'' روتے روتے آپا کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ ٹوٹ کر روئیں، تب شاید امی کو احساس ہوا۔ وہ بری طرح چونکیں۔

''آئی ایم سوری برکہ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔''

''آپ ایک بار ابا سے کہہ کر تو دیکھتیں شاید وہ مان جاتے......'' آپا کی آواز میں ان کے انداز میں کیا تھا...ایسا کیا تھا کہ میری آنکھیں بھی ساون بھادوں لٹانے لگیں۔ امی حیران تھیں۔

''مجھ سے بڑی بھول ہوگئی۔ برکہ، مجھے تمہارے ابا سے بات کرنی چاہیے تھی۔'' وہ متاسف سی بیٹھی تھیں۔ آپا جانے کب سے اس غم کو اس دکھ کو جھیل رہی تھیں۔ عارفین سے وقتی ناراضی کے تحت وہ عازب کی انگوٹھی پہن بیٹھی تھیں مگر اب آنسوؤں کی برسات نے ان کے تن من کو بھگو دیا تھا۔ شام بے حد اداس ہو گئی تھی۔ ہم لوگ بوجھل دلوں کے ساتھ اُٹھ گئے مگر میں نوٹ کر رہی تھی امی اُس دن کے بعد... بجھ سی گئی تھیں، ان کے بلند و بانگ قہقہے اب کہیں سنائی نہیں دیتے تھے وہ شاید پچھتاوے کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھیں۔

اس رات مجھے دیر تک پڑھنا تھا، آپا کی نیند خراب ہونے کے خیال سے میں کتابیں لے کر لاؤنج میں چلی آئی وہاں ابا ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ امی مضطرب سی ان کے پاس بیٹھی تھیں چپ چپ سی پھر اچانک وہ سیدھی ہو بیٹھیں اور آہستہ آہستہ ابا سے جانے کیا کہنے لگیں۔ ابا نے یک دم ٹی وی بند کر کے ریموٹ میز پر رکھ دیا۔

''تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے سارہ...... یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی تم نے بہت برا کیا ہے سارہ......'' ابا اپنے غصے کو کنٹرول میں رکھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ میں نہ چاہتے ہوئے سب کچھ سن رہی تھی۔ جلد ہی ابا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ امی بھی پیچھے ہی چلی گئیں، مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ میں بے مقصد کتابیں کھنگالتی رہی۔

اگلی شام ابا جلدی گھر آ گئے۔ پہلے اپنے کمرے میں گئے پھر چینج کر کے لاؤنج میں آ بیٹھے اور سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے رہے۔

''برکہ کو میرے کمرے میں بھیجو۔'' مجھ سے کہا تو میں نے آپا کو بتا دیا۔ آپا حیران سی ان کے کمرے میں چلی گئیں۔

''بیٹا اگر تمہاری کہیں انڈر اسٹینڈنگ تھی تو مجھ سے کہا ہوتا۔'' ابا کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ آپا یک دم اٹھ کر ابا کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ابا نے پیار سے ان کا سر تھپتھپایا۔

''رو نہیں برکہ مجھ سے کہو جو تمہارے دل میں ہے۔ سب کچھ کہہ دو، صاف صاف۔''

''لیکن ابا آپ کو تو عازب پسند ہے نا۔'' آپا ہچکیوں کے دوران بولیں۔

''مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی برکہ بیٹے، مجھے عازب لوگوں کو ہاں کرنے سے پہلے تم سے پوچھنا چاہیے تھا۔''

''مجھے بھی یہی دکھ ہے ابا، آپ نے مجھ سے پوچھا نہیں صرف بتایا۔'' آپا آج بول رہی تھیں۔ ابا کے چہرے پر تاسف صاف نظر آ رہا تھا۔ میں کب سے لاؤنج میں کھلنے والی ابا کے بیڈروم کی کھڑکی جس کا پردہ قدرے ہٹا ہوا تھا اندر کا سارا منظر دیکھ اور سن رہی تھی۔

''ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا میرے بچے میں عازب لوگوں کو انکار کر دیتا ہوں۔'' ابا بہت زیادہ پریشا

www.Paksociety.com

تھے، دکھ ان کے چہرے سے ہویدا تھا۔ مجھے ابا کی حالت دیکھ کر بھی دکھ ہو رہا تھا اور آپا کی ہچکیاں اور سسکیاں بھی مجھے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈبو رہی تھیں۔

"تم اس لڑکے سے کہو اپنے پیرنٹس کو ہمارے گھر بھیجے۔"

"نہیں ابا اب جو کچھ ہو گیا ہے وہ مجھے قبول ہے، میں سارے خاندان کے سامنے آپ کو رسوا نہیں ہونے دوں گی۔" آپا کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گئی۔ کتنا گولڈن چانس وہ مس کر رہی تھیں، ابا نے خود ان سے کہا تھا کہ عازب لوگوں کو جواب دے دیں گے پھر آپا کو کیا مصیبت آئی تھی، وہ یہ کیا کہہ رہی تھیں۔ میں حیرت کے بحرِ زخار میں گم تھی۔

"اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دو بیٹا، میں نہیں چاہتا کہ تم کوئی پچھتاوا پال لو۔" ابا کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

"نہیں ابا، آپ کی پسند میری پسند ہے جو آپ نے کر دیا مجھے منظور ہے، قبول ہے۔"

میں نے پہلی دفعہ دیکھا ابا رو رہے تھے۔ انہوں نے آپا کا سر سینے سے لگا لیا تھا۔ دونوں باپ بیٹی بے تحاشا آنسو بہا رہے تھے۔

رات کو جب ہم دونوں سونے کے لیے کمرے میں آئے تو میں نے آپا سے پوچھا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟"

"ابا میری خوشی کی خاطر سب کچھ ختم کرنے کو تیار تھے کیا میں ابا کی خوشی کی خاطر عارفین کو نہیں بھول سکتی۔" آپا کی آنکھیں برس رہی تھیں لیکن لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں جو ساری زندگی خود کو آپا سے برتر سمجھتی رہی، انہیں حقارت سے دیکھتی رہی آج ایک بار پھر ہار گئی۔ آپا حسبِ معمول پھر اونچی مسند پر جا بیٹھی تھیں۔

"اگر عارفین نے اپنے پیرنٹس کو بھیج دیا پھر؟" میں نے انہیں ڈرایا۔

"نہیں، وہ نہیں آئیں گے میں منع کر دوں گی۔ امی نے کہا تھا عارفین کو اسٹیبلش ہونے میں بہت وقت لگے گا اور مجھے تم سے جلد فارغ ہونے کے بعد باقی تین بیٹیوں کا بھی سوچنا ہے۔" آپا کتنی سمجھدار کتنی گہری نکلیں۔ میں جو انہیں اپنے طرزِ عمل سے ہمیشہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ غلط ہیں، عارفین سے دوستی غلط ہے، آج قربانی کے کس درجے پر فائز ہو گئی تھیں جہاں شاید میں نہ پہنچ پاتی۔ دھیرے دھیرے آپا کی زندگی سے عارفین کا ذکر ختم ہو گیا۔ فائنل پروف کا رزلٹ آ گیا تھا۔ آپا نے حسبِ معمول حسبِ سابق شاندار کامیابی حاصل کی اور کچھ ہی عرصے بعد ہاؤس جاب میں جت گئیں۔ پتا بھی نہیں چلا ایک سال گزر گیا۔ عازب بھائی لوگ پاکستان آ گئے۔ شادی کا پنڈال سجا اور آپا چپکے سے پیا دیس سدھار گئیں۔ صرف مجھے پتا تھا وہ دلہن بن کر کتنی حسین لگ رہی تھیں مگر آنکھوں میں چھپی وہ حسرت وہ غم وہ کچھ کھو دینے کا دکھ انہیں اور بھی حسین بنا رہا تھا۔ جلد ہی آپا امریکا سدھار گئیں گھر یک دم سے خالی خالی لگنے لگا۔

مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد میں نے اپنا کمرا سیٹ کیا، الماریاں خالی کیں۔ آپا کے خانے میں کپڑوں کے نیچے چھپائے گئے عارفین کے سارے گفٹس اسی احتیاط سے رکھے تھے۔ پتا نہیں کیوں میرا دل بھر آیا۔ میں نے ان سارے گفٹس کو ویسے ہی رہنے دیا۔

"آپا آپ جہاں بھی رہیں خوش رہیں، شاد و آباد رہیں۔ عازب بھائی کے دل پر راج کریں۔" میں نے دل کی گہرائیوں سے آپا کے لیے دعا مانگی۔ پتا نہیں اس دنیا میں ایسی کتنی ادھوری محبتیں ہوں گی جو پروان نہیں چڑھ سکیں... بیچ راستے میں دم توڑ گئیں، دلوں کے بھید دلوں میں رہ گئے، پنچھی اُڑ گئے جانے کدھر کو۔

دُرِ نایاب

سکینہ فرخ

اماں نے یاسر کی شادی کے لیے دیکھی جانے والی بارھویں لڑکی بھی بڑے آرام سے ریجیکٹ کر دی۔ ثمن اور ثمرہ دونوں ہی کو پوری امید تھی کہ اماں اس بار بھی یہی کریں گی البتہ یاسر کی امید ہر بار بنتی اور ہر بار ٹوٹتی۔

ابا بے چارے سدا کے "تین میں نہ تیرہ میں۔" اماں کے معاملات میں دخل اندازی انہیں ہر بار مہنگی پڑتی تھی سو کئی سالوں سے یہ کام انہوں نے قطعی ترک

www.paksociety.com

کردیا تھا۔ ثمن اور ثمرہ کی دفعہ تو پہلے پہل آئے ہوئے رشتوں ہی پر ہاں کردی گئی تھی مگر یاسر...... شاید اکلوتا بیٹا ہونے کے ناتے وہ بہو خوب چھان پھٹک کے لانا چاہتی تھیں۔ خاندان کی بچیوں کو تو وہ پہلے ہی ہری جھنڈی دکھا چکی تھیں پھر ثمن اور ثمرہ کے سسرالیوں کی ”امیدیں“ توڑتی ہوئی گلی محلے کی خاک چھاننے کے بعد شادی دفتر کی بھی ہوا کھا آئیں مگر وہ گوہر نایاب نہ ملنا تھا نہ ملا۔ کسی کا قد چھوٹا، کسی کا رنگ سانولا تو کسی کے گھر بار میں کوئی نقص، کسی کے بہن، بھائیوں کی تعداد بہت زیادہ، کوئی حد سے زیادہ فیشن ایبل تو کوئی تیز طرار۔ انہیں تو وہ معصوم، سیدھی، اللہ میاں کی گائے جو شکل، صورت میں بھی لاجواب ہو، جس کے ابا کے مالی حالات بہت اچھے ہوں مگر اس کے بہن بھائیوں کی تعداد مختصر ہو، سگھڑ بھی ہو، تعلیم یافتہ بھی اور اس کی عمر بھی بیس بائیس سے زیادہ نہ ہو، وہ ابھی تک نظر نہیں آسکی تھی۔ لڑکیوں میں مندرجہ بالا خصوصیات میں سے تین چار خصوصیات تو مل رہی تھیں مگر تمام کی تمام موجود نہ ہونے پر وہ آرام سے ریجیکٹ ہوجاتیں۔

یاسر نے بہ مشکل رو پیٹ کر بی اے کرلیا تھا۔ ابا کا چلتا ہوا جنرل اسٹور تھا، وہ کئی سالوں سے انہی کے ساتھ اسٹور پر بیٹھا کرتا تھا اور کاروباری اسرار و رموز سمجھ رہا تھا، پھر اس کے ذہن میں نیا آئیڈیا آیا۔ اب خواتین جنرل اسٹورز کی جگہ سپر اسٹورز سے خریداری کرنا زیادہ پسند کرتی تھیں۔ سپر اسٹور کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ لوگ خریدنے تو چار چیزیں آتے تھے مگر وہاں سجی ہوئی بے شمار ملکی و غیر ملکی اشیا دیکھ کر بغیر کسی ضرورت کے چار چیزیں اور خرید کے لے جاتے تھے۔ گویا فائدہ ہی فائدہ۔ اس نے تھوڑی سی محنت کے بعد ابا کو اس بات پر راضی کرلیا۔ ساری جمع پونجی اور کچھ قرض ادھار لینے کے بعد وہ ایک چھوٹا موٹا سپر اسٹور بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ چاہے اندر چلنے کی بھی جگہ نہ ہو مگر ٹرالیاں سجادی گئیں، سامان بھر دیا گیا، باہر سے شو شا بھی ٹھیک تھی اور نام بھی اچھا سا رکھ دیا گیا، گاہکوں کو تو آنا ہی تھا۔ سیل پروموشن کے بھی سارے گُر اسے آتے تھے اس لیے سیل بھی دھڑا دھڑ شروع ہوگئی۔ چار پیسے زیادہ آئے تو اماں کو بیٹے میں مزید چار چاند لگتے ہوئے محسوس ہونے لگے اور ہمہ صفت موصوف کی بہو کی تلاش کا کام زور شور سے شروع ہوگیا۔ ان کو جونہی کہیں اچھی لڑکی کا پتا چلتا وہ بیٹیوں کو بلا بھیجتیں۔ کبھی ثمن تو کبھی ثمرہ اور کبھی دونوں کو ماں کے ہمراہ جانا پڑتا اور پھر منہ لٹکا کے واپس آنا پڑتا۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں اکلوتے بھائی کی شادی کی چاہ نہیں تھی مگر اس طرح گھر گھر جھانکنا انہیں پسند نہیں تھا اور نہ ہی ہر دس بارہ دن کے بعد اپنا گھر چھوڑ کے ساسوں اور میاؤں کی تیوریاں گنتے ہوئے میکے آنا ان کے لیے اتنا آسان تھا۔ وہ دونوں گھبرا گئیں مگر اماں کو کون سمجھاتا؟

یاسر نے جب سے پوش علاقے میں یہ سپر اسٹور کھولا تھا خود اس کے اپنے طور طریقوں میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ جدید تراش خراش کے لباس استعمال کرنے لگا تھا۔ شکل، صورت تو پہلے ہی اچھی تھی۔ اچھے دوستوں میں رہنے سے اس کی شخصیت اور نکھر گئی تھی۔ تعلیم تو زیادہ نہیں تھی صرف گریجویٹ ہی تھا کہ اسے پڑھنے لکھنے کا کبھی بھی شوق نہیں رہا مگر پڑھے لکھے اور اچھی فیملی کے لڑکوں کو دوست بنانے کے بعد ان کے ساتھ اسے اٹھنا بیٹھنا بھی آگیا تھا۔ کھلا پیسا آیا تو پرانے علاقے سے رہائش بھی پوش علاقے میں منتقل ہوگئی۔ ایک عدد کار مع ڈرائیور کے گھر پر موجود رہتی دوسری اس کے اپنے استعمال میں تھی۔ حالات میں کافی بہتری آگئی تھی، یہ سب دیکھ کر ابا میاں نے سکھ کی سانس لی اور از خود ریٹائرمنٹ لے لی۔ انہیں یاسر پر پورا بھروسا تھا کہ وہ اب ان کے بغیر

بھی سب کچھ سنبھال سکتا ہے۔

یاسر کی زندگی میں کامیابیاں تھیں، خوشیاں تھیں، پیسا تھا مگر کمی تھی تو گھر والی کی۔ اس کے سارے دوست شادی شدہ اور بال بچوں والے ہوچکے تھے اور وہ خود ابھی تک کنوارا تھا۔ اسے سب چھیڑتے تو وہ اندر ہی اندر شرمندہ ہوجاتا مگر ماں سے کیا کہتا......؟ اسے ماں سے محبت بھی تھی اور ماں پہ اعتماد بھی۔ وہ اس کا بھلا ہی سوچیں گی، یہ یقین بھی تھا...... بس انتظار ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”دُرِّ نایاب...... دُر...... ارے بھئی کہاں ہو تم......“ اماں جھنجلا کے پوری قوت سے چلائیں حالانکہ اس ڈیڑھ بالشت کے مکان میں اتنی زوردار آواز کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ ان کی یہ پکار یقیناً آگے پیچھے دائیں بائیں کے آٹھ مزید گھروں میں ضرور سنی گئی ہوگی...... مگر وہ دُرِّ نایاب ہی کیا جو اماں کی پکار کا فوری جواب دے دے ہر بار اس کے پاس ایک نیا بہانہ ہوتا تھا۔

”اماں میں سو رہی تھی...... باتھ روم میں تھی...... کانوں پہ ایئر فون لگایا ہوا تھا۔“ وغیرہ وغیرہ چند سال پہلے تک تو اماں اسے تیسری پکار پہ بھی جواب نہیں دینے پر بڑی بے تکلفی سے دو ہاتھ جڑ دیا کرتی تھیں مگر پھر اس کے لمبے ہوتے ہوئے قد کو دیکھ کر انہیں لحاظ آجاتا اور اگر کسی کو کسی بات کا لحاظ نہ آتا تو وہ دُرِّ نایاب تھی۔ دُرِّ نایاب کی شخصیت میں اگر کوئی چیز اچھی تھی تو وہ اس کی شکل صورت تھی جس میں کم از کم درنایاب کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ یہ قدرت کی فیاضی تھی اور کچھ اس کی خوش قسمتی! اماں گوری تھیں مگر قد چھوٹا تھا، ابا سانولے تھے مگر لمبے قد کے تھے۔ اماں کے بال بہت لمبے اور گھنے تھے تو ابا کے خاندان میں گنج پن کا مرض۔ اماں کے نین نقش قدرے موٹے تھے تو ابا کے انتہائی ستواں اور خوب صورت۔ بس دُرِّ نایاب بی بی نے رنگ اماں کا تو قد ابا کا، بال اماں کے تو نین نقش ابا کے لے لیے۔ دونوں اطراف کی ساری خوب صورتیاں اس میں اکٹھا ہوگئیں اور بن گئیں ”دُرِّ نایاب۔“ البتہ مزاج میں مار کھا گئیں۔ کاہلی، سستی، نکما پن اور بے پروائی خدا جانے اس کی فطرت کا حصہ کیسے بن گئی......؟ ماں باپ میں سے دونوں ہی ایسے نہ تھے۔ اماں سوچ سوچ کے حیران ہوتیں۔

ان کے گھر میں غربت تھی مگر عزت تھی۔ ابا گو پڑھے لکھے تھے، سرکاری ملازم تھے اور حق حلال پہ یقین رکھتے تھے۔ اماں کا سلیقہ سارے خاندان میں مشہور تھا۔ چھوٹا سا گھر اپنا تھا وہ لوگ اسی پر شکر ادا کرتے تھے۔ اوپر تلے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں، پلی بڑھیں اور ان میں سے تین عزت کے ساتھ رخصت بھی ہوگئیں۔ جب تک دُرِّ نایاب سے بڑی عفت گھر میں موجود تھی اماں کو پتا بھی نہیں چلا کہ ٹینشن کس بلا کا نام ہے۔ انہوں نے اپنا سلیقہ بیٹیوں میں منتقل کیا۔ لڑکیوں نے تعلیم بھی حاصل کی، گھر سنبھالنا بھی سیکھا اور اس دور میں بھی اپنے اپنے جہیز کے لیے ان گنت کارآمد چیزیں خود بنائیں، کپڑے خود سیئے...... اسی بچت اور سلیقے کے ساتھ آرام سے رخصت بھی ہوگئیں۔ بہنوں کے سائے میں دُرِّ نایاب ایسی چھپی رہی کہ اماں کی نگاہوں میں نہ آسکی۔ عفت کے رخصت ہوتے ہی درنایاب کے جوہر کھل کے سامنے آگئے اور اماں نے اپنا سر پیٹ لیا کہ ان سے چوک کب اور کہاں ہوئی؟

وہ بے چاری جوڑوں کی مریضہ تھیں۔ کچھ سالوں سے بیٹیوں نے انہیں پلنگ پر بٹھا دیا تھا...... اور اب ان کے جانے کے بعد اماں ہی کو مجبوراً اٹھنا پڑتا کہ درنایاب تو خیر سے نہ پکانا جانتی تھی اور نہ ہی چاہتی تھی...... البتہ کھانے کا خوب شوق تھا...... دوسرا

شوق اسے گانے سننے کا تھا اور تیسرا سونے کا......
اماں پہ اس کے شوق کے اسرار کھلے وہ دل تھام کے رہ گئیں۔ تینوں بڑی بہنوں نے چھوٹی کی محبت میں اس کا ٹھیک ٹھاک بیڑا غرق کر دیا تھا اور یہ بات اماں سے پوشیدہ رکھی گئی تھی کہ اس کے حصے کے کام بھی وہی کر دیا کرتی تھیں۔ اماں کو ان پر بڑا غصہ آیا...... چھوٹی، پیاری، گڑیا، رانی، شہزادی آپاؤں کی راج دلاری کو اب سیدھے راستے پر لانا بہت ہی مشکل کام تھا اور یہ مشکل کام کرنے کا انہوں نے بیڑا اٹھالیا۔ وہ جتنا بدکتی اماں اتنا ہی اس کے سر پر سوار رہتیں۔ علی الصباح اسے جگا دیتیں...... اس نے سوسو مصیبتیں جھیلنے کے بعد پچھلے سال ہی بی ایس سی پاس کیا تھا اور کالج ختم ہونے کی سب سے زیادہ خوشی اسی بات کی تھی کہ اب اسے دیر تک سونے کو ملے گا مگر اماں......؟ اس کے بعد اس کے سر پر کھڑے ہو کے سارا کھانا پکواتیں، ابا کے کپڑے استری کرواتیں پھر اسے سلائی سکھانے پاس بٹھا لیتیں۔

درنایاب کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ صبح شام بس ایک ہی دعا مانگتی......اے اللہ میری شادی کروادے۔ یہ نہیں تھا کہ اس کا کوئی رشتہ نہیں آرہا تھا اس کے تو بے شمار رشتے موجود تھے مگر ایک تو اس کا نمبر بہنوں میں سب سے آخری تھا سو اماں کو اس کی باری کا انتظار کرنا تھا پھر عفت کی شادی کے بعد جب وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں تو اس کا لاابالی پن دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ایسی بیٹی کو رخصت کرنا انہیں مستقبل میں اپنے ہی لیے وبال نظر آرہا تھا۔ عشرت، راحت اور عفت تو اپنے اپنے سسرال اور سسرالیوں کے دلوں پر راج کر رہی تھیں۔ اپنی محبت، خلوص اور خدمت سے انہوں نے سب کے دل جیت لیے تھے۔ ہر نئی بہو کے لیے سسرال میں شروع کے دو تین سال ضرور مشکل ہوتے ہیں لیکن جو بھی اپنی سمجھداری سے یہ دو تین سال بخوبی گزار لیتی ہیں باقی کی ساری زندگی ان کی اپنی ہوتی ہے......سو اماں تن من دھن سے اسے سدھارنے میں لگ گئیں اور وہ سدھرنے کو تیار نہیں سو ایک کھینچا تانی والا معاملہ پیدا ہو گیا۔

ابا درمیان میں ریفری کا کردار بخوبی نبھاتے۔ کبھی اماں کو اکیلے میں سمجھاتے تو کبھی لاڈلی بیٹی کو دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتے اور تو اور اب تو بہنوں نے بھی اسے روکنا ٹوکنا شروع کر دیا تھا۔ سب کی تان اسی پر آکے ٹوٹتی کہ تمہیں دوسرے گھر جانا ہے، نہ جانے وہاں کا ماحول کیسا ہو؟ نہ جانے شوہر کس مزاج کا ہو؟ نہ جانے ساس کس طبیعت کی ہو؟ اور اس کی تان اس بات پر ٹوٹتی۔ جو جیسا ہے بھلے سے ہو...... وہ اپنے گھر خوش اور میں اپنے گھر......

اماں کی سال بھر کی ٹریننگ کے بعد بھی نہ تو اس کی ٹیڑھی روٹیاں گول ہو پائیں اور نہ ہی سالن میں نمک مرچ کا اندازہ درست ہوا۔ ابا کی کئی قمیصیں استری سے جل گئیں اور سلائی میں سیدھی سلائی سے بات آگے نہ بڑھ پائی۔ وہی رفتار بے ڈھنگی قائم و دائم تھی۔

اماں نے ہار مان لی اور پیاری بیٹی کو یونہی رخصت کرنے کی ٹھان لی۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی اگر اسی طرح کے ماحول میں وہ مزید چند سال اور گزار لیتیں تو یہ بات یقینی تھی کہ انہیں جوڑوں کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کا عارضہ بہ آسانی لاحق ہو سکتا تھا...... اور وہ یہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے بیاہی بیٹیوں سے فوری طور پر بہن کے لیے رشتے ڈھونڈنے کا کہہ دیا اور خود منتظر ہو گئیں۔

ان کی پانچویں پکار پر درنایاب کی آواز نے ان کے کانوں میں رس گھولا۔

''جی اماں۔''

''کھانا لگا دیا ہے، کھالو۔'' انہوں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''جی اماں، کیا پکایا ہے؟'' وہ تابعداری سے بولی۔

ان کا دل چاہا کہہ دیں اپنا کلیجا مگر دل کی بات دل میں دبا کر بولیں۔ ''آلو مٹر'' اور وہ بصد شوق آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور سالن میں سے مٹر چن چن کر نکالنے لگی۔ اماں بے بسی سے اپنی خوب صورت بیٹی کو دیکھنے لگیں۔ دمکتا ہوا رنگ، بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں، ستواں ناک، لمبی چوٹی میں سے بے ترتیبی سے نکلتے ہوئے بال، شاید دو دن سے بال نہیں بنائے گئے تھے۔ تین دنوں سے پہنا ہوا ملگجا جوڑا جس پر بے پروائی سے اوڑھا گیا دوپٹا شاید کسی اور سوٹ کا تھا......ایک ہاتھ سے موبائل پر کسی کو میسج کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے کھانا کھا رہی تھی۔ نہ اسے کالج جانا ہے، نہ یہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لیتی ہے، نہ ہی اسے کسی اور چیز سلائی کڑھائی وغیرہ کا شوق ہے پھر بھی نہ نہانے کا ٹائم ہے نہ بال سنوارنے کا۔ الماری میں بے شمار کپڑے موجود تھے جو گولوں کی صورت میں اِدھر اُدھر لڑھک رہے تھے۔ جو ہاتھ لگا نکالا اور پہن لیا۔

''آخر یہ کرتی کیا ہے؟'' انہوں نے کوفت سے سوچا۔ اس کی حرکتوں سے مایوس ہو کے بے چاری اس کے جہیز کے لیے بیڈ کور کاڑھنے میں لگی تھیں پھر گھر کے دس کام اور......''یہ کب سدھرے گی؟'' ان کے دل نے کراہ کے ان سے پوچھا۔ ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

''اگر اماں اپنے دس نکات میں سے دو چار کم کر دیں تو شاید یاسر کے جوڑ کی کوئی نہ کوئی لڑکی مل جائے......'' ثمن نے فون پر ثمر سے کہا۔

''اماں کا کیا، کیا جائے، وہ تو کچھ سنتی ہی نہیں ہیں۔ اب جمال صاحب کے ہاں تو سب کچھ ٹھیک تھا...... اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے...... لڑکی کے صرف دو بھائی تھے اس نے ماسٹرز بھی کیا ہوا تھا، شکل، صورت کی بھی مناسب تھی...... اماں کو کچھ اور نہیں ملا تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر ریجیکٹ کر دیا کہ وہ شکل ہی سے تیز طرار لگ رہی ہے۔ اب بھلا اس اکیسویں صدی میں انہیں شرم و حیا سے لبریز معصوم صورت کہاں سے ملے گی۔ آج کل کی لڑکیاں اتنی میچورڈ ہو چکی ہیں کہ شکل پر سنجیدگی تو مل سکتی ہے الھڑ پن کہاں سے آئے گا۔'' ثمر بولی۔

''اور جو کم عمر ہیں وہ ظاہر ہے میٹرک یا انٹر میں ہوں گی......وہ بھی ریجیکٹ ہو جاتی ہیں۔'' ثمن نے کہا۔

''یاسر کے لیے اب اتنی کم عمر لڑکی مناسب بھی نہیں، وہ تیس کا ہو رہا ہے۔'' ثمر جلدی سے بولی۔

''ایک تو اماں کو اتنی دیر میں اس کی شادی کا خیال آیا......اوپر سے اب لڑکی بھی پسند نہیں آرہی ہے۔ نہ جانے کیا بننے والا ہے۔'' ثمن پریشانی سے بولی۔

''اماں کی ریجیکٹ شدہ لڑکیوں میں سے جتنی بھی خاندان کی تھیں سب کی تو شادیاں بھی ہو گئیں اور وہ کئی بچوں کی امائیں بھی بن گئیں۔'' ثمر نے تپ کے کہا۔

''خاندان کی لڑکیوں کو تو اماں بہت پہلے ہی صاف منع کر چکی تھیں، کسی کے منہ سے بھاپ نکالنے کی نوبت ہی نہیں آئی......البتہ میری ساس کی نظر یاسر پر تھی شہلا کے لیے...... بڑی مایوس ہوئی تھیں بے چاری۔'' ثمن کو کچھ یاد آیا۔

''شہلا کی تو شادی کو بھی دو سال ہو گئے نا؟'' ثمر نے پوچھا

''ہاں دبئی میں ہے، ایک بیٹا بھی ہے۔ اسے

www.paksociety.com

رشتوں کی کمی تھوڑی تھی، بس میری ساس کے خیال میں نہ دھن نہ دولت نہ شکل نہ صورت...... سب سے اہم چیز لڑکے یا لڑکی کے کردار اور شخصیت کی خوبی ہوتی ہے...... اس کا مزاج اور اخلاق ہوتا ہے کہ بعد میں بس یہی وصف کام آتا ہے باقی ساری چیزیں آنی جانی ہیں۔ انہیں یاسر اس اعتبار سے پسند تھا کہ وہ شریف اور سلجھا ہوا لڑکا ہے...... تب وہ ابا کے ساتھ ان کے جنرل اسٹور پر بیٹھا کرتا تھا۔ آج کی طرح کہاں تھا۔'' ثمن نے کہا۔

''کاش ہماری اماں کی سمجھ میں بھی یہ بات آجائے۔'' ثمر نے حسرت سے کہا۔

''آج کل بڑے دنوں سے خاموشی ہے، اماں کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آیا۔'' ثمن نے تعجب کا اظہار کیا۔

''اماں نے آج کل لائن آف ایکشن تبدیل کردی ہے۔ وہ اب لوگوں کے بتائے ہوئے رشتے دیکھنے کے بجائے ''ون ٹو ون'' لڑکی دیکھنے کے طریقے پر عمل پیرا ہیں۔'' ثمر ہنسی۔

''کیا مطلب......؟'' ثمن حیرانی سے بولی۔

''مطلب یہ کہ اماں آج کل شادیوں، میلاد، درس وغیرہ کی تقاریب پورے زور، شور سے اٹینڈ کررہی ہیں اور ہر آنے والی لڑکی کو اچھی طرح تاڑ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہفتے میں ایک دوبار یاسر کے سپر اسٹور بھی پہنچ جاتی ہیں...... وہاں بھی اچھی اچھی صورتیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ تاحال تو کوئی بات نہیں بنی ہے مگر اچھا ہے کم سے کم اس طرح وہ ٹھیک اس جگہ پہنچیں گی جہاں انہیں لڑکی پسند آگئی ہوگی۔ یوں دیکھ دیکھ کر آگے تو نہیں بڑھیں گی۔'' ثمر سنجیدگی سے بولی۔

''لڑکی نہ ہوئی کپڑے کا تھان ہوگئی...... کھلوایا، ٹٹولا، دیکھا اور ناپسند کرکے اگلے کی طرف اشارہ کرویا۔ کتنی غلط بات ہے۔'' ثمن نے خفگی سے کہا۔

''غلط بات تو ہے مگر اس کے بغیر گزارہ بھی تو نہیں۔'' ثمر بے چارگی سے بولی۔

''لڑکیاں حساس ہوتی ہیں، وہ ان باتوں کو دل پر لے جاتی ہیں۔ ریجیکٹ ہونا بہت مشکل کام ہے۔'' ثمن بولی۔

''یہ تو ہے...... لیکن اگر لڑکے کی مائیں، بہنیں اپنی سوچ نہیں بدل رہی ہیں تو یہ قدم لڑکیاں ہی اٹھالیں...... اپنے اندر اعتماد پیدا کریں اگر یہ سسٹم نہیں بدل پارہا تو وہ اپنے ذہن کو، اپنی سوچ کو تبدیل کریں، اگر گھر آنے والے مہمان رشتے جوڑنے کے بجائے خاموشی سے واپس چلے گئے تو کیا ہوا...... یہ نہیں سوچیں کہ انہوں نے ہمیں ریجیکٹ کردیا بلکہ یہ سوچیں کہ بہت اچھا ہوا، ضرور یہ ''میرا رائٹ مین'' نہیں رہا ہوگا۔ میرا رائٹ مین جب بھی اس دروازے پر دستک دے گا مجھے اپنے ساتھ لے کر ہی جائے گا اور اللہ پر بھروسا رکھیں، ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔'' ثمر نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

''کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہو مگر تم شاید بھول رہی ہو ہم بہن کے لیے نہیں بلکہ بھائی کے رشتے کے لیے پریشان ہورہے ہیں۔'' ثمن ہنسی۔

''ہاں تو بھائی کا رشتہ ہی کون سا آرام سے طے ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ آپ کسی کو ریجیکٹ کریں یا کوئی آپ کو...... نتیجہ تو وہی نکلتا ہے ناں...... ٹائیں ٹائیں فش۔'' ثمر کو بھی ہنسی آگئی۔

''چلو یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، کام کی بات یہ ہے کہ میں اس ہفتے اماں کی طرف جارہی ہوں ایک دن رکنے کا پروگرام ہے۔ اتوار کی شام ارشد مجھے لینے کے لیے آجائیں گے۔ شرافت سے تم بھی آجاؤ۔'' ثمن کو کچھ یاد آیا۔

''ٹھیک ہے، میں ساجد سے پوچھ لوں پھر بتاتی ہوں۔'' ثمر نے جواب دیا۔

''پوچھنا نہیں ہے، ہاں کروانی ہے، کوئی بہانہ مت بنانا۔'' ثمن نے اسے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

''اچھا بابا ٹھیک ہے، ماں کے گھر آنے کے لیے بہانے بنائے جاتے ہیں، نہ آنے کے لیے نہیں۔'' ثمر نے ہنستے ہوئے فون بند کردیا۔

ثمن بھی مسکراتے ہوئے فون بند کرکے سوچنے لگی ''کاش یہ اکٹھا مل کے بیٹھنا کسی خوش خبری کا سبب بن جائے۔'' اور شاید وہ قبولیت کا وقت تھا۔

☆☆☆

''اماں میری ساری سہیلیاں بڑے بڑے اسٹورز سے شاپنگ کرتی ہیں۔ خوب ساری چیزیں خرید کے لاتی ہیں اور آپ مہینے کا سارا سودا نکڑ والی دکان سے منگوا لیتی ہیں۔'' اس نے ٹی وی ڈرامے میں دکھائے جانے والے اس بڑے اسٹور کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کے کہا جہاں سے ڈرامے کی ہیروئن کچھ خرید رہی تھی۔

''یہ اطلاع ضرور تمہیں ان ایس ایم ایس کے ذریعے ملی ہوگی جو تمہیں ہر وقت موصول ہوتے رہتے ہیں۔'' اماں نے جل کر کہا۔

''تو اور کیا...... آپ کسی کے گھر جانے تو دیتی نہیں ہیں۔ کالج بھی ختم ہوگیا ہے کہ کسی سے ملاقات ہو، اب ایک فون کا ہی تو سہارا ہے۔'' اس نے دلگیر لہجے میں کہا۔ اس کا لہجہ اماں کو اور زیادہ تپا گیا۔

''تو ایسا کرو تم ایم ایس سی میں ایڈمیشن لے لو، گھر میں تو تمہارے کرنے لائق کوئی کام ہے ہی نہیں۔ دوبارہ کالج یا یونیورسٹی جانے سے کم از کم اتنا تو ہوجائے گا کہ تم نہانے، دھونے، بال سنوارنے اور ڈھنگ کے کپڑے پہننے لگو گی۔'' اماں نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

''آپ کا مشورہ تو اچھا ہے مگر اماں...... ایک مصیبت ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''کیسی مصیبت......؟'' اماں اس کے فوراً مان جانے پر تھوڑا چونکیں۔

''اماں داخلہ لینے کے بعد باقی سب تو ٹھیک ہے...... مگر پڑھنا بھی تو پڑے گا۔'' وہ قدرے شرمندگی سے بولی۔ اماں نے اپنے ہونٹوں تک آنے والی مسکراہٹ کو بہ مشکل دبایا۔

''ہاں، یہ تو واقعی بہت بڑا مسئلہ ہے۔''

''کیا بہت بڑا مسئلہ ہے بھئی۔'' ابا عین اسی وقت کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ کہیں ابا نے سن نہ لیا ہو ابا کے بے حد اصرار اور ان کے دباؤ پر اور ان ہی کی وجہ سے وہ بی ایس سی کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ایم ایس سی بھی کرلے لیکن وہ ہاتھ پیر چھوڑ کے بیٹھ گئی تو انہیں مجبوراً چپ رہنا پڑا کہیں انہیں پھر سے یاد نہ آجائے۔ اس نے گھبرا کر سوچا۔ پڑھنے سے تو اس کی ہمیشہ سے جان جاتی تھی۔

''ابا...... میں کہہ رہی تھی کہ اس ماہ کی خریداری ہم لوگ سپر اسٹور سے کرتے ہیں۔''

''یہ اچھوتا خیال تمہیں کیسے سے آیا؟'' ابا حیرانی سے بولے۔

''بس ابا میری ساری سہیلیاں ہی شہر کے مختلف سپر اسٹورز جاتی رہتی ہیں۔ اتنے سارے تو اسٹورز ہیں یہاں...... میں کبھی نہیں گئی، میرا بھی دل چاہتا ہے۔'' وہ ٹھنک کر بولی۔

''اچھا اچھا لے جاؤں گا تم دونوں ماں بیٹی کو بھی۔'' ابا نے دلاسا دیا۔

''کل چلتے ہیں۔'' وہ لہک کر بولی۔

''ہوں...... چلو ٹھیک ہے، کل ہفتہ ہے میں جلدی آجاؤں گا، پھر تم دونوں کو وہاں لے جاؤں

www.paksociety.com

گا۔'' ابا نے کچھ سوچ کر کہا۔

''آپ بھی اس بے وقوف کی باتوں میں آگئے۔ ارے جب ہماری ضرورت کی ساری چیزیں ہمارے گھر کے پاس والی دکان میں بہ آسانی کم پیسوں میں دستیاب ہیں تو بھلا ہمیں مہنگے مہنگے اسٹورز میں جا کے فضول خرچی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اماں تنک کے بولیں۔

''ارے بھئی سارے اسٹورز ہی مہنگے نہیں ہوتے، کچھ میں اشیائے ضرورت مناسب داموں میں بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ میں ایک ایسے اسٹور کو جانتا ہوں۔ میرے جاننے والوں میں سے کئی لوگ وہاں سے خریداری بھی کرتے ہیں اور تعریف بھی۔ میں تم دونوں کو وہیں لے جاؤں گا۔'' انہوں نے اماں کو دلاسا دیا۔ اماں گومگو کی کیفیت میں تھیں مگر...

دُرِّ نایاب کا چہرہ وفورِ مسرت سے چمک رہا تھا۔ ابا نے محبت سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ جو لوگ چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر زیادہ خوش ہوتے ہیں ان کے دل صاف اور معصوم ہوتے ہیں۔ خوش ہونا بھی ایک سعادت ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ خوشیاں تو بہت سے لوگوں کو ملتی ہیں مگر خوش کتنے ہوتے ہیں؟ زیادہ تر تو اس خوشی میں ہی مین میخ نکال کے اور زیادہ کی ہوس کر کے اس کی لذت کو برباد کر دیتے ہیں۔

''میری بچی بہت سادہ ہے۔'' وہ مسکرائے لیکن اماں متوقع خرچے کی وجہ سے فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ دونوں سرِ شام ہی میکے پہنچ گئیں۔ دونوں کے بچے آپس میں کھیلنے لگے اور وہ دونوں ماں باپ کے کمرے میں آ گئیں۔ خوشگوار ماحول میں چائے پی گئی۔ یاسر کو فون کیا تو وہ بھی بہنوں کی آمد پر بے حد خوش ہوا۔

''تم بھی آ جاؤ بڑا مزہ آ رہا ہے۔'' ثمر نے کہا۔

''ابھی تو مشکل ہے، ایسا کریں کہ آپ لوگ اِدھر ہی آ جائیں۔ میں نے اپنے اسٹور کے اوپر والے فلور کا افتتاح کیا ہے وہ بھی دیکھ لیں اور آئس کریم میری طرف سے۔'' وہ ہنسا۔ کچھ عرصے قبل ہی اس نے ساتھ کی کچھ دکانیں ملا کر اسٹور کو کشادہ کرایا تھا۔ اب اوپر بھی۔

''ارے واہ...... یہ تو اچھی نیوز سنائی تم نے۔ ٹھیک ہے پھر ہم سب آ رہے ہیں۔'' ثمر خوش ہوئے بولی۔

''ویلکم!'' وہ ہنس کے بولا۔ ثمر نے فون بند کر کے سب کو یاسر کی دعوت کا بتایا۔ سب فوراً جانے کو تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ اماں اور ابا بھی...... سارا قافلہ کچھ ہی دیر بعد یاسر کے سپر اسٹور کے سامنے تھا۔

''کتنا سمجھدار ہے میرا بیٹا...... اگر اس کے ذہن میں یہ آئیڈیا نہ آتا تو آج وہ بھی تمہارے ابا کے اسی جنرل اسٹور میں بیٹھا ہوتا۔'' اماں کے لہجے میں ماں کا فخر تھا۔

''اسی جنرل اسٹور نے ہمیں اپنی ذمے داریاں، بچوں کی پڑھائیاں، شادیاں سب کچھ کرنے کے قابل بنایا۔ اسی کی بدولت تمہارا بیٹا یہ سپر اسٹور خریدنے اور چلانے کے قابل ہوا۔ اسے برا مت کہو اسے اللہ نے میری روزی کا سبب بنایا تھا۔'' ابا کو اسٹور یاد آیا تو ان کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو گئے۔

''ارے ارے ابا، اماں کا یہ مطلب تھوڑی تھا...... وہ تو بس یاسر کی کامیابیوں پر خوش ہو رہی ہیں۔'' ثمر جلدی سے بولی۔

''خوش ہونے کا طریقہ بھی درست ہونا چاہیے۔'' ابا نے کہا تو اماں پہلو بدل کے رہ گئیں۔ ماحول کو سنجیدگی کی طرف جاتا دیکھ کر ثمن نے سنبھالنا چاہا۔

''کیا خبر آج اماں کو سپر اسٹور میں کوئی من مرادہی مل جائے۔''

''کتنی دفعہ تو یہ سوچ کے گئی ہوں...... مگر۔'' اماں نے بیزاری سے کہا۔

''میمونہ بیگم اس سے پہلے کہ بیٹا کسی کو ہاتھ سے پکڑ کے لے آئے اور سامنے کھڑا کر دے کہ اس سے ملیے یہ رہی میری بیوی...... پھر کیا کر لیں گی آپ؟'' ابا شاید آج سارے اگلے پچھلے حساب برابر کرنے کے موڈ میں تھے۔ اماں نے تنک کے کچھ کہنا چاہا مگر ثمر نے جلدی سے ان کا کندھا دبا دیا۔ اماں ابا کی مہابھارت شروع ہو جاتی تو آئس کریم کا سارا مزہ غارت ہی ہوتا۔ شکر تھا کہ اماں اشارہ سمجھ گئیں۔ یاسر کے اسٹور کے سامنے گاڑی رکی۔ وہ عمارت کے اندر داخل ہوئے تو یاسر سامنے ہی کھڑا نظر آیا وہ ملازمین کو کوئی ہدایت دے رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے وہ ان کے قریب آ گیا۔

''نیچے تو کوئی خاص تبدیلی نہیں ہے، ویسا ہی لگ رہا ہے۔'' ثمر نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

''نیچے تو وہی گروسری ہی ہے۔ میں نے تو اوپر کے فلور کی بات کی ہے۔ چلیں، وہ دکھاتا ہوں۔'' اس نے زینے کی طرف اشارہ کیا۔

''اوپر کیا ہے؟'' ثمن زینہ چڑھتے ہوئے بولی۔

''آپ کی پسند کی چیز۔'' وہ مسکرایا۔ آخری زینے پر پہنچتے ہی سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''بھئی یہ تو خالص خواتین کا سیکشن ہے۔'' ابا مسکراتے ہوئے بولے۔

''سچ پوچھیں تو ابا ایک یہی کیا نیچے گروسری والا سیکشن بھی خواتین ہی کے دم سے آباد ہوتا ہے۔'' یاسر مسکرایا۔

''بازاروں میں خواتین ہی کے مطلب کی چیزیں تو ہوتی ہیں۔ مرد بے چارے تو بس نام کے ہی خریدار ہوتے ہیں۔'' ابا نے کہا۔

''خیر...... مردوں کی ضرورت اور شوق کی چیزیں بھی کم نہیں ہوتیں۔ کپڑے، جوتے، موبائل اور نہ جانے کیا کیا......'' اماں فوراً بولیں۔

''بہت خوب صورت لگ رہا ہے تمہارا یہ سیکشن......'' ثمر نے تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور ماشاء اللہ رش بھی تو دیکھو کتنا ہے۔'' ثمن نے خوش ہو کے کہا۔ کھلے کھلے ہال میں ترتیب سے لگے ہوئے کراکری، جیولری، کاسمیٹکس اور لان کے دیدہ زیب سوٹ اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

''سب کے لیے کھلی آفر ہے...... جو کچھ پسند آئے آپ لوگ میری طرف سے تحفتاً لے سکتے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''ارے بھئی تم نے آئس کریم کھلانے کو کہا تھا، وہ کھلاؤ۔ ان سب چکروں میں کیوں پڑ رہے ہو۔'' ثمن تکلفاً بولی۔

''یہ بھی میری خوشی ہے۔'' وہ پھر مسکرایا۔ دفعتاً زوردار چھناکے کی آواز آئی۔ سب نے گھبرا کے آواز کی سمت دیکھا۔ یاسر وہاں پہنچنے والوں میں سب سے آگے تھا۔ درمیانی عمر کے میاں بیوی تھے جو کراکری کے ریک کے پاس دم بخود سے کھڑے تھے اور کارنر پر رکھا ہوا گلدان زمین بوس ہو کے ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ لوگوں میں گھبراہٹ سی پھیل گئی تھی۔ وہ یہ جاننا چاہ رہے تھے کہ کیا ہوا اسی لیے اس جگہ جمگھٹا سا بن گیا۔ یاسر نے اپنے حواس بحال رکھے اور لوگوں سے وہاں سے ہٹ جانے کی درخواست کی۔ عملہ بھی مستعدی سے وہاں پہنچ چکا تھا۔ اب یاسر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

www.paksociety.com

''بیٹے ہمیں افسوس ہے...... بے دھیانی میں یہ واقعہ رونما ہوگیا۔ آپ جو بھی پے منٹ مانگیں ہم دینے کو تیار ہیں۔'' ان صاحب نے شرمندگی سے کہا۔ یاسر نے ان کی طرف دیکھا۔ دفعتاً اس کی نظر ان کے پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی پر پڑی۔ لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ یاسر نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ لڑکی کے چہرے پر موجود شرمندگی اور گھبراہٹ اس کے حسن کو دوآتشہ بنا رہی تھی۔ اماں، ثمر اور ثمن کی نگاہیں بھی یاسر کے تعاقب میں اس لڑکی پر پڑیں۔

''یہ کون ہے؟'' ثمر نے سوال کیا۔

''یہ میری بیٹی ہے......'' خاتون نے شرمندگی سے کہا۔

''یہ اتنی پریشان کیوں ہے؟'' ثمر نے اس لڑکی کا ہاتھ تھام کے اسے باپ کے عقب سے باہر نکالا۔

''دراصل یہ حادثہ اسی کی بے پروائی سے ہوا اسی لیے یہ گھبرائی ہوئی ہے۔'' وہ صاحب بولے۔

''یہ کوئی اتنا بڑا حادثہ تو نہیں...... محض ایک گلدان ہی ٹوٹا ہے اس کی قیمت بھی چند ہزار روپوں سے زیادہ نہیں۔ آپ لوگ اس قدر پریشان مت ہوں۔'' ثمن نے مسکراتے ہوئے ان لوگوں سے کہا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ثمر سے کچھ کہا۔ ثمر کا جواب بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اثبات میں تھا۔ اماں بھی ٹکٹکی باندھے لڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔ دفعتاً ابا جو اُن صاحب کو بڑی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ محمود صاحب ہیں؟'' اب چونکنے کی باری اُن صاحب کی تھی۔

''ارے مشتاق صاحب...... بہت بدل گئے ہیں آپ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے۔

''پندرہ برس کا عرصہ کافی ہوتا ہے بدلنے کے لیے۔ یہ میرے بہت اچھے جاننے والے ہیں، کئی برس پہلے بڑی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔'' مشتاق صاحب نے کہا۔

''یاد ہے میں آپ کی دکان پر آیا کرتا تھا اور آپ مجھے جوس پلاتے تھے۔'' محمود صاحب نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''جی، جی بالکل...... اب تو وہ دکان ختم ہوگئی۔ بیٹے نے تین برس پہلے یہ سپر اسٹور کھولا ہے۔'' مشتاق صاحب بھی مسکرائے۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ...... مبارک ہو آپ لوگوں کو۔ اللہ برکت ڈالے۔'' وہ بولے۔

''آمین۔'' سب نے ایک ساتھ کہا۔

''بیٹی کیا کرتی ہے آپ کی۔'' دوسری طرف اماں ان کی بیٹی کو ٹھوک بجا کے دیکھنے کے بعد اس کی ماں سے مخاطب تھیں۔

''بی ایس سی کیا ہے پچھلے سال...... اب گھر داری سیکھ رہی ہے۔'' وہ خاتون مسکرائیں۔

''بہت اچھی بات ہے۔'' اماں متاثر ہوگئیں۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' ثمر کو اس میں مستقبل کی بھابی نظر آنے لگی تھی۔

''دُرِ نایاب۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''نام بھی تمہاری طرح ہی پیارا ہے۔'' ثمن ہنسی۔

''بیٹے آپ اس گلدان کی قیمت بتادیں میں کاؤنٹر پر ادائیگی کر دیتا ہوں۔'' ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے کے بعد وہ دوبارہ اسی موضوع پر آگئے۔ اتنی دیر میں عملے نے مستعدی سے اس جگہ کی صفائی کر دی تھی۔

''ارے نہیں انکل، کیوں شرمندہ کر رہے ہیں...... کوئی بات نہیں۔'' وہ تابعداری سے بولا۔

''نہیں بیٹے پھر میں شرمندہ رہوں گا۔'' وہ واقعی بے حد شرمندہ نظر آرہے تھے۔

''ارے محمود صاحب اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے...... اس بہانے دو پرانے دوست مل گئے، یہ گلدان کا ٹوٹنا تو بہت ہی مبارک ثابت ہوا ہے۔ اب غیروں جیسی باتیں مت کریں۔ بہت کرنا چاہتے ہیں تو ایسا کریں کل ہمیں اچھی سی چائے پلوائیں۔ ہم سب آپ کے گھر آرہے ہیں۔'' انہوں نے دُرِ نایاب کے سر پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''لڑکی معصوم ہے، کم عمر ہے، مناسب حد تک پڑھی لکھی بھی ہے، گھر داری سیکھ رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر بے حد خوب صورت ہے۔ بس اماں ''ڈن'' کردیں۔'' ثمر نے ماں کی جان کھائی۔

''جاننے والے ہیں، اچھے شریف آدمی ہیں، دولت مند تو نہیں ہیں مگر خاندانی لوگ ہیں۔ باقی کی تفصیل گھر جا کے دیکھ لینا۔ بچی مجھے بھی پسند آئی۔'' ابا بولے۔

''آج کل کی لڑکیوں والی تیزی نہیں ہے اس میں۔ مجھے تو پسند آئی۔'' ثمن نے بھی سر ہلایا۔ اماں نے باری باری سب کو دیکھا پھر صوفے پر ٹکے یاسر پر نظر گئی جو بظاہر تو ٹی وی دیکھ رہا تھا مگر اس کے کان یہیں لگے ہوئے تھے ایک دم خاموشی ہوئی تو اس نے گردن گھما کے اُن سب کو دیکھا اور نگاہیں ماں کی نگاہوں سے ملیں۔ اماں کو لگا جیسے وہ بھی کہہ رہا ہو۔ قبول ہے، قبول ہے۔ وہ مسکرائیں۔

''ٹھیک ہے جیسی تم لوگوں کی مرضی۔''

''کیا مطلب...... آپ کو نہیں پسند آئی وہ؟'' ثمر مایوسی سے بولی۔

''نہیں، مجھے بھی پسند آئی ہے۔'' انہوں نے سر ہلایا۔

''مبارک ہو، مبارک ہو، اماں کو لڑکی پسند آگئی۔'' ثمر نے نعرہ لگایا۔ اماں نے پھر یاسر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی بڑی آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

''یہ لڑکی کبھی نہیں سدھرے گی...... جہاں سے گزرتی ہے چار پانچ چیزیں تو خود بخود گرنے لگتی ہیں جیسے کوئی بھونچال آگیا ہو۔ گھر کی تو خیر...... اب باہر بھی؟'' اماں نے تلملا کر اسے دیکھا۔ انہوں نے گھر پہنچنے تک اپنا غصہ بہ مشکل دبایا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد وہ شروع ہوگئیں۔

''بچی ہے...... دھیان نہیں رکھا۔'' ابا نے بیٹی کی بسورتی صورت دیکھ کر اس کی طرف داری کی۔

''بچی ہے...... پورے اکیس برس کی ہوچکی ہے۔ وہ تو کہیں آپ کے جاننے والے تھے درگزر کر گئے اگر یہ حرکت کسی اور جگہ کی ہوتی تو پتا چلتا، پورے چھ ہزار کا گلدان تھا۔ میں نے قیمت پڑھی تھی اس کی۔ ہم تو لے کر ہی دس ہزار گئے تھے جس میں سے ماہانہ خریداری کے علاوہ یہ محترمہ نہ جانے کیا کیا الم غلم خرید کے اسے برابر کروا چکی تھیں۔ اگر پیسے بھرنے پڑتے تو کیا کرتے آپ......؟ میرا تو مہینے کا پورا بجٹ ہی برباد ہوگیا۔ اب نہ کہے کوئی مجھ سے سپر اسٹور سے خریداری کرنے کو۔ نکڑ والی دکان ہی ٹھیک ہے ہمارے لیے۔'' اماں کو سخت غصہ آیا ہوا تھا۔ وہ آنسو پیتے ہوئے اٹھی اور اندر بھاگ گئی۔

''چلو جو ہوگیا سو ہوگیا...... دینے تو نہیں پڑے ناں پیسے تمہیں۔ بچی کا شوق پورا ہوگیا...... اب نہیں کہے گی، جانے دو۔'' ابا نے نرمی سے سمجھایا۔

''اب وہ جو کل آرہے ہیں آپ کے مہمان...... انہیں اچھا سا چائے ناشتا تو کروانا ہوگا۔'' اماں کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''مجھے تو لگتا ہے وہ لوگ کسی خاص مقصد کے لیے آرہے ہیں۔'' ابا بھی کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''کیا مطلب......؟'' اماں نے حیرانی سے پوچھا۔

"پہلے بھی ہم لوگوں کا باہر ہی ملنا ہوتا تھا، کبھی ایک دوسرے کے گھر نہیں گئے، پھر رفتہ رفتہ ملنا ملانا کم ہوتا گیا۔ بڑے عرصے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی اور اب ایک دم اُن کا گھر آنا اور چائے پینے کو کہنا...... ذرا سمجھو تو......؟" ابا نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اماں کی نگاہوں میں وہ مہذب اور اسمارٹ سا نوجوان گھوم گیا۔ کاش......! انہوں نے سوچا۔

☆☆☆

اماں نے ڈرتے ڈرتے بیٹی کے گھر قدم رکھا۔ لان میں کھلے تازہ پھولوں کی خوشبو نے ان کی پذیرائی کی۔ دُرِّ نایاب اور یاسر کی شادی کو دو ماہ گزر چکے تھے۔ دونوں ہی ہنی مون ٹرپ سے واپس آئے تو کچھ ہی دنوں کے بعد یاسر کی اماں نے بلاوا دے بھیجا۔

"خیر سے کل آپ سب لوگوں کی دعوت ہے۔ دُرِّ نایاب کی کھیر پکوائی کی رسم ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ اماں کی اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے رہ گئی۔

"جی۔" اُن کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"جی بہن دیکھیں میں بوڑھی عورت...... بیٹیاں اپنے گھر کی ہوئیں...... اب تو جو کچھ ہے بہو کا ہے۔ یہ گھر اسے ہی سنبھالنا ہے، چاہے آج چاہے کل۔ میں نے سوچا نیک کام میں دیر کیسی۔" انہوں نے کہا۔

"جی بالکل درست کہہ رہی ہیں آپ۔" انہوں نے اپنی اٹکی ہوئی سانس بحال کی۔ اُن کے گھر میں کل جو غدر مچنے والا تھا وہ اسے چشمِ تصور سے دیکھ کے دل ہی دل میں لرز رہی تھیں۔

"ویسے تو گھر میں ملازم ہے لیکن گھر تو عورت ہی کا ہوتا ہے ناں...... آپ ماشاء اللہ اتنی سلیقہ مند ہیں، مجھے خوشی ہے کہ دُرِّ نایاب آپ کی بیٹی ہے، ماں سے اس نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔" وہ بہت پُرامید تھیں اور یہ بہت خوف زدہ۔ انہوں نے ڈر کے مارے بیٹی کو صبح فون تک نہیں کیا اور نہ ہی اس کا کوئی فون آیا۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ انہوں نے چشمِ تصور سے ان کے کچن میں ہر چیز لرزتی، گرتی، پڑتی دیکھی...... پھر اُن کے ذہن میں لئی جیسی کھیر آئی...... کبھی جلی ہوئی دیگچی دو چار برتن تو ضرور ٹوٹیں گے اور وہ ہاتھ بھی ضرور جلائے گی کیونکہ میکے میں دُرِّ نایاب جب بھی کچن میں رونق افروز ہوتی تھی یہ دو کام ضرور رونما ہوتے تھے۔

"یا اللہ خیر......"

دعوت میں ان کی تینوں بیٹیاں مع اپنے شوہر...... اور بچگان کے مدعو تھیں۔ وہ لرزتے، کانپتے اندر داخل ہوئیں۔ انہیں در و دیوار سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ یاسر کی اماں بہت محبت سے ملیں۔

"مطلب ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔" انہوں نے دل میں سوچا۔

ان کے گھر میں بھی سارا خاندان جمع تھا۔ سب خوش تھے، خاص طور پر یاسر تو بات بات پر کھلا پڑ رہا تھا۔ ان کی جان میں جان آئی۔ دُرِّ نایاب بھی ان سے آ کے لپٹ گئی۔ سلک کے خوب صورت جوڑے اور ہلکی پھلکی جیولری کے ساتھ وہ قرینے سے تیار ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر اچھا لگا۔ کھانا بھی بہت لذیذ تھا اور کھیر تو واقعی لاجواب تھی...... سب لوگ ہنسی خوشی کھانا کھا رہے تھے اور اماں اپنے اندر سوالوں جوابوں میں الجھی ہوئی تھیں۔

"یہ کڑاہی ضرور لیں، میں نے تو صرف کھیر پکانے کا کہا تھا مگر درنایاب نے یہ کڑاہی بھی خود ہی بنالی۔ ماشاء اللہ جھٹ پٹ سارا کام ہوگیا...... سب لوگ ہی شامل ہیں آج کی دعوت میں...... ثمر اور ثمن بھی بھابی کے ساتھ لگی رہیں...... سارا کھانا گھر ہی میں بنا ہے۔" یاسر کی اماں فخر سے بولیں۔

"کھیر تو بہت اچھی بنی ہے۔" اماں نے بیٹی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھیر بنانا تو میں نے اماں سے ہی سیکھی ہے۔" درنایاب جھٹ بولی۔

"ایں......" اماں کو اچھو لگ گیا۔ ان کی نظروں میں وہ نادر و نایاب اشکال کی کھیریں گھوم گئیں جو انہوں نے بیٹی سے بنوانے کی کوشش کی تھی۔

"بالکل بالکل بیٹیاں عموماً سلیقے اور گھر داری میں اپنی ماں کا پرتو ہوتی ہیں۔ تبھی تو کہا جاتا ہے کہ بیٹے کے لیے رشتہ ڈھونڈنے نکلو تو پہلے لڑکی کی ماں کو دیکھو۔" یاسر کی اماں فوراً بولیں۔

"اب تو بھائی کے سارے کام بھی ہماری بھابی صاحبہ ہی کرتی ہیں۔" ثمر لاڈ سے بولی۔

"یاسر کی ساری وارڈ روب سنبھال لی ہے۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی ہے۔ ہماری بہت عزت کرتی ہے۔ درنایاب واقعی در نایاب ہے۔" ثمن نے بھی محبت سے کہا۔

"آپ سب لوگ بھی تو بہت اچھے ہیں۔" درنایاب نے لاڈ سے ساس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اماں فرطِ حیرت سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں پھر وہ جب تک وہاں بیٹھی رہیں درنایاب کی تعریفیں سنتی رہیں۔ عجیب بات تھی۔ نہ تو وہ کسی چیز سے ٹکرا رہی تھی اور نہ ہی کوئی دوسری چیز خود بخود آ کے اس سے ٹکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہر چیز مکمل تھی۔ انہیں خوشی ہوئی...... کاش میں جو کچھ دیکھ رہی اور سن رہی ہوں وہ حقیقت ہی ہو اور آئندہ بھی حقیقت رہے...... انہوں نے دل سے دعا کی۔ اُن کے سر سے بوجھ اتر گیا تھا۔ واپسی پر انہوں نے عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد دو رکعت نمازِ نفل بطور شکرانہ ادا کی...... تسبیح گھماتے ہوئے وہ ابا کی طرف آئیں...... وہ بھی کسی سوچ میں گم تھے۔

"جو کچھ آپ نے دیکھا اور سنا آپ کو یقین

...گوشے میں اور ملک بھر میں

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

...سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
...کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
...لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

...اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

آیا......؟'' انہوں نے مسکرا کے شوہر کو مخاطب کیا۔
''کیوں نہیں۔'' ابا سر اٹھا کے مسکرائے۔
''در نایاب چند دنوں میں اتنا بدل جائے گی۔ میں تو حیران ہوں۔'' انہوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔
''در نایاب کہاں بدلی ہے۔ وہ تو درحقیقت ایسی ہی تھی۔'' ابا مسکراتے ہوئے بولے۔
''ایسی تھی......؟ کیا بات کر رہے ہیں آپ۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں اس نے مجھے خون کے آنسو رُلائے ہیں۔ اتنا پریشان کیا، جس کی حد نہیں۔ میں تو اس کا رشتہ دیتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ آپ کہہ رہے ہیں وہ ایسی ہی تھی۔'' اماں مزید حیران ہوئیں۔
''آپ کیا سمجھتی ہیں، آپ جو کچھ اسے سمجھایا کرتی تھیں، سکھایا کرتی تھیں، روکا ٹوکا کرتی تھیں سب بیکار جاتا تھا۔'' ابا نے پوچھا۔
''ہاں تو اور کیا، سب کچھ اس کے سر پر سے گزر جاتا تھا۔'' اماں نے فوراً کہا۔
''ایسا نہیں تھا، آپ کی ہر نصیحت، آپ کا انداز، آپ کا سلیقہ سب کچھ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنے اندر جذب کرتی رہی...... جیسے کسان زمین تیار کرتا ہے، بیج بوتا ہے پھر پانی لگاتا ہے اس کے بعد اس زمین سے کونپلیں پھوٹتی ہیں پھر سبزہ اگتا ہے پھر کہیں جا کے اناج کی باری آتی ہے۔ بس اسی طرح زمین آپ نے تیار کی اور اب کونپلیں پھوٹنا شروع ہو گئی ہیں۔'' ابا مسکرائے۔
''لیکن یہ کونپلیں مجھے پہلے نظر کیوں نہیں آئیں؟'' اماں نے جرح کی۔
''شاید آپ کے گھر کی فضا ان نرم و نازک کونپلوں کے لیے سازگار نہیں تھی۔ ہر وقت آپ کے غصے کے تند و تیز بادلوں کی گرج چمک میں وہ ڈر کے اندر ہی چھپ جاتی تھیں۔ اب اسے سازگار ماحول ملا ہے تو وہ نمودار ہو گئی ہیں۔'' ابا ہنسے۔
''لوگ تو اچھے ہیں شکر ہے مالک کا۔'' اماں نے اعتراف کیا۔
''بس اسی کو قسمت کہتے ہیں ورنہ کہاں وہ اور کہاں ہم...... بظاہر تو اس رشتے کے ہونے کا کوئی سبب ہی نہیں تھا۔'' ابا نے کہا۔
''سپر اسٹور سے خریداری کا شوق تھا اسے......'' اماں آبدیدہ ہو گئیں۔
''اور سپر اسٹور کی مالکہ بن گئی۔'' ابا ہنسے۔
''اتفاق ہے۔'' اماں نے کہا۔
''اتفاق نہیں قسمت۔'' ابا نے کہا۔
''اگر وہ گلدان نہ ٹوٹتا پھر؟'' اماں مسکراتے ہوئے بولیں۔
''تو اس بے چاری کو اتنی زیادہ ڈانٹ نہ سننے کو ملتی آپ سے۔'' ابا نے شکایتاً کہا۔
''اور اتنا اچھا رشتہ بھی نہیں ملتا۔'' اماں نے فخر سے کہا جیسے ان کی ڈانٹ کے طفیل ہی یہ رشتہ ہوا ہو۔
''ماں کی ڈانٹ میں بھی محبت ہوتی ہے۔'' ابا نے سر ہلایا۔
''لیکن بیٹی کے رخصت ہونے کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں نے اسے اتنا نہ ڈانٹا ہوتا۔'' اماں پھر سے آبدیدہ ہو گئیں۔
''افسوس نہ کیجیے اگر آپ نے اسے اتنا نہ ڈانٹا ہوتا تو وہ سب کچھ جو آپ کے گھر کر کے گئی ہے آج وہی سب وہاں بھی کر رہی ہوتی۔'' ابا یک دم بولے۔
اماں حیرانی سے ان کی شکل دیکھنے لگیں پھر مسکرانے لگیں۔ ''یہ باپ بھی کتنے چالاک ہوتے ہیں' ہر جائز ناجائز پہ بیٹیوں کی طرف داری کر کے اچھے بنے رہتے ہیں ورنہ اندر سے......'' انہوں نے ابا کو دیکھا۔ ابا بھی یک دم ہنس پڑے۔

* *

WWW.PAKSOCIETY.COM

کاش

عروسہ عالم

''رشتہ بہت اچھا ہے، میں تمہاری حماقت میں یہ لڑکا ہرگز ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔ لو بھلا غضب خدا کا اچھا رشتہ چھوڑ کے ایک معمولی لڑکے کو قبول کر لیں۔''
''کیوں، کیا معمولی لڑکوں کی شادیاں نہیں ہوتی ہیں؟'' رخسار تڑخ کے بولی۔
''بالکل ہوتی ہیں لیکن رشتہ جوڑنا اپنے ہم پلّہ لوگوں میں ہی اچھا لگتا ہے۔''
''معاف کیجیے گا امی، ہمارا پلّہ بھی کوئی ایسا بھاری

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں ہے۔'' اس نے پھر مرچیں لگاتا ہوا جواب دیا۔

''ہاں لیکن اللہ کے کرم سے بہت سوں سے بہت اچھے ہیں۔ ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں' بے شک یہ رشتہ ہماری حیثیت سے بڑھ کر ہے اسے انکار کر دینا اللہ کی ناشکری ہوگی اور ویسے بھی بزرگوں کا قول ہے کہ بیٹی دو اپنے سے اونچے گھر میں اور بہو لاؤ اپنے سے نیچے گھر کی دونوں صورتوں میں لڑکی تو اپنے سے اونچے ہی گھر میں گئی ناں۔ ابھی تم اتنی بڑی اور عقلمند نہیں ہوئی ہو کہ اپنے لیے اتنے بڑے بڑے فیصلے کرو۔''

''لیکن امی زندگی مجھے گزارنی ہے اور جو شخص مجھے پسند ہی نہیں ہوگا میں اس کے ساتھ کیسے خوش حال زندگی گزار سکتی ہوں۔''

''لڑکا امریکا کا پڑھا ہوا ہے' بینک میں ملازم ہے' خوش اخلاق اور خوش شکل ہے۔ مختصر فیملی ہے، شریف لوگ ہیں۔ ایسے لڑکے اور ایسے لوگوں کے ساتھ تم خوش نہیں رہ سکتی ہو تو اپنے سے کم تر لڑکے کے ساتھ کیسے گزارا کروگی اور پھر تم نے اس سے ملے بغیر اسے دیکھے بغیر کیسے ناپسندیدہ قرار دے دیا۔''

اس لیے کہ میرے سامنے پہلے سے ایک پسندیدہ شخص موجود ہے۔''

''وہ پسندیدہ شخص جو ابھی نوکری تلاش کر رہا ہے اور ٹیوشنز پر اس کا گزارہ ہو رہا ہے۔ وہ جو اپنے گھر والوں سے چھپ کر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''امی وہ پڑھا لکھا ہے، نوکری ڈھونڈ رہا ہے، وہ اسے مل جائے گی اور جہاں تک چھپ کے شادی کرنے کی بات ہے تو اس کی فیملی میں خاندان سے باہر شادیاں کرنے کا رواج نہیں ہے۔''

''یعنی اس شادی کے نتیجے میں دو جرم تمہارے حصے میں آئیں گے، ایک تو چھپ کے شادی کرنے کا جرم اور دوسرے ناپسندیدہ بہو کا تحفہ۔ کیسے زندگی گزاروگی تم ان جرائم کے ساتھ، کیا حیثیت ہوگی تمہاری ان لوگوں کی نظر میں...... ہماری تربیت کو بھی بدنام کروگی....'' امی جل کے بولیں۔

''شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بہت سی شادیاں اس طرح ہوتی ہیں پھر بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اتنا آگے تک سوچیں گی تو کبھی شادی نہیں ہوگی۔''

''ہاں، شادی کے لیے آگے تک ہی سوچنا پڑتا ہے۔ ساری زندگی کی بات ہوتی ہے ایسے ہی تو نہیں اولاد کو اندھے کنویں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب سب کچھ ٹھیک اور اچھا لگتا ہے جبھی رشتے جوڑنے پر دل ٹھکتا ہے۔ تم یہ خیال دل سے نکال دو کہ ہم اس رشتے کو قبول کرلیں گے جو تم سوچ نہیں سکتی ہو وہ ہمیں نظر آرہا ہے اور صمد کے بارے میں وہ سب ہم دیکھ رہے ہیں جو تمہاری سوچوں میں بھی نہیں ہے۔ جب تمہارا یہ بھوت اترے گا تو سب تمہیں اچھا لگے گا۔'' وہ جواب دیے بغیر پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

اس دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی کہ امی چلی آئیں۔

''صمد آئے ہیں تم چاہو... تو ان سے مل سکتی ہو۔''

''امی یہ شادی آپ کی اور بابا کی مرضی سے ہو رہی ہے، اس میں میری پسند اور مرضی شامل نہیں ہے لہٰذا میں ان سے ہرگز نہیں ملوں گی۔'' اس نے نہایت بدتمیزی سے انکار کر دیا۔

''رخسار اپنے رویّے میں لچک پیدا کرو...... کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی زندگی پچھتاوؤں کی نظر ہو جائے۔''

''میں شادی بھی آپ کی مرضی سے کروں اور بعد میں بھی آپ کی مرضی سے جیوں، ناممکن! بعد کی زندگی میری ہوگی، میں اپنی مرضی سے جیوں گی...... اُس وقت میں کسی کی مداخلت اور پسند برداشت نہیں کروں

گی۔'' اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''ہر اچھی اور شریف لڑکی کی طرح بعد میں تمہیں اپنے میاں کی مرضی سے جینا ہوگا۔''

''اونہہ، میاں...... بہر حال میں ان سے نہیں ملنا چاہتی......''

''نصیب بننے سے پہلے اپنے نصیبوں کو ٹھوکر مت مارو۔'' امی غصے میں کہہ کر واپس چلی گئیں۔

''میرا نصیب میری مٹھی میں ہے۔'' اس نے دل میں کہا اور لیٹ گئی۔

☆☆☆

وہ شادی ہو کے صمد یزدانی کے گھر آگئی۔ سسرال اور میکے کی رسموں نے اسے بہت تھکا دیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے حجلہ عروسی میں بیڈ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے تمام زیورات اتار کے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیے اور واش روم جا کے چینج کر کے فریش ہو کے نکل آئی۔

''آپ نے اتنی جلدی چینج کیوں کرلیا؟'' صمد یزدانی کمرے میں آئے تو دلہن بیگم کا روپ دیکھ کر انہیں زوردار جھٹکا لگا۔

''میرا وہ روپ آپ کے لیے نہیں تھا۔'' وہ آج ہی ان پر ہر بات کلیئر کر دینا چاہتی تھی تاکہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ رہے۔

''کیا مطلب......؟'' وہ کافی حیران ہوئے۔

''آپ کی شادی میرے ساتھ ہوئی ہے، آپ بیاہ کر میرے ساتھ میرے گھر آئی ہیں۔''

''بس یہیں تک ہے ہماری شادی۔''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں کھل کے بات کریں۔'' صمد ایک دم سے سنجیدہ ہو گئے۔

''میں کسی اور کی امانت ہوں۔ میرے والدین نے میرے منع کرنے کے باوجود میری شادی آپ کے ساتھ زبردستی کر دی جبکہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔''

اس کی بات پر صمد دھیرے سے مسکرا دیے۔ اس وقت وہ انہیں بالکل چھوٹی اور ضدی سی بچی لگ رہی تھی۔

''کسی کو پسند کرنا کوئی بری بات نہیں' شادی سے پہلے اکثر ایسا ہوتا ہے لیکن یہ بھی سوچنا اور سمجھنا چاہیے کہ والدین بچوں کے لیے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں بہت سوچ بچار کے بعد اپنے تجربے کی روشنی میں ہی کرتے ہیں۔ اس میں بچوں کے لیے بہتری ہوتی ہے۔''

''میں ایسے فیصلوں کو نہیں مانتی ہوں جن میں اولاد کی خوشیوں اور خواہشات کا خیال نہ رکھا جائے۔''

''چلیں انہوں نے آپ کی خواہشوں کا خیال نہیں رکھا۔ میں تو ہوں ناں، میں آپ کی ہر بات کا خیال رکھوں گا۔''

''مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے' اب میں اپنا ہر فیصلہ خود کروں گی۔'' اس نے بے باکی سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے کرلیجیے گا، آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھ جائیں۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو وہ بدک کے پیچھے کو ہوگئی۔

''پلیز...... مجھے ہاتھ مت لگائیں۔ یہ حق کسی اور کا ہے' میں کسی اور کی امانت ہوں۔'' صمد چونک کر نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''پلیز آپ مجھے فوراً طلاق دے دیجیے۔'' اس نے ملتجی سے انداز میں کہا۔

''واٹ......'' صمد یزدانی اچھل پڑے۔ ''آپ ہوش میں تو ہیں!''

''میں بالکل ہوش میں ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کو یہی سب کچھ کرنا تھا تو آپ نے شادی کیوں کی۔''

''میں نہیں کر رہی تھی، میرے والدین نے

www.Paksociety.com

زبردستی کی ہے۔'' اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔
''اس وقت آپ بہت جذباتی ہو رہی ہیں، ہم اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ یہ بہت بڑا اور سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اس پر سنجیدگی سے ہی بات ہوگی۔ ابھی آپ بہت تھکی ہوئی ہیں، آرام کیجیے۔'' انہوں نے سنجیدگی اور نرمی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔
اس کے بگڑے موڈ کے ساتھ ولیمہ بھی ہوگیا۔ دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ صمد کے ساتھ کہیں بھی جانے کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ وہ ان کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو ان سے بچا کے بہت سنبھال کے رکھ رہی تھی۔ دعوتوں اور صمد سے بچنے کے لیے وہ امی کے گھر جا کے بیٹھ گئی۔ کئی دفعہ صمد کا فون آیا تو اس نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ کئی دن تک ایسے ہی ہوتا رہا۔
''آخر مسئلہ کیا ہے تمہارا...... تم اپنے میاں سے بات کیوں نہیں کر رہی ہو؟'' امی نے اس کی کھنچائی کر دی۔
''امی میں نے آپ کے کہنے کے مطابق شادی کر لی ہے اب مزید آپ کی مرضی سے میں کچھ نہیں کروں گی۔''
''ہماری مرضی سے شادی کی ہے تو ہماری مرضی کے مطابق اپنے میاں کے ساتھ بھی رہو۔''
''میں آپ کی مرضی کے میاں کے ساتھ نہیں رہوں گی، اب میں اپنی مرضی کے میاں کے ساتھ رہوں گی۔''
''کیا مطلب ہے تمہارا...... کیا کہنا چاہ رہی ہو تم؟'' امی کا وجود ہل گیا۔
''مجھے صمد یزدانی کے ساتھ نہیں رہنا ہے، میں مہران خان کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''
''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے...... بالکل ہی غیرت مر گئی ہے۔ شادی شدہ اور شوہر والی ہو کر ایک غیر مرد کے ساتھ رہنے کی باتیں کر رہی ہو۔''
''میرے لیے صمد یزدانی بھی ابھی تک غیر ہی ہیں، ہم دونوں کے درمیان صرف ایک کاغذی بندھن قائم ہوا ہے جو صرف ایک کاغذ سے ختم بھی ہو جائے گا۔'' اس نے بے باکی سے کہا اور ماں کو ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔
پھر وہ علیحدگی کے لیے صمد کے پیچھے پڑ گئی۔ انہوں نے سختی نرمی ہر طرح سے اسے سمجھا کے دیکھ لیا۔ بالآخر تنگ آ کر اس کی ماں سے رابطہ کیا۔
''بیٹا میں تو اس لڑکی کی حرکتوں سے پریشان ہو گئی ہوں۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ شادی کے بعد یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ میں تو سمجھا سمجھا کر عاجز آ چکی ہوں کہ اب اس لڑکے کا خیال دل سے نکال دے اور تمہارے بارے میں سوچے۔''
''میرے بارے میں تو وہ علیحدگی لینے کا سوچ رہی ہے۔''
''نہیں نہیں تم ہرگز اس کی بات نہیں ماننا، وہ تو پاگل ہو گئی ہے...... تم سمجھداری سے کام لو ایسا کوئی قدم مت اٹھانا۔''
''آپ پریشان مت ہوں، میں ایسا کچھ نہیں کر رہا ہوں۔''
صمد رات کو سونے کے لیے کمرے میں آئے تو وہ ان کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔
''آپ نے کاغذات تیار کروا لیے؟'' اس نے عجیب جارحانہ سے انداز میں پوچھا۔
''کون سے کاغذات؟'' انہوں نے سمجھ کے بھی انجان بننے کی کوشش کی۔
''علیحدگی کے کاغذات...... اتنے دن سے آپ سے یہی ایک بات تو ہو رہی ہے۔''
''دیکھو رخسار تم صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور نہیں کر رہی ہو صرف جذباتی ہو رہی ہو۔ مجھ سے علیحدگی لینے کے بعد وہ لڑکا ہرگز تمہیں قبول نہیں کرے گا۔ مرد اس معاملے میں بہت تنگ دل اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔''
''یہ محض آپ کا خیال ہے جبکہ وہ تو انتظار میں بیٹھا ہوا ہے کہ میں کب اس کے پاس آتی ہوں۔''
''لگتا ہے تمہیں سمجھانا صرف پتھروں سے سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ تم میری اس سے بات کراؤ، میں اپنی تسلی کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔''
''آپ کا کیا مطلب ہے، آپ کے خیال میں وہ جھوٹ بول رہا ہے، مجھے دھوکا دے رہا ہے۔'' ان کی بات پر وہ بری طرح تپ گئی۔
''ہاں، یہی ہے میرا خیال...... کیونکہ غیر شادی شدہ مرد کے لیے کسی طلاق یافتہ لڑکی کو قبول کرنا بڑے حوصلے کی بات ہے۔''
''ہاں وہ اتنا ہی حوصلہ مند ہے۔'' رخسار نے ایک عزم سے کہا۔
''پھر تو اتنا ہی بے وقوف بھی ہے کیونکہ مجبوری میں ملنے والی طلاق اور جان بوجھ کر لی گئی طلاق میں بہت فرق ہے، مجبور مطلقہ سے شادی کرنا ثواب کا کام ہے جبکہ جان بوجھ کر طلاق لینا اور دلوانا گناہ کا کام ہے اور ایسی لڑکی سے شادی کرنے والا مرد ہرگز عقلمند نہیں ہو سکتا ہے...... جو عقلمند ہوگا وہ شادی نہیں کرے گا۔''
''یہ ساری باتیں آپ مجھے طلاق نہ دینے کے لیے کر رہے ہیں۔ میں کوئی ایسی شادی شدہ بھی نہیں ہوں۔''
''اس بات کا کیا مطلب ہے؟'' انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔
''مطلب یہ کہ ہم دونوں کا رشتہ صرف کاغذی رشتہ ہے۔''
''یہ بات ہم دونوں جانتے ہیں، وہ یا کوئی اور

بہنا

میں تجھ کو کیسے بھلاؤں بہنا
اپنے دل کو کیسے بہلاؤں بہنا

تیرا ساتھ جب سے مجھ سے ٹوٹا ہے
لگتا ہے یہ جگ بھی مجھ سے چھوٹا ہے

تجھ بن میں دکھ سکھ کس کو سناؤں بہنا
میں تجھ کو کیسے بھلاؤں بہنا

ادھورا مجھ کو کر کے سنگ تم نے توڑ لیا
اِک میں کیا سارے جہاں سے ہی منہ موڑ لیا

میں اپنا بندھن اب کس سے بناؤں بہنا
میں تجھ کو کیسے بھلاؤں بہنا

اب تو نہیں پر تیرے ہونے کا احساس ہے
تنہا ضرور ہوں مگر تیری یاد میرے پاس ہے

میں اپنے آنسو کیسے چھپاؤں بہنا
میں تجھ کو کیسے بھلاؤں بہنا

تیرا نام ہی میرے ماتھے کی بندیا تھا
تیرا ہونا ہی میری آنکھوں کی نندیا تھا

تیری چاہت کو کیسے مٹاؤں بہنا
میں تجھ کو کیسے بھلاؤں بہنا

صائمہ گلزار بندیال، لیہ

نہیں...... یقیناً وہ یہ بات آسانی سے ہضم نہیں کر سکے گا۔"

"بہر حال، اپنی تسلی کے لیے آپ اس سے بات کر لیجیے۔" اس نے مہران کا نمبر ملا کے موبائل انہیں پکڑا دیا۔ سلام دعا کے بعد وہ اصل بات پر آ گئے۔

"آپ رخسار کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"میں تو اب بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔"

"اب وہ ایک شادی شدہ لڑکی ہے، کیا آپ ایک شادی شدہ اور طلاق یافتہ لڑکی کو قبول کر لیں گے؟"

"میں اسے اتنا چاہتا ہوں کہ ہر حال میں اسے قبول کر لوں گا۔" اس کے الفاظ نے صمد یزدانی کا چہرہ سرخ اور مزید سنجیدہ کر دیا۔ اپنی بیوی کے لیے کسی غیر مرد کے منہ سے ایسے الفاظ سننا یا اپنی بیوی کی شادی کسی اور کے ساتھ کرنا ایک غیرت مند اور شریف مرد کے لیے مرنے اور مار دینے کا مقام تھا۔ اس لڑکی نے انہیں اس نہج پر پہنچا دیا تھا۔

"یہ تو ابھی کی بات ہے جب وہ میرے گھر میں ہے، اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ بعد میں بھی آپ کا فیصلہ یہی رہے گا۔ ہو سکتا ہے آپ ایک مطلقہ سے شادی نہیں کرنا چاہیں۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا، میں اپنی بات پر قائم رہوں گا۔" صمد یزدانی نے ٹھنڈی سانس بھر کے فون بند کر دیا۔

"اب ہو گئی آپ کی تسلی؟"

"نہیں، مجھے لڑکے پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔ اس لڑکے کے لیے لڑکی کا شادی شدہ اور طلاق یافتہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے تو اس کی نظر میں لڑکی کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو خود پر اعتبار نہیں ہے۔" وہ چڑ گئی۔

"مجھے تو تم پر حیرت ہو رہی ہے کہ تم اس حد تک احمق اور نادان ہو کہ اپنے شوہر سے زیادہ ایک غیر مرد پر بھروسا کر رہی ہو۔"

"میرے لیے تو آپ بھی غیر ہی ہیں، اس کاغذی بندھن کو میں نہیں مانتی۔" اس نے جل کر کہا۔

"تم پاگل اور بے وقوف ہو، ساری دنیا احمق تھوڑی ہے۔ اسی کاغذی بندھن پر نسلیں آباد ہوتی ہیں اور جس سے کاغذی بندھن بھی نہیں ہے اسے تو تم بہت مان رہی ہو۔" ان کی بات پر چپ ہو کر وہ نظریں چرانے لگی۔

"تم ایسا کرو کہ اسے پہلے نقلی طلاق نامہ دکھاؤ پھر دیکھو کہ اس کے تاثرات اور رویّہ کیا ہوتا ہے، اگر وہ تمہارے ساتھ مخلص اور وفادار ہوا تو اس کے تاثرات سے اس کے فیصلے کا اندازہ ہو جائے گا اور اگر اس کے دل میں تمہارے لیے گنجائش نہ ہوئی تو تم برباد ہونے سے بچ جاؤ گی۔"

"برباد تو میں اب ہوئی ہوں، وہ مجھے اس بربادی سے بچانا چاہتا ہے۔ ایک دفعہ میں اس کے ساتھ بے وفائی کر چکی ہوں اب دوبارہ میں اسے کوئی دھوکا نہیں دوں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی...... ویسے اسے ٹیسٹ کرنے کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے۔"

والدین اور تمام سسرال والوں نے اسے بہت سمجھایا لیکن اس نے کسی کی نہیں سنی۔ اس پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ صمد طلاق کے کاغذات تیار کرا کے لے آئے۔

"ابھی میں نے ان کاغذات پر سائن نہیں کیے ہیں اور نہ تمہیں زبانی طلاق دی ہے۔ وقت اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے، تم اچھی طرح سے سوچ سمجھ لو۔ کارروائی مکمل ہونے کے بعد میری طرف آنے والا تمہارا ہر راستہ بند ہو جائے گا۔ اگر تم حلالہ کر کے بھی میرے پاس آنا چاہو گی تو میں قبول نہیں کروں گا۔" لیکن وہ تو اندھی اور بہری ہو چکی تھی۔ عقل پر پتھر پڑ چکے تھے۔ سب کی باتیں بکواس لگ رہی تھیں۔ زبردستی کی شادی پر زبردستی کی طلاق لے کر وہ واپس والدین کے گھر آ گئی۔

☆☆☆

اس دن اس کے ماں باپ آدھے سے زیادہ مر گئے لیکن اسے تو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ابھی اس نے مہران خان کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ عدت کے بعد وہ اسے یہ تحفہ دینا چاہتی تھی۔ یہ دن اس کے لیے گزارنے مشکل ہو رہے تھے۔ ماں باپ نے اس سے بات چیت بند کر دی تھی۔ اسے کسی طرف دیکھنے کا ہوش نہیں تھا۔ کسی کے احساسات اور جذبات کی پروا نہیں تھی۔

عدت پوری ہونے کے بعد وہ خوشی، خوشی طلاق کے کاغذات لے کر مہران خان کے پاس پہنچ گئی۔

"دیکھو مہران، آج میں ہر بندش ہر بندھن سے آزاد ہو کر تمہارے پاس پہنچ گئی ہوں۔ تمہاری محبت اور تمہیں پانے کی لگن میں، میں نے سب کو شکست دے دی ہے۔ ارے بھئی یہ طلاق نامہ تو دیکھو۔ سب کی مخالفت مول لے کر میں نے یہ طلاق حاصل کی ہے۔"

"دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے یقین ہے کہ تم واقعی میں طلاق لے کر آئی ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"امی ابو دوبارہ میری شادی ہرگز دھوم دھام سے نہیں کریں گے۔ اس لیے چلو ہم آج ہی کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" مہران نے نہایت سختی سے کہا تو رخسار حیرت سے اس کی شکل تکنے لگی۔

"کک...... کیا مطلب؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ تم نے سب کی مخالفت میرے لیے مول نہیں لی اور سب کو میری خاطر شکست نہیں دی ہے۔ یہ سب کچھ تم نے اپنے لیے کیا ہے۔ اگر میری چاہ میں تم کچھ کرتیں تو اس شادی کو روک دیتیں۔ میری وجہ سے شادی ہی نہ کرتیں۔" اسے اپنے چاروں طرف بم پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے تو ہمیشہ مجھ سے یہی کہا تھا کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ تم نے تو صمد یزدانی سے بھی یہی کہا تھا۔" اس نے بدحواس ہو کر کہا۔

"ہاں، اس لیے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ کی جانے والی بے وفائی کی سزا دینا چاہتا تھا۔ تم اتنی بولڈ ہو کہ شوہر اور والدین کی عزت اور بدنامی کی پروا کیے بغیر سب کی مخالفت کے باوجود طلاق لینے جیسا بڑا کام کر لیا تو شادی کو روکنا تو تمہارے لیے بہت ہی معمولی سی بات تھی۔ تم میرے ساتھ باوفا اور سنجیدہ تھیں ہی نہیں پھر میں مرد ہو کر کیسے ایک شادی شدہ اور مطلقہ کو قبول کر لوں۔ اس وقت اگر اسی طرح تم میرے پاس شادی کرنے آ جاتیں تو میں اپنے گھر والوں سے تمہارے لیے لڑ سکتا تھا لیکن اب ایسی لڑکی کے لیے نہیں جو کسی کے ساتھ مخلص اور وفادار نہیں ہے، جو اپنی غرض کے لیے دوسروں کی عزتوں کو پامال کر سکتی ہے۔"

جس کے لیے اس نے ساری دنیا سے جنگ لڑی تھی وہ یوں اسے دنیا میں تنہا کر گیا۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن رو نہیں پا رہی تھی۔ چیخنا چاہتی تھی لیکن آواز گلے میں گھٹ کے رہ گئی تھی۔ اس کی ساری حسیں منجمد ہو چکی تھیں۔ واپسی کا ہر راستہ گم ہو چکا تھا۔

صمد یزدانی کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ کتنا صحیح پہچانا تھا انہوں نے اس شخص کو کاش وہ ان کی بات سن لیتی، مان لیتی...... کاش...... وقت پلٹ جائے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اتنا روئے کہ اپنے ہی آنسوؤں میں غرق ہو جائے اور کوئی اسے ڈھونڈ نہ سکے۔

☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

مکمل ناول

موسمِ گل حیراں ہے

صائمہ اکرم

رات کی تیرگی میں املتاس اور شہتوت کے درختوں میں گھری سیاہ کولتار سڑک پر سُرمئی رنگ کی ہنڈا سوک بہت سرعت سے دوڑتی جا رہی تھی۔ اس نے گاڑی کی کھڑکی سے آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھا جو اُن کے ساتھ ہی محوِ سفر تھے جبکہ راستے میں آنے والے شہروں پر گہری ہوتی رات ایک سحر کے مانند طاری ہو چکی تھی۔ وہ آج اس کے سحر میں گرفتار نہیں ہو سکی تھی۔ اس وقت آسمان پر جتنے

www.paksociety.com

ستارے تھے اس سے زیادہ وہم اور اندیشے اس کے ذہن کے آسمان پر پوری آب وتاب کے ساتھ دمک رہے تھے۔

وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بظاہر ٹیک لگائے انتہائی پُرسکون تھی لیکن اس کے اندر پریشانی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا بلو جینز کے ساتھ سفید گھریلو سی ٹی شرٹ میں ملبوس شخص اس کے لیے بالکل انجان تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش اس کو کچھ شناسا سے تو لگے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے۔

اسی لمحے اس نے بیک مرر سے اسے دیکھا، وریشہ نے گڑبڑا کر اپنی آنکھیں دانستہ باہر کے مناظر پر مرکوز کرلیں لیکن ایک لمحے میں وریشہ نے اس کے چہرے پر پھیلی خاموشی اور گہری سوچ کی پرچھائیوں کو پڑھا تھا۔ چہرے پڑھنا ویسے بھی اس کا مرغوب مشغلہ تھا۔ گاڑی میں وہ دونوں ہی تھے اس لیے بڑی بوجھل سی خاموشی ان کے درمیان تھی۔

گاڑی بہت تیزی سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ وریشہ ایک دفعہ پھر اپنی سوچوں میں غلطاں تھی۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے وہ کافی کا ایک بڑا سا مگ پاس رکھے اپنی میڈیکل کی کسی کتاب میں گم تھی پروفیسر جمال احمد نے کل ٹیسٹ لینا تھا اور وہ ٹیسٹ بری طرح سے اس کے حواسوں پر سوار تھا۔ اس کی روم میٹ ملیحہ تو اس ٹیسٹ کی تیاری کے لیے اپنے تایا کے گھر گئی ہوئی تھی جو خود بھی بہت اچھے ڈاکٹر تھے۔ راول پنڈی میں اس کے کوئی ایسے رشتے دار نہیں تھے اس لیے وہ ہر ویک اینڈ پر ہاسٹل میں ہی رہنے کو ترجیح دیتی تھی ویسے بھی یہ اس کا راول پنڈی میڈیکل کالج میں آخری سال تھا۔

وہ اس دن بھی اپنا بڑا سا مگ جس پر ''لیو'' اسٹار کا بڑا سا نشان بنا ہوا تھا، اس میں کافی منہ تک بھرے ہوئے ہاسٹل کے لان میں اپنے مخصوص پسندیدہ کونے میں براجمان تھی جب خلافِ توقع بابا کی کال آئی۔ اس کے دماغ نے کچھ انہونی کے سائرن تو دیے تھے مگر اس نے ان کو بری طرح جھٹک دیا تھا۔ بابا اس دن خلافِ عادت اور خلاف مزاج بہت تیزی سے بول رہے تھے۔ ان کی بات نے اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔ وہ بہت عجلت میں کہہ رہے تھے۔

''وریشہ! ایک گھنٹے تک تمہیں میرا اسٹوڈنٹ ابتہاج پک کرنے آئے گا، اپنا بیگ تیار کرلو تمہیں دس پندرہ دن کے لیے کہیں جانا ہے......''

''لیکن پاپا، میں دس پندرہ دن کے لیے کالج سے کیسے چھٹی کروں گی پھر پروفیسر جمال آج کل ٹیسٹ لے رہے ہیں۔'' وہ بڑی سرعت کے ساتھ ان کو بتا رہی تھی۔

''میری پروفیسر جمال سے بات ہوچکی ہے، انہیں کوئی اعتراض نہیں۔'' انہوں نے ایک اور بم اس پر گرایا تھا۔ ''دیکھو وریشہ مجھے کچھ دن کے لیے کہیں جانا ہے۔ کہاں اور کدھر اس کے جوابات میں فوری نہیں دے سکتا۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

''مجھے معلوم ہے کہ میری بیٹی بہت سمجھدار ہے، وہ ان فضول سوالات میں نہیں پڑے گی، میں کسی اور دن آپ سے تفصیل سے بات کروں گا۔'' وہ بابا کی بات پر حواس باختہ ہوکر سامنے پڑے کافی کے خالی مگ کو دیکھنے لگی۔ سارے الفاظ جیسے اس کے دماغ سے اڑ گئے تھے، انہوں نے تازہ تازہ سمجھداری کا تمغا پہنایا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خاموش ہوگئی، ورنہ دماغ میں مختلف سوالوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔

''میری بات سن رہی ہیں نا وریشہ آپ......؟؟'' ہمیشہ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے والے بابا آج بہت تیزی سے بول رہے تھے اور یہی بات وریشہ کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔

''ج...... جی بابا......'' اس نے فوراً بوکھلا کر جواب دیا اور پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔ ''آخر جانا کہاں ہے؟''

''بس وہ جہاں بھی لے جائے، آپ چلی جانا......'' بابا کا جواب اسے انتہائی بے تکا لگا تھا۔ پہلی دفعہ وریشہ کو بابا کی ذہنی حالت پر شک ہوا تھا تبھی تو وہ انتہائی فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

''بابا، آپ ٹھیک تو ہیں نا......؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا، بس کچھ دن کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ میری آپ سے بات بھی نہ ہوسکے، اس لیے پریشان نہیں ہونا۔'' وہ حد درجہ اسے مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

''کہاں......؟ کس ملک؟'' وہ کچھ اور پریشان ہوئی۔

''بیٹا میں نے کہا تھا ناں کہ زیادہ سوال نہیں کرنے۔'' وریشہ کو محسوس ہوا کہ بابا بری طرح جھنجلائے تھے۔ ان کی جھنجلاہٹ نے اسے بری طرح خفت میں مبتلا کردیا تھا۔

''آئی ایم سوری بابا۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

''ابتہاج آنے والا ہی ہوگا، تم اپنے ڈاکومنٹس اور سب ضروری کاغذات رکھ لینا اور کتابیں بھی۔'' وہ انتہائی غیر متوازن آواز میں اسے کہہ رہے تھے۔ ''اور ہاں یاد رکھنا پریشانیاں اور مسائل ہماری زندگی کا حصہ ضرور ہوتے ہیں لیکن پوری زندگی نہیں ہوتے، ان کے ساتھ ہی زیست بسر کرنا پڑتی ہے اس لیے ان کو ذہن پر سوار نہیں کرنا۔'' وہ پتا نہیں اسے کیا سمجھانا چاہ رہے تھے جب کہ وریشہ کو ان کی بے ربط گفتگو اور زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ وہ ایک دم ہی تناؤ کا شکار ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی بابا اختتامی الفاظ کہہ کر اس کا خدا حافظ سنے بغیر فون بند کرچکے تھے۔

اپنی چیزیں اٹھا کر وہ کمرے میں آئی تو پریشانی کے ساتھ ساتھ کوفت اور بیزاری بھی اس کے وجود میں سرائیت کرچکی تھی۔ انتہائی جھنجلاہٹ کے ساتھ اس نے اپنے بیگ میں کپڑے ٹھونسے تھے۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کچھ رکھ چکی ہے البتہ دوسرے بیگ میں کتابیں، نوٹس اور مختلف جرنلز اس نے بہت دھیان اور توجہ سے رکھے۔ اپنے سارے ڈاکومنٹس رکھنے کی تک اسے سمجھ تو نہیں آئی تھی لیکن بابا کی بات اس نے کبھی ٹالی نہیں اس لیے اس نے سارے کاغذات خاموشی سے رکھ لیے تھے۔ اپنی پیکنگ کے دوران اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی روم میٹ کو اپنے جانے کا بتا دے لیکن پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کردیا کیونکہ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ آخر جانا کہاں ہے؟

☆☆☆

شاور لے کر وہ اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی جب چوکیدار نے اسے باہر کسی مہمان کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ اپنے دونوں بیگ اس نے چوکیدار کے ہاتھ بھجوا دیے اور خود اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈال کر وہ باہر نکلی تو اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ گیٹ کے پاس بنے وزیٹنگ روم میں بیٹھا شخص اسے دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔

''آپ وریشہ سکندر ہیں ناں......؟'' وہ انتہائی اعتماد سے اس سے مخاطب تھا۔ وریشہ نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ وہ خاصا دراز قد تھا، اس کا جسم خاصا مضبوط اور رنگت سفید تھی، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ اس کی شخصیت کا نمایاں وصف اس کی خوداعتمادی اور بے نیازی تھی۔ اس وقت وہ دونوں بازو سینے پر باندھے بہت اطمینان سے اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔

”آپ ابتاج ہیں؟“ اس نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا ورنہ مدِمقابل کا انداز ہی اسے بتانے کو کافی تھا کہ وہ اسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔

”جی، مجھے ابتاج ہاشمی کہتے ہیں، مجھے سر نے بھیجا ہے۔“ اس نے مختصراً بتایا۔

”اٹس او کے......“ وہ زبردستی مسکرائی۔ ”کیا لیں گے آپ؟ چائے یا کولڈ ڈرنک......؟“ اس نے ایک اچھے میزبان کے طور پر رسماً ہی پوچھا تھا ورنہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس صورتِ حال میں کیا جواب دے گا۔

”نو تھینکس......! ہم لیٹ ہو جائیں گے ویسے بھی کافی لمبا سفر ہے۔“ اس کا لہجہ دوٹوک اور کسی بھی قسم کی گنجائش سے عاری تھا۔ وریشہ نے بھی کندھے اچکائے اور مزید اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اب اس کے بیگ اٹھا کر گاڑی کی ڈگی میں رکھ رہا تھا۔ وریشہ نے دیکھا وہاں پہلے سے ہی ایک لیدر کا بیگ پڑا تھا۔ وہ شاید خود بھی کہیں سے سفر کر کے آیا تھا۔ اس کی گاڑی پر پڑی گرد سے وریشہ نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ اس کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول چکا تھا۔ اس کے لبوں سے بے اختیار ایک پُرسکون سی سانس خارج ہوئی تھی، وہ خود بھی آگے بیٹھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ ابھی بیٹھی ہی تھی کہ سیل فون پر بابا کی کال آ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں ایک دم ہی ارتعاش برپا ہوا تھا۔ اس نے بے تابی سے کال اٹینڈ کی۔

”ابتاج آ گیا......؟“ دوسری طرف بابا اس کے سلام کا جواب دیے بغیر بہت بے چینی سے بولے تھے۔

”جی بابا......“ وہ جی بھر کر بدمزہ ہوئی۔

”او کے...... میری بات کرواؤ اس سے۔“ وہ اب کے ذرا اطمینان سے بولے تھے، جبکہ وریشہ کو نہ جانے کیوں غصہ آ گیا تھا تبھی اس نے خاموشی سے سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ ”بابا بات کرنا چاہتے ہیں۔“ اس کے حیرت زدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے فوراً وضاحت دی۔ وہ سیل فون لے کر قدرے فاصلے پر چلا گیا۔ وریشہ نے دیکھا وہ بس سر ہلا رہا تھا دوسری طرف بابا کی بات شاید لمبی ہو گئی تھی۔ اسے اس وقت سخت دھچکا لگا جب اس نے بات کر کے فون بند کر دیا۔ بابا نے اس سے بات نہیں کی تھی یہ بات گھنٹوں اس کا دل جلانے کو کافی تھی اور وہ تو ویسے ہی پورے خاندان میں حد درجہ حساس مشہور تھی۔ وہ کچھ بھی بولے بغیر ڈرائیونگ شروع کر چکا تھا۔ جیسے جیسے باہر اندھیرا پھیل رہا تھا ویسے ویسے وریشہ کے اندر ایک مایوسی پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے انتہائی بے دلی سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی تھی۔

اگلی سیٹ پر بیٹھا بندہ عادتاً کم گو تھا یا کسی مصلحت کی وجہ سے خاموش تھا وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ سفر شروع ہوئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا لیکن وہ مسلسل خاموشی اور سکون کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا جیسے اس سے زیادہ اہم کام دنیا میں کوئی نہ ہو۔

”ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں......؟“ اس نے بہ مشکل دل پر جبر کر کے اسے مخاطب کر ہی لیا۔ دوسری طرف سے استفہامیہ لہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

”آپ کو پروفیسر صاحب نے بتایا نہیں......؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی یا سادگی، وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ اب بھی پورے دھیان سے ڈرائیونگ میں مگن تھا۔ اس کی خاموشی وریشہ کو خفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

”ظاہر ہے نہیں بتایا تبھی تو آپ سے پوچھ رہی ہوں......“ اس نے ڈھٹائی کی حد کر دی تھی۔

”ابھی ان کی دوبارہ کال آئے گی تو پوچھ لیجیے گا......“ اس نے احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے شائستہ انداز میں کہا۔

”بابا کے سارے اسٹوڈنٹ ہی عجیب سے روکھے اور فلاسفر ٹائپ ہیں۔ ایک بھی کام کا نہیں۔“ اسے اچانک بیٹھے بیٹھے ارسلہ کا بے لاگ تبصرہ یاد آیا تھا۔ ارسلہ کی بات سے اس کی اچانک یاد بھی بے وقت آئی تھی، وہ اس کی اکلوتی بہن تھی اور شادی کے بعد اپنے میاں کے ساتھ جاپان میں مقیم تھی۔

”کتنی بدتمیز ہے ارسلہ، کتنے دنوں سے مجھے کال تک نہیں کی۔“ اسے بیٹھے ہوئے ایک اور دکھ یاد آیا تھا۔ دل میں خودترسی کے جذبات امڈ امڈ کر آ رہے تھے۔ اچانک اگلی سیٹ پر بیٹھا بندہ بولا۔

”آپ کا میڈیکل کا کون سا سال ہے۔“ وہ جو اپنی سوچوں میں گم تھی اس کی بات پر بے اختیار چونکی۔

”آپ کو کس نے بتایا کہ میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں......“ اس نے انتہائی بے تکا سوال کیا تھا۔

”ظاہر ہے میں نے آپ کو راول پنڈی کالج سے پک کیا ہے اور وہاں میڈیکل کی ہی تعلیم دی جاتی ہے۔“ اس نے جتایا نہیں تھا لیکن وہ بری طرح شرمندہ ہوئی، اسی لیے دانستہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”کیوں آپ کو پروفیسر صاحب نے بتایا نہیں؟“ اس کے دانستہ جتاتے ہوئے لہجے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابتاج کے چہرے پر دوڑی تھی۔ وہ بیک مرر سے اسے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

”میں نے پوچھا نہیں، ورنہ وہ بتا دیتے......“ اس کا انداز اور لہجہ خاصا مہذب تھا۔ وہ اب ٹھیک ٹھاک شرمندہ ہوئی تھی اس لیے خاموش رہی۔ ابتاج نے بھی اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ کی طرف مبذول کر لی تھی اس نے دوبارہ نہیں پوچھا تھا۔ گاڑی موٹر وے پر پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اتنی ہی تیزی سے مختلف یادیں اور مناظر وریشہ کے ذہن کے پردے پر دوڑ رہے تھے۔ اسے آج ارسلہ بری طرح یاد آ رہی تھی، وہ اس سے دو سال بڑی تھی لیکن دونوں میں کمال کی انڈر اسٹینڈنگ اور محبت تھی۔ سی ایس ایس کے بعد وہ فارن آفیسر کی حیثیت سے جاپان میں تعینات تھی؛ اس سے پہلے کچھ عرصہ اس نے اٹلی میں بھی گزارہ تھا۔ وہ حد درجہ ذہین و فطین اور اوور کانفیڈنٹ لڑکی تھی۔ ماما اور بابا اس کا تعارف بہت فخر اور محبت سے کرواتے تھے۔ ویسے تو دونوں بیٹیاں ہی ان کو عزیز تھیں لیکن شوخ و چنچل، حاضر دماغ اور باتونی سی ارسلہ ہر جگہ نمایاں ہوتی تھی۔ اس کے مقابلے میں وریشہ حد درجہ کم گو، تنہائی پسند اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی تھی حالانکہ ذہانت میں وہ بھی ارسلہ سے کم نہ تھی لیکن وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے سے گھبراتی تھی اس لیے ارسلہ کے مقابلے میں لوگ اس کی طرف کم ہی متوجہ ہوتے تھے۔

”ارسلہ ہر چیز میں اپنے باپ کا پرتو ہے جبکہ وریشہ میری کاپی ہے۔“ اسے ماما کی بات اچانک ہی یاد آئی تھی۔ ماما کی شخصیت حد درجہ سحر انگیز تھی۔ وہ ٹھنڈے مزاج کی بہت مضبوط اور متاثر کن اندازِ بیاں کی حامل خاتون تھیں۔ وریشہ کو کبھی... نہیں لگا تھا کہ وہ ماما کی کاپی ہے۔ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ ماما بس اس کا دل خوش کرنے کے لیے ایسا کہتی ہیں۔ ماما نے نفسیات میں پی ایچ ڈی کی تھی اور وہ یونیورسٹی میں اپنے شعبہ کی ہیڈ بھی رہی تھیں۔ ان میں اور بابا میں کمال کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔

گاڑی چلتے چلتے رکی تھی۔ وہ ایک دم ہی ہوش کی دنیا میں آئی تو دیکھا وہ پیچھے مڑ کر اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ یہ بھیرہ کا اسٹاپ ہے اور یہاں کافی اچھے ہوٹلز ہیں اور مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

”لیکن مجھے تو بھوک نہیں ہے۔“ وہ بے ساختہ

www.paksociety.com

بولی تھی لیکن اس کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ سے اسے اپنی بات کے بے تکے ہونے کا احساس ہوا۔

''اٹس او کے...... اگر آپ کو بھوک نہیں تو کوئی بات نہیں لیکن یقین مانیں میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ صبح ہی لاہور پہنچا تھا اور وہاں سے سیدھا راولپنڈی آ گیا......'' وہ انتہائی سادہ انداز میں بتا رہا تھا۔

''اوہ، آپ لاہور میں بابا سے مل کر آ رہے ہیں۔'' وہ ایک دم بے چین ہوئی۔

''جی ہاں......'' وہ اس کے بے صبرے پن پر مسکرایا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو ہم کھانا کھا لیں کیونکہ کافی لمبا سفر ہے۔''

''اوہ...... ہاں ضرور......'' آج وریشہ کے صرف شرمندہ ہونے کا دن تھا اسے کافی دیر سے اس بات کا احساس ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وریشہ نے غور سے دیکھا، وہ اچھا خاصا دراز قد اور وجیہہ شخصیت کا حامل تھا۔ اس نے باہر نکلتے ہی اس کی سائڈ کا دروازہ کھولا تو وہ چونک کر باہر نکلی۔ ٹھنڈی ہوا کا نم جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔

''لگتا ہے قریب ہی کہیں بارش ہو رہی ہے۔'' وہ بلند آواز میں بولا۔

''ہاں، اسی لیے موسم خوشگوار ہے۔'' وریشہ نے اس کی بات کا جواب دیا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی، وریشہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اس نے شاور لینے کے بعد بال ایسے ہی کھول رکھے تھے جو اَب اسے الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ وہ بیگ سے ہیئر بینڈ نکال کر قدرے بے پروائی سے بالوں میں ڈال رہی تھی۔

''آپ کے بال بالکل میڈم شائستہ کی طرح لمبے اور گھنے ہیں۔'' وہ بلا ارادہ ہی بولا تھا، اس کے سخت حیرت زدہ چہرے پر وہ پہلی دفعہ بری طرح خجل ہوا تھا۔

''آئی ایم سوری، اصل میں آپ کے نقوش میم کے ساتھ بہت ملتے ہیں اور پہلی نظر میں دیکھنے سے ہی احساس ہوتا ہے کہ آپ ان کی بیٹی ہیں۔'' وہ اب بلا ضرورت وضاحت دے رہا تھا۔

''آپ نے میری ماما کو دیکھ رکھا ہے؟'' ایک بے ساختہ سی خوشی کا احساس اس کے چہرے سے جھلکا تھا۔ وہ بالوں میں ہیئر بینڈ ڈالنا بھول کر اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔ ابتہاج نے پہلی دفعہ اس کو غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر بلا کی جاذبیت اور معصومیت تھی، بے حد پُرکشش آنکھیں، انتہائی متناسب جسم اور چہرے کے خدوخال خاصے پُرکشش تھے۔ ڈارک گرین لمبی اے لائن قمیص کے ساتھ میرون چوڑی دار پاجامے اور میرون ہی دوپٹے میں اس کی رنگت دمک رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت میں سنہری پن جھلکتا تھا۔

''آئیں اندر چلتے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ یہاں بھی بارش ہونے والی ہے۔'' اس نے صاف بات کو بدلا تھا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے وہ اس کی بات بدلنے پر اچھی خاصی کوفت کا شکار ہوئی تھی جبکہ وہ اس کے آگے آگے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سامنے ہوٹل کے داخلی دروازے پر پہنچ گیا تھا۔

''کیا لیں گی آپ؟'' وہ اب مینیو کارڈ ہاتھ میں پکڑے اس سے پوچھ رہا تھا جو اس سے دل ہی دل میں خفا ہوئی بیٹھی تھی۔

''کچھ بھی نہیں۔'' اس کے انداز میں ناراضی صاف جھلکی تھی۔

''سوری، اس مینیو میں تو اس نام کی کوئی چیز نہیں......'' وہ خاصی سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ وریشہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں آپ کی ماما کا نہیں بابا کا اسٹوڈنٹ

ہوں۔'' اس نے اس کے ناراض چہرے کے پیچھے چھپی ناراضی کو تیزی سے پڑھا تھا اس لیے اب بے پروائی سے کہہ رہا تھا۔ وریشہ اپنے بچگانہ انداز پر شرمندہ ہوئی اس لیے وہ اب مینیو دیکھ کر اسے ایک فرائڈ رائس منگوانے کا کہہ رہی تھی حالانکہ اس کا قطعاً بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ سارا دھیان بابا کی طرف تھا اس کو ابھی تک اس ایمرجنسی دورے کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''پتا نہیں بابا ٹھیک بھی تھے یا نہیں......؟'' وہ تھوڑا سا مضطرب ہوئی۔ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی ابتہاج کی زیرک نظروں سے نہیں چھپ سکی تھی۔

''کچھ باتوں کے جواب نہیں ہوتے ان کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیے، وقت بہت بڑا منصف ہے۔'' اس نے بہت سرعت سے اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھا تھا۔

''بابا ٹھیک ہیں ناں......؟'' وہ کچھ بے چین ہوئی۔

''الحمدللہ وہ بالکل ٹھیک ہیں، صبح ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی کر آیا ہوں۔'' وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا، وریشہ کو اس کے لہجے سے اندازہ ہو گیا تھا۔

''اوہ، تھینکس گاڈ......'' وریشہ کے لبوں سے بڑی پُرسکون سی سانس خارج ہوئی تھی۔ ''آپ نے ماما کو کہاں دیکھا ہے؟'' وہ اب اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔

''بھئی میں اسی یونیورسٹی میں تھا اور میڈم تو بہت ہر دل عزیز تھیں وہاں۔ میں تو ان کا زبردست فین تھا اور اکثر سر سے کہتا تھا کہ کاش میں آپ کے دور میں پیدا ہو جاتا تو میڈم کو ہرگز آپ سے شادی کرنے نہ دیتا۔'' وہ ہنستے ہوئے انتہائی شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کی بات پر وریشہ کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی تھی وہ جانتی تھی کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا۔ ماما حقیقت میں بہت خوب صورت اور پُروقار تھیں۔

''میڈم کھانا بہت اچھا بناتی تھیں، ان کے ہاتھ کا بنا ہوا حلیم کھانے کے لیے تو میں اکثر آپ کے گھر بھی آ جاتا تھا۔'' وہ اس کی بات پر بری طرح چونکی...... بابا کے اور ماما کے اسٹوڈنٹس دن رات ان کے گھر آتے تھے اس لیے ان دونوں بہنوں نے کبھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں حیرت پڑھ کر اب خوشگوار انداز سے کہہ رہا تھا۔

''اصل میں، میں پروفیسر صاحب کا بہت چہیتا اسٹوڈنٹ تھا اور ان سے میری بہت زیادہ دوستی ہے، مجھے ان سے بہت زیادہ عقیدت ہے، اس لیے وہ اکثر مجھے ضرورت سے زیادہ رعایت دے دیتے تھے۔'' وہ نہ بھی بتاتا تو وریشہ کو اس کی حیثیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ بابا اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے کسی عام بندے پر تو اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔

''لیکن میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا، نہ اپنے گھر نہ بابا کے ساتھ......'' وہ صاف گوئی سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں، ہو سکتا ہے۔'' اس نے اختلاف نہیں کیا تھا، وہ اب اپنی پلیٹ میں چاول نکال رہا تھا۔ ''لیکن میں نے آپ کو کئی دفعہ پہلے بھی دیکھ رکھا تھا۔''

''اچھا......؟'' وہ منہ میں نوالہ ڈالنا بھول گئی تھی۔ ''کہاں پر......؟'' اس کے چہرے پر تعجب کی فراوانی تھی۔

''ایک دفعہ آپ کے گھر، دوسری دفعہ ارسلہ کی شادی پر، تیسری دفعہ آپ کی ماما کی ڈیتھ پر اور چوتھی دفعہ اب......'' وہ سرسری سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''کیا......؟'' اسے خاصا جھٹکا لگا تھا۔ وہ اب ہاتھ میں پکڑا چمچہ، پلیٹ میں رکھ کر سخت حیرت سے

www.Paksociety.com

اسے دیکھ رہی تھی جو بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' اس نے تعجب سے اسے دیکھا جو کھانا، کھانا بھول گئی تھی۔

''آپ ارسلہ کی شادی پر آئے تھے؟'' وریشہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا، اسے یاد تھا کہ ماما کی بیماری کی وجہ سے بابا نے بہت ہی کم اور سلیکٹو لوگوں کو مدعو کیا تھا۔

''کیوں، نہیں آنا چاہیے تھا کیا؟'' وہ بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا، وریشہ گڑبڑا گئی۔

''نہیں نہیں، میرا مقصد یہ نہیں تھا اصل میں ارسلہ کی شادی پر بہت کم لوگ انوائٹڈ تھے، اس لیے مجھے حیرت ہے کہ میں نے آپ کو کیوں نہیں دیکھا۔''

''حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ سارا وقت میڈم شائستہ کے ساتھ تھیں اور اس فنکشن میں ان کی طبیعت خاصی خراب تھی۔''

''ہوں......'' وہ کچھ اداس ہوئی۔ اسے یاد آیا کہ اس دن ماما کی خرابی طبیعت کی وجہ سے فنکشن بہت مختصر کر دیا گیا تھا، نکاح کے فوراً بعد کھانا اور پھر رخصتی کر دی گئی تھی۔

''میڈم بہت گریس فل خاتون تھیں، اللہ ان کو جنت میں سب سے اچھے مقام پر رکھے۔'' وہ بہت عقیدت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کو اداسی کی کیفیت سے نکالنے کے لیے وہ ایک دم سے بولا تھا۔

''آپ ارسلہ سے بہت مختلف ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تھا۔

''اچھا......؟'' وہ مسکرائی۔ ''آپ ارسلہ کو بھی جانتے ہیں؟'' وہ تحیّر کے عالم میں کچھ دیر اس کی شکل دیکھتی رہی۔ اسے اس بات پر جھٹکا تو لگا تھا لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔

''ارسلہ نہ صرف میری کلاس فیلو تھی بلکہ بہت اچھی دوست بھی، اس کی شادی میرے بیسٹ فرینڈ اشعر سے ہوئی ہے، میں ان دونوں کو ملنے جاپان بھی گیا تھا۔''

''اشعر بھائی آپ کے دوست ہیں؟'' وہ ایک دفعہ پھر کھانا، کھانا بھول گئی تھی۔ ایک دفعہ پھر وہ خود کو حیران ہونے سے نہیں روک سکی تھی۔

''ہاں، وہ میرا بہترین دوست ہے، ہم دونوں کئی سال ہاسٹل میں ایک ہی روم میں رہے ہیں۔ وہ ارسلہ سے پہلی دفعہ میرے ہی توسط سے ملا تھا اور اس کے پروپوزل کا میں نے ہی آپ کے بابا کو بتایا تھا۔'' ابتہاج کی بات پر اسے یاد آیا تھا کہ ارسلہ کا پروپوزل بابا کے کسی اسٹوڈنٹ کے توسط سے آیا تھا اور ماما نے یہ بات یونہی سرسری سے انداز میں بتائی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' وہ رسٹ واچ پر وقت دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب پہلے کی طرح سنجیدگی سی طاری ہو چکی تھی۔ وہ جو صرف اس کا ساتھ دینے کے لیے زبردستی کھا رہی تھی، فوراً نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے کھڑی ہو گئی۔

وہ بل ادا کر کے اب باہر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا وریشہ نے بھی اس کی پیروی کی۔ باہر مکمل طور پر تیرگی کا راج تھا۔ مختلف قسم کی گاڑیاں وہاں کھڑی تھیں۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو اگلی سیٹ پر آ جائیں، مجھے کھانے کے بعد شدید قسم کی نیند آتی ہے، اگر آپ پیچھے سو گئیں تو مجھے بھی نیند آ جائے گی......اور ڈرائیور کی نیند کا انجام خاصا خطرناک ہوتا ہے۔''

''اوہ......'' وہ چونکی۔ ''نیور مائنڈ......'' وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''اگر آپ نہیں بیٹھنا چاہتیں تو کوئی پرابلم نہیں۔ اٹس۔ اوکے......'' وہ بہت اچھا چہرہ شناس تھا یا اس کا چہرہ ہی کھلی کتاب تھا۔ وریشہ سمجھ نہیں پائی۔

''نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔'' وہ پُراعتماد ہوئی۔

وہ بہت تیز رفتاری سے لیکن محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے اس کام میں خاصی مہارت تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر چپ کی چادر تان لی تھی۔ وریشہ کو پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ وہ خاصا موڈی قسم کا بندہ ہے۔ ایک لمحے میں اس طرح سے بات شروع کر دیتا تھا جیسے ازل سے شناسائی ہو اور اگلے ہی لمحے ایسا اجنبیت کا خول اپنی ذات کے گرد تان لیتا تھا کہ اچھا خاصا بندہ خجل ہو جائے۔ وریشہ نے اس کی اجازت کے بغیر ہی سی ڈیز کی سلیکشن کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کا انتخاب خاصا لاجواب تھا خصوصاً اقبال بانو اور غلام علی کی غزلیں دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔

''آپ کو موسیقی سے شغف ہے؟'' وہ ایک دم ہی سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''ہر وہ شخص جو جمالیاتی ذوق رکھتا ہو، ادب سے اس کی شناسائی ہو، زندگی کی خوب صورتیاں اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہوں، وہ لطیف قسم کے احساسات کا حامل ہو اسے یقیناً موسیقی بھی بھاتی ہی ہے......'' وہ بہت دھیمے انداز میں بولی تھی۔ اس کی بات کو ابتہاج نے خاصا انجوائے کیا تھا۔

''بہت خوب...... میرا خیال ہے کہ میڈیکل کے لوگ ان چیزوں سے دور ہی بھاگتے ہوں گے۔''

''کیوں، میڈیکل کی دنیا کے لوگ کیا انسان نہیں ہوتے......؟'' اس نے برا مان کر کہا تھا۔

''نہیں، انسان تو ہوتے ہیں لیکن سنا ہے قدرے خشک اور بور......'' وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

''سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے، ورنہ ہم دکھی انسانیت کی خدمت کرنے والے لوگ جتنے حساس ہوتے ہیں آپ لوگ اندازہ ہی نہیں کر سکتے...... اور ہر حساس دل کو نازک جذبات کی حامل چیزیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔''

''ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ابتہاج نے مزید بحث کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ورنہ اس کی بات پر وہ اچھی خاصی بحث کر سکتا تھا۔

''آپ کو پتا ہے بابا نے مجھے اس طرح اچانک کیوں ہاسٹل سے بلوایا ہے اور کہاں بھیج رہے ہیں؟'' جگجیت کی سی ڈی کو ہاتھ میں پکڑے اس نے اچانک ہی موضوع بدلا تھا۔

''جی نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ وریشہ کو اس کے جواب سے سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی سی ڈی ڈیش بورڈ میں رکھتے ہوئے قدرے خفا انداز سے کہا۔ ''اچھا یہ تو آپ کو علم ہوگا کہ ہم جا کہاں رہے ہیں یا پھر یہ بھی نہیں پتا اور آپ شوقیہ ہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے پھر رہے ہیں۔''

ابتہاج نے سبک رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے اس کو مسکرا کر دیکھا جو تھوڑا سا رخ موڑے باہر اندھیرے میں بھاگتے دوڑتے درختوں میں پتا نہیں کیا چیز تلاش کر رہی تھی۔ باہر تاریکی کے ساتھ گہرا سناٹا تھا۔

''آپ کو نیند تو نہیں آ رہی......؟'' وہ فکرمندی سے پوچھ رہا تھا اس کے اس طرح بات پلٹنے پر وریشہ نے باقاعدہ مڑ کر اسے غصے سے گھورا تھا۔

''ایسے نامعلوم سفر پر جاتے ہوئے بھلا کس کو نیند آئے گی۔'' وہ بلند آواز میں بڑبڑائی تھی۔ اس کی بات پر ابتہاج بے ساختہ ہنسا تھا۔

''آپ ناراض نہ ہوں، ہم لوگ ملتان کے ایک گاؤں.... جا رہے ہیں۔''

''ملتان کے گاؤں......کون سے گاؤں......'' وہ ناراضی بھلائے اب باقاعدہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سخت حیران تھی۔

''دیکھا، میں انہی سوالوں کی وجہ سے نہیں بتا رہا

تھا، گاؤں کا نام بتا دوں تو کیا فائدہ، آپ کون سا پہلے ملتان گئی ہیں۔'' اس نے صاف اسے چھیڑا تھا۔

''آپ سے کس نے کہا کہ میں نے ملتان نہیں دیکھا؟'' وہ اسے گھورتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''آپ کے بابا نے......'' اس کے جواب نے وریشہ کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی تھی۔

''ہاں، ٹھیک کہا تھا بابا نے......'' وہ تھوڑا سا دھیمی ہوئی۔'' وہاں کس کے پاس جا رہے ہیں اور کیوں......؟'' وہ تھوڑا سا فکر مند ہوئی۔

''یہ آپ کو پتا چل جائے گا وہاں جا کر......'' وہ مبہم سے انداز میں مسکرایا۔

''کیا پتا چل جائے گا، اچھا خاصا بیٹھے بٹھائے مجھے ایمرجنسی اور خفیہ دورے پر بھجوا دیا ہے اور پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ سب ٹھیک ہے۔'' وہ تھوڑا سا چڑ کر بولی تھی۔

''کیا آپ کو اپنے بابا پر اعتبار نہیں۔'' وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

''استغفر اللہ میں نے ایسا کب کہا؟'' اس کے چہرے پر حیرت کی فراوانی تھی، وہ باقاعدہ برا مان گئی تھی۔

''آپ اس طرح ناراض جو ہو رہی ہیں۔''

''میں ناراض نہیں ہو رہی، مجھے بس بابا کی ٹینشن ہے، انہوں نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا اور ان کو پتا ہے کہ میرا میڈیکل کا آخری سال ہے۔'' وہ جذباتی ہوئی۔

''ان کا تعلق بھی شعبۂ تعلیم سے ہے اور ان سے زیادہ کون وقت کی اہمیت سے آگاہ ہوگا۔ آپ تھوڑا سا صبر و تحمل کریں۔ کچھ چیزیں ٹائم مانگتی ہیں۔ سب کچھ انشاء اللہ بہت جلد واضح ہو جائے گا۔'' وہ بہت سکون سے اسے سمجھا رہا تھا۔

''مجھے وقت کے ضائع ہونے کا دکھ نہیں، آپ میرا پوائنٹ آف ویو سمجھ نہیں رہے، مجھے اس چیز کی ٹینشن ہے جس کی وجہ سے بابا نے اس طرح ایمرجنسی میں مجھے بلایا ہے۔ ورنہ وہ اسٹڈی کے معاملے میں کس قدر ٹچی ہیں آپ کو اس چیز کا بخوبی اندازہ ہوگا۔''

''اگر ایسی کوئی بات ہے تو آپ کو ٹینس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں، وہ پندرہ دن کے لیے کوئی سیمینار اٹینڈ کرنے انڈیا جا رہے ہیں اور بالکل ٹھیک ہیں۔'' اس نے انکشاف کیا تھا۔

''تو وہ کون سا پہلی دفعہ ملک سے باہر جا رہے ہیں۔'' وہ بالکل بھی نہیں چونکی تھی۔

''ہاں آپ کو پہلی دفعہ انہوں نے آپ کی مرضی کے خلاف بھجوایا ہے یہ شاید آپ کو اچھا نہیں لگا۔'' اس کی بات پر وہ بالکل ٹھنڈی ہو گئی جبکہ وہ اس کے یوں خفت زدہ چہرے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بادلِ ناخواستہ بولی تھی۔

''ویسے آپ کے بابا کی ایک رائے تو آپ کے متعلق غلط ہے۔'' وہ خوشگوار انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وریشہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ان کا خیال ہے کہ آپ خاصی کم گو ہیں اور بحث بالکل نہیں کرتیں......'' ابتاج کی آنکھوں میں بے حد دلچسپی تھی۔ اس کی بات پر وریشہ خجل سی ہو کر فوراً وضاحت دینے لگی۔

''اصل میں سب اس طرح اچانک ہوا کہ میں بوکھلا گئی اور ایسی سچویشن میں اچھے خاصے بندے کی مت ماری جاتی ہے اور میں تو ارسلہ کی طرح بالکل بھی مضبوط اعصاب کی مالک نہیں۔''

''میرا خیال اس کے برعکس ہے، آپ ارسلہ سے زیادہ مضبوط ہیں اور اس کی طرح بالکل بھی

جذباتی نہیں......'' وریشہ نے بوکھلا کر اس کی شکل دیکھی جس کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں۔

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وریشہ کو حد درجہ تعجب ہوا۔

''میں نے میڈم شائستہ کی ڈیتھ والے دن آپ کو دیکھا تھا، آپ ارسلہ کے مقابلے میں بہت حوصلے سے تھیں اور جس طرح اسے سنبھال رہی تھیں وہ بھی حیران کن تھا۔ پروفیسر صاحب اکثر آپ کی تعریف کرتے ہیں۔'' وہ بڑی مہارت سے گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

''میری تعریف کرتے ہیں؟'' وہ سخت حیران ہوئی۔'' حالانکہ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ ارسلہ کے زیادہ قریب ہیں اور ارسلہ نے ان کی خواہش کے مطابق سی ایس ایس کیا، جبکہ میں ماما کے زیادہ قریب تھی اور ماما کی آرزو تھی کہ ان کی ایک بیٹی ڈاکٹر بنے۔'' وہ ناخن کھرچتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

''اچھا، ہوسکتا ہے لیکن میں نے اکثر ان کو ارسلہ کے بجائے آپ کی تعریف کرتے زیادہ سنا ہے۔'' وہ سادہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ انتہائی سکون سے گاڑی چلا رہا تھا چونکہ رات کافی ہو چکی تھی اس لیے باہر سڑک پر ٹریفک کم تھا، زیادہ تر بڑے بڑے ٹرک اور ٹرالر ہی چل رہے تھے۔ وہ لوگ اب پنڈی بھٹیاں والی سڑک پر تھے جو خاصی خراب تھی۔ اس لیے گاڑی ہچکولے کھا رہی تھی۔

''بہت گندا روڈ ہے۔'' وریشہ خاصی ناگواری سے بولی۔

''کیا کیا جائے، اب کبیر والا تک ایسی ہی سڑک کو برداشت کرنا پڑے گا۔'' وہ رسٹ واچ سے ٹائم دیکھتے ہوئے فکر مندی سے اسے بتا رہا تھا۔ اسی دوران گاڑی ایک جھٹکا کھا کر چلتے چلتے اچانک ہی رکی تھی۔ انجن نے کچھ لمحوں کے لیے شور مچایا اور اس کے بعد ساکن ہو گیا۔

''یہ کیا ہوا......؟'' وریشہ کا دل دھک کر کے رہ گیا، اس نے خوفزدہ نظروں سے اس سنسان سڑک کو دیکھا جس کے دائیں بائیں گندم کے کھیت تھے۔

''ڈونٹ وری......! میں دیکھتا ہوں۔'' اس کے چہرے پر بڑی حوصلہ کن مسکراہٹ تھی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آگیا اور گاڑی کا بونٹ اٹھا کر انجن دیکھنے لگا۔ وہ بڑی توجہ سے مختلف تاروں کو گھما پھرا کر دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ کہیں انجن تو گرم نہیں ہو گیا؟'' وریشہ نے اسے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔ وہ بار بار چابی گھما رہا تھا لیکن انجن بالکل بے جان تھا۔

''نہیں، ابھی موٹر وے سے اترتے ہوئے تو پانی ڈالا تھا......'' وہ ابھی بھی پُرسکون تھا۔ اس کے انداز میں بالکل بھی تشویش یا فکر مندی نہیں تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر گاڑی سے اتر کر انجن کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب اسے پانچ منٹ سے زائد ہو گئے تو وریشہ گھبرا کر نیچے اتر آئی۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ دور کہیں گیدڑ کے بولنے کی آواز سے وہ خوفزدہ ہوئی۔

''کیا ہو گیا اس کو اس وقت......؟'' وریشہ نے پریشانی بھری جھنجلاہٹ سے کہا۔

''کچھ نہیں ہوا، حوصلہ کریں، ہر کام کی کامیابی کی پہلی شرط صبر و تحمل ہوتا ہے......'' ابتاج نے متبسم لہجے میں کہا۔

''اتنی سنسان جگہ پر صرف چور ڈاکو ہی صبر و تحمل سے کھڑے ہو سکتے ہیں۔''

''بس پھر آپ کچھ دیر کے لیے خود کو چور ڈاکو ہی سمجھ لیں۔'' مشورہ مفت حاضر تھا۔ وہ چونکہ انجن پر جھکا ہوا تھا اس لیے وریشہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پائی تھی۔

''مجھے لگتا ہے جنریٹر فیل ہو گیا ہے......'' ابتاج کے لہجے میں پہلی دفعہ تشویش کا عنصر شامل ہوا تھا۔ اس کی اطلاع پر وریشہ نے سخت ہراساں نظروں سے اسے دیکھا۔

''اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں، بس تھوڑا سا مستری کا کام ہے۔'' اس نے سر

www.Paksociety.com

اٹھا کر وریشہ کا خوفزدہ چہرہ دیکھا۔ ”یہ آپ کو کیا ہوا؟“ اتنی ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں؟“ اس نے شرارت بھری سنجیدگی سے پوچھا۔

”ظاہر ہے اس طرح کے حالات میں ہر نارمل انسان پریشان ہو سکتا ہے۔ میں نے کون سا انوکھا کام کیا ہے۔“ وریشہ چڑ گئی تھی نہ جانے آج اسے بار بار غصہ کیوں آ رہا تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”آپ کے اس طرح پریشان ہونے سے کیا گاڑی خود بخود ٹھیک ہو جائے گی؟“ دونوں بازو سینے پر باندھے اسے انتہائی سکون سے کھڑے دیکھ کر وریشہ کو اس پر بے ساختہ رشک آیا تھا۔

”ایسے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے سے بھی ٹھیک نہیں ہوگی......“ اس کے طنزیہ انداز پر ابتہاج قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز دور تک گونجی تھی۔

”چلیں، آپ کو میرے ہاتھ باندھنے پر اعتراض ہے تو میں سیدھا کھڑا ہو جاتا ہوں۔“ رات کے اس پہر اس کی شوخی وریشہ کو سخت بری لگی تھی اس لیے وہ خاموش رہی۔ اسی وقت ایک ٹرک ست روی سے چلتا ہوا ان کے پاس آ کر رکا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ اندر جا کر بیٹھیں، اس طرح آپ کا سڑک پر کھڑے ہونا مناسب نہیں۔“ وہ بہت مہذب انداز میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔ ٹرک سے دو بندے اتر کر ان کی جانب آ رہے تھے۔ وریشہ فوراً گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی لیکن اس کا سارا دھیان ان کی گفتگو کی طرف تھا۔ اسے تھوڑا سا غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ وہ لوگ پشتو میں گفت و شنید کر رہے تھے جسے سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔

وہ تینوں ایک دفعہ پھر گاڑی کے انجن پر جھکے ہوئے تھے۔ ابتہاج نے ایک دفعہ پھر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ پھر مایوس ہو کر سر نفی میں ہلانے لگا تھا۔ اس کے بعد ٹرک ڈرائیور نے دھکا لگا کر گاڑی کو ایک سائڈ پر کیا۔ انہوں نے دوبارہ آپس میں کوئی بات کی اور اس کے بعد وہ اپنا ٹرک اسٹارٹ کر کے لے گئے۔ ان کے جاتے ہی وریشہ بجلی کی سی تیزی سے نیچے اتری اور بے تابی سے بولی۔

”کیا ہوا...... یہ لوگ کیوں چلے گئے؟“

”ظاہر ہے جانے والوں نے جانا ہی ہوتا ہے، کوئی کسی کے لیے کتنا ٹھہر سکتا ہے۔“ رات کے اس پہر وہ اس کا فلسفہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”آپ نے ان کو کیوں جانے دیا؟“ وریشہ قدرے زچ ہو کر بولی۔

”کمال کرتی ہیں آپ، میں ان کو بھلا کیسے روک سکتا تھا۔“ ابتہاج نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جتایا تو وہ چپ کی چپ رہ گئی۔

”فکر مت کریں، ان لوگوں نے وعدہ کیا ہے کہ آگے جا کر کسی مکینک کو بھیجیں گے......“ اس کی خاموشی پر اس نے مسکراتے ہوئے تسلی دی جبکہ وریشہ نے بڑی سرعت سے اپنی کیفیت پر قابو پایا وہ اب لاتعلقی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”آپ ٹینس نہ ہوں اللہ بہتر کرے گا۔“ وہ اب بہت نرمی سے اس سے مخاطب تھا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں......“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے سامنے جھاڑیوں میں دیکھنے کی کوشش کی، جہاں پر کسی جانور کی موجودگی کا احساس ہی اتنا خوفناک تھا کہ اس کے چہرے پر بڑی برق رفتاری سے خوف کی پرچھائیاں پھیلی تھیں۔ ابتہاج نے چونک کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور اسے تسلی دی۔

”میرا خیال ہے کہ وہاں جھاڑیوں میں کوئی گیدڑ ہے یا کوئی آوارہ کتا، میں دیکھتا ہوں۔“ وہ جیسے ہی آگے بڑھنے لگا وریشہ نے بلا ارادہ اور بے ساختہ

اس کا بازو پکڑا تھا۔

”دفع کریں، پتا نہیں کیا چیز ہو، ہم گاڑی میں جا کر بیٹھتے ہیں۔“ خوف کے ایک ان جانے قسم کے احساس کے زیر اثر اس نے بالکل لاشعوری طور پر اس کا بازو صرف ایک لمحے کو پکڑا تھا اور اگلے ہی لمحے اپنی حرکت کا احساس ہوتے ہی وہ سٹپٹا گئی۔ اس کا سرخ چہرہ ابتہاج نے بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات بہت واضح تھے۔

”اٹس اوکے......“ اس کا انداز متبسم و شریر تھا جبکہ وریشہ خفت زدہ ہو کر خود کو اس بے اختیاری حرکت پر دل ہی دل میں کوس رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس قدر دلچسپ تھے کہ ابتہاج زور سے ہنس دیا جیسے کوئی پرلطف بات سنی ہو جبکہ وہ اس کی معنی خیز ہنسی سمجھنے سے قاصر تھی۔ اچانک ہی پولیس کی گشتی گاڑی ان کے پاس آ کر رکی۔ وریشہ فوراً ہی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

پولیس کی گاڑی کی لائٹیں روشن تھیں اس لیے سامنے کا منظر واضح تھا۔ وہ ان دونوں سے گفت و شنید کرنے میں مگن تھا اور وریشہ کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ عجیب سی کیفیات میں گھر گئی تھی۔ وہ ابھی تک اس نظر کے حصار میں تھی جب اس نے لاشعوری طور پر اس کا بازو پکڑا تھا تب اس نے اس قدر حیرت سے اسے دیکھا تھا کہ وریشہ کو اس کے تاثرات بھلائے نہیں بھولتے تھے۔

”ہر مشکل اور ہر پریشانی کا اللہ پاک کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال دیتا ہے، بس اللہ پر بھروسا ہونا چاہیے۔“ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بہت متوازن لہجے میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

وریشہ نے چونک کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔

”بس پانچ منٹ میں مکینک یہاں ہوگا، پولیس والے اسے لینے گئے ہیں۔“

”حیرت ہے، آپ نے پولیس والوں کی بات کا اعتبار کر لیا۔“ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔

”کیوں، نہیں کرنا چاہیے تھا کیا؟“ وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

”ظاہری بات ہے۔ ان کا امیج ایسا بن چکا ہے کہ اعتبار کرنا بے وقوفی ہی لگتی ہے۔“ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے کہ اس شعبے کے سارے لوگوں کا امیج ہی منفی ہے۔ ان میں اچھے لوگ کوئی نہیں؟“ وہ بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”نہیں، خیر ایسا بھی نہیں۔“ وہ اب خاموشی سے اپنی دوسری انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو بہت فرصت سے گھما رہی تھی۔

”وریشہ انصاری، زندگی گزارنے کے لیے اگر ہم مثبت رویہ اپنا لیں تو یقین کریں زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے، اللہ انسانوں کو وہی دیتا ہے جس کا وہ گمان کرتے ہیں۔“ اس کی بات پر اس نے دہل کر اسے دیکھا۔

”اللہ نہ کرے جو میں اس وقت سوچ رہی ہوں ویسا ہو جائے۔“ وہ یکدم خفگی سے بولی...... وہ اس کے اس انداز پر محظوظ ہوا۔

”اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اچھا اچھا سوچا کریں۔“ اس نے مفت مشورہ دیا۔

اگلے پانچ منٹ میں پولیس وین واپس آ گئی تھی۔ ابتہاج نے کچھ جتاتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تھا جو بے اختیار جھینپ گئی تھی۔ پرانے سے کپڑوں میں جمائیاں لیتا ہوا مکینک اب انجن پر جھکا ہوا تھا۔ کوئی تھوڑا سا ہی کام تھا وہ جیسے ہی ہاتھ جھاڑتا

ہوا کھڑا ہوا، ابتہاج نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی۔ انجن اس دفعہ پوری قوت سے جاگ اٹھا تھا۔ وریشہ کے چہرے پر طمانیت بھری خوشی جھلکی تھی۔

''تھینکس گاڈ!'' اس نے خلوصِ دل سے کہا تھا۔

اگلے ہی دس منٹ میں گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔

''زندگی بھی گاڑی کی طرح ہوتی ہے، کبھی کبھی پریشانیوں کے کسی جھٹکے سے رک سی جاتی ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ یہ کبھی چلے گی ہی نہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا، کوئی بھی موسم چاہے وہ مایوسی یا قنوطیت کا ہی کیوں نہ ہو، اسے بدلنا ہی ہوتا ہے۔ یہی فطرت کا قانون ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اور پتا ہے غیر موافق حالات بھی اسپیڈ بریکر کی طرح ہوتے ہیں، کبھی کبھی تو اچانک ہی سامنے آجاتے ہیں، وقتی طور پر جھٹکا ضرور لگتا ہے لیکن کچھ ہی دیر بعد زندگی کی سڑک بھی ہموار ہوکر رواں دواں ہوجاتی ہے۔''

''آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔'' ایک پریشانی نے بے ساختہ ہی اس کا دامن پکڑا تھا۔ وہ بری طرح گھبرائی تھی۔ ابتہاج کا قہقہہ بڑا بے ساختہ اور جاندار تھا اس نے اس کی بات کو خاصا انجوائے کیا تھا۔

''میں تو ویسے ہی کچھ فلسفہ جھاڑنے کے موڈ میں تھا۔ آپ نے سارا موڈ ہی غارت کردیا۔ بائی دا وے آپ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے گھبرا کیوں جاتی ہیں۔''

''اس لیے کہ مجھے ٹارزن بننے کا کوئی شوق نہیں۔'' اس بار وریشہ نے قدرے تحمل سے کہا۔ وہ پھر ہنس دیا۔

''کیوں ٹارزن، انسان نہیں ہوتے کیا......؟''

وہ اسی کے انداز میں بولا تھا اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہوچکا تھا حالانکہ رات کے دو بج رہے تھے۔

''پتا نہیں۔'' وہ بیزاری سے بولی تھی۔

''اچھا یہ بتائیں کہ آپ نیکسٹ کس میں اسپیشلائزیشن کریں گی، خدا کے واسطے یہ مت کہیے گا کہ گائنی میں......'' اس نے میڈیکل کے حوالے سے اس سے پوچھا تھا۔

''بے فکر رہیں، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں......'' وریشہ نے ابرو اچکا کر کہا۔

''اچھا پھر کس میں ہے؟'' وہ بڑی مہارت سے گاڑی چلاتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا، وریشہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ صرف اپنی نیند کو بھگانے کے چکر میں اس سے زبردستی گفتگو کر رہا تھا۔

''میرا ارادہ نیورلوجی میں جانے کا ہے ہمارے ملک میں نیوروفزیشن کی تعداد بہت کم ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''اگر تعداد کی بات کرتی ہیں تو پاکستان میں خواتین انکولوجسٹ (ماہر سرطان) کی تعداد اس شعبے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ کچھ سال پہلے ایک سروے ہوا تھا اور مجھے سخت حیرت ہوئی کہ پاکستان میں اس وقت صرف چھ خواتین تھیں۔'' وہ بھی حد درجہ سنجیدہ تھا۔ وریشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، اصل میں خواتین ڈاکٹرز کی ایک بڑی تعداد گائنی میں چلی جاتی ہے لیکن اب ٹرینڈ تبدیل ہو رہا ہے اب تو لڑکیاں ان شعبوں میں بھی نظر آتیں ہیں جو پہلے صرف مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے تھے۔ اب تو آرتھوپیڈک شعبے میں بھی کافی لڑکیاں دکھائی دینے لگی ہیں۔'' وریشہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟''

''کچھ خاص نہیں، بس زندگی گزار رہے ہیں۔'' وہ بہت عاجزی سے بولا تھا۔

''کیا کوالیفکیشن ہے آپ کی......؟'' وہ سادہ سے انداز میں گویا ہوئی۔

''ایک نالائق بندے کی کیا کوالیفکیشن ہوسکتی ہے؟'' اس نے صاف ٹالا تھا۔

''خیر نالائق تو آپ نہیں ہوسکتے۔'' اس نے سامنے لمبی سڑک کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟'' وہ ہنسا اور دلچسپی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میرے بابا نالائق لوگوں کو لفٹ نہیں کرواتے۔'' اس کے شرارتی انداز پر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ وریشہ نے بوکھلا کر اس کی شکل دیکھی۔

''خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، میں واقعی بہت نالائق تھا، ارسلہ کے نوٹس پڑھ پڑھ کر پاس ہوتا رہا ہوں۔'' اس نے بڑی مہارت سے موڑ کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے جگمگا رہی تھیں۔ وریشہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں خاصی چمکدار اور روشن ہیں۔

''یہ بات تو میں مر کر بھی نہیں مان سکتی کیونکہ ارسلہ اپنے نوٹس دینے کے معاملے میں بہت پکی ہے۔ وہ اپنا لکھا ہوا ایک لفظ بھی کسی سے شیئر نہیں کرتی۔ اس معاملے میں وہ بہت بدلحاظ ہے۔'' اس کی صاف گوئی پر ابتہاج نے باقاعدہ مڑ کر اسے دلچسپی سے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کیے بہت اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ بے تحاشا خوب صورت تھے ایسا لگتا تھا جیسے سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے ہوں، ابتہاج کچھ لمحوں کے لیے اس کے ہاتھوں سے نظریں ہٹانا بھول گیا تھا۔ گاڑی ایک دم ہی اچھلی تھی۔

''سوری، میں نے اسپیڈ بریکر دیکھا نہیں......'' وہ اپنا سر سہلاتے ہوئے ایک دم شرمندہ ہوا تھا۔ وریشہ نے بہ مشکل اپنی ہنسی کو روکا تھا۔

''ایسے ہی اسپیڈ بریکر کی کچھ دیر پہلے آپ بات کر رہے تھے ناں، جو زندگی میں بھی اچانک آجاتے ہیں لیکن دیکھ لیں کچھ دیر کے لیے حواس باختہ تو کردیتے ہیں ناں......'' اس کے باقاعدہ جتانے پر وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔ اس کا اب سارا دھیان ڈرائیونگ کی طرف تھا۔

''آپ اگر تھک گئی ہیں تو سیٹ کو پیچھے کر کے ریسٹ کرلیں۔ میری ٹینشن نہ لیں، میری نیند اڑ گئی ہے۔ اب میں آرام سے ڈرائیونگ کرسکتا ہوں۔'' وہ بہت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھے بغیر کہہ رہا تھا۔

''اٹس اوکے......'' وریشہ نے تھوڑا سا سیٹ کو ریلکس کیا۔ وہ اب کیسٹ پلیئر چلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی میں مغنیہ کی آواز گونج رہی تھی۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی، کتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا، کتنی مداراتوں کے بعد

وہ آواز کے سوز اور شاعری کو غور سے سن رہی تھی۔ باہر بالکل سناٹا تھا۔ سڑک پر اِکا دُکا ٹریفک تھی اس لیے وہ پوری قوت سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اس نے سیٹ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگا کر ٹانگیں احتیاط سے قدرے پھیلالی تھیں۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ شاید کوئی تیسری غزل تھی جب اس کی آنکھ لگ گئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ گہری تھکن کے احساس کے تحت نیند کی وادیوں میں کھوچکی تھی۔

مختلف گاڑیوں کے ہارن اور شور کی آوازوں سے اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا گئی۔ چمکدار دن پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوچکا تھا۔ باہر اچھی خاصی دھوپ تھی۔ وہ گاڑی ایک پٹرول پمپ پر روک چکا تھا۔

''سامنے واش روم ہیں، آپ فریش ہوجائیں۔'' ابتہاج کی آواز سے وہ یک دم ہوش کی دنیا میں آئی تھی اسے فوراً احساس ہوا کہ تھا کہ وہ کہاں

www.Paksociety.com

ہے، تبھی ہڑ بڑا کر ٹھیک ہو کر بیٹھ گئی۔
''آپ نے مجھے اٹھایا ہی نہیں۔'' اس نے شرمندگی سے وقت دیکھتے ہوئے کہا۔
''آپ نے اٹھ کر کیا کرنا تھا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا، ٹھٹکا اور چند لمحوں کے لیے اس کے خوابیدہ حسن سے نظریں ہٹانا ہی بھول گیا۔ اس نے اپنے آپ سے خائف ہوتے ہوئے بہ مشکل نظریں ہٹائی تھیں اور فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وریشہ بھی اس کے پیچھے ہی باہر نکل آئی تھی۔ اس پٹرول پمپ کے واش روم خاصے صاف ستھرے تھے۔ اس لیے اس نے اطمینان سے نہ صرف منہ ہاتھ دھویا بلکہ برش بھی کیا تھا۔ اسے باہر نکل کر اچھی خاصی گرمی کا احساس ہوا تھا۔ دھوپ میں خاصی تپش تھی۔ وہ گاڑی میں آ کر بیٹھی تو اس نے دیکھا وہ دوڈسپوزیبل کپوں میں گرما گرم چائے لیے بیٹھا تھا۔ وریشہ نے آرام سے چائے کا کپ پکڑ کر منہ سے لگا لیا تھا۔ چائے اس کی کمزوری تھی۔
''کتنا سفر رہ گیا اب......؟'' وہ اطمینان سے پوچھ رہی تھی۔
''ہم ملتان پہنچ چکے ہیں، اب گاؤں کی طرف جا رہے ہیں، مزید ایک گھنٹا اور لگے گا۔'' اس نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔ اگلے پانچ منٹوں بعد وہ اپنا سفر شروع کر چکے تھے۔ اسی وقت بابا کی غیر متوقع کال نے اس کے اندیشے کافی حد تک دور کر دیے تھے۔ وہ اب خاصی مطمئن تھی۔

☆☆☆

ان کی زبان وہ سمجھ نہیں سکتی تھی لیکن محبت اور اشاروں کی زبان اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ گاؤں میں بلند و بالا حویلی نما بڑے سے گھر میں پہنچتے ہی اس کا بہت والہانہ استقبال ہوا تھا۔ وہیں اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ اسے لے کر اپنے گھر آیا ہے اس سے پہلے تو وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ بابا کے کسی دوست کے گھر چھوڑنے جا رہا ہے لیکن حویلی پہنچتے ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ اس کی آمد کی پہلے سے ہی اطلاع تھی اس لیے خاصے جوش و خروش سے سب اس سے ملے تھے۔ ان کی زمینوں پر کام کرنے والے مزارعوں کے گھروں کی خواتین اس کے ارد گرد جمگھٹا لگائے کھڑی تھیں۔ وہ تو اس بڑے سے صحن والی حویلی کے بہت بنے کمروں میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ اس کے ارد گرد کھڑی دیہاتی عورتیں اسے انتہائی محبت اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔

''اسے آپ لوگوں کی بولی سمجھ نہیں آتی، اس لیے آپ لوگ اپنا وقت ضائع نہیں کریں۔'' وہ تولیے سے بال خشک کرتا باہر آیا اور اب ہنستے ہوئے ان خواتین کو سرائیکی میں چھیڑ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی شاور لے کر آیا تھا اس لیے خاصا فریش تھا۔

''پیار کی بولی جو بھی ہو اگر بندہ قدر کرنے والا ہو تو سمجھ ہی لیتا ہے۔'' بڑے سے سبز لکڑی کے تخت پوش پر لیٹی بے بے نے محبت بھرے انداز سے کہا تھا۔ وہ خاصی بیمار تھیں۔ اس کا اندازہ وریشہ کو فوراً ہی ہو گیا تھا وہ بالکل ان کے پاس بیٹھی تھی۔
''آپ کو ان کی سمجھ آ رہی......'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ وہ اپنے گھر آ کر خاصا خوش تھا۔
''بس کچھ کچھ لفظوں کی سمجھ آ رہی ہے اور کچھ کی نہیں۔'' اس نے بے بسی سے اعتراف کیا۔
''اچھا، یہ تو پتا چل رہا ہے ناں کہ آپ کی آمد ان کے لیے خوشی کا باعث بن رہی ہے۔''
''ہاں، اس کا تو پتا چل رہا ہے کہ سب بہت پیار کرنے والے لوگ ہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔
''آپ کو پتا ہے ابھی بے بے کہہ رہی تھیں کہ

پیار کی بولی سب کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
''رئیلی......!'' اس نے ہنستے ہوئے اماں کا کمزور اور ضعیف سا ہاتھ تھاما تو ان کے چہرے پر بڑی خوب صورت روشنی پھیلی تھی۔ وہ سرائیکی میں ابتہاج سے کچھ کہہ رہی تھیں۔
''کیا کہہ رہی ہیں؟'' وریشہ نے دلچسپی سے پوچھا۔
''ان کو اس چیز کی بہت خوشی ہے کہ آپ ڈاکٹر ہیں، کہہ رہی ہیں کہ سب خواتین کو آپ سے ملوائیں گی۔ انہوں نے میری چھوٹی بہن کو ساتھ والے گاؤں سے بلوانے کے لیے بندہ بھیج دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ وہ آپ کو بہتر کمپنی دے سکتی ہے۔'' وہ اب سامنے بیٹھا بڑے ذوق شوق سے لسی کا بڑا سا گلاس تھامے پی رہا تھا۔ اماں کو اور وہاں موجود خواتین کو اردو تو سمجھ آ رہی تھی لیکن بولنے سے ہچکچا رہی تھیں۔ صرف ابتہاج کی بوا تھیں جو بلا جھجک ٹوٹی پھوٹی ہی سہی لیکن بہت اعتماد کے ساتھ اس سے بول رہی تھیں۔ اماں نے بھی کچھ چھوٹے چھوٹے سے سوالات کیے تھے۔
''اوہ، آپ کی بہن کہاں رہتی ہیں؟'' اس نے ویسے ہی پوچھا تھا۔
''اس کی چھ ماہ پہلے ساتھ والے گاؤں میں شادی ہوئی ہے۔ وہ ہر ہفتے چکر لگاتی رہتی ہے۔'' وہ جگ سے ایک اور گلاس لسی کا بھر رہا تھا۔
''ہماری والدہ بہت سادہ خاتون ہیں لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی بہت قدر کرتی ہیں۔'' اس کے لہجے میں اپنی والدہ کے لیے حد درجہ عقیدت اور لگاؤ تھا۔ اس کے سامنے ناشتے کی ٹرے لگا دی گئی تھی وہ اتنا بھاری ناشتا دیکھ کر گھبرا گئی۔
''میں اتنا ہیوی ناشتا نہیں کرتی۔'' اس نے دیسی مرغ کا گھی میں تر بتر سالن اور پراٹھے دیکھ کر کہا تھا۔
''کوئی بات نہیں، سادہ روٹی بھی ہو گی۔'' ابتہاج نے اس کی مشکل آسان کی۔ وہ تھوڑی سی آلو کی بھجیا نکال کر سادگی سے کھا رہی تھی۔ اماں بار بار اس سے کچھ اور لینے کا اصرار کر رہی تھیں۔ وہ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بہ مشکل بیٹھی تھیں۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ مہمان خانے میں چلی گئی، شاور لے کر اس نے اے سی آن کیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ گہری نیند میں تھی۔ گھریلو ملازمائیں کئی دفعہ اسے آ کر دیکھ چکی تھیں۔

☆☆☆

شام کو جب وہ اٹھی تو ایک بھرپور نیند کے بعد وہ خاصی تر و تازہ ہو چکی تھی۔ بالوں میں برش کر کے وہ باہر آئی تو ایک خوب صورت شام اس کی منتظر تھی۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے باہر نکلی تو بڑے سارے صحن کے ارد گرد بنے بڑے برآمدے میں چار پائیاں بچھا کر بڑے اہتمام سے سفید چادریں بچھائی گئی تھیں۔ ان پر مختلف خواتین بے تکلفی سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ برآمدے کے ایک کونے میں بنے تندور میں آگ دہک رہی تھی اور وہ خواتین بہت مہارت سے اس میں روٹیاں لگا رہی تھیں۔ اس نے پہلی دفعہ غور سے صحن میں لگے جامن کے بڑے سے درخت کو دیکھا جس پر موسم کا پھل لگ چکا تھا۔ صحن کے ایک طرف بے شمار کیاریاں تھیں اور ان میں موسم کی سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔ وریشہ کو باہر آتے دیکھ کر سب نے تجسس سے اسے دیکھا ان سب کے کام کرتے ہاتھ ایک منٹ کو ساکت ہوئے تھے۔ وہ کچھ سوچ کر اماں کی بڑی ساری چار پائی کی طرف آئی۔ انہوں نے بہت محبت سے اسے دیکھا تھا، اس نے جھک کر سلام کیا تو انہوں نے لیٹے لیٹے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ محبت کی اس تاثیر کو اس نے دل تک محسوس کیا تھا۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس نے ان کے بازو کو ہاتھ

لگایا تو وہ چونک گئی۔

''آپ کو بخار ہے؟'' اس نے تشویش زدہ انداز سے پوچھا۔ وہ پھیکے سے انداز کے ساتھ مسکرادیں۔

''السلام علیکم! آپ وریشہ ہیں؟'' کوئی ایک دم پیچھے سے آکر بولا تو وریشہ نے بے ساختہ مڑ کر گلابی رنگ کے خوب صورت سے لان کے سوٹ میں ملبوس اس نازک سی لڑکی کو دیکھا۔ اس کے انداز میں بچوں کی سی سادگی اور بے ساختگی تھی۔ وریشہ نے مسکرا کے اس کے خوب صورت نقوش کو دیکھا۔ وہ جھینپ گئی۔

''سوری، مجھے تابندہ کہتے ہیں، میں ابتہاج بھائی کی چھوٹی بہن ہوں۔'' وہ بہت شائستگی سے اپنا تعارف کروا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی چمک اور ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔

''اوہو، نائس ٹو میٹ یو۔'' وریشہ کو اسے دیکھ کر حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔ ''مجھے وریشہ کہتے ہیں۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''وریشہ نہیں، ڈاکٹر وریشہ انصاری۔'' اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تابندہ نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا، اس سے......'' اس نے سادگی سے کہا۔

''بہت فرق پڑتا ہے جناب، اتنی محنت سے تو ڈاکٹر بنتے ہیں، پھر نام کے ساتھ بھی نہ لگائیں تو کیا فائدہ......؟'' وہ خاصے دوستانہ مزاج کی حامل تھی۔ وریشہ کو ایک منٹ میں اس چیز کا اندازہ ہوگیا تھا۔

''کیسی ہیں آپ......؟ بھائی کو آپ کی بہت ٹینشن تھی۔ اس لیے خود ہی لینے آگئے۔ ان کو ڈیوٹی پر جانا تھا اس لیے فوراً ہی نکل گئے۔''

''کہاں چلے گئے؟'' اسے سخت حیرت ہوئی۔

''سرگودھا، آج کل وہیں پوسٹنگ ہے ناں......'' وہ سادگی سے کہہ رہی تھی جبکہ مزید تفصیل جاننا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے اس موضوع پر مزید بات نہیں کی۔

''کون کون رہتا ہے یہاں؟'' اس نے اندر پھیلتی مایوسی کو چھپانے کے لیے ویسے ہی پوچھا۔

''پہلے تو بہت سارے لوگ تھے، چچا کی فیملی تھی ان کے دو بچے تھے وہ دونوں ناروے میں سیٹل ہوگئے، چچی کا انتقال ہوگیا تو چچا بھی چلے گئے۔ اب یہاں اماں کے ساتھ پھپھو اور پھوپا ہوتے ہیں ان کے بچے نہیں ہیں اس کے علاوہ کچھ مزارعے ہیں ان کو پچھلے صحن کی طرف گھر بنا کر دیے ہوئے ہیں۔ جبکہ ہمارے بابا کی وفات کو بھی اب تو پانچ سال ہوچکے ہیں، زمینوں کا حساب کتاب پھوپا جی سنبھالتے ہیں۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے صحن میں بنی کیاریوں کے پاس آگئی تھیں۔ وریشہ نے پھولوں کی ایک ٹہنی پر بیٹھی اداس سی تتلی کو دیکھا۔

''آپ دو بہنیں ہیں نا......؟'' وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''ہوں......'' ایک اداس سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا تھا۔

''بھائی اکثر آپ لوگوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ خصوصاً آپ کے بابا سے وہ بہت متاثر ہیں۔'' وہ بہت محبت سے بتا رہی تھی۔ وہ دونوں چلتے چلتے گھر کے پیچھے بنے بڑے سے صحن میں آگئی تھیں۔ یہاں چار پانچ بھینسیں اور کافی ساری بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ وریشہ نے کونے میں بنے ٹیوب ویل کو بہت دلچسپی سے دیکھا۔ وہ چل رہا تھا۔ سفید شفاف پانی ایک منہ زور جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ بے اختیار سیمنٹ کے بنے بڑے سے حوض پر بیٹھ گئی۔

''تم سارا دن گھر میں کیا کرتی ہو؟'' ہاتھوں کی اوک میں پانی بھرتے ہوئے اس نے تابندہ سے یونہی پوچھا۔

''آدھا دن تو میرا کالج میں گزر جاتا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کالج میں پڑھ رہی ہو؟'' وریشہ نے ہتھیلیوں میں پانی بھر کر اپنے چہرے پر اچھالا۔

''نہیں، پڑھا رہی ہوں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی اور وریشہ نے سخت بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''تم لیکچرر ہو؟''

''ہاں، کیوں لگتی نہیں ہوں کیا......؟'' اس کی آنکھوں میں مسرت کا احساس بڑا فطری سا تھا۔

''بالکل بھی نہیں، کون سا سبجیکٹ ہے تمہارا؟'' وریشہ نے تجسس سے پوچھا۔

''انگلش لٹریچر......'' وہ اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

''اچھا، کہاں سے کیا ماسٹرز......؟

''ماسٹر میں نے پنجاب یونیورسٹی سے کیا تھا......'' وہ خوش دلی سے بتا رہی تھی۔

''ویری نائس......'' وریشہ نے کھلے دل سے اسے سراہا۔ ''ویسے مجھے توقع نہیں تھی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ وہ ایک دفعہ پھر پانی فضا میں اچھال رہی تھی۔

''ہاں، ہمارے گاؤں کو دیکھ کر آپ نے اندازہ لگایا ہوگا، ہم لوگ آج کے دور میں بھی بہت پیچھے ہیں۔ یہاں ابھی تک صرف ایک پرائمری اسکول ہے۔ کوئی اسپتال نہیں، ہم لوگ بہت سی بنیادی سہولیات سے محروم ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ پھر بھی ہزاروں اور لاکھوں سے بہتر ہیں۔'' وہ خاصی قناعت پسند تھی۔ وریشہ کو ابھی ابھی اس چیز کا اندازہ ہوا تھا۔

''ہاں، خالص آب و ہوا میں رہنے والے خالص لوگ، ہے ناں؟'' وریشہ نے ٹھنڈے پانی سے کھیلتے ہوئے کہا۔ وہ ٹیوب ویل کے پانی سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں......'' تابندہ کھلکھلائی۔ وہ بھی اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی، اس نے شلوار تھوڑی سی اوپر کر کے پاؤں پانی میں ڈبو لیے تھے۔ ٹھنڈا اور یخ پانی خاصی طمانیت کا باعث بن رہا تھا۔

''اس گاؤں میں رہتے ہوئے تم لوگوں نے کیسے پڑھ لیا۔'' وریشہ کی بڑی بادامی آنکھوں میں خاصی حیرانی تھی۔

''مت پوچھیں، اماں نے ہماری خاطر کتنے محاذوں پر جنگیں لڑیں، بھائی کی اسٹڈی کے لیے ابا خود ہی بہت کونشس تھے ان کو تو انہوں نے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ امریکا بھجوایا، جبکہ خود بھی تحصیل دار تھے اور گریجویٹ تھے لیکن گاؤں کے ماحول اور خاندان کے رسم و رواج کی وجہ سے ہمارے معاملے میں کچھ ہچکچاہٹ کا شکار ہوگئے۔''

''اچھا پھر کیا ہوا؟'' وریشہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا۔ اماں، میدانِ جنگ میں اتر آئیں۔'' تابندہ کی آنکھوں کی روشنی میں یک دم ہی اضافہ ہوا تھا۔ ''دھان پان سی اماں بس دیکھنے میں ہی کمزور سی لگتی ہیں لیکن اپنے ارادوں میں حد درجہ مضبوط اور ثابت قدم، ابا کی ان کے سامنے ایک نہیں چلی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ابتہاج پڑھائی کے لیے ہاسٹل میں رہ سکتا ہے تو میری بیٹیوں کو کیا کانٹے لگے ہوئے ہیں۔''

''اوہ دیٹس گریٹ......'' اسے حقیقتاً سن کر خوشی ہوئی تھی۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''اس کے بعد ہم دونوں بھی بھائی کے پیچھے مری میں کانوینٹ میں پہنچ گئیں۔'' تابندہ کھلکھلا کر

www.Paksociety.com

ہنسی۔

"اوہ مائی گاڈ......! مجھے یقین نہیں آرہا......"

وریشہ نے سخت تعجب سے اسے دیکھا جو خاصی زندہ دل لڑکی تھی۔

"کسی کو بھی یقین نہیں آیا تھا۔ پورے خاندان کے لوگ ہر دفعہ جب ہم چھٹیوں پر گھر آتے تو ہمیں دیکھنے کے لیے ایسے آتے تھے جیسے کوئی عجوبہ دیکھنے آتا ہے۔ بھائی کا پڑھنا تو عام سی بات تھی لیکن ہم لڑکیوں کا ہاسٹل میں رہ کر پڑھنا سب کو بہت مشکل سے ہضم ہوا تھا، اماں بے چاری نے ہماری خاطر بہت تلخ جملے سہے اور ان کو صبر سے برداشت کیا۔ ہم دونوں نے بھی اماں کے اس اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلکا تھا۔

"سائرہ نے نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کیا اور آج کل اپنے میاں کے ساتھ نیوزی لینڈ میں ہوتی ہے۔ اس نے گائنی میں اسپشلائزیشن کی تھی۔ جب بھی گاؤں آتی ہے اماں سارے گاؤں کی خواتین کا مفت چیک اپ کرواتی ہیں۔ چاہے کسی کو کوئی بھی مسئلہ ہو یا نہ ہو۔" تابندہ کی اس بات کو وریشہ نے خوب انجوائے کیا تھا۔

"دیکھ لیجیے گا صبح سے آپ کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔" وہ ہنستے ہوئے اسے ڈرا رہی تھی۔

"اچھا......لیکن میرا تو یہ آخری سال ہے ابھی تو مجھے ڈگری بھی نہیں ملی۔" وریشہ نے گڑبڑا کر کہا۔

"بے شک نہ ملی ہو، یہ اماں کا مسئلہ تھوڑی ہے۔" تابندہ نے اسے مزید ڈرایا جبکہ وہ اس کے لہجے میں شرارت کی فراوانی سے سمجھ گئی تھی کہ وہ محض اسے تنگ کر رہی ہے۔

وہ دونوں باتیں کرتے اندر والے حصے میں آگئی تھیں۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ گھر میں خواتین کا جمگھٹا کم ہوگیا تھا۔ کھانا بن چکا تھا۔ ایک ملازمہ اماں کو ان کی چارپائی پر ہی وضو کروا رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر بڑی شفیق سی مسکراہٹ دوڑی تھی، ایسی مسکراہٹ جو سامنے والے کو خاصی تقویت دے۔

"ہیپاٹائٹس کی وجہ سے اماں کا جگر کافی حد تک خراب ہو چکا ہے۔ کافی دیر بعد علم ہونے کی وجہ سے اس بیماری نے ان کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اب بھی علاج تو ہو رہا ہے لیکن ہر وقت ان کی وجہ سے ہم تینوں بہن بھائی اپ سیٹ رہتے ہیں۔" تابندہ نے ان کے سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔

"اوہ، ٹیسٹ وغیرہ کروائے ہیں؟" وریشہ کے چہرے کے تاثرات بھی تیزی سے تبدیل ہوئے تھے۔

"سب کچھ کروایا ہے، کچھ عرصہ یہ لاہور بھی ایڈمٹ رہی ہیں لیکن اسپتال کے ماحول سے یہ بہت گھبراتی ہیں، اس لیے مجبوراً ہمیں یہاں لانا پڑا۔ پرسوں میں بھی میاں کے ساتھ پندرہ دن کے لیے عمرہ کرنے جا رہی ہوں، ہم لوگ ان کی وجہ سے پریشان تھے۔ بھائی نے شاید آپ کے بابا کے سامنے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو بھجوا دیتے ہیں۔ بھائی نے تو بہت منع کیا تھا، وہ خاصے شرمندہ بھی ہو رہے تھے لیکن......" وہ خاصی خفت محسوس کر رہی تھی۔

"اوہ آئی سی......" وریشہ کو ڈھیروں وزن اپنے اعصاب سے اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ایک دم ہی بابا پر بے انتہا غصہ آیا تھا، اگر ایسی کوئی بات تھی تو وہ اسے صاف صاف بھی بتا سکتے تھے اس طرح پُراسرار طریقے سے بھجوانے کی بھلا کیا تک بنتی تھی اور وہ موصوف بھی سارے راستے منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ دنیا جہاں کی باتیں کرلیں لیکن اصل بات کو دل کے پنجرے سے باہر نہیں نکالا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس قدر رازداری رکھنے پر بابا سے لڑنے کے

منصوبے بنا رہی تھی جبکہ اس کی خاموشی سے گھبرا کر تابندہ شرمندگی سے وضاحت دے رہی تھی۔

"اصل میں سائرہ بھی یہاں نہیں ہے اور باقی خاندان میں کوئی بھی پڑھی لکھی لڑکی نہیں، کچھ دن پہلے پھوپو بے چاری نے کچھ غلط قسم کی میڈیسن بھی اماں کو دے دیں اندازے سے جس سے خوب مسئلہ ہوا، تب سے بھائی بہت ڈر گئے تھے۔"

"اٹس اوکے یار......نو پرابلم تم ٹینشن نہ لو۔" وریشہ نے اس کی الجھن دور کرتے ہوئے تسلی دی۔

"مجھے بابا نے بتایا تھا۔" اس نے اس کا دل رکھنے کو غلط بیانی کی تو وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

"تھینکس گاڈ! اصل میں، میں اور سائرہ تو بہت ڈرے ہوئے تھے۔ سائرہ کو بھی چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ ورنہ وہ پاکستان آجاتی جبکہ میرے میاں بھی آج کل فارغ تھے۔" وہ ابھی بھی وضاحت دے رہی تھی۔

"کیا ہوگیا ہے تابندہ......میں نے کہا نا اٹس اوکے......" وریشہ نے اس کا ہاتھ دبا کر بہت محبت اور خلوص سے کہا تھا جبکہ تابی یک ٹک وریشہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" وریشہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں اماں کہہ رہی تھیں کہ تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں، میں نے بھی ابھی ابھی دیکھا تو مجھے ان کی بات کا یقین آیا، بہت چمکدار اور دن کی روشنی کی طرح روشن اور بہار کی صبح کی طرح اجلی۔" اس کی بات پر وریشہ بری طرح جھینپ گئی۔ اس کے رخساروں پر شرم بہت تیزی سے پھیلی تھی۔ تابندہ نے بہت دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

وہ اگلا دن پورا اس کے ساتھ رہی تھی اس نے ایک لمحے کے لیے بھی وریشہ کو بور ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے اڑوس پڑوس میں رہنے والے رشتے داروں کے گھر اور زمینوں پر بھی لے گئی تھی۔ وریشہ نے کافی عرصے کے بعد خوب کھل کر انجوائے کیا تھا۔ ان کے پڑوس میں رہنے والی ایک دو لڑکیوں کو اردو سمجھ میں آتی تھی اور وہ کچھ نہ کچھ بول بھی لیتی تھیں۔ تابندہ نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ وقفے وقفے سے ان کے گھر کا چکر لگاتی رہیں۔ تابندہ کے جانے کے بعد گھر میں ایک دم ہی خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ ہلے گلے کی خاصی شوقین تھی۔ اس کے جانے کے بعد وریشہ نے بابا کو کال کرنے کی کوشش کی ان کا نمبر بند جا رہا تھا۔ کچھ ان کے گاؤں میں سیل فون کے سگنلز کا کافی مسئلہ تھا۔ سگنلز ایک دم غائب ہو جاتے تھے۔ یہ چیز اسے خاصی جھنجلاہٹ کا شکار کر رہی تھی۔

☆☆☆

ابتہاج جو اس دن کا گیا پھر لوٹ کر نہیں آیا تھا البتہ اماں کے سیل فون پر اس کا صبح شام باقاعدگی سے فون آرہا تھا۔ اماں کو کبھی اس کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی تو کبھی وہ وہاں سے شور مچا رہا ہوتا تھا کہ آواز نہیں آرہی۔ ایک دن سائرہ کی بھی نیوزی لینڈ سے کال آگئی۔ اس دن خوش قسمتی سے سگنل کافی آرہے تھے اس لیے دونوں طرف کی بات سمجھ آرہی تھی۔ اماں گول تکیے سے ٹیک لگائے بہت محبت اور شفقت سے اپنی زبان میں بہت روانی سے اس سے گفتگو کرنے میں مگن تھیں جس کو سمجھنے سے وریشہ بالکل قاصر تھی۔ ایک آدھ لفظ ہی پلے پڑ رہا تھا۔ اماں نے بات کرتے کرتے سیل فون اس کی طرف بڑھایا تو وہ چونک گئی۔ دوسری طرف سائرہ بہت محبت اور بے تکلفی سے اس کا حال احوال پوچھ رہی تھی۔

"تم سے تو ملاقات نہیں ہوسکی لیکن ایک دفعہ ارسلہ سے لاہور میں بھائی نے ملوایا تھا۔ وہ بہت مزے دار لڑکی ہے۔" سائرہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وریشہ اس کی بات پر ہکا بکا رہ گئی۔ یہ تینوں بہن بھائی ہی اسے قدم قدم پر چونکا رہے تھے۔

www.paksociety.com

''اچھا، کب کی بات ہے یہ؟'' وہ اس کے ''مزے دار'' والے کمنٹس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ آج سے تین سال پہلے جب میں شادی کی شاپنگ کرنے لاہور آئی تھی تب بھائی اور ارسلہ نے خوب مجھے لبرٹی، اور یگا اور فورٹریس میں گھمایا تھا۔ تمہاری پاما نے مجھے شادی کا لہنگا پسند کرنے میں خاصی مدد دی تھی۔ تمہارے گھر بھی میں آئی تھی لیکن تم ان دنوں.... راول پنڈی میں تھیں۔'' وہ بہت مزے سے کہہ رہی تھی۔

''اچھا مجھے اس کا علم نہیں۔'' اس نے شرمندگی سے کہا ویسے بھی ماما اور ارسلہ کا ملنا ملانا خاصا تھا، دونوں ہی اس معاملے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں جبکہ وہ حد درجہ تنہائی پسند اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی تھی۔

''تمہاری ماما کے انتقال کا مجھے بھائی نے بتایا تھا، میں اس وقت بھی نیوزی لینڈ میں تھی یقین مانو کہ بہت دل دکھا کہ وہ اس قدر خوب صورت اور پُروقار خاتون تھیں...... کوئی ان کو بھلا ہی نہیں سکتا۔'' وہ بہت دل سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں، ماما کی ڈیتھ کا تو ہمیں بھی ابھی تک یقین نہیں آتا۔ ایسے لگتا ہے کہ اپنے ڈیپارٹمنٹ گئی ہیں اور شام کو یونیورسٹی سے گھر آجائیں گی۔'' وہ افسردہ انداز میں گویا ہوئی، دوسری طرف شاید سائرہ نے بھی شاید اس کی رنجیدگی کو محسوس کرلیا تھا تبھی بات کو دانستہ پلٹتے ہوئے قدرے رازدارانہ مگر شریر انداز میں بولی۔

''ویسے تم دیکھنے میں کیسی ہو؟ میں نے بھائی سے پوچھا تھا کہ کیا ارسلہ کی طرح خوب صورت ہے؟ بھائی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ نہیں، اس سے زیادہ خوب صورت ہے بالکل میڈم شائستہ کی طرح۔'' سائرہ کی بات پر وریشہ کا دل ایک لمحے کو بے ہنگم انداز میں دھڑکا تھا۔ دوسری طرف وہ اس کے جھینپ کر ہنسنے پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

''اماں تمہاری بہت تعریف کررہی تھیں اور یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ بہت خیال رکھ رہی ہے اور وقت پر میڈیسن دیتی ہے اور صبح شام ٹمپریچر بھی چیک کرتی ہے۔ میں نے ان کو سنجیدگی سے ایک مشورہ دیا ہے۔'' اپنی بات کر کے وہ ایک لمحے کو رکی۔ ''پتا ہے کیا؟''

''کیا......؟'' وریشہ نے سنبھل کر پوچھا۔ اتنا تو اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ تابندہ کے مقابلے میں خاصی پُراعتماد بھی ہے اور صاف گو بھی۔ بغیر کسی لگی لپٹی کے بات کرنے والی۔

''یہ ہی کہ بھائی کے لیے کوئی ڈاکٹر ہی ڈھونڈ لیں، فائدے میں رہیں گے۔'' وہ ایک دفعہ پھر بلند آواز میں ہنس رہی تھی۔ ''تمہاری کوئی کولیگ وغیرہ ہو تو مجھے بتانا......'' وہ خاصی بے تکلفی سے کہہ رہی تھی۔

''جی ضرور......'' وریشہ اس سے زیادہ بھلا کیا کہتی اس لیے چپ رہی۔

''ویسے تم ارسلہ کے مقابلے میں بہت کم گو سی لگ رہی ہو، اماں بھی بتارہی تھیں کہ فالتو باتیں نہیں کرتی ہو، میں نے کہا، یہ بھی ٹھیک ہے لیکن آپ کی زبان ہی اس بے چاری کو نہیں آتی تو وہ کیا بات کرے۔'' سائرہ کے سو فیصد درست اندازے پر وریشہ کو خاصی حیرت ہوئی تھی۔ اس کا مشاہدہ خاصا تیز تھا جو اتنی دور بیٹھ کر بالکل ٹھیک ٹھاک اندازے لگارہی تھی۔

''نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں، پڑوس سے نائلہ وغیرہ آجاتی ہیں' ان سے گپ شپ لگتی رہتی ہے۔'' اس کی سادہ سی بات پر وہ بری طرح چونکی۔

''نائلہ کی بڑی بہن سدرہ تو نہیں آتی ہوگی؟'' اس نے قدرے رازدارانہ انداز میں دریافت کیا تھا۔

''جی، ایک دفعہ آئی تھیں لیکن زیادہ بات نہیں ہوئی۔'' وریشہ نے کچھ سوچ کر کہا اور سچ بات تھی کہ اسے وہ نک چڑھی اور قدرے مغرور سی لڑکی بالکل اچھی نہیں لگی تھی جسے اپنے ایف اے پاس کرنے کا خاصا زعم تھا۔

''وہ زیادہ بات کرے گی بھی نہیں۔'' سائرہ کی بات پر وہ بری طرح چونکی۔

''وہ کیوں......؟''

''اصل میں اسے لگتا ہے کہ وہ خاندان کی سب سے پڑھی لکھی لڑکی ہے اس لیے ابتاج بھائی پر اس کا پہلا حق ہے۔ اس کی والدہ اماں کی خالہ زاد بہن ہیں۔ ان لوگوں نے خاندان والوں کے ذریعے کہلوایا تھا لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ بھائی نے صاف انکار کردیا اور دوسری بات یہ کہ اماں کو بھی وہ اپنی عادات کی وجہ سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بالکل پسند نہیں تھی۔'' وہ بڑی بے تکلفی سے بتارہی تھی جبکہ وریشہ کو اس کی بات پر عجیب سی الجھن اپنے اندر تیزی سے پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ بات نہیں ہوسکتی تھی تبھی اس نے دو چار باتیں کر کے فون اماں کو پکڑا دیا تھا اور اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ حد درجہ ذہنی پراگندگی کا شکار ہورہی تھی۔ بابا کو کال کی تو ان کا نمبر بند جارہا تھا۔ ارسلہ کو کال ملائی تو بیلنس کم تھا، مجبوراً اپنی روم میٹ نویلہ کا نمبر ملایا اور اس سے کالج کا حال احوال پوچھا تو پتا چلا کہ آج کل اسپتال میں کوئی ہڑتال چل رہی ہے اور پروفیسرز اس میں مصروف ہیں اس لیے کلاسز بھی نہیں ہورہیں اور وہ بھی اپنے شہر چکوال جارہی ہے۔ وریشہ نے تنگ آکر فون بند کیا۔ ٹی وی چلایا تو پتا چلا کہ یہاں صرف پی ٹی وی آتا ہے، کچھ دیر بعد اس نے جھنجلا کر اسے بھی بند کردیا۔

وہ تنگ آکر ایک دفعہ پھر باہر نکل آئی۔ موسم نے ایک دم ہی انگڑائی لی تھی۔ سرمئی دھنکی ہوئی روئی جیسے بادل اچانک ہی آسمان پر نمودار ہوگئے تھے۔ تخت پر اماں اور پھپھو نہ جانے کون سی باتوں میں مگن تھیں اسے دیکھ کر چونک گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے پاس آکر بیٹھ گئی...... آج اماں کی صبح سے طبیعت خاصی بہتر تھی اور آج کافی دن بعد انہوں نے کھانا بھی ڈھنگ سے کھایا تھا۔ وہ دونوں ٹوٹی پھوٹی اردو زبان میں اس سے بات کر کے اسے کمپنی دینے کی کوشش کررہی تھیں۔ وریشہ کو ان کے اس انداز پر ہنسی آگئی۔ ان لوگوں کو تو وریشہ کی بات سمجھ میں آتی تھی جبکہ اب تو اسے بھی کافی حد تک ان کی زبان سے واقفیت ہوتی جارہی تھی۔

''رہنے دیں خالہ، کہاں متھا مار رہی ہیں؟'' سدرہ ایک پلیٹ میں کڑی چاول ڈالے اچانک ہی پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ گہرے نارنجی رنگ میں اس کا سانولا رنگ اور بھی گہرا لگ رہا تھا۔ سائرہ سے بات کے بعد وریشہ نے اب کے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے کے نقوش خاصے دلآویز تھے اور قد بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ بس رنگت میں تھوڑی مار کھاتی تھی یا پھر مزاج کی کرختگی نے اس کی شخصیت کا حسن دھندلا دیا تھا۔ وریشہ کو ابھی ابھی اندازہ ہوا تھا کہ اسے بات بات پر طنز کرنے کی خاصی بری عادت تھی۔

اس کی آمد پر بوا کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو متغیر ہوا تھا۔ انہوں نے خاصی ناگواری سے اماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا تھا۔ سدرہ کے بیٹھتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سدرہ کے لبوں پر بڑی زہر آلود سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ بوا، کبھی ہم غریبوں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو، جن کو تمہاری زبان پلے نہیں پڑتی، ان کے ساتھ تو گھنٹوں گونگے بہروں والی اشاروں کی زبان

میں بھی باتیں ہوجاتی ہیں جبکہ ہمارے لیے تو تمہیں ٹائم ہی نہیں ملتا۔'' وہ دانستہ اردو میں بولی تھی اس کی بات پر وریشہ دنگ رہ گئی۔ اس نے صاف چوٹ کی تھی۔ اماں اور بوا کو بھی حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ اس حیرت میں ناگواری اور ناپسندیدگی کا عنصر واضح تھا۔

بوا نے اپنی زبان میں انگلی اٹھا کر اسے کوئی وارننگ دی...... جسے سن کر سدرہ کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا تھا جبکہ اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں تھیں، سامنے بنے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وریشہ کو اپنا آپ خاصا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اماں نے بھی اپنا سفید ململ کا دوپٹا منہ پر ڈال کر ٹانگیں سیدھی کر لی تھیں۔ وریشہ بھی ان کے تخت سے اٹھ کر قدرے فاصلے پر رکھی چارپائی پر سدرہ کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ سدرہ کے چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتا حسد اور خود غرضی کے جذبات کوئی بھی سمجھ سکتا تھا۔

''یہ بوا خاصی کینہ پرور خاتون ہیں، ان سے بچ کر رہنا، یہ نہیں چاہتیں کہ ابتہاج کی شادی ہو اور ان کی راج دھانی میں کوئی اور آئے۔'' وہ اب اس کی طرف جھک کر خاصے دھیمے انداز میں اسے خبردار کر رہی تھی۔ وریشہ کو اس غیر متعلقہ بات پر خاصا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے بے یقینی سے سامنے باورچی خانے کے فرش پر بیٹھی بے ضرر سی خاتون کو دیکھا جو پالک صاف کر رہی تھیں۔ وریشہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر وہ مزید گویا ہوئی۔

''ہماری خالہ تو بے چاری سیدھی سادی خاتون ہیں، ان کی اس نند نے ساری زندگی ان کی سادگی کا فائدہ اٹھا کر ان کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کیا ہے۔ اولاد ان کی تھی نہیں، میاں کو بھی ورغلا کر یہاں لے آئی ہیں اور تب سے یہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتیں اور باقی خاندان والوں کے خلاف خالہ کو بھڑکاتی رہتی ہیں۔ انہوں نے میرا اور ابتہاج کا رشتہ تڑوایا ہے۔'' وہ حد درجہ بدگمان تھی اس کی آنکھوں میں پھیلی نفرت اور بیزاری نے وریشہ کو بے اختیار پہلو بدلنے پر مجبور کیا تھا۔

''میں بچپن سے ابتی کی منگ ہوں، اس نے دل سے اس رشتے کے ختم ہونے کو قبول نہیں کیا۔ اس لیے کہیں اور رشتے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔'' وہ خاصی خوش فہم بھی تھی۔ وریشہ کو ایک لمحے میں اس بات کا ادراک ہوا تھا۔

''اچھا، کیا انہوں نے ایسا تمہیں خود کہا تھا؟'' وریشہ کو اس کیس میں تھوڑی سی دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی بات پر وہ فوراً شرما گئی۔

''ایسی باتیں کہنے والی تھوڑی ہوتی ہیں، ہر رشتے میں تو وہ کوئی نہ کوئی میخ نکال کر انکار کر دیتا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے ناں......'' اس کی غلط فہمیوں کی داستان خاصی لمبی تھی۔

''اچھا...... پھر مسئلہ کیا ہے؟'' اس نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ چھپا کر پوچھا۔

''سارا مسئلہ ان چڑیل بوا کا ہے، پتا نہیں کیا گند بلا اس کے ذہن میں بھر رکھا ہے، وہ تو اب شادی کے نام سے ہی خار کھانے لگا ہے حالانکہ خالہ کو سخت ضرورت ہے کہ کوئی ان کی دیکھ بھال کے لیے چوبیس گھنٹے موجود ہو۔ اب دیکھو نا سارا خاندان باتیں بنا رہا ہے کہ پرائی جوان لڑکی کو گھر میں تیمارداری کے لیے بلا رکھا ہے۔ سارا خاندان لڑکیوں اور عورتوں سے بھرا پڑا ہے، مزارعوں کی گھر والیاں بھی سارا دن یہیں مفت کی روٹیاں توڑتی ہیں۔ کون سا خدمت کرنے والوں کی کمی تھی۔ بس ہماری ناک کٹوانی تھی......'' اس کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔ وریشہ نے الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھا جو آج خاصی فرصت سے بیٹھی تھی۔

''تم کب جاؤ گی اپنے گھر......؟'' اس کا انداز وریشہ کو خاصا برا لگا تھا۔

''جب تابندہ عمرہ کر کے آجائے گی۔'' وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔

''لو اسے آنے میں تو ابھی پورے دس دن پڑے ہیں۔'' اسے سن کر خاصی مایوسی ہوئی تھی اور اس کا چھپانا بھی اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وریشہ خاموش رہی۔ ''ویسے میرا خیال ہے کہ بندے کو حج اور عمرہ فارغ ہو کر بڑھاپے میں کرنا چاہیے، تمہارا کیا خیال ہے؟'' سدرہ نے اپنا ذاتی فلسفہ جھاڑا تھا جس سے وہ قطعاً متفق نہیں تھی۔

''بس جب بھی اللہ کسی کو بلا لے اپنے گھر۔'' اس کی بات پر سدرہ کو خاصی مایوسی ہوئی تھی۔

''دیکھو ناں ابھی جمعہ جمعہ چار دن تو ہوئے ہیں تابی کی شادی کو، مجال ہے کہ اپنے سسرال میں ٹک کر بیٹھی ہو، ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے ہفتے میں چار دن تو وہ یہاں رہتی ہے۔'' اسے سب ہی سے شکایتیں تھیں۔

''خیر وہ بہانہ تو نہیں کرتی، اماں ٹھیک ٹھاک بیمار ہیں۔'' وریشہ خود کو کہنے سے نہ روک پائی۔

''تو وہ کون سا ڈاکٹر ہے......'' اسے سخت برا لگا تھا۔ ''اب اگر اس کا میاں کوئی کورس کرنے ملک سے باہر گیا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سسرال میں ٹکا ہی نہ جائے...... اب میاں کو آئے پاکستان میں مشکل سے ہفتہ ہی ہوا ہے کہ محترمہ سعودی عرب چلی گئی ہیں۔'' اس کی باتوں نے وریشہ کے سر میں اچھا خاصا درد کر دیا تھا لیکن مجبوری تھی کہ اماں سو چکی تھیں اور اسے جب تک وہ بھی وہیں بیٹھنا تھا۔

''اور پھر ساس، سسر کو ساتھ لے جانے کا کیا فائدہ...... اب بندہ ان بوڑھوں کو ہی سنبھالتا رہے۔ مجھے تو تابی کا میاں بڑا ہی خرانٹ لگتا ہے۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ وہ اپنی بیوی کو ماں، باپ کی خدمت کے لیے لے کر گیا ہوگا۔ میرے جیسی ہوتی تو جانے سے ہی انکار کر دیتی۔'' وریشہ نے تاسف بھری نظروں سے اس لڑکی کو دیکھا، جس کو خاندان میں اپنے پڑھے لکھے ہونے کا دعویٰ تھا۔ وہ اپنی سمجھ میں آنے والی اس ''اچانک'' بات پر خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اپنی اس سمجھداری کی مزید تصدیق کروانا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا اس لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت بوا تین چائے کی پیالیاں ٹرے میں رکھ کر نمودار ہوئیں۔ وریشہ نے سکون کی سانس لی۔ اسے شدید طلب ہو رہی تھی۔

''تم تو چائے نہیں پیتی ہو ناں...... اس لیے میں نے تمہارے لیے نہیں بنائی۔'' بوا کی بے مروتی اور بدلحاظی بھی عروج پر تھی۔ بے رخی کا یہ مظاہرہ اور وہ بھی مہمان کے سامنے سدرہ کے لیے انتہائی کوفت کا باعث بنا تھا۔ اس لیے وہ جل کر بولی تھی۔

''مجھے کوئی شوق نہیں اتنی گرمی میں اپنا کلیجا سڑانے کا، آپ ہی پیو یہ چائے......'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے گئی تھی۔ وریشہ نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا تھا لیکن اس کے جاتے ہی جس طرح فوراً اماں نے اپنے منہ سے دوپٹا ہٹایا تھا وریشہ کو حیرت ہوئی۔

''آپ سوئی نہیں تھیں کیا؟'' وریشہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

اماں نفی میں سر ہلا کر معصومیت سے ہنسنے لگیں۔ وریشہ کو اس لمحے وہ بہت پیاری لگیں۔

''بھرجائی خود تو ایسے موقع پر چادر تان لیتی ہیں اور یہ جنجال ہمیں بھگتنا پڑ جاتا ہے۔'' بوا ذرا خفگی بھرے انداز میں بولیں۔

''خیر ہے سکینہ اپنا دل وڈا کر۔'' اماں متانت

www.Paksociety.com
www.Paksociety.com

سے بولی تھیں۔

''ہم سے نہیں ہوتے وڈے دل، پورے چک میں ماں بیٹیاں مجھے بدنام کرتی پھرتی ہیں کہ میں نے ان کا رشتہ تڑوایا ہے۔ بندہ پوچھے جو رشتہ ہوا ہی نہیں اس کے ٹوٹنے کا کیا سوال۔ خود ہی مشہوری کردی اور جب منڈے نے صاف انکار کردیا تو اب دنیا کو بتاتے پھر رہے ہیں کہ پھوپو نے لت (ٹانگ) ماردی رشتے میں۔ اکو اک میرا بھراسی، تے اکو اک میڈا بھتیجا...... سب نال زیادہ تو مجھ نمانی کو اس کے ویاہ کے چاہ ہیں اور مجھ پر الزام......'' بوا غصے میں تیز تیز چسکیاں لے کر چائے پی رہی تھیں۔

''چل چھڈ تو اپنا دل برا نہ کر......'' اماں نے ان کو دلاسا دیا۔

''بھرجائی، بے شک پوچھ لے اس بچی سے، اسے یہ کہانی سنا کے گئی ہوگی کم بخت......'' بوا کے سو فیصد درست اندازے پر وریشہ کو سخت تعجب ہوا تھا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی۔

''ہے نا دھی رانی......'' بوا نے یقین دہانی کے لیے اس کی طرف دیکھا تو اسے شدید حیرت ہوئی جب اس نے اماں کو بڑی سرعت سے نفی میں سر ہلا کر اسے نہ بتانے کا اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اسے یہ سوچ کر ہی دھچکا لگا تھا کہ انہوں نے سدرہ کی تلخ گفتگو کو خود اپنی سماعتوں سے سنا تھا ورنہ وہ اسے منع نہیں کرتیں۔

''نن نہیں بوا، وہ تو اپنی ہی باتیں کررہی تھی۔'' اس نے گڑبڑا کر مصلحتاً جھوٹ بولا تھا۔

''وہ کہاں کی پروفیسر لگی ہے جو اپنی باتیں کرے گی۔ صغراں کی بیٹیوں کی رگ رگ سے واقف ہوں، آج کل وہ ہر جگہ بس مجھے بدنام کرنے کا کھاتا کھول رہی ہیں۔'' بوا بھی ان کے بارے میں ضرورت سے زیادہ آگاہ تھیں۔ اس لیے ان کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔

''آج پتا نہیں کڑی کہاں سے پکا کرلے آئی ورنہ پہلے تو ایسی سوغاتیں تو بس ہمارے پُتر کے آنے پر ہی دیکھنے کو ملتی تھیں۔'' وہ ابھی تک غصے سے بڑبڑا رہی تھیں۔

''واہ بوا چائے تو بڑے مزے کی بنائی ہے۔'' اس نے محض ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کروانے کے لیے کہا تھا۔

''اچھا، واقعی......؟'' وہ واقعی بچوں کے سے انداز میں خوش ہوگئی تھیں۔

''یہ تمہارے سوٹ پر کڑھائی کس نے کی ہے؟'' ان کی توجہ اس کے کاسنی رنگ کے سوٹ پر کی گئی کڑھائی کی طرف ہوگئی تھی۔

''یہ تو ریڈی میڈ ہے، مطلب کہ ایسے ہی بازار سے لیا تھا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو انہوں نے توصیفی نظروں سے ایک دفعہ پھر اس کو بغور پکڑ کر دیکھا۔ دوپٹے کے پلو پر بھی نازک سی بیل بنی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ بوا کی توجہ دوسری جانب ہونے سے اماں نے بڑی لمبی سکون کی سانس لی تھی۔ وہ دونوں ایک دفعہ پھر اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بے ضرر سی باتوں میں مصروف ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

گرمی میں ایک دم اضافہ ہوگیا تھا۔ اسے وہاں آئے ہوئے پورے سات دن ہوچکے تھے۔ اس دوران ایک دفعہ بھی بابا سے بات نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات اسے حد درجہ کوفت اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کررہی تھی۔

''حد ہے کسی کو میری پروا نہیں......'' یہ فقرہ آج اس نے کوئی بلا مبالغہ ہزار دفعہ سوچا تھا۔ پہلے تو ہر تیسرے یا چوتھے دن ارسلہ کی بھی کال آجاتی تھی لیکن اس دفعہ تو اس نے بھی کمال کردیا تھا۔ وہ ان سب

سے بری طرح دل ہی دل میں خفا ہوچکی تھی۔ اس دفعہ اس نے بھی پکا تہیہ کرلیا تھا کہ اب خود سے ان کو کال نہیں کرنی۔ بابا کا نمبر تو ویسے ہی بند تھا۔ اوپر سے وہ بھی اسے چھوڑ کر جو گیا تو دوبارہ نہیں آیا۔ وہ اس سے بھی کئی گلے دل ہی دل میں پال چکی تھی۔

اس دن رات کو اماں کی طبیعت ایک دم ہی بگڑ گئی تھی۔ اس کے تو ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ گھر کے سب لوگ جو اس کی وجہ سے مطمئن تھے اسے حواس باختہ دیکھ کر خود بھی گھبرا گئے۔ اس نے پھوپا کو فوراً گاڑی نکالنے کو کہا۔ اماں کی حالت بالکل بھی ٹھیک نہیں تھی۔ پھوپا بار بار ابتہاج کو فون کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ جب اس نے قدرے سختی سے انہیں کہا کہ اماں کو جلد از جلد ایمرجنسی میں لے جانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت رات کے تقریباً دو بج رہے تھے جب وہ لوگ نشتر اسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچے۔ راستے میں وریشہ نے اپنے ایک دو سینئر کو سوتے سے اٹھا کر نشتر اسپتال میں کسی جاننے والے ڈاکٹر کا پوچھا تھا۔ اس کی بھاگ دوڑ خاصی کام آئی تھی جب تک وہ لوگ ایمرجنسی میں پہنچے ایک دو ڈاکٹرز سے رابطہ ہو ہی گیا تھا جس کی وجہ سے ان کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اماں کو جاتے ہی خاصا پروٹوکول مل گیا تھا۔ بوا کے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی۔ پریشانی سے ان کی رنگت زرد ہوچکی تھی۔ پھوپا خود بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ ابتہاج سے ان کا آخر رابطہ ہو ہی گیا۔

''وریشہ کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟'' اس کی اچانک ہی اس کے نمبر پر کال آگئی تھی۔ وہ حد درجہ پریشان تھا۔ وہ کچھ لمحوں کے لیے بالکل چپ کرگئی اور پھر کچھ محتاط لفظوں میں بولی۔

''وہ بہتر نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب......؟'' وہ انتہائی عجلت میں بولا۔

خوش فہمی

ایک ماہر ازدواجیات چند شہریوں کو لیکچر دے رہا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔

''اگر کسی شخص کی بیوی سیدھی سادی ہو اور وہ چاہتا ہو کہ وہ چالاک ہوجائے تو وہ کھڑا ہوجائے۔''

سب خاموش رہے، ایک آدمی اٹھا تو ماہرِ ازدواجیات نے کہا۔ ''اچھا تو آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی چالاک ہوجائے۔''

وہ آدمی مایوس ہوکے بیٹھ گیا اور بولا۔

''میں سمجھا آپ نے کہا ہے کہ ہلاک ہوجائے۔''

از: سیدہ فرزانہ، حجرہ شاہ مقیم

تجربے کی بات

ایک صاحب نے کتب فروش سے پوچھا۔ ''آپ کے پاس پانچ دس سال پرانے رسالے ہوں گے۔''

دکاندار نے کہا۔ ''جی ہاں مل جائیں گے، کیا آپ کو کسی خاص مضمون کی تلاش ہے۔''

''جی نہیں، میں نے اسی سال ایم بی بی ایس کیا ہے اور اپنا کلینک کھول رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے مریض مجھے نیا ڈاکٹر نہ سمجھیں۔''

مرسلہ: نور افشاں، شکارپور

''مطلب یہ کہ اس قسم کے مرض میں جو کچھ خطرے کے سائن ہوتے ہیں ان میں سے کچھ ظاہر ہو رہے ہیں۔'' اس نے اب کچھ کھول کر بتانے کی کوشش کی تھی۔ دوسری طرف اس کی بات پر اسے سخت دھچکا لگا تھا۔ اس لیے کافی دیر تک کچھ بول نہیں سکا تھا۔

''اٹس او کے...... میں آرہا ہوں۔'' وہ فون بند کر چکا تھا۔ وریشہ کو ایک دم ہی ایسا لگا جیسے کائنات کی نبض تھم سی گئی ہو۔ وہ صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب پہنچا تھا۔ اس وقت اماں دوائیوں کے زیرِ اثر سو رہی تھیں۔ وہ سیدھا وہاں آیا تھا اس وقت وہ ڈاکٹر اسد کو اماں کی فریش رپورٹس دکھا رہی تھی۔ انہیں پرائیوٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ بلیک پینٹ پر گرے شرٹ میں وہ خاصا مضطرب تھا۔ اس کی آنکھیں رت جگے کی وجہ سے سرخ تھیں۔ پھوپا جی اس کے ساتھ تھے اور اس کو رات کا واقعہ تفصیل سے بتا رہے تھے۔

''اب کیسی حالت ہے اماں کی......؟'' وہ حد درجہ بے چینی سے ان کی طرف لپکا تھا۔

''اب اللہ کا شکر ہے ان کی حالت کافی بہتر ہے۔'' ڈاکٹر اسد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا تھا۔

''یہ ان کے چہرے پر سوجن کیوں محسوس ہو رہی ہے؟'' وہ تھوڑا سا مضطرب ہوا۔ ڈاکٹر اسد اور وریشہ نے ایک دم ہی ایک دوسرے سے آنکھیں چرائی تھیں۔

''اللہ بہتر کرے گا۔'' ڈاکٹر اسد نے ایک دفعہ پھر ان کو تسلی دی اور وریشہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ایسا ہے وریشہ کہ میری ٹائمنگ تو ختم ہو گئی ہے اپنے ایک اور کولیگ کو میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً یہاں کا وزٹ کرتا رہے گا پھر بھی کوئی ایمرجنسی ہو تو آپ مجھے کال کر سکتی ہیں۔''

''تھینک یو ڈاکٹر اسد......'' وہ حد درجہ ممنون تھی۔

''یہ میرے سینئر تھے انہوں نے رات کافی ہماری ہیلپ کی ورنہ سرکاری اسپتالوں میں تو آپ کو پتا ہے کہ جان پہچان کے بغیر اتنی جلدی کام نہیں ہوتے۔'' ڈاکٹر اسد کے جاتے ہی اس نے بتایا۔

''تھینکس وریشہ، آپ اگر نہ ہوتیں تو شاید کافی پرابلم ہوتی۔ پھوپا بتا رہے تھے کہ ان کو تو کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اللہ آپ کو اجر دے گا۔'' وہ حد درجہ مشکور تھا۔ اس کا انداز ویسا ہی تھا انتہائی نرم اور دھیما، وریشہ کو نہ جانے کیوں اپنی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اب اماں کے بالکل پاس کھڑا تھا اور ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے سائرہ کو کہہ دینا چاہیے کہ وہ آجائے......'' وریشہ کو اس کا لہجہ بھیگا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اماں کی حالت کی سنگینی کو سمجھ سکتی تھی لیکن وہ اس سے بھی زیادہ سمجھدار تھا۔

''اللہ بہتر کرے گا، مایوس کیوں ہوتے ہیں؟'' وریشہ ایک دم ہی اس کے سامنے آکر بولی تھی۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو وریشہ کو بے اختیار ہی اس کی سرخ مگر کچھ بولتی ہوئی آنکھوں سے پہلی دفعہ ڈر لگا تھا۔ وہ فوراً نظریں چرا گئی تھی۔

''آپ ڈاکٹر ہو کر جھوٹی تسلی دیتی ہیں۔'' اس کا انداز حد درجہ آزردہ تھا۔

''میں ڈاکٹر ہونے سے پہلے مسلمان بھی ہوں اور مومن کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔'' اس نے ایک دم ہی اسے لاجواب کر دیا تھا۔

اگلے دو دن اس نے لمحہ لمحہ اماں کے ساتھ

www.paksociety.com

گزارہ۔ اماں کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو انہوں نے گھر جانے کی ضد شروع کر دی تھی۔ وہ اس وقت بالکل ایک ضدی بچے کی طرح لگ رہی تھیں، مجبوراً چار دن کے بعد ان کو گھر لے جانا ہی پڑا۔ گھر پہنچتے ہی وہ خاصی خوش تھیں اور وریشہ نے ان کو بات بے بات مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ سائرہ اور تابندہ دونوں ہی ان کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھیں۔ ان کی بار بار کالز آرہی تھیں۔ وریشہ کو خود ان کی بیماری نے بوکھلا دیا تھا۔ وہ خود بھی سب کچھ بھلائے ہوئے تھی۔ آج کل تو اس کا دھیان بابا اور ارسلہ کی طرف بھی نہیں جارہا تھا۔ وہ تو اچانک ہی بابا کی غیر متوقع کال آگئی تو اسے احساس ہوا۔ اس دن سگنل کا بھی کچھ مسئلہ تھا اس لیے کچھ بات سمجھ میں آرہی تھی اور کچھ نہیں۔ اسے یاد تھا کہ وہ بار بار ابتہاج کی والدہ کا خیال رکھنے کو کہہ رہے تھے۔ اسی دوران کال کٹ گئی، وہ بہت افسردہ ہوئی۔ اس دن شام کو وہ اماں کا ٹمپریچر چیک کر رہی تھی۔ وہ اپنے مخصوص تخت پوش پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے بالکل پاس کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے ابتہاج آج کا اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔ بوا سامنے صحن میں کچھ خواتین سے گندم صاف کروانے میں مصروف تھیں۔ اسی وقت سامنے سے سدرہ اور نائلہ آتی ہوئی دکھائی دیں۔ اماں نے بھی ان کو دیکھ لیا تھا۔ آج کل ویسے بھی ان کی عیادت کرنے والوں کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔

''اماں آج دوپٹا منہ پر رکھ کر سونے کا ارادہ نہیں؟'' اس نے اپنی طرف سے سرگوشی میں شرارت کی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اماں اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیں گی۔ ابتہاج نے چونک کر قدرے خوشگوار انداز سے ان کو ہنستے ہوئے دیکھا جبکہ وہ اپنی خجالت مٹانے کے لیے جھینپ سی گئی۔ ابتہاج اس کی بات کے پس منظر سے واقف نہیں تھا اس لیے تعجب سے اماں کو ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''خیر ہے خالہ، آج تو بڑے قہقہے لگائے جارہے ہیں۔'' سدرہ کی طنزیہ نظریں اسے ہی شرمندہ کرتی تھیں لیکن اس وقت ابتہاج کی موجودگی نے اسے اور بھی جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

''آؤ آؤ سدرہ، نائلہ، کیسی ہو تم لوگ......؟'' ابتہاج نے ان کو دیکھ کر خوش دلی سے کہا۔

''یہاں تو خالہ ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی ہیں اور پورے پنڈ میں بوا نے خوامخواہ شور مچا رکھا ہے۔'' اس نے سامنے موڑھے پر بیٹھتے ہی ناک چڑھائی۔

''ہاں بوا کو تو بہت شوق ہے ناں خوامخواہ شور مچانے کا، خود اپنی ماں کا پتا نہیں ایک چھینک بھی آجائے تو سات گاؤں میں دوہائی مچا دیتی ہے۔'' بوا ایک دم ہی گندم چھوڑ کر سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے سرخ لان کے نئے سوٹ میں ملبوس سدرہ کو دیکھا تھا۔

''لو بوا تم تو ویسے ہی غصہ ہو جاتی ہو، میں تو ویسے ہی مخول کر رہی تھی۔'' ابتہاج کی موجودگی اس کو خود بخود دھیما ہو جانے پر مجبور کر دیتی تھی اور اس وقت تو وہ خصوصی تیاری سے آئی تھی۔

''سکینہ بچیوں کو کچھ لسی پانی کا پوچھنا تھا۔'' اماں نے بوا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کی تھی۔

''اونہہ، کاجل کا ٹرک لگتا ہے کل ہمارے ہی پنڈ میں گرا تھا......'' وہ جاتے جاتے سدرہ پر طنز کرنا نہیں بھولی تھیں جس نے اس وقت آنکھوں کو کالا سیاہ کر رکھا تھا۔ ابتہاج اس وقت نائلہ سے باتیں کرنے میں مصروف تھا جب سدرہ نے شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وریشہ اب اماں کا بلڈ پریشر چیک کر کے ان کو اس وقت کی میڈیسن دے رہی تھی جبکہ وہ سدرہ اور

www.paksociety.com

نائلہ سے چھوٹی چھوٹی باتوں کے دوران اس کی تمام سرگرمیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بڑی خوشگوار سی حیرت ہو رہی تھی کہ اماں اور وریشہ کی کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ان سے باتیں کرتے ہوئے ان کو مختلف دوائیاں کھلا رہی تھی جس کو اماں تھوڑے نخرے کے بعد بالآخر کھا رہی تھیں۔ یہ منظر سدرہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

''بھئی آپ لوگ کب تک اس بے چاری سے اماں کی خدمتیں کروائیں گے، یہ بے چاری بھی سوچتی ہو گی کہ کہاں پھنس گئی۔ ہمیں بتائیں اگر سائرہ یا تابندہ نہیں ہیں تو میں اور نائلہ تو ہیں نا......'' اس کے لہجے میں تپش جبکہ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ تھی۔ اس کی بات پر ابتہاج نے چونک کر وریشہ کو دیکھا جس کی آنکھوں میں تحیر نمایاں تھا۔

''یہ بچی ایسی فضول باتیں نہیں سوچتی۔ ماشاءاللہ اچھے گھرانے کی ہے اور نیک ماں باپ کی اولاد ہے۔'' بوا کا لہجہ سلگتا ہوا لیکن انداز خاصا پُرسکون تھا۔

''میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ دس دن سے بے چاری اماں کو سنبھال رہی ہے۔'' سدرہ نے سنبھل کر کہا۔

''رہنے دو بی بی، ان دس دنوں میں کسی اور کو تو توفیق نہیں ہوئی۔ اب خود کو دیکھ لو گھر کے دروازے کے ساتھ دروازہ جڑا ہوا ہے لیکن تمہاری اماں کو دو قدم چل کر آنے کی ہمت نہیں ہوئی اور تم خود ان دس دنوں میں تیسری دفعہ نظر آئی ہو۔ باتیں کر رہی ہو خدمتیں کرنے کی......'' بوا نے ایک منٹ میں اس کی طبیعت صاف کی تھی۔ ابتہاج کے سامنے اتنی سچی باتیں اس کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ اس لیے اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس کی کاجل سے بھری آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو دیکھ کر سوائے بوا کے سب لوگ گھبرا گئے۔

''کیا ہو گیا ہے بوا آپ کو، یہ کوئی وقت ہے ایسی باتیں کرنے کا۔'' ابتہاج تھوڑا سا جذباتی ہو کر بولا تھا۔

''ہاں تو یہ کوئی ایسا بھی وقت نہیں ہے کہ خوامخواہ بیٹھ کر گونگلوؤں سے مٹی جھاڑی جائے۔'' وہ بھی کسی رعب میں آنے والی نہیں تھیں۔ اس لیے اپنی بات کر کے آرام سے صحن کی طرف چل دیں۔ وریشہ نے گھبرا کر سدرہ کو دیکھا جس کے آنسوؤں کے ساتھ بے دریغ بہتا کاجل اس کے چہرے کی رنگت کو مزید سانولا کر رہا تھا۔ اس نے اماں کے پاس پڑے ہوئے پانی کے جگ سے ایک گلاس پانی ڈال کر سدرہ کی طرف بڑھایا۔ اسے حقیقتاً اس کے آنسوؤں سے تکلیف ہوئی تھی، وہ حد درجہ حساس لڑکی تھی۔ اس گلاس کو دیکھ کر سدرہ کو کرنٹ لگا۔

''میں خالہ کے گلاس میں پانی نہیں پیوں گی......'' اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ وریشہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جو گھبرا کر کہہ رہی تھی۔ ''نہ جی نہ، ایسے مریض کے جراثیم بہت تیزی سے اڑ کر لگتے ہیں اس لیے تو اماں ڈر کے مارے نہیں آ رہی ہیں۔''

سدرہ کی بات پر ایک دم ہی سناٹا سا چھا گیا تھا۔ ابتہاج کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی تھی۔ اماں خوفزدہ نظروں سے وریشہ کو دیکھ رہی تھیں جو بے پروائی سے ان کے ہی چمچ سے ان کی چھوڑی ہوئی کھچڑی کھا رہی تھی۔ اس کی بات پر وہ دانستہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

''ایسا بالکل بھی نہیں ہے سدرہ، تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔'' وہ ابھی اسی گلاس سے پانی پی رہی تھی۔ سدرہ اور نائلہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ ابتہاج کے لیے مزید برداشت کرنا انتہائی مشکل تھا۔ اسے سدرہ کی بات سے سخت تکلیف

ہوئی تھی۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا رہا تھا اس لیے فوراً اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں بھی زیادہ دیر نہیں بیٹھی تھیں۔

''کیا ہو گیا ہے اماں آپ کو......'' وہ بہت نرمی سے بالکل خاموش اور ساکن سی اماں کا بازو پکڑ کر بولی تھی۔

''کچھ نہیں بیٹا......'' انہوں نے ایک سرد سی آہ بھری تھی۔

''میری بات غور سے سنیں، ہم مسلمان ہیں ناں......'' وہ بہت آہستگی سے ان سے مخاطب تھی۔ ''ہمارا تقدیر پر ایمان ہے ناں، یاد رکھیے گا، اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے آنے جانے اور دنیا میں رہنے اور دولت، بیماری ہر چیز کے بارے میں پہلے سے لکھ دیا ہے۔ ان سب چیزوں کو بس دعا بدل سکتی ہے اور کوئی چیز نہیں۔ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہوتی ہے بیماری بھی اور صحت بھی۔ کسی کو کسی سے کچھ نہیں ہوتا اگر ایسا ہو تو سب سے زیادہ تو ڈاکٹرز بیمار ہوں، جو سارا دن طرح طرح کے مریضوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ ساری فضول باتیں ہیں۔ اس کے لیے دل چھوٹا نہیں کرتے......'' وہ بہت پیار سے ان کو سمجھا رہی تھی۔

''بھرجائی دفع کرو، دیکھو کتنے مزے کا دلیا بنایا ہے میں نے......'' بوا ابھی ابھی اندر سے اپنی آنکھیں صاف کر کے باہر آئی تھیں، انہوں نے بھی سدرہ کی بات سن لی تھی لیکن دانستہ اس بات پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ ''قسم سے مجھے تو سدرہ کی شکل دیکھ کر بہت ہاسا (ہنسی) آیا، ایسے لگ رہا تھا جیسے تارکول کا پورا ڈرم اس کے بوتھے پر آن گرا ہو......'' بوا زبردستی ہنس رہی تھیں۔ ان کی تشبیہ پر وریشہ اور اماں کو بھی ہنسی آ گئی۔

''بے چاری کا سارا ہار سنگھار ضائع ہی ہو گیا......'' بوا کو اب واقعی میں ہنسی آ رہی تھی۔

''سکینہ ایسے کسی کا مذاق نہیں اڑاتے......'' اماں نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

''بھرجائی، وہ کسی کی نہیں صغراں کی بیٹیاں ہیں جن کی بے عزتی مجھ پر فرض کر دی گئی ہے......'' وہ ابھی بھی شرارت کے موڈ میں تھیں۔ اماں کو ان کے انداز پر دوبارہ ہنسی آ گئی۔ وریشہ اٹھ کر اندر کی طرف آ گئی۔

☆☆☆

ابتہاج کے کمرے میں وہ ہلکی سی دستک دے کر اندر چلی آئی تھی۔ وہ جو تکیہ منہ پر رکھے کمرے میں اندھیرا کیے لیٹا تھا، چونک گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ دیوار پر لگے بٹن کے ذریعے کمرے کی ٹیوب لائٹس کو روشن کیا۔

''کیا ہوا آپ کو، ایسے کیوں اٹھ کر آ گئے......؟'' وہ بے دھڑک اٹھ کر آ تو گئی تھی لیکن اب اسے اپنی یہ حرکت بہت بچگانہ سی لگ رہی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا، آپ کو کس نے کہہ دیا......؟'' وہ زبردستی ہنسا تھا۔

''آپ کا ہر انداز کہہ رہا ہے......'' اس نے فوراً کہا تھا۔

''مثلاً، کیا کہہ رہا ہے؟'' اس نے الٹا ہی سوال کر دیا۔

''یہی کہ آپ کو کوئی بات بری لگی ہے......'' وہ اس قدر غور سے دیکھ رہا تھا کہ وریشہ کو اپنے سارے الفاظ اڑتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

''اچھا، کیا بات ہو سکتی ہے......؟'' وہ اس کے کنفیوز ہونے پر مبہم سے انداز میں مسکرایا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ کو سدرہ کی بات بری لگی ہے......'' وہ بہ مشکل بولی تھی۔

''ہوں......!'' وہ کسی خیال میں الجھ کر بولا۔

''بری کا تو پتا نہیں لیکن مجھے دکھ ضرور ہوا ہے۔''

''ہاں، بعض دفعہ کہنے والے کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، آپ ذہن سے نکال دیں اس بات کو۔ خوامخواہ خود کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ؟'' وہ بہت محتاط انداز میں بات کر رہی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، اصل میں جب اپنے ہی رشتے دار آپ کے زخموں سے کھیلنے لگیں تو زیادہ دکھ ہوتا ہے اور سدرہ کی والدہ تو میری اماں کی سگی خالہ زاد ہیں۔ اماں نے بہت سے مواقع پر ہم سے چھپ کر ان کی مدد کی، وہ نیکی کی تشہیر کرنے کی قائل نہیں، اس لیے مجھے خاصا افسوس ہوا۔'' وہ خاصے رنجیدہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''بس اپنے اپنے ظرف کی بات ہوتی ہے ناں، اور پھر وہ ایک قول بھی تو ہے ناں کہ جب کسی پر احسان کرو تو پھر اس کے شر سے بچو......'' وریشہ کا انداز بھی حد درجہ سنجیدہ تھا۔

''ہاں، میں آئے دن اوٹ پٹانگ باتیں سنتا رہتا ہوں لیکن نظر انداز کر جاتا ہوں جبکہ بوا بے چاری بھڑک اٹھتی ہیں۔ اصل میں انہوں نے زندگی میں بہت مشکل حالات دیکھے ہیں، ان کے میاں کی والدہ سوتیلی تھیں جنہوں نے ان کے سسر کے انتقال پر دونوں کو خالی ہاتھ گھر سے نکال دیا تھا۔ ابا ان کو زبردستی یہاں لے کر آئے۔ ابا کے ایک بھائی اور ایک بہن تھیں اور معاشی حالات بہت مضبوط تھے ماشاء اللہ۔ ان کے اکلوتی بہن کوئی بوجھ نہیں تھی لیکن اس کے باوجود پھوپا آج بھی زمینیں سنبھالنے کی تنخواہ کے علاوہ ایک پیسہ نہیں لیتے۔ بہت ایماندار اور محنتی ہیں لیکن سارے خاندان والے ان کو باتیں سنانے اور گھر دامادی کے طعنے دینے سے باز نہیں آتے۔ بوا نے تنگ آ کر ان کی باتوں کا جواب دینا شروع کیا ہے ورنہ وہ بہت صابر خاتون ہیں۔ اللہ ان کو اجر دے، انہوں نے اماں کی بہت خدمت کی ہے......'' وہ پہلی دفعہ اپنے خاندان کے بارے میں اتنی باتیں شیئر کر رہا تھا۔ اسے اچانک خیال آیا تھا کہ وہ ابھی تک کھڑی ہے۔

''آئی ایم سوری، میں نے ابھی تک آپ کو بیٹھنے کا نہیں کہا......'' وہ ایک دم ہی شرمندہ ہو کر خود بھی کھڑا ہو گیا۔ ''بلکہ ایسا کرتے ہیں میں آپ کو اپنا لان اور اصطبل دکھاتا ہوں، باہر ہی چلتے ہیں......'' اس کا محتاط انداز وریشہ کو اچھا لگا تھا۔

''اچھا، گھوڑوں سے بھی شغف رکھتے ہیں آپ......؟'' اس کے شرارت بھرے انداز پر وہ ایک دم قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ اس کو ہنستے ہوئے اماں نے بڑی خوشگوار حیرت سے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار جگنو ایک دم ہی اتر آئے تھے۔ انہوں نے دونوں کو اکٹھے جاتے ہوئے دیکھا اور ساتھ بیٹھی بوا کو مسکراتے ہوئے دیکھا، وہ بھی ان کا اشارہ سمجھ کر مسکرا دیں۔

''آپ کو پتا ہے کہ بابا کا نمبر کیوں بند جا رہا ہے، اس دن کال بھی آئی تو نمبر ڈسپلے نہیں ہو رہا تھا......'' وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے یک دم بولی تھی۔

''اچھا، میرے ساتھ تو ان کی رات ہی بات ہوئی ہے، وہ انڈیا میں تھے اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔'' وہ چلتے چلتے رکا تھا۔

''واقعی......؟'' وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

''جی وہ کہہ رہے تھے کہ شاید ان کو مزید ایک ہفتہ اور لگ جائے، اس لیے جیسے ہی تابی واپس آ جائے تو میں آپ سے پوچھ کر ہاسٹل چھوڑ آؤں......'' وہ اصطبل کے سامنے پہنچ گئے تھے۔

ہاسٹل جانے کا ابھی کوئی فائدہ نہیں، ہڑتال چل رہی ہے اور دور دراز کے لوگ بے فکر ہو کر اپنے گھروں کو جا چکے ہیں......'' اس نے بے پروائی سے کہا تو ابتہاج کے منہ سے بے اختیار پُرسکون سی سانس

خارج ہوئی۔ وہ اپنے اصطبل میں موجود تینوں گھوڑوں کا تعارف کروا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور لہجے میں ان کے لیے بے تحاشا محبت تھی۔

''یہ عربی نسل کی گھوڑی بابا کو ان کے ایک شیخ دوست نے گفٹ کی تھی اور اس کے ساتھ میں نے پاکستان ڈربی کے کئی مقابلے جیتے ہیں۔ گھڑ سواری کے شوقین افراد کے لیے پاکستان ڈربی کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس میں ملک بھر کے چوٹی کے گھوڑے اور گھوڑیاں حصہ لیتے ہیں۔ میں پاکستان ریس کلب کا ممبر بھی ہوں۔'' وہ اپنی سیاہ رنگ کی خوب صورت نسل کی گھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''گھوڑوں سے محبت مجھے بابا کی طرف سے جینز میں ملی ہے، مجھے انہوں نے چھ سال کی عمر میں ہی گھڑ سواری سیکھنے کے کلب میں بھیج دیا تھا۔ ان کو گھڑ سواری کا جنون تھا اور وہ پولو کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔''

''ہوں، نائس......'' وریشہ نے ڈرتے ڈرتے ایک گھوڑے پر ہاتھ رکھا تو وہ یک دم ہنہنایا، وہ ڈر کر فوراً پیچھے ہٹی تو ابتہاج اپنے بے ساختہ قہقہہ کو نہیں روک پایا۔

''اصل میں آپ کا لمس ابھی اس کے لیے اجنبی ہے، اس لیے اس نے ناگواری کا اظہار کیا ہے۔ آپ بار بار آئیں گی ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں گی اور ان کو پیار سے سہلائیں گی تو یقین کیجیے یہ بہت پیارا اور وفادار جانور ہے، یہ آپ کو بہت اچھا رسپانس دے گا۔''

''نہ بھئی نہ، جانوروں کا کیا اعتبار......'' وہ ڈر کے دیوار کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ڈر اور تذبذب تھا۔

''آج کل کے دور میں انسانوں کا اعتبار نہیں ہے، جانور تو بہت معصوم ہوتے ہیں......'' وہ اچھل کر اس پر سوار ہوا تھا۔ گھوڑی نے فوراً خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وریشہ دو قدم اور پیچھے ہو کر کھڑی ہو گئی تھی، اس کی یہ غیر ارادی حرکت ابتہاج کی تیز نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ وہ مسکرا کر نیچے اتر آیا تھا پھر وہ اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا اور اس کو بتا رہا تھا۔

''ابا ویسے تو تحصیل دار تھے لیکن ان کے اندر وہی زمینداروں والا ٹپیکل خون تھا۔ وہ اپنی زمینوں پر آ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے چند سال ہی نوکری کی اور جب چچا باہر چلے گئے تو وہ فوراً استعفیٰ دے کر گاؤں واپس آ گئے پھر ان کی ساری زندگی یہیں گزری۔''

''اس کا مطلب ہے کہ زمین سے محبت بھی آپ کو جینز میں ہی ملی ہوگی......'' وریشہ نے اسے چھیڑا۔ وہ لوگ پچھلے گیٹ سے باہر نکل آئے تھے۔ سامنے گندم کی فصل لہلہا رہی تھی۔

''نہیں، یہ شوق مجھے وارثت میں نہیں ملا......'' وہ ہنسا...... ''مجھے کوئی ایسا لگاؤ نہیں، اس لیے میں اس طرف آیا ہی نہیں، زمینوں کے معاملے پھوپا اور منشی صاحب ہی سنبھالتے ہیں۔ میں اصل میں چاہتا تھا کہ کچھ زمین جو فالتو پڑی ہے اس پر اسپتال بنا کر سائرہ کے حوالے کر دوں لیکن اس کے میاں کو پاکستان میں رہنا ہی پسند نہیں۔''

''آپ اسپتال کیوں بنانا چاہتے ہیں......؟'' اس نے بڑے تحیر کے عالم میں پوچھا۔ اس کے لیے یہ بات بہت حیرت انگیز تھی۔

''سچ بتاؤں پہلے تو کبھی کبھی یہ خواہش بیدار ہوتی تھی جب اپنے گاؤں کے لوگوں کو آج کے اس دور میں بھی بنیادی ضروریات کے لیے ترستے دیکھتا تھا۔ اب ہر کوئی تو شہر جانا افورڈ نہیں کر سکتا ناں۔ اس کے بعد جب اماں کی بیماری کا اس وقت پتا چلا جب بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا، اس کے بعد سے تو یہ خواہش جنون بن چکی ہے۔ میں نے سارا

WWW.PAKSOCIETY.COM

استیمیٹ لگوایا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ڈاکٹر کو ہم بھاری بھرکم پیکیج دے کر ہی اس گاؤں میں آنے پر مجبور کرسکتے ہیں۔ کوئی اپنی خوشی سے اس پسماندہ گاؤں میں کیوں آئے گا۔ اس میں ان کا بھی قصور نہیں، معاشی ضروریات سارے انسانیت کے سبق بھلادیتی ہیں۔'' وہ آخر میں تھوڑا تلخ ہوا۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، سب لوگ ایسا نہیں سوچتے......'' وریشہ نے برا منایا۔

''وریشہ بی بی، کتنے فیصد لوگ ایسا سوچتے ہوں گے۔ آپ خود بتائیں کہ آپ یہاں آکر کام کرنے کو تیار ہوں گی......؟'' وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بالکل اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ وریشہ کو جھٹکا لگا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا جس کی گہری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وریشہ کو ایسا لگا جیسے اس نے کوئی ایکسرے مشین اپنی آنکھوں میں فٹ کروا رکھی ہو اور وہ اس کا دماغ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''دیکھا......چپ ہوگئیں نا......؟'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا اور وریشہ کو ایک دم غصہ آگیا تھا۔

''میں نے کب انکار کیا؟'' اب کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہی تھی۔

''جانے دیں وریشہ انصاری، ایسے جذباتی نہیں ہوتے۔ زندگی جذباتیت کے سہارے نہیں گزرتی۔'' وہ اب بھی اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

''زندگی میں سے جذبات نکال دیے جائیں تو اس مشینی زندگی کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ آپ خود بتائیں کہ کیا اسپتال بنانے کا ارادہ آپ نے بھی جذبات کے زیر اثر نہیں کیا؟'' وہ تڑخ کر بولی۔

''یہ میرا بالکل بھی جذباتی فیصلہ نہیں، میں نے پورے دو سال اس پر سوچا اور پھر اس کو فائنل کیا ہے، میں نے اس جگہ آنکھ کھولی ہے ان لوگوں کے درمیان پلا بڑھا، ان کی مشکلات کا مجھے اندازہ ہے۔ یہی جذباتی انسیت مجھے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ کو کیا انس ہوسکتا ہے؟ آپ کیوں اپنے آپ کو اس جگہ پر ضائع کریں گی......'' وہ بے حد سنجیدہ تاثرات لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں یہاں کیوں خود کو ضائع کروں گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ میں اسٹڈی مکمل کر کے لاہور واپس جاؤں اور وہاں کسی اسٹیبلش اسپتال سے منسلک ہوجاؤں۔ جہاں میرے نہ ہونے سے کسی کو بھی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ وہاں پہلے سے بہترین لوگ ہوں گے۔ ہاں ایسی کسی پسماندہ جگہ جہاں میرے نہ ہونے سے بہت سے لوگوں کو فرق پڑے......میں خود کو وہاں کے لیے وقف کیوں نہ کروں؟'' اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

''سوچ لیں بہت بڑی بات کہہ رہی ہیں آپ......'' ابتہاج مطمئن انداز میں ہنسا اور گہری سانس لے کر اسے نظروں میں سمویا۔

''اپنی غلط فہمی دور کرلیں، میں آپ کے اسپتال کی بات نہیں کررہی بلکہ کسی بھی پسماندہ علاقے میں بننے والے اسپتال کی بات کررہی ہوں۔ وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں لپکنے والی چمک نے وریشہ کو ٹھٹکنے پر مجبور کردیا۔ وہ گھبرا کر سامنے بنی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے بولی۔ وہ ایک دم تیز تیز چلتا ہوا اس کے سامنے آکر راستہ روک کر بولا۔

''اگر میرے اسپتال، میرے گھر، میرے دل سے بہتر جگہ آپ کو کوئی لگے تو آپ جاسکتی ہیں......'' اس نے بہت جذب سے کہا تھا۔ وریشہ کو اپنے پورے وجود میں کرنٹ سا دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ گھبرا کر پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اندر کی جانب بڑھنے لگی۔ اپنے عقب میں اس نے ابتہاج کا قہقہہ سنا تھا۔ اس کے چہرے کی سرخی میں اضافہ ہوا۔ اس کا دل عجیب سی لے پر دھڑک رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے حصار میں

جکڑی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ہکا بکا تابی کو دیکھ رہی تھی جو پندرہ دن کے بجائے بارہ دن بعد ہی واپس آگئی تھی اور اب بڑے مزے سے اماں کے تخت پر ان کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ چھلانگ مار کر خوشی سے اتری اور اب بڑے والہانہ انداز میں اس کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

''تم کہاں سے آگئیں؟ کیا سعودیہ سے ڈائریکٹ لینڈنگ یہیں گاؤں میں کی تھی......'' اس نے بے ساختگی سے کہا۔

''ہمیں پتا چلا تھا کہ آپ اور اماں ہمیں بہت دل سے یاد کررہی ہیں، بس ہم نے بھی فوراً واپس آنے کی ٹھان لی۔'' تابندہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ہم نے تو ایسی غلطی نہیں کی، کیوں اماں......؟'' اس کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی۔ اماں بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا کر ہنسنے لگیں۔

''دیکھ لیں بھائی، آپ ڈاکٹر صاحبہ کو اور اماں کو، دونوں آپس میں کتنا ''ایکا'' کر کے بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں بے چاری دس دنوں کے لیے کیا گئی دونوں نے آنکھیں ہی ماتھے پر رکھ لیں ہیں۔'' وہ لاڈ بھرے انداز سے برآمدے کے ایک کونے میں رکھے بڑے سارے لکڑی کے جھولے میں اخبار منہ پر رکھے ابتہاج سے مخاطب ہوئی۔ وہ بھی وریشہ کی آواز پر فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پچھلے تین دن سے اس کے سامنے آنے سے ہر ممکن کترا رہی تھی۔ اس وقت شاید اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے بوکھلا کر وہ فوراً ہی اماں کے پاس بیٹھ گئی۔

''بھئی میں کیا کہہ سکتا ہوں، یہ آپ خواتین کا معاملہ ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنا دامن چھڑایا۔ وہ اب متبسم انداز میں بغور اسے دیکھ رہا تھا جو اماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کررہی تھی۔

''اس لیے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ اپنی خاتون بھی گھر لے آئیں تاکہ خواتین کے معاملے میں بول سکیں۔'' اس نے بھائی کو چھیڑا۔

''نہ بابا، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں......'' اس نے ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''سوچ لیں، ورنہ ہم بہت کچھ سوچ چکے ہیں......'' تابندہ کے لہجے کی معنی خیزی نے وریشہ اور ابتہاج دونوں کو ہی چونکا دیا تھا۔

''کیوں اماں؟'' اس نے اپنی چھیڑ چھاڑ میں اماں کو بھی گھسیٹا، جن کو صبح سے ہلکا ہلکا بخار تھا لیکن وہ اس کے باوجود مسکرا رہی تھیں۔

''میری تو بیٹا اب آخری یہی خواہش ہے کہ جو چند دن رہ گئے ہیں بیٹے کی خوشی بھی دیکھ لوں۔'' دلگرفتہ تو وہ پہلے سے ہی ہو رہی تھیں اب آنسو بھی چلے آئے تھے۔ وہ تینوں بوکھلا گئے۔

''کیا ہوگیا ہے اماں آپ کو، کیوں ایسی باتیں کرتی ہیں......'' تابندہ جذباتی ہوکر سب سے پہلے بولی تھی۔ ابتہاج بھی اٹھ کر ان کے پاس آگیا تھا۔ وریشہ نے اٹھ کر فوراً اسے جگہ دی۔ وہ اب سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ پورے ماحول میں ایک محسوس کی جانے والی سوگواریت پھیل گئی تھی۔ ابتہاج اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو صاف کر رہا تھا۔

''ان کی وجہ سے ہم لوگ پندرہ دن کی جگہ بارہ دن میں واپس چلے آئے اور اگلے ہفتے سائرہ بھی آجائے گی پھر بھی اماں ایسی دل دکھانے والی باتیں کرتی ہیں۔'' تابی نے بہ مشکل آنسوؤں پر قابو پا کر بھیگے لہجے میں کہا۔

''اماں کو اسی چیز کی تو ٹینشن ہے کہ اتنی مشکلوں سے تم دونوں کو گھر سے نکالا تھا، تم لوگ ہر تیسرے دن

آجاتی ہو، کیوں اماں......؟'' ابتہاج نے ماحول کی سوگواریت دور کرنے کی ہلکی پھلکی کوشش کی۔

''آ لینے دیں سائرہ کو بتاؤں گی اسے، وہ ہی آپ کو ٹھیک رکھتی ہے......'' تابندہ روتے روتے ہنسی تھی۔

''آجائے وہ کون سا میرے اوپر ڈی سی لگی ہوئی ہے......'' وہ بھرپور انداز میں اسے چھیڑ رہا تھا۔

''چلیں، آپ تو کافی لوگوں کے اوپر ڈی سی لگے ہوئے ہیں ناں، ان کو جا کر ڈرائیں، ہم ڈرنے والوں میں سے نہیں......'' وہ حسبِ عادت زور سے ہنس دی۔

''تم لوگ مجھ سے چھوٹی ہو کر نہیں ڈرتی ہو کوئی اور کیا ڈرے گا......'' اس نے اماں کے کندھے دباتے ہوئے مصنوعی مایوسی اپنے اوپر طاری کی۔

وریشہ نے چونک کر ان دونوں کو دیکھا۔ جو اب ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ بوا بھی ان کے پاس آ بیٹھیں اور رات گئے تک گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ اماں بھی باقاعدہ ساری بات چیت میں بھرپور حصہ لیتی رہیں۔ وہ بخار کے باوجود کافی فریش تھیں۔ صبح چار بجے کے قریب ان کی حالت کچھ خراب ہوئی اور ان کو دوبارہ اسپتال لے جایا گیا، وہاں کچھ گھنٹوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ سب ہکا بکا تھے۔ سب سے بری حالت سائرہ کی تھی۔ اس کی سیٹس اگلے ہفتے کی تھیں اور اماں اس کا انتظار کیے بغیر چلی گئی تھیں۔ وہ سخت صدمے کے عالم میں جب پہنچی تو اماں اپنی آخری آرام گاہ جا چکی تھیں۔ ایک ہفتے کے بعد سائرہ آئی تو گھر کا ماحول ایک دفعہ پھر سوگوار ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اماں کا انتقال ابھی ابھی ہوا ہو۔ سارا گاؤں ایک دفعہ پھر امڈ آیا تھا۔ تعزیت کا سلسلہ تو پچھلے ایک ہفتے سے ہی جاری تھا لیکن سائرہ کی آمد کے بعد لوگ ایک دفعہ پھر اس سے افسوس کرنے آ رہے تھے۔ بوا تو بالکل گم صم تھیں وہ اماں کی وفات کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں اس لیے بیٹھے بیٹھے اماں کو آوازیں دینے لگتیں تو کبھی ان کے لیے پرہیزی کھانا تیار کر کے گھنٹوں میز پر رکھ کر اسے تکتی رہتیں اور پھر بلند آواز میں رونا شروع کر دیتیں۔

وریشہ نے کچھ دن ان کو ڈپریشن کم کرنے کی ادویات دیں لیکن کوئی افاقہ نہ دیکھ کر اس دن وہ بوا کے سامنے آ بیٹھی۔

''آپ اس حقیقت کو مان کیوں نہیں لیتیں کہ اماں اب اس دنیا میں نہیں رہیں، یقین کریں اس کو مان لینے سے آپ کی زندگی آسان ہو جائے گی۔'' وریشہ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بہت محبت اور نرمی سے کہا تھا۔

''میرا دل نہیں مانتا......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

''آپ کے دل کے نہ ماننے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی ناں، جب میری ماما کا انتقال ہوا تھا تو مجھے بھی لگتا تھا کہ بس یہ ایک ڈراؤنا سا خواب ہے، آنکھ کھلے گی تو سب کچھ ویسا ہو گا لیکن بوا سب کچھ ویسا نہیں ہو سکتا، حقیقت پہاڑ کی طرح ہوتی ہے ہم جب بھی ڈر سے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولتے ہیں وہ پہاڑ پوری طاقت کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں حقیقت کی طاقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ یقین مانیں بہت دکھ ہوتا ہے، دل پھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ وقت اس کی تلخی کو خود بخود کم کر دیتا ہے۔'' وہ بہت اپنائیت سے ان کو سمجھا رہی تھی۔

''پتر تم سوچ نہیں سکتی ہو کہ میری بھر جائی میرے لیے کیا تھی، ایک ماں کی طرح اس نے مجھے پناہ دی، ایک بہن کی طرح مجھے محبت سے نوازا، ایک سہیلی کی طرح میرے دکھ سکھ سنے۔ میں جب اس

گھر میں میاں کے ساتھ آئی تھی تو دنیا نے بہت ڈرایا تھا کہ بھر جائیاں مستقل طور پر نندوں کو برداشت نہیں کرتیں لیکن میری بھر جائی تو ایسی نیک صفت عورت تھی کہ ساری زندگی میں نے اس عظیم عورت کے متھے پر کوئی بل نہیں دیکھا۔ مجھے تو لگتا ہے میری ماں ایک دفعہ پھر مر گئی۔'' بوا کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ سائرہ بھی ان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر وہاں آ گئی تھی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''میں مانتی ہوں بوا اس بات کو۔ آپ کا دکھ بہت بڑا ہے لیکن یہ بھی تو سوچیں ناں کہ اللہ اپنے بندوں پر کبھی بھی ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ صبر کرنا آسان نہیں لیکن انسان اس معاملے میں بے بس ہے۔ آپ یہ بھی تو سوچیں کہ اماں نے اپنی تکلیف کو کس قدر بہادری اور حوصلے سے برداشت کیا، میں نے کبھی بھی ان کے منہ سے اف نہیں سنی، ورنہ جتنی تکلیف میں وہ تھیں ایسے مریض بے چارے تو تکلیف کی شدت سے بے حال ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے گھر والے بھی اسی تکلیف کو محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔'' اس کی بات پر بوا نے بے اختیار اپنے آنسو صاف کیے تھے جبکہ وہ اپنے مخصوص محبت بھرے انداز میں گویا تھی۔ ''جتنی تکلیف میں وہ تھیں اللہ نے ان کو بہت آسانی دی ہے۔ آپ بس ان کے لیے دعا کریں کہ ان کی اگلی منزلیں بھی اللہ آسان کرے۔''

''انشاء اللہ......'' بوا اور سائرہ دونوں کے منہ سے ایک ساتھ ہی نکلا تھا۔

''وریشہ تم بہت اچھی لڑکی ہو اللہ تمہاری قسمت بہت اچھی کرے تم نے ہمارا بہت مشکل وقت میں ساتھ دیا۔'' سائرہ نے پُرخلوص انداز سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

''پتا نہیں سائرہ، میرے یہاں آنے میں خدا کی کیا مصلحت تھی، میں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس علاقے میں آؤں گی لیکن میں نے یہاں جتنا بھی وقت گزارہ، میں سب لوگوں کی محبت اور اپنائیت کو کبھی بھی نہیں بھلا پاؤں گی۔ آپ کی والدہ بہت اچھی اور نیک خاتون تھیں، انہوں نے مجھے بالکل ایک سگی ماں کی طرح ٹریٹ کیا بعض دفعہ تو مجھے بے اختیار ماما یاد آ جاتی تھیں......'' وریشہ کی آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی لیکن وہ زبردستی مسکرا رہی تھی۔

''تمہیں اس لیے اماں اچھی لگیں کیونکہ تم اصل میں خود بہت اچھی اور خالص لڑکی ہو، تم میں بناوٹ قطعاً نہیں......'' سائرہ نے کھلے دل سے اسے سراہا تھا۔

''تھینک یو سائرہ......'' وریشہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے ابتہاج بتا رہا تھا کہ تمہارے بابا تمہیں لینے آ رہے ہیں......'' سائرہ کی بات پر وہ چونکی، خوشی کا بڑا گہرا احساس بڑے فطری انداز سے اس کے چہرے پر نمودار ہوا تھا۔

''اچھا واقعی......کب......؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

''ابھی تو تم ہماری محبتوں کا اعتراف کر رہی تھیں اور اب ایسے خوش ہو رہی ہو جیسے کسی قیدی کو جیل سے چھٹکارا مل رہا ہو......'' سائرہ نے شرارت سے اسے چھیڑا تو وہ فوراً جھینپ گئی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، اصل میں بابا سے ملاقات ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ناں اس لیے اور پھر میرے فائنل ایئر کے ایگزام بھی قریب ہیں......''

''چلو شکر ہے ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ شاید تم ہمارا دل رکھنے کے لیے کہہ رہی تھیں......'' سائرہ نے اس کے بلش ہوتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھا۔

www.paksociety.com

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

''وریشہ بہت مروت والی لیکن بہت سادہ سی لڑکی ہے اس کو گھمن گھیریاں دینی نہیں آتیں......'' تابی چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہیں بہت پتا ہے نا......'' سائرہ نے چائے کی شوقین تابندہ کا بڑا مگ اٹھاتے ہوئے شرارت سے کہا، جبکہ وہ اس کی شرارت پر گھور کر رہ گئی۔

''جوہر شناس نظریں ہیں ہماری......'' تابندہ نے اپنا فرضی کالر اٹھاتے ہوئے ٹھاٹ سے کہا تھا۔

''کس کی جو ہر شناس نظریں ہیں، کیا میری......؟'' ابتہاج کوئی فائل اٹھائے اچانک اندر آیا تھا۔ اس نے تابندہ کی بات سنی تھی۔ اس لیے سوالیہ نظروں سے سامنے بیٹھی چاروں خواتین کو غور سے دیکھا۔ آج کافی دن بعد بوا کے چہرے پر کچھ اسے بشاشت نظر آئی تھی۔ اس نے آتے ہی وریشہ کی چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگالیا۔

''بھائی یہ وریشہ کی چائے تھی......'' تابی نے احتجاجی نظروں سے اسے دیکھا جو بہت مزے سے کھڑا چائے پی رہ تھا۔

''زیادہ چائے پینے سے رنگ کالا ہوجاتا ہے، تمہارا تو پہلے ہی پورا سورا ہے اب وریشہ کو تو احتیاط کرنی چاہیے......'' وہ بھی آج کافی دن بعد مسکرایا تھا۔

''آپ کو وریشہ کے رنگ کی کیوں اتنی ٹینشن ہورہی ہے......؟'' سائرہ نے غور سے بھائی کا چہرہ دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولی۔

''ظاہر ہے مجھے ہی تو ٹینشن ہوگی، کل پروفیسر صاحب آرہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ اپنی بیٹی کو پہچاننے سے انکار کردیں'لے کر تو میں ہی آیا تھاناں......'' اس کا انداز سنجیدہ جبکہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

''بے فکر رہیں، دوبارہ بھی آپ ہی لے کر آئیں گے......'' سائرہ کے ذومعنی انداز پر دونوں نے گڑ بڑا کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر شوخی اور شرارت رقصاں تھی اور وہ بہت مزے سے چسکیاں لے لے کر چائے پی رہی تھی، وریشہ کو اندازہ ہوا کہ دونوں بہن بھائی میں حد درجہ بے تکلفی تھی۔ اسے یاد آیا تابندہ نے بتایا تھا کہ دونوں میں صرف ایک سال کا فرق ہونے کی وجہ سے کافی دوستی تھی۔ سائرہ بڑی بے تکلفی سے اس کا نام لے کر بلاتی تھی۔ اس کی بات کو نظر انداز کرکے وہ بولا تھا۔

''اب فٹافٹ ان کاغذوں پر سائن کردو، اپنا اپنا حصہ لو، ایسا نہ ہو کہ کل میری نیت خراب ہوجائے......'' وہ مختلف قانونی معاملات کے ڈاکومنٹس سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

''یہ کیا خرافات ہیں، میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے......'' تابی نے انتہائی خفگی سے کہا تھا۔

''یہ خرافات نہیں، اماں کے نام پر جو چیزیں تھیں ان کے ڈاکومنٹس ہیں، مجھے اسلام کے بنائے گئے قوانین پر چلنا ہے، جو تم لوگوں کا حصہ بنتا ہے وہ تو میں کسی صورت نہیں رکھوں گا۔ میں کیوں گناہ گار بنوں۔ اس لیے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں، فوراً سائن کرو......'' اس نے انتہائی محبت بھرے انداز میں دھمکایا تھا۔

''آپ میرا سارا حصہ تو اپنے اسپتال میں ڈال لیں اور ایک وارڈ اماں کے نام پر ضرور بنائیں......'' اس نے سائرہ کی سنجیدہ سی بات سنی تھی۔ وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ آئی۔ وہ ان کا انتہائی ذاتی معاملہ تھا اس لیے اس نے وہاں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔

''میں پورا اسپتال ہی اماں کے نام پر بنا رہا ہوں......'' وریشہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے ابتہاج کا جواب سنا تھا۔ اسپتال کے نام پر اسے کچھ دن پہلے کی اس کی بات یاد آگئی۔ اس کے چہرے پر

www.Paksociety.com

بڑے خوب صورت رنگ پھیلے تھے۔

☆☆☆

''اوہ مائی گاڈ......تم کامریڈ کے گاؤں میں اس کے گھر پر ہو، مجھے جب بابا نے بتایا، یقین مانو مجھ سے صبر نہیں ہو سکا......'' ارسلہ کی کافی دن کے بعد جاپان سے کال آئی تھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں چیخ کر بول رہی تھی۔ وہ جب بھی کچھ جوش میں آتی تھی اس کی آواز کا والیوم خود بخود تیز ہو جاتا تھا۔

''کہاں ہے وہ خبیث انسان......؟'' وہ ارسلہ کے انتہائی بے تکلفانہ انداز پر چونکی۔ ''اس خبیث کو میں نے اماں کے انتقال پر فون کیا، اس سے پہلے ان کی بیماری کے دنوں میں بھی اس سے رابطہ رہا لیکن اس گھنے نے مجھے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ تم اس کے گھر میں ہو، یہ شروع سے ہی انتہائی گھٹیا حرکتیں کرتا آیا ہے۔'' ارسلہ کے انداز و بیاں سے لگ رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیاں خاصے بے تکلفانہ مراسم تھے۔

''تم اس کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ، تم کہاں مر گئی تھیں، آج بیس پچیس دن کے بعد تمہیں میرا خیال آیا ہے......'' وریشہ نے اس کی کلاس لی۔

''کہاں فون کرتی، جس سرنگ میں تم رہ رہی ہو آج کل، وہاں سگنل ہی کہاں ڈھنگ سے آتے ہیں، ویسے یہ کامریڈ کا بچہ ڈپٹی کمشنر لگا ہوا ہے اور اپنے گاؤں میں ایک بوسٹر نہیں لگوا سکتا، ذرا بات کراؤ مجھ سے اس کی طبیعت میں سیٹ کروں گی۔'' ارسلہ کا غصہ کسی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا۔

''یہ تم کامریڈ ابتہاج کو کہتی تھیں......یہ ڈپٹی کمشنر ہے؟'' وریشہ کے دماغ میں کچھ باتیں کلک کر کے روشن ہوئی تھیں۔ اس کو جھٹکا ہی تو لگا تھا۔

''یہ کامریڈ وہی ہے نا جس کی سی ایس ایس میں سیکنڈ پوزیشن تھی......؟'' اس نے سخت حیرت سے پوچھا تھا۔ کامریڈ کے حوالے سے اس کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس نے کئی دفعہ بابا اور ارسلہ کے منہ سے یہ نام سنا تھا۔

''ہاں، وہی میرا خبیث کلاس فیلو، اتنا مشکل اس کا نام تھا، کون ایک منٹ لگا کر ابتہاج ہاشمی کہے۔ اس لیے جب بابا نے اس کا نام کامریڈ رکھا تو ہم سب نے بھی اسے یہی کہنا شروع کر دیا۔'' وہ بہت مزے سے کہہ رہی تھی۔ ''میرا اور اس کا ہر معاملے میں مقابلہ چلتا تھا جب میں نے سی ایس ایس میں ٹاپ کیا تھا تو اس کی شکل دیکھنے والی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہماری بڑی مزے والی دوستی تھی بلکہ ہے۔ ابھی بھی ہر پندرہ دن بعد بات ہو جاتی ہے اور زیادہ وقت ہمارا لڑنے میں ہی گزر جاتا ہے۔ کئی دفعہ تو ہمارے گھر بھی آیا ہے، تمہیں یاد ہے......؟''

''نہیں مجھے یاد نہیں اور ویسے بھی پچھلے چار سالوں سے تو میں ہاسٹل میں ہوں......'' اس نے سادگی سے کہا۔ اسے سخت حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنا سادہ دکھائی دینے والا بندہ ڈپٹی کمشنر تھا۔ اسے اور نہ ہی اس کے گھر میں سے کسی کو اس کی اس پوسٹ پر اس نے اتراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سارے ہی حد درجہ سادہ اور درویش صفت لوگ تھے۔

''حیرت ہے مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں......'' وہ بات کرتے کرتے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر رک گئی تھی۔

''پتا ہے وریشہ، بابا کی بہت خواہش تھی کہ میری اس کے ساتھ شادی ہو جائے......'' ارسلہ نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا، وریشہ کو اپنے ارد گرد دھماکا سا محسوس ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ کھڑکی کے پٹ کو تھاما۔

''ہاں......'' وہ اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگا کر ہنسی...... ''میرا ان دنوں عشق اشعر کے ساتھ زوروں پر تھا اور کامریڈ کو اس کا پتا تھا۔ یہ تھا تو خبیث لیکن اس نے اس معاملے میں ہمارا خوب ساتھ دیا کیونکہ اشعر اس کا بیسٹ فرینڈ تھا۔ بابا کو آج تک ہمارے عشق کی خبر نہیں ہو سکی، ابتی نے بڑے اچھے انداز سے اس کا پرپوزل بابا کے سامنے پیش کیا اور بے چارے بابا، ماما کو بتا رہے تھے کہ ان کی خواہش تو ابتہاج کے لیے تھی لیکن اس نے پہلے ہی اپنے دوست کا پرپوزل بھیج دیا اس لیے انہوں نے اس معاملے کو وہیں ختم کر دیا اور پھر اشعر سے مل کر تو بابا بہت خوش ہوئے اور جھٹ پٹ ہماری شادی ہو گئی۔''

''تم کتنی گھٹیا ہو ارسلہ، تم مجھے آج یہ اپنی تھرڈ کلاس فلمی اسٹوری سنا رہی ہو، تمہیں شرم نہیں آتی......'' وریشہ کو اس کی ہنسی سخت زہر لگ رہی تھی۔

''اس وقت تو قسم لے لو بہت شرم آتی تھی اور کچھ تم اپنی میڈیکل کی اسٹڈی میں اتنی غرق تھیں کہ میں نے سوچا کہ کیا اپنی معصوم بہن کو تنگ کرنا، خود ہی مسئلہ حل کر لیتے ہیں اور کچھ تم سے تھوڑی سی جھجک جو تھی کہ کیا سوچو گی......'' اپنی بات کے آخر میں اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا تھا۔

''یقین کرو دل کر رہا ہے کہ میں آ کر تمہارا سارا منہ نہ سہی لیکن اگلے چار دانت تو ضرور توڑ ہی دوں......'' اس کی ہنسی وریشہ کو تپا رہی تھی۔ اس نے کوفت اور جھنجلاہٹ سے سامنے کھلی کھڑکی سے اندر آتی سدرہ کو دیکھا۔ اسی وقت ابتہاج بھی برآمدہ کراس کر کے صحن میں پہنچا تھا۔ سدرہ نے اسے روک لیا تھا۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے ہاتھ میں پکڑی فائل کا ماتھے پر چھجا سا بنائے کھڑا تھا۔ وریشہ کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

''شکر ہے کہ بابا کا مسئلہ حل ہوا، مت پوچھو کتنی ٹینس تھی میں......؟'' ارسلہ اب کچھ سنجیدہ ہو رہی تھی۔

''کون سا مسئلہ......؟'' اس نے بے دھیانی سے پوچھا۔ آنکھیں اتنے فاصلے سے بھی سامنے کا منظر صاف دیکھ رہی تھیں۔ وہ سدرہ کو کچھ کہہ رہا تھا جبکہ اس کا شرمایا ہوا چہرہ اور اس پر پھیلے رنگ وریشہ کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہے تھے۔ مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ بھی نہ جانے کون سی داستان امیر حمزہ اسے سنا رہا تھا۔ وہ ایک ٹک ان دونوں کو دیکھے جا رہی تھی۔

''بابا بہت اپ سیٹ تھے لیکن شکر ہے کہ اللہ نے عزت رکھ لی......'' ارسلہ کی بات سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔ آف وائٹ شلوار سوٹ میں ابتہاج کا دراز قد اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اب بالکل کھڑکی کے پاس آ گئی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا اور اس وقت سب ہی کمروں میں دبک کر بیٹھے تھے۔

''کس کی عزت کی بات کر رہی ہو......؟'' وریشہ اب الجھی لیکن اسی وقت سگنل ڈراپ ہونا شروع ہو گئے تھے اور ابتہاج بھی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سدرہ اپنا پراندہ فضا میں گھماتی بڑے سرشار انداز سے اندر آ رہی تھی۔ وریشہ کو آج پہلی دفعہ اس سے تھوڑا سا حسد محسوس ہوا تھا۔ وہ اپنے محسوسات خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے واقعی غصہ آ رہا تھا۔ کال ڈراپ ہو چکی تھی۔

''یہ ارسلہ کس کی عزت کی بات کر رہی تھی۔''

وہ اب فراغت سے سامنے پڑے بیڈ پر لیٹی تھی جب معاً اسے یاد آیا۔ کچھ دیر اس نے بے مقصد اپنا دماغ لڑایا لیکن دماغ پر سدرہ کا رنگوں میں نہایا ہوا چہرہ کسی بھی نکتے کی جانب اس کی توجہ مبذول ہونے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے تھک ہار کر پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا لی، وہ خاصی ملول بیٹھی ہوئی تھی۔ سدرہ شاید گول کمرے میں تابندہ اور سائرہ کے پاس تھی۔ اس کے آج کل یہاں کے خوب چکر لگ رہے تھے۔

www.paksociety.com

''میری طرف سے جائے بھاڑ میں، مجھے کسی سے کیا لینا، دینا۔ آج ہی بابا کو فون کرتی ہوں کہ جلد آئیں، اتنا زیادہ میرا پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے ان کو احساس ہی نہیں......'' اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ خود کو سمجھانا دنیا کا مشکل کام ہے اور یہ مشکل کام وہ انتہائی وقت سے سرانجام دے رہی تھی۔ سوچوں میں گم نہ جانے وہ کس وقت نیند کی آغوش میں چلی گئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔

☆☆☆

اس نے سخت بے یقینی سے سامنے کا منظر دیکھا...... وہ یک دم ہی آگے بڑھی، اس کے چہرے کی حیرت بڑی تیزی سے مسرت کے رنگوں میں ڈھلی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ بابا، یہ آپ ہیں......؟'' اس نے ابھی ابھی ابتہاج کے ساتھ اندر داخل ہوتے بابا جانی کو دیکھا تھا۔ صبح سات بجے کا وقت تھا اور وہ چمپا کے خوشبو اڑاتے پیڑوں کے پاس کرسی رکھے بڑی فراغت کے ساتھ چائے کا مگ لیے بیٹھی تھی۔ آج موسم خاصا خوشگوار تھا اور وہ سائرہ کے ساتھ موسم کی دلفریبی کو محسوس کرنے کے لیے اپنے پسندیدہ گوشے میں بیٹھی تھی اور سدرہ کے دبئی پلٹ کزن سے اس کی اچانک منگنی کا قصہ دلچسپی سے سن رہی تھی۔ اسے کل سدرہ کے چہرے پر پھیلی خوشی کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ سائرہ ابھی ابھی کسی کام سے اندر گئی تھی، جب اس نے بابا کو ابتہاج کے ساتھ گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

''بابا، یہ آپ ہی ہیں ناں......؟'' وریشہ کے چہرے پر بڑی بھرپور قسم کی مسکراہٹ تھی۔

''نہیں بیٹا، ابھی کلوننگ کروا کر آرہا ہوں......'' بابا کے چہرے پر صدیوں کی تھکن جبکہ لہجہ بشاشت کا بھرپور انداز لیے ہوا تھا۔ وہ بھاگ کر ان کے سینے سے لگی تھی۔

''بابا یہ آپ کو کیا ہوا ہے......؟'' اس نے غور سے ان کا کمزور جسم اور بڑھی شیو کو دیکھا۔ کپڑے بھی شاید اچھی طرح سے پریس نہیں تھے۔ اس کو شدید حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ جانتی تھی کہ بابا کتنے ویل ڈریس اور نفیس انسان تھے۔ ایسا حلیہ تو ان کا ماما کے انتقال کے روز بھی نہیں تھا۔

''بابا آپ کو انڈیا والوں نے کہیں قید میں تو نہیں رکھا ہوا تھا، یہ کیسا حلیہ بنایا ہوا ہے آپ نے......؟'' اس کی خوشی پریشانی میں ڈھل چکی تھی۔

وہ اب غور سے بابا کے سرخ و سفید چہرے میں جھلکتی زردی، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور جھریوں کو دیکھ رہی تھی۔ بائیس دن سے وہ یہاں تھی اس سے پہلے پندرہ دن سے وہ راولپنڈی میں تھی۔ اس نے تقریباً ان کو ڈیڑھ ماہ بعد دیکھا تھا۔ ڈیڑھ ماہ پہلے وہ بالکل فریش ان کو چھوڑ کر آئی تھی۔ بابا اپنے ازلی پُروقار انداز سے مسکرا رہے تھے۔ اسی وقت سائرہ ایک اور چائے کا مگ لیے اندر سے نمودار ہوئی تھی۔

''یار کیا ہے تم لوگوں کو صبح شام بس ایک ہی کام ہے، جب دیکھو اتنی گرمی میں یہ بڑے بڑے مگ منہ سے لگا کر رکھے ہوتے ہیں۔'' ابتہاج نے بہت سرعت سے بات تبدیل کی تھی۔ سائرہ سے ملنے کے بعد وہ اب بابا کا ہاتھ پکڑ کر مہمان خانے کی طرف جارہا تھا۔

''یہ ابتہاج کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا، مجھے ڈھنگ سے پروفیسر صاحب کا حال احوال بھی پوچھنے نہیں دیا۔'' سائرہ جھنجلاہٹ سے کہتے ہوئے سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ ''ہمیں چائے پینے سے منع کرتے ہیں اور خود اللہ بخشے اماں کہا کرتی تھیں کہ ابتہاج کے جسم میں خون کم اور چائے زیادہ ہوگی۔''

''بابا پتا نہیں کیوں اتنے کمزور لگ رہے ہیں......'' وہ حد درجہ پریشان اور بے چین ہوگئی تھی۔ سائرہ نے غور سے اس کا الجھا ہوا چہرہ دیکھا۔

''ہاں، مجھے کافی ویک لگ رہے تھے کہیں بیمار تو نہیں رہے......'' سائرہ کی بات نے اس کی بے چینی میں اضافہ کردیا تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں مہمان خانے میں بابا کے پاس جارہی ہوں......'' اس نے چائے کا مگ ویسے ہی چھوڑ دیا تھا، اس سے پہلے کہ سائرہ کچھ کہتی وہ فوراً چل پڑی۔ راستے میں ہی اس کا ابتہاج سے ٹکراؤ ہوگیا۔ وہ ٹھٹک گیا۔

''آپ کہیں پروفیسر صاحب کے پاس تو نہیں جارہیں......؟'' اس کی قدرے سنجیدہ آواز وریشہ کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وریشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کوئی ضرورت نہیں، وہ ابھی بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ان کو شاور لے کر آرام کرنے دیں۔ جب وہ اٹھ جائیں تب مل لیجیے گا......'' ابتہاج کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

''لیکن کیوں......؟ مجھے ان سے ابھی ملنا ہے، وہ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے......'' اس کا انداز بھی دو ٹوک تھا۔ ابتہاج نے اس کا سرد لہجہ اور ضدی انداز غور سے دیکھا، وہ ہلکا سا جھنجلایا تھا۔

''یہ کیا بچگانہ پن ہے وریشہ، جب میں کہہ رہا ہوں کہ وہ خاصے تھکے ہوئے ہیں اور زیادہ سوال جواب کی پوزیشن میں نہیں، تو آپ میری بات کیوں نہیں سن رہیں......''

''میرا تعلق کون سا خفیہ ایجنسیوں سے ہے جو میں ان سے سوال جواب کروں گی، اب کیا میں اپنے باپ سے بھی نہیں مل سکتی۔'' اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی، اس نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔ ابتہاج کو وہ کچھ خفا خفا سی لگی تھی لیکن وہ اس کی ناراضی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

''میں کون سا ان کا یا آپ کا دشمن ہوں۔ ان کے فائدے کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔ وہ کئی راتوں کے جاگے ہوئے ہیں۔'' وہ بھی لاتعلقی کا انداز لیے غصے میں بولا۔

''وہ کئی راتوں سے کیوں نہیں سو سکے...... یہی بات تو میں پوچھنا چاہ رہی ہوں......'' وہ یک دم ہی پریشان ہوگئی تھی لیکن اس کی نگاہوں میں موجود ناراضی اور خفگی کی لہریں اس سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ اس لیے وہ تھوڑا سا نرم ہوئی۔

''ادھر آئیں میں بتاتا ہوں......'' اس نے لاشعوری طور پر اس کا بازو پکڑا تھا۔ وریشہ کے دل میں عجیب سی دھکڑ پکڑ ہورہی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا وہ کب اس کے ساتھ سامنے والے کمرے میں آگئی تھی۔ ابتہاج کو ایک دم ہی خیال آیا تھا اس نے گڑبڑا کر اس کا بازو چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسے اماں کے کمرے میں لے آیا تھا۔ وہ اب کھڑکیاں کھول کر پردے پیچھے کررہا تھا۔ وریشہ سامنے پڑی کرسی پر بڑے محتاط انداز میں بیٹھ گئی تھی جبکہ وہ دروازے میں کھڑا ہو کر کسی ملازمہ کو کھانا مہمان خانے میں بھیجنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے سیل فون پر منشی صاحب کو کچھ فائلیں لانے کو کہا تھا...... وریشہ حد درجہ بے چین تھی۔ اس کا دل عجیب ہی قسم کے سگنلز دے رہا تھا۔

''آپ بتا کیوں نہیں دیتے، یہ سب کام بعد میں کر لیجیے گا......'' وہ اسے ایک اور نمبر ملاتے دیکھ کر جھنجلائی تھی۔

''محترمہ میں پچھلے پندرہ دن سے چھٹی پر ہوں، میری ایک ننھی سی جان پر ڈھیروں ذمے داریوں کا بوجھ ہے، اتنے بڑے شہر کی انتظامی

www.Paksociety.com

مصروفیات کم نہیں ہوتیں......'' وہ پُرسکون انداز میں اسے کہہ کر ایک دفعہ پھر اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔ دوسری طرف شاید آواز نہیں جارہی تھی اس لیے اس نے ہیلو ہیلو کی گردان ختم کر کے فون ہی بند کردیا۔ وریشہ کو پہلی دفعہ خراب نیٹ ورک اتنا برا نہیں لگا تھا۔ اس نے سکون کی سانس لی کیونکہ وہ اب سامنے والی کرسی سنبھال چکا تھا۔

''مجھ سے کیوں ناراض ہیں آپ......؟'' وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑے اطمینان سے پوچھ رہا تھا۔

''میں آپ سے ناراض نہیں ہوں، مجھے صرف بابا کی ٹینشن ہے۔'' اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

''اتنے دن سے بابا یاد نہیں تھے، آج دیکھتے ہی ساری پریشانی اُڈ آئی ہے......'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''آپ کو زیادہ پتا ہے ناں......'' اس کو ایک دم غصہ آیا۔

''مجھ سے زیادہ کسی کو پتا بھی نہیں ہوسکتا......'' اس کا معنی خیز انداز وریشہ کو اس وقت کوفت میں مبتلا کررہا تھا۔

''آپ بتائیں گے یا میں بابا کے پاس جاؤں......'' اس نے دھمکی دی۔

''زیادہ دھمکیاں نہ دیں، ان سے بات اگلوانا بھی اتنا آسان نہیں......'' اس نے صاف چڑایا تھا۔ وریشہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ اس کی نم آنکھیں دیکھ کر بوکھلا گیا۔

''اٹس اوکے، میں بتاتا ہوں آپ آنکھیں صاف کریں فوراً......'' اس کے تحکم بھرے انداز پر وریشہ نے سر جھکا کر بازو کی پشت سے آنکھوں کو باقاعدہ رگڑا تھا۔

''اصل میں آپ کے بابا انڈیا نہیں گئے تھے......وہ یہیں تھے اور مختلف انکوائریاں بھگت رہے تھے۔ اصل میں جب ان کو اپنی فیکلٹی کا ڈین بنایا گیا تھا تو یہ بات یونیورسٹی کی کچھ گندی مچھلیوں کو پسند نہیں آئی اور ان کے خلاف باقاعدہ ایک منظم انداز سے مہم کا آغاز کردیا گیا......'' وہ بہت اطمینان سے بتارہا تھا۔ وریشہ نے حواس باختہ انداز میں اسے دیکھا جو کہہ رہا تھا۔

''آپ کو علم ہوگا کہ آپ کے بابا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کو اسٹوڈنٹس اپنا آئیڈیل مانتے ہیں۔ ایک دنیا ان سے متاثر ہے اور جس شخص کو اتنا زیادہ سراہا جاتا ہو، وہاں کچھ پروفیشنل جیلسی رکھنے والے لوگ حسد کی آگ میں جلتے ہوئے بہت گھٹیا قسم کے ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو پہلے دھمکایا گیا کہ وہ ڈین بننے سے خود ہی انکار کردیں جب وہ نہیں مانے تو اس گروپ نے ایک اور وار کیا۔'' وریشہ کا دل کچھ اور بے چین ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''انہوں نے ایک اسٹوڈنٹ کو مختلف قسم کی ترغیبات دے کر آمادہ کیا اور اسے اپنا مہرہ بنا کر استعمال کیا، اس نے پروفیسر صاحب پر ریپ کا الزام لگا کر میڈیا والوں کو بلالیا۔''

''کیا......؟'' وریشہ کے سر پر آسمان ہی تو گرا تھا۔ وہ کچھ ساعتوں کے لیے بالکل سن سی ہوگئی۔

''ایک دفعہ تو یہ خبر الیکٹرانک میڈیا پر آگئی تھی......'' ابتہاج کی بات پر اس کا دل بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ''اس کے بعد میں نے ارسلہ نے اور کچھ اور لوگوں نے اس خبر کو چلنے سے رکوایا، آپ کے بابا کو آپ کی ٹینشن تھی کہ آپ کالج میں اپنے ساتھیوں کو کیسے فیس کریں گی اس کا حل ہمیں یہی نظر آیا کہ آپ کو وہاں سے نکالا جائے۔ پروفیسر صاحب کو میں نے اپنے گھر کی آفر کی، انہوں نے فوراً رضامندی ظاہر کی۔ جس کے نتیجے میں آپ یہاں آگئیں، یہاں نہ تو کیبل تھی نہ کوئی اور ذریعہ......اس وجہ سے آپ کا رابطہ باقی دنیا سے کٹ گیا۔ پروفیسر صاحب نے ارسلہ کو بھی نہیں بتایا تھا کہ آپ یہاں ہیں، ان کو ڈر تھا کہ وہ کہیں جذباتی ہو کر آپ کو کچھ بتا ہی نہ دے۔ اتفاق سے اس پریشانی میں ارسلہ نے بھی آپ سے رابطہ نہیں کیا۔ اس کا مجھ سے مسلسل رابطہ تھا لیکن آپ کی یہاں آمد کا اسے پروفیسر صاحب نے ہی بتایا تھا......''

''بابا کے معاملے کیا بنا......؟'' وریشہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تھی، اس کا لہجہ پریشانی کا غماز تھا۔ بابا کی ذہنی تکلیف کا سوچ کر ہی اس کا حساس دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

''جس طرح جھوٹ کے کوئی پاؤں نہیں ہوتے اور اسے اپنے ٹھکانے سے بہت محبت ہوتی ہے اسی طرح دھوکا فریب بھی ساری دنیا میں گھوم پھر کر اپنے ٹھکانے پر واپس آ ہی جاتا ہے۔ اس کے مالکوں کے حصے میں پھر رسوائی اور ندامت ہی آتی ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی، ہم نے اس لڑکی کو ہی ٹریپ کیا، اس کے ضمیر کو جھنجوڑا، اس نے سارا بھانڈا کھول دیا۔ ساری گرہیں کھل گئیں۔ پروفیسر صاحب کی بے گناہی ثابت ہوئی۔ ان کے مخالفین اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں......'' وہ سارے واقعے کی سنگینی کو حد درجہ کم کر کے مختصراً بتارہا تھا۔

''تو جب ساری دنیا کو پتا تھا تو مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی، بابا نے اتنے تکلیف دہ دن پتا نہیں کیسے گزارے ہوں گے......'' اس کے آنسو پھسل کر گالوں پر بہہ رہے تھے۔

''آپ نے ان تکلیف دہ دنوں میں یہی کچھ کرنا تھا جو آپ اب کررہی ہیں......'' وہ ٹشو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے شرارتی انداز میں بولا تھا۔ ''اصل میں

محبت مستقل غم ہے

محبت درد کا صحرا محبت مستقل غم ہے
محبت ایک پچھتاوا محبت مستقل غم ہے

وہی درد آشنا آنکھیں وہی بے تاب سے آنسو
وہی اِک ہجر کا دریا محبت مستقل غم ہے

وہی ہے آبلا دل کا وہی پاؤں کے چھالے ہیں
وہی کانٹوں بھرا رستہ محبت مستقل غم ہے

وہی سرگوشیاں غم کی وہی رُت رت جگوں والی
ابھی تک کچھ نہیں بدلا محبت مستقل غم ہے

وہی ہم لوگ دیوانے وہی ہے درد کا رستہ
محبت کا وہی سودا محبت مستقل غم ہے

محبت درد ہے اور جب دردِ دل میں آن بستا ہے
تو پھر دل سے نہیں جاتا محبت مستقل غم ہے

وہی دل درد کا ٹکڑا وہی شام جدائی ہے
کہیں بھی کچھ نہیں بدلا محبت مستقل غم ہے

مرسلہ: صبا نور، لیہ

کیسے کیسے لوگ

شہر میں آگ لگانے والے
اب تو خود کو بھی بچانے سے گئے
مر نہ جائیں کوئی تدبیر کرو
اب ہمیں دکھ بھی رُلانے سے گئے

شاعرہ: بختاور بلوچ، لونی بلوچستان

www.paksociety.com

آپ کے بابا کو آپ سے بہت محبت ہے، وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ان کی لاڈلی بیٹی اس تکلیف سے گزرے جس سے وہ پورے پچیس دن گزرے تھے۔“

”اب کون سا نہیں ہو رہی تکلیف ......“ اس نے ٹشو سے آنکھیں صاف کیں۔ اس کا لہجہ ابھی بھی نمی لیے ہوئے تھا۔

”اب تو تھوڑی دیر کی تکلیف ہے، آپ نے تو پچھلے پچیس دنوں میں ٹینشن سے فوت ہی ہو جانا تھا پھر میرا کیا بنتا......؟“ اس کی آنکھوں میں شرارت جگمگا رہی تھی۔

”پھر آپ کسی اور لڑکی کو ایسے ہی بٹھا کر پٹا رہے ہوتے......“ وہ نم آنکھوں سے مسکرائی تھی۔ ابتہاج کو اس لمحے بے شمار ستارے اس کی آنکھوں میں چمکتے دکھائی دیے تھے۔

”استغفراللہ، میں آپ کو ایسا لگتا ہوں......“ وہ مصنوعی تاسف بھرے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ وہ تعجب سے یوں اس کو دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بڑی غیر معمولی بات سنی ہو۔

”جی ہاں، اس سے بھی زیادہ بڑھ کر لگتے ہیں جتنا آپ سوچ رہے ہیں......“ وہ بھی متبسم انداز میں بولی تھی۔

”اوہ، اس کا مطلب ہے کہ میں بہت خوش قسمت ہوں جو ایک خوب صورت لڑکی کو اتنا ”اچھا“ لگتا ہوں، واہ میرے مولا، جب بھی دیتا ہے چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے......“ اس کے چہرے پر پھیلی حیرانی اور بوکھلاہٹ پر ابتہاج کا انتہائی جاندار اور محظوظ کن قہقہہ گونجا تھا۔

”بہت خوش فہم ہیں آپ......!“ وہ تھوڑا سا سنبھل کر بولی۔

”جناب ”غلط فہمی“ سے تو ”خوش فہمی“ پھر بھی بہتر ہوتی ہے کم از کم بندے کو خوش تو رکھتی ہے۔ ہم تو ویسے بھی عوام کی خدمت کے لیے اپنی زندگی متعین کر چکے ہیں۔ عوام ہمیں پسند کرتی ہے بس اسی خوش فہمی سے زندگی کو جینے کے لیے ایک مضبوط جواز مل جائے گا۔“ وہ دلفریبی سے مسکرایا اور اس کے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔

”یہ ”عوام“ کس کو کہا ہے آپ نے......؟“ وہ تپ کر کھڑی ہوئی۔

”جناب کو......“ اس نے گردن کو خم دے کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ وریشہ تھوڑا سا بلش ہوئی۔

”منہ دھو رکھیں آپ، عوام خاصی عقلمند ہو چکی ہے، ایسی ”سرکار“ کو لفٹ نہیں کرواتی......“ وہ اس کی نگاہوں کی شوخی سے گھبرا کر باہر نکلنے کی نیت سے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

”آپ ٹینشن نہ لیں، میرے ووٹ خاصے پکے ہیں، ارسلہ کو میں نے بتا دیا ہے کہ اب وہ میرے احسان کا بدلہ اتارے، جو میں نے اس کی اور اشعر کی شادی کروا کے کیا تھا، حالانکہ اس کا ذاتی خیال ہے کہ یہ میری خباثت ہے لیکن پہلی دفعہ اسے میری خباثت اتنی پسند آئی ہے کہ وہ جاپان سے اگلے ہفتے پاکستان آ رہی ہے......“

”کیا......؟“ وریشہ کو بہت خوشگوار قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر پھیلی مصنوعی قسم کی مسکینیت دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ موسم ایک دم ہی بدلا تھا۔ سیاہ سرمئی رنگ کے سیاہ بادل بھی شرارت سے مسکرا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی سی کن من سے شہتوت کے پتّوں کے جھونکوں سے آنے والی موتیے کی دلفریب مہک نے باہر کا موسم تو مہکایا ہی تھا لیکن اس کے دل کے موسم کو بھی خاصا معطر کر دیا تھا۔

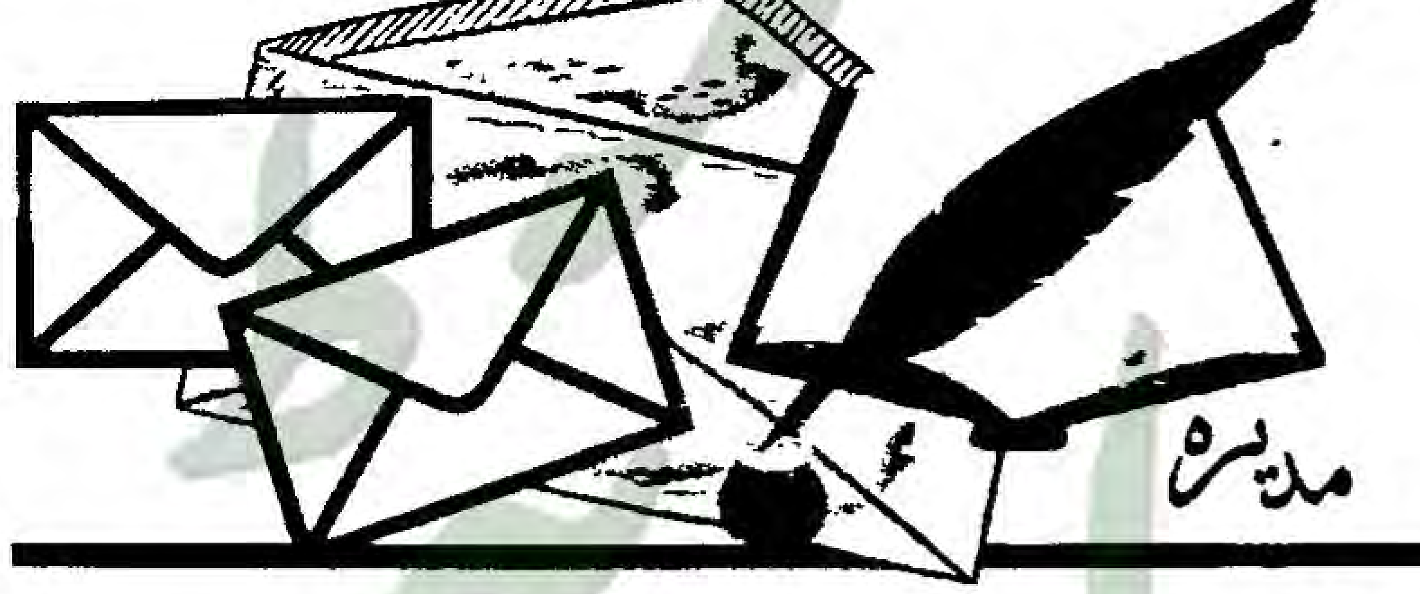

بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السّلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ۔

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ نہ میں پھلکڑ ہوں، اور نہ ہی اپنی چیزوں کو بے احتیاطی سے رکھتی ہوں...... مگر اس کے باوجود مجھے اپنے کپڑے، اپنے پسندیدہ بیگ اور چپلیں وقت پر نہیں ملا کرتی ہیں...... ایمرجنسی میں کہیں جانا ہو تو میں اپنی الماری تلپٹ کر کے رکھ دیتی ہوں۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ میرے پاس یہ چیزیں محدود تعداد میں ہوں...... میری الماری ان چیزوں سے پٹی پڑی ہے...... بیٹی کی شادی پر تو کیا...... اپنے بہن بھائیوں کی شادیوں پر جو کپڑے بنائے تھے...... وہ بھی میری الماری میں موجود ہیں۔ ہر فیشن، ہر ڈیزائن کا کپڑا...... شیموز کی ساڑی سے لے کر جارجٹ اور وولی کی ساڑیاں بھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے جب الماری کی استعداد سے زیادہ اس میں چیزیں ٹھونسی جائیں گی تو ضرورت کی چیزیں اس میں سے کیسے مل سکتی ہیں۔ آج میں نے اپنی الماری اس وجہ سے بھی ترتیب دے لی ہے کہ رمضان میں مجھے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو...... تو پھر آپ بھی یہ کام کیوں نہیں کرتیں...... آپ کے پاس بھی تو درجنوں چپلوں کا ڈھیر ہو گا...... پلیز آپ ان کو باہر نکالیے...... اور انہیں ان لوگوں میں تقسیم کیجیے جو اپنے جوتے جڑوا جڑوا کر پہنتے رہتے ہیں کہ دوسرا جوتا خریدنا ان کے بس میں ہی نہیں ہوتا...... آپ اپنی یہ چیزیں اپنے غریب رشتے داروں میں بھی دے سکتی ہیں...... مجھے بھی اپنی چیزیں نکالتے ہوئے واقعی ملال سا ہوا تھا کہ ہم جیسے لوگ ان چیزوں سے محبت کرنے لگتے ہیں...... جو ہمارے کسی کام کی نہیں ہیں...... اگر آپ کی الماری میں آپ کا کوئی جوڑا ہینگر پر دو سال سے جھول رہا ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ آئندہ دو سال بھی مزید جھولے جھولتا رہے گا...... تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم یہ چیزیں ان لوگوں کو دے دیں جنہیں ان کی اشد ضرورت ہے...... اور ہاں...... یہ بات اچھی طرح سے یاد رکھیے گا اپنی چیزیں اللہ کی راہ میں دینے سے کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی...... اللہ آپ کو ان کے بدلے پتا نہیں کتنی اور ..... پیاری چیزوں سے مزید نوازے گا...... (انشاءاللہ)

تو آئیں...... آج ہم سب اپنی الماریوں میں صرف وہی چیزیں رکھیں گے جو ہماری روزمرہ کے استعمال کی ہیں۔

تو پھر...... بانٹ رہی ہیں ناں آپ...... اس خوب صورت کباڑ کو...... جو آپ کے کام کا نہیں ہے...... (آج ہی سے)

* * *

☆ آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ (ابھی پڑھ لیں) آیت کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحنك انی کنت من الظالمین ٥

* * *

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ گزشتہ ہفتے آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی میں انٹرنیشنل یوتھ فورم اور ڈریم وژن فورم کے زیرِ اہتمام معروف

افسانہ نگار نگہت اعظمی کی کتاب آبگینے کی تعارفی تقریب ہوئی۔ جس کے مہمان خصوصی صوبائی وزیرِ تعلیم جناب پیر مظہر الحق تھے۔ تقریب کی صدارت معروف صحافی وادیب جناب محمود شام نے کی۔ کتاب کے بارے میں رخسانہ سہام مرزا، طلعت آفتاب، نسرین پرویز اور آپ کی باجی انجم انصار نے اظہارِ خیال کیا۔ تقریب کی نظامت سیما رضا ردا نے کی۔

☆ معروف افسانہ نگار اور ٹی وی ڈراما رائٹر سیما مناف کا افسانوں کا مجموعہ بہت جلد آنے والا ہے۔ (پیشگی مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری رافعہ شاہ کی بیٹی طوبیٰ شاہ نے لمس سے ایم بی اے نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کرلیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ڈاکٹر شہلا عامر کے شوہر عامر العباد خان کو ڈاکٹر ثمر مبارک کے ہاتھوں انرجی ایوارڈ ملا ہے۔ (مبارک باد)

☆ افسانہ نگار گیتی آرا، کراچی کی نند شدید علیل ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ فصیحہ آصف خان، ملتان ان دنوں علیل ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار زم زم وہاڑی، ان دنوں علیل ہیں۔ ان کی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ گزشتہ دنوں اسلام آباد میں مقیم میرے پیارے بھائی احمد ندیم صدیقی کو دل کی تکلیف ہوئی، فوری اسپتال لے جایا گیا، جہاں ان کی انجیو پلاسٹی کی گئی۔ آپ دعا کیجیے گا اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو کلی صحت اور زندگی دے، آمین۔

☆ گزشتہ دنوں ہماری پیاری مصنفہ عمیرہ احمد کا پاکیزہ میں شائع ہونے والا ناولٹ گھر اور گھاٹا ٹیلی فلم کی صورت میں ایک نجی ٹی وی چینل پر دکھایا گیا۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ میں شائع ہونے والا آپ کی باجی انجم انصار کا ناول چاندنی ان دنوں ہر پیر سے جمعرات تک رات نو بجے ایک نجی چینل سے دکھایا جا رہا ہے۔ آپ کی باجی کا ایک اور ٹی وی سوپ اٹکھیلیاں ان دنوں ہر پیر اور منگل کو شام سات بجے...... ایک دوسرے چینل سے دکھایا جا رہا ہے اور پورے ہفتے ری پیٹ ہوتا ہے۔

☆ پاکیزہ کی سینئر تبصرہ نگار شمسہ الماس اور ان کے تینوں بیٹوں کی سالگرہ گزشتہ ماہ ہوئی۔ (بے حد مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری غزالہ اقبال، انگلینڈ کے ہاں پہلا نواسا ہوا ہے جس کا نام سامی عدیل رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی کے ہاں پہلا پوتا ہوا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز تنویر استقبال بخاری اپنے شوہر، بیٹے، بہو اور پوتی کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کرکے آگئی ہیں۔ (ماشاءاللہ، بے حد مبارک باد)

☆ میری بھتیجی عائشہ بابر، اسلام آباد سے واپس امریکا جا چکی ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ اور مراسلہ نگار پروین افضل شاہین، بہاول نگر اپنی فیملی کے ساتھ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار زاہدہ نسیم، مانسہرہ اپنے بھانجوں اور بھتیجوں کی شادیوں میں گزشتہ ماہ خوب خوب مصروف رہیں۔ (مبارک باد)

☆ افسانہ نگار مدیحہ عدنان اسلام آباد کا بیٹا ان دنوں علیل ہے اس کی کلی صحت کے لیے دعا کیجیے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلانوالی ان دنوں شدید علیل ہیں ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے

دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری رخسانہ بیگم، کراچی اور مونا، لاہور ان دنوں بے حد پریشان ہیں ان کے لیے دعا کریں۔

☆ برادرم۔ ع کی ایک کثیر رقم ان کا دوست لینے کے بعد واپس نہیں کر رہا۔ انہیں اپنی رقم مل جائے۔ اس کے لیے دعا کیجیے گا۔

☆ مسز شعیب، سوات عمرے کی ادائیگی کرکے واپس وطن آچکی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ کراچی میں مقیم 23 سالہ لڑکی تعلیم ایم اے کے لیے تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار رشتے کی خواہش مند لڑکے کے والدین یا سرپرست سے رابطہ چاہتی ہیں۔ والدہ فاروقی سے اس نمبر پر رابطہ کریں۔ 0334-3053906

☆ سکمی ایاز، سندھ کی منگنی اپنے کزن سے ہوگئی ہے۔ (مبارک باد)۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری کے اوپر اس کے دشمنوں نے جادو کروا دیا ہے۔ اس کے جسم پر کالے اور نیلے دھبے پڑ گئے ہیں۔ گھر میں آئے دن خون کے قطرے پڑے نظر آتے ہیں۔ اس کے لیے دعا کریں کہ وہ دشمنوں سے بچی رہے۔

☆ مایہ ناز مصنفہ ساجدہ حبیب کی بھتیجی عالیہ سعید کی منگنی گزشتہ دنوں ساجد کیانی کے ساتھ ہوئی۔ (مبارک باد)

☆ مایہ ناز مصنفہ سیما مناف کے دو ٹی وی سیریل نجی ٹی وی چینل سے گزشتہ ہفتے شروع ہو چکے ہیں۔ (دلی مبارک باد)

* * *

انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار میمونہ گل، سکھر کی والدہ انتقال کر گئیں۔

☆ شاعرہ افسانہ نگار بیگم اختر بیگانہ چل بسیں۔

☆ مصنفہ رخ چوہدری کے فرسٹ کزن چوہدری اختر اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔

☆ برف کے تودے تلے دب کر شہید ہو جانے والے فوجیوں میں رخ چوہدری کے فرسٹ کزن کا بیٹا مصطفیٰ شاہد بھی شامل ہے۔ ادارہ پاکیزہ تمام شہدا فوجیوں کے خاندانوں کے غم میں شریک ہے اور سب کے لیے دعاگو بھی ہے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار فیروزہ بیگم، کراچی کے سمدھی خلیق احمد صدیقی انتقال کر گئے۔

نوٹ: مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ ساتھ تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

رضوانہ پرنس، لندن سے۔ ”انجم، رخ چوہدری آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ ہماری کتاب کی کوریج بہت اچھے طریقے سے کی بلکہ بڑی محبت کے ساتھ کی ہے۔ مجھے اپنی ان تبصرہ نگار بہنوں کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جنہوں نے ایک حقیقت ایک افسانہ کے تحت میرے انٹرویو یا میری آپ بیتی کو پسند کیا...... ہم نے اپنے سکھ اور دکھ اس وجہ سے آپ سے شیئر کیے تھے کہ آپ سب ہماری دوست ہیں اور بہنوں کی محفل میں کوئی بات چھپائی نہیں جاسکتی۔“ (پیاری رضوانہ یہ آپ کا اپنا پن ہے کہ آپ نے ہم سب کو اپنا دوست سمجھا...... یہ انٹرویو ہماری بہنوں نے تو پسند کیا ہی ہے اس کے علاوہ بے شمار پسندیدگی کے فون ہمارے پاس بھی آئے ہیں جو اس محفل میں شریک بھی نہیں ہو سکے)

مسز عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔ ”اس ماہ عمیرہ احمد کا عکس دوبارہ پڑھا، بالکل ایسی ہی کہانی حقیقت میں دیکھی ہے۔ عمیرہ آپ میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہو۔ جب آپ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی...... تو میں نے آپ کے افسانے جمع کرکے ان کو اپنے پاس بائنڈ کرا کے رکھا تھا، جب دل چاہے انہیں دوبارہ پڑھ سکوں...... اور یہ کتاب

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی الماری میں تالا لگا کر رکھا کرتی تھی ...... میں واقعی تمہاری تحریروں کی عاشق ہوں۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناول بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ ناہید بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ کانچ سی لڑکی پہلی سے آخری قسط تک بہت پسند آیا۔ ہاں انجم اس وقت ٹی وی کے دو چینلز پر تمہارے سلسلے وار ڈرامے چل رہے ہیں اور یقیناً یہ اللہ کا تم پر بہت کرم ہے۔'' (ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، میں اپنے پروردگار کا شکر ادا ہی نہیں کر سکتی کہ اس نے مجھے میری اوقات سے زیادہ نوازا ہے۔ ہاں عمیرہ احمد شکریہ کہہ رہی ہیں)

✍ پروفیسر شیریں سلیم، لاہور سے۔ ''کافی دنوں سے عظمیٰ خورشید کے تبصرے نظر نہیں آ رہے، کہاں غائب ہیں۔ (اس ماہ حاضر ہیں وہ) عمیرہ احمد ٹاپ پر رہیں۔ سب سے اچھا ناول ان کا چل رہا ہے۔ ناہید سلطانہ اور میمونہ کی تحریریں بھی پسند آئیں۔ اقبال بانو کا افسانہ بھی پسند آیا۔ گزشتہ ماہ نگہت سیما اور رفعت سراج کے افسانے بھی پسند آئے تھے مگر کانچ سی لڑکی بہترین ناولٹ رہا ہے۔ بہنوں کی محفل مجھے مختصر لگی ...... زیادہ خطوط ہونے چاہئیں۔ جلترنگ پڑھ کر مزہ آتا ہے اور جلترنگ کے خاکے ٹی وی پر اٹکھیلیاں کے روپ میں پسند بھی خوب آ رہے ہیں۔ ہاں اس ماہ کا اداریہ بہترین تھا جسے میں نے اپنی بیٹیوں کو بھی پڑھوایا۔'' (شکریہ)

✍ عظمیٰ آفاق سعید، کراچی سے۔ ''آنٹی اختر بیگانہ کے انتقال کا بے حد افسوس ہوا۔ ایک بے حد پیار کرنے والی ہستی اس دنیا سے چلی گئی۔ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ عمیرہ احمد کے ناول نے بڑا زبردست موڑ لیا ہے۔ اس دفعہ کی قسط بہت اچھی تھی۔ ناہید سلطانہ اختر آپ کی تو کیا بات ہے، زندگی میں بھرپور زندگی نظر آ رہی ہے۔ میمونہ خورشید نے بھی حقیقت کی عکاسی کی۔ مجھے اس دفعہ کے افسانے بھی بہت پسند آئے اور شائستہ زریں کا لیا گیا انٹرویو بھی کمال کی چیز رہا۔ شگفتہ فرحت اور اویس ادیب انصاری ہمارے شہر کی جانی پہچانی شخصیت ہیں لیکن ان کے بارے میں پہلی مرتبہ اتنی تفصیل سے پڑھنے کو ملا۔ شکریہ شائستہ زریں! اس ماہ جو تحریر اس شمارے کی یادگار تحریر رہی ...... وہ مجھے اقبال بانو کا تیرا پیاں جاناں لگا۔ بے انت لمحہ، خربوزے اور ہماری بھول بھی اچھی تحریریں تھیں۔ رضوانہ پرنس اور اختر بیگانہ کی کتابوں کی کوریج اچھی رہی۔ نور افشاں اور شگفتہ ناز ملک کے انٹرویوز پسند آئے۔ ایسے انٹرویوز ہر ماہ شامل ہونے چاہئیں۔'' (اگر ہماری بہنیں اپنی تصویر کے ساتھ اپنے انٹرویوز بھیجیں گی تو ہم انہیں ضرور شامل کریں گے)

✍ ظلِ شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''کئی ماہ سے اس محفل میں شامل نہیں ہو سکی، پہلے بھائی کی شادی کی مصروفیات رہیں پھر آنکھوں میں الرجی ہو گئی مگر ہر صورت میں پاکیزہ پڑھتی رہی ...... آپ سب سے پہلے میری تمام بہنوں اور عذرا آنٹی کو سلام پہنچا دیں ...... میں معراج بھائی کی صحت کے لیے ہمہ وقت دعا گو رہتی ہوں۔ اس ماہ کا پاکیزہ کل ہی ملا ہے اور میں نے پورا پڑھ لیا ...... اور بہت اچھا لگا ہے۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں۔ پاکیزہ کے ناولوں کی تو کیا بات ہے۔ سب اے ون ہیں۔'' (شکریہ)

✍ نائلہ ملک، گاؤں جتوئی سے۔ ''پاکیزہ میں، میں سب سے پہلے روحانی مشورے پڑھتی ہوں۔ بے حد مفید سلسلہ ہے۔ جلترنگ پڑھ کر تو بہت ہنستی ہوں اس لیے بار بار پڑھتی ہوں۔ مکمل ناول کا سلسلہ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ اس ماہ کے مکمل ناول پسند آئے۔ بہنوں کی محفل میں شریک تمام بہنوں کو سلام۔ پاکیزہ میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔'' (شکریہ)

✍ شمسہ الماس، ناروے سے۔ ''پورے پاکستان میں اس وقت موسم گرما کا عروج ہے ...... اور میں بے حد ٹھنڈے موسم میں سویٹر پہنے ہوئے آپ کو خط لکھ رہی ہوں ...... سب سے پہلے آپ کو اپنے ٹی وی سوپ چاندنی کی مبارک باد جس نے پاکیزہ میں دھوم مچا دی تھی۔ اب اسے ٹی وی پر دیکھ کر مزہ آ رہا ہے۔ مار دھاڑ سے بھرپور ڈراموں کے درمیان چاندنی کی محبت بھری کہانی بہت اچھی لگ رہی ہے ...... چاندنی کی کہانی ہر محبت کرنے والے کو ضرور دیکھنی چاہیے ...... یہ ان کے لیے بے حد مفید ہوگی۔ عکس ناول کی قسط ٹھا کر کے لگی۔ میمونہ خورشید کی بس ٹھیک ہی تھی جبکہ ناہید سلطانہ اختر نے بھی

www.Paksociety.com

بہت اچھا لکھا۔ خربوزے پھیکے رہے۔ بے انت لمحہ وقت کا زیاں تھا۔ اقبال بانو کا پہلے والا افسانہ اس سے بھی اچھا تھا۔ شمیم نمل خالق بھی کامیاب رہیں اور سب سے اچھی ہماری بہنوں کی محفل رہی۔ امینہ عندلیب کے لیے بے شمار دعائیں پہنچا دیجیے گا۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ سائرہ احمد، جرمنی سے۔ ''انجم باجی بہت عرصے بعد اس محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ میں نے شادی سے پہلے لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ میرا خیال ہے میری بہنیں مجھے بھول بھی گئی ہوں گی ...... میرا دل چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح اس میں اپنی شاعری بھیجوں اور مستقل سلسلوں میں اپنے مراسلات بھی۔ پاکیزہ کے بارے میں یہ میں کہہ سکتی ہوں کہ اس کا معیار بڑھ ہی رہا ہے۔ آپ نے جو میری دوست بنوائی تھی وہ میرے لیے بہنوں جیسی ہے۔'' (پیاری سائرہ بہت عرصے بعد تم نے مجھے یاد کیا، بے حد شکریہ۔ تمہاری غزل بھی ملی مگر جب اسے پڑھنا چاہا تو گیلی جگہ میں رہنے کی وجہ سے اس کے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو چکے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں تم آئندہ اپنی نظموں، غزلوں کے ساتھ اپنا انٹرویو بھی ہمیں بھیج دو تا کہ پتا تو چلے تم کیا رہی ہو؟)

✉ محمد اشفاق، گجرات۔ برادرم اس محفل میں حضرات کے خطوط شائع نہیں کیے جاتے مگر میں آپ کا یہ پیغام عمیرہ احمد تک پہنچا رہی ہوں۔ ''آپ اپنے ناول جلدی جلدی شائع کروائیں۔ اچھا لکھنے والوں میں مجھے آپ کے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔''

✍ عظمیٰ ندیم، فاضل پور، راجن پور سے۔ ''پاکیزہ میں میرے پسندیدہ سلسلے جلترنگ، بہنوں کی محفل ہے۔ ہر خط اتنے شوق سے پڑھتی ہوں جیسے وہ کوئی افسانہ ہو۔ اسی لیے پاکیزہ میں شامل ہر بہن کو جانتی ہوں۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں ہر ماہ مجھے پاکیزہ لا دیتے ہیں۔ جس کو پڑھ کر میرا وقت بہت اچھا گزرتا ہے۔ رضوانہ پرنس کا انٹرویو پڑھ کر بہت اچھا لگا تھا، باجی آپ بھی اپنا انٹرویو دیجیے ناں ...... ہاں آپ کا ٹی وی ڈراما چاندنی مجھے بہت پسند آ رہا ہے۔'' (شکریہ ہاں پہلے ہماری مصنفات کے انٹرویوز تو پڑھ لیں)

✍ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''اس ماہ کا شمارہ اچھا لگا اداریہ بہت اچھا تھا۔ ناول زبردست جا رہے ہیں۔ اقبال بانو کا ناولٹ بہت اچھا لگا۔ عطیہ عمر کا افسانہ پسند آیا۔ فرحانہ ناز کا بھی ٹھیک ہی تھا۔ عقیلہ حق کی تحریر بے حد عام سی تھی۔ عالیہ آپ کی طوالت سے کچھ بوریت سی بھی ہوئی مگر بہرحال موضوع اچھا تھا۔ پلیز نئی مصنفات کے بجائے سینئر مصنفات کو زیادہ جگہ دیا کریں۔ ہاں ایک خاص بات سلمیٰ غزل آپ کے بیٹے کی شادی کی کوریج پسند آئی۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ غزالہ اقبال، انگلینڈ سے۔ ''پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ بے حد تاخیر سے پرچہ ملتا ہے ...... مگر جب تک نہ پڑھ لوں چین نہیں ملتا۔ عکس ناول اچھا لگ رہا ہے۔ رضوانہ پرنس کا انٹرویو بھی پسند آیا تھا۔ عظمیٰ آفاق کا لکھنے کا طریقہ بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ عظمیٰ جلدی سے افسانہ لکھو۔ اویس ادیب انصاری اور شگفتہ فرحت کا انٹرویو پسند آیا۔ کانچ سی لڑکی کا اختتام آپ نے بہت اچھا کیا تھا۔ ہاں بہنوں کی محفل اور جلترنگ کی کیا بات ہے۔'' (نوازش)

✍ ایک بہن ایس ایس کراچی سے۔ ''انجم باجی میں ہمہ وقت مصروف رہنے والی عورت ہوں۔ مجھے کوئی مختصر ترین دعا بتا دیں جو مفید ترین بھی ہو۔'' (پیاری بہن ایسی بے شمار دعائیں موجود ہیں۔ آپ نے مختصر ترین کی بات کی ہے، تو اس دعا میں صرف ایک فقرہ ہے۔ اے اللہ مجھے زندگی میں اور موت میں اور مرنے کے بعد آسانیاں عطا فرما)

✍ تابندہ لاری، کراچی سے۔ ''ایک حقیقت ایک افسانہ میں رضوانہ پرنس کا انٹرویو پڑھا اور مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی کہانی پڑھ رہی ہوں۔ میرے مرحوم شوہر عارفین ایسے ہی تھے اور مجھے کسی طرح قرار نہیں آ رہا ہے۔ بہنوں سے التدعا کروں گی آپ جب جب مجھے ٹی وی کے چینلز یا تقریبات میں مجھے نعت پڑھتے دیکھیں تو میرے شوہر کی مغفرت کی ضرور دعا کریں۔'' (پیاری تابندہ آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے اور ہم سب آپ کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں)

www.Paksociety.com

✉ قیصر قدیر، کینیڈا سے۔ ”بہت دور سے جا کر پاکیزہ لے کر آئی...... کہ اس کو پڑھے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ عمیرہ احمد آپ میری ہارٹ فیورٹ ہو، عکس بہت خوب صورت ناول ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر بھی بڑی گہری ہوتی ہے۔ جلترنگ اس ماہ بھی بازی لے گیا۔ اقبال بانو نے بہت اچھا لکھا۔ عالیہ حرا سے معذرت کے ساتھ آپ کے افسانوں کا موضوع ایک ہی جیسا ہوتا ہے، ایک ہی جیسے کردار...... بہر حال پھر بھی ٹھیک ہی تھا...... مگر مستقل سلسلہ جو نمبر ون رہا وہ بہنوں کی محفل تھی۔“ (شکریہ)

✉ ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی سے۔ ”اس ماہ پاکیزہ مشکل سے ملا، جگہ جگہ معلوم کروایا تو پتا چلا کہ ختم ہو گیا ہے۔ اداریہ بہترین موضوع پر تھا۔ عمیرہ احمد آپ کے ہاتھ چوم لوں...... عکس کی اس قسط میں سارے رازوں سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے۔ ناہید سلطانہ ابھی خوب جا رہی ہیں۔ کانچ سی لڑکی ابھی بھی یاد آ رہی ہے۔ باجی جب میں کالج میں پڑھتی تھی اس وقت پاکیزہ میں آپ کا ناول چاندنی شائع ہوا تھا۔ مار دھاڑ اور چیختے چلاتے ڈراموں کے درمیان چاندنی کی پُرمحبت کہانی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ میں ٹھیک نو بجے باقاعدگی سے دیکھ رہی ہوں۔ اس ماہ بہنوں کی محفل مختصر لگی اگر کسی بہن کا انٹرویو لگانا ہو تو بہنوں کی محفل کے صفحات نہ لیے جائیں۔ میرا انتخاب اور پاکیزہ ڈائری لاجواب ہیں۔ ہاں اقبال بانو کو بھی میری مبارک باد پہنچا دیجیے گا۔“ (ضرور)

✉ زبیدہ حبیب، کراچی سے۔ ”عکس بہت اچھا لگا۔ اچھے موڑ پر آ گیا ہے۔ روحانی مشورے بہترین، ناہید سلطانہ اختر تو بہت ہی اونچی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا کا دکھ پڑھ کر میں افسردہ سی ہو گئی۔ اقبال بانو کا افسانہ بھی اچھا لگا تھا۔ کانچ سی لڑکی ابھی تک یاد آ رہی ہے۔ پر آپ کے لکھے ہوئے ڈرامے اٹکھیلیاں میں ہمیں جلترنگ کا مزہ آ رہا ہے۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

✉ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ”اس ماہ کا پاکیزہ اے ون رہا۔ میں سب سے پہلے بہنوں کی محفل سے اسٹارٹ لیتی ہوں۔ سب کے دکھ سکھ معلوم ہو جاتے ہیں۔ پھر روحانی مشورے پڑھتی ہوں۔ ناولوں میں عکس سب سے پہلے پڑھا اور اچھا لگا۔ میمونہ خورشید علی نے اچھا لکھا۔ بہنوں کی محفل میں کافی دنوں سے کوئی تیکھا خط نہیں آ رہا۔ سعدیہ ہما شیخ کہاں ہو تم اپنی شاعری کے ساتھ فوراً حاضری دو۔ ناہید آپا نے بہت اچھا لکھا۔ جلترنگ تو پاکیزہ کا ٹانک ہے اور اسی جلترنگ نے اٹکھیلیوں میں ہنسی کا ریکارڈ قائم کر رکھا ہے۔ میں بیرونِ ملک بہنوں کو مشورہ دوں گی۔ اپنی رائٹرز کے ڈرامے یوٹیوب پر دیکھے جا سکتے ہیں اور انجم باجی کے ڈرامے تو ان کے بیٹے نے انجم باجی کی فیس بک پر لوڈ کر دیے ہیں اور ہاں سب سے خاص بات تو رہ ہی گئی۔ رضوانہ پرنس کو ان کی خوب صورت تقریب کی مبارک باد ضرور دے دیجیے گا۔“ (ضرور)

✉ سمیرا حمید فاروقی، کراچی سے۔ ”انجم باجی پاکیزہ کا جون کا شمارہ پڑھ کر منہ سے واہ نکلا۔ اداریے سے لے کر آخری صفحے تک پڑھا ہے۔ اداریہ بہت اچھا لگا۔ عمیرہ احمد آپ نے ٹاپ کر لیا ہے۔ آپ ہمیں مٹھائی کھلائیں۔ آپ کی تحریر کی ہم فین ہیں۔ اتنا اچھا کیسے لکھ لیتی ہیں۔ ہمیں بھی ٹپس بتا دیجیے۔ جلترنگ اچھا تھا دیگر تحریروں میں اقبال بانو نے اچھا لکھا۔ خربوزے پھیکے لگے۔“ (تبصرے کا شکریہ)

✉ فرحت نسیم، ڈیفنس لاہور کینٹ سے۔ ”ڈیئر انجم پاکیزہ کی پرانی قاری ہوں مگر خط کبھی کبھار ہی لکھتی ہوں کیونکہ تبصرہ کرنے سے قبل تاخیر ہو جاتی ہے۔ میں مجموعی طور پر چند سطور لکھوں گی۔ پاکیزہ کی ہر تحریر آپ کی کاوشوں اور لکھاری بہنوں کی ہمت سے دل کو موہ لیتی ہے۔ ناولٹ کانچ سی لڑکی اور زندگی ایسی تحریریں ہیں لگتا ہے کہ ناہید اور انجم ہم سب کے درمیان بیٹھی کوئی سچی کہانی سنا رہی ہیں۔ آپ دونوں کا انداز بیان سادہ، عام فہم اور دل پر اثر کرتا ہے۔ انجم آپ کی ہمت ہے کہ پاکیزہ میں نئی لکھاری بہنوں کو آگے لا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ مجھے چند پرانی رائٹرز سے شکوہ ہے کہ پاکیزہ کو بھول بیٹھی ہیں۔ جس ادارے نے انہیں نام دیا اسے نظر انداز کر دینا اچھا نہیں۔ روحانی مشورے اور اسمائے گرامی ﷺ نہایت علم افروز ہیں۔ ایک مشورہ ہے کہ میں اکثر گنگناتی ہوں کے دو صفحات اگر کسی ٹاپک کے لیے وقف کر لیے جائیں مثلاً

کسی رائٹرز کا تعارف کسی ایسی ہستی کے متعلق جو گمنام ہو مگر کارنامے ایسے کہ فراموش نہ کیے جا سکیں۔“ (ہماری بہنوں کو اگر آپ کا یہ مشورہ پسند آیا تو ضرور ایسا بھی ہو جائے گا)

✉ ام طیفور، گوجرانوالہ سے۔ ”کانچ سی لڑکی پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ یہ خوب صورت ناولٹ پڑھ کر قرآن پاک میں گھروں میں بیٹھی پردے دار بیبیوں پر بہتان باندھنے والوں پر اللہ نے لعنت فرمائی ہے۔ آپ نے بہت زوراثر انداز میں ایسا کرنے والوں کا عبرت انگیز انجام بیان کیا ہے۔ رضوانہ پرنس جی کے بارے میں تفصیلاً جان کر اچھا لگا۔ وہ ایک حوصلہ مند خاتون ہیں جنہوں نے اپنی خانگی زندگی کو مایوسیوں کی لپیٹ میں نہیں آنے دیا۔ تمام افسانے زبردست تھے اور اس دن پُرزبردست لکھوں گی جس دن میری تحریر بھی شامل ہوگی...... ہاہاہا...... بتائیے گا ضرور کہ ہنسنا منع ہے۔ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں۔“ (گڑیا آپ کی دونوں تحریریں قابلِ اشاعت ہیں مگر پاکیزہ میں انتظار تو کرنا پڑتا ہے۔)

✉ عقیلہ حق، کراچی سے۔ ”پچھلے دنوں معراج صاحب کی مزاج پرسی پر گئی تھی۔ ان کو دیکھ کر دل کو گہرا صدمہ پہنچا مجھے ایسا لگا جیسے میرے والد بسترِ علالت پر ہوں۔ گھر آ کر بہت روئی اور اب میری کوئی دعا ان کی صحت کی دعا کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اللہ عذرا کے گھر کو ہر مصیبت بلا اور نظرِ بد سے بچائے۔ (آمین) آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح لازوال رہا اور جلترنگ کے کیا کہنے...... رضوانہ پرنس کی تقریب میں مجھے محسوس ہوا تھا کہ شاید آپ بیمار ہیں لیکن سوچا ہو سکتا ہے آپ تھکی ہوئی ہوں۔ اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ (آمین) عمیرہ احمد کا ناول عکس زبردست لکھ رہی ہیں۔ جس وقت رسالہ ہاتھ میں آتا ہے تو میں کچن میں ہوں یا جم میں سارے کام چھوڑ کر میں عکس پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ اقبال بانو ایک سینئر رائٹر ہیں اور انہوں نے بہت اچھا لکھا۔ سلمیٰ غزل کے بیٹے کی شادی کی روداد پڑھی بہت اچھا لگا۔ رضوانہ آپ کو آپ کی کتاب کی اشاعت بہت مبارک ہو، اللہ آپ کو بہت سی کامیابیاں عطا فرمائے (آمین) پورا رسالہ بہت مکمل اور اچھا رہا۔ تمام مستقل سلسلے اچھے جا رہے ہیں۔ شمیم فضل خالق صاحبہ نے ہمیشہ کی طرح بہت زبردست لکھا۔ میں مکمل اور تفصیل سے تبصرہ کرتی لیکن ایک تو آج کل میں خود بیمار رہوں اور اس سے بھی زیادہ میری بیٹی کائنات کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں انجم باجی آپ کو ایک اطلاع دینی تھی۔ میری بیٹی کائنات نے ہمدرد نونہال اسمبلی میں قرات کی تھی اور ماشاء اللہ انعام وصول کیا۔ کائنات کے بیس پارے اور وجیہہ کے پندرہ پارے حفظ ہو گئے ہیں۔“ (ماشاء اللہ، سبحان اللہ...... اللہ تعالیٰ آپ کو یہ سعادت جلد عطا فرمائے کہ بچے قرآن پاک حفظ کریں)

✉ جویریہ سلیم، راول پنڈی سے۔ ”اس ماہ کے شمارے کا ایک ہی نچوڑ ہے...... جو آپ نے شکرانے کے نوافل کے بارے میں لکھا ہے۔ میں نے امی کو پڑھایا ہے اور ابو کو بھی۔ بس اسی دن سے سب گھر والوں نے شکرانے کے نفل باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دیے ہیں اور اس کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے اور بہت سی دعائیں آپ کے لیے لبوں سے نکلتی ہیں کہ اللہ پاک آپ کو سدا سکھی، تندرست اور آباد رکھے، آمین۔“ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو اللہ کا شکر، بندوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق ہمیشہ عطا فرمائے۔ آمین)

✉ ارم ہاشمی، لاہور سے۔ ”آپی انجم صاحبہ ماشاء اللہ پاکیزہ بہت ہی خوب صورت اور دلکش ہے۔ میری طرف سے پاکیزہ کو چالیس ویں سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ کرے یہ سال پاکیزہ کے لیے بہت ہی خوب صورت لمحات، خوب صورت احساس، خوب صورت رائٹرز اور میری طرح کے خوب صورت قارئین سے رشتہ بنانے میں اہم اور مددگار ثابت ہو، آمین۔ ماشاء اللہ محترمہ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، اور آپی جی آپ اور دیگر اسٹاف رائٹرز حضرات پاکیزہ کو آسمان پر چمکنے کے لیے بے تاب اور بے چین کر دیتے ہیں۔ وہ بھی ہر ماہ اور پاکیزہ واقعی ہر ماہ آسمان پر چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔ عمیرہ احمد نے اپریل اور مئی کے شمارے میں عکس میں ایسا تجسس اور سسپنس برقرار رکھا ہے کہ یہ عقل دنگ رہ گئی ہے۔ میرا آپی عمیرہ احمد کو سلام کہیے جی اور ان سے میری طرف سے پوچھیں کہ آپ اتنی پیاری اور سوچنے پر مجبور کر دینے والے معاشرتی ناسور کو اپنے قلم سے کس طرح بیان کرتی ہیں۔“ (آپ کی پُرمحبت آرا پہنچائی جا رہی ہے)

☜ زینت عبدالصمد، میر پور ساکرو سے۔ ”رب العالمین تمام بہنوں کی خوشیوں کو دائمی اور رنج و آلام کو عارضی ثابت کرے (آمین) بہنوں کی محفل میں اس بار آپ نے دوگانہ نمازِ شکرانہ کا مشورہ جس خلوص نیت سے دیا، ہم نے اسے بے تابانہ عقیدت سے تھام لیا۔ اللہ پاک آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین اور ہمیں توفیق آمین ثم آمین۔ جون کی کڑکتی گرمی میں ہلکے پھلکے رنگوں سے سجا سرورق آنکھوں کی تراوٹ کا سبب بنا۔ دھیمی سی مسکان کے ساتھ ماڈل کی سوچتی نگاہیں دل میں اترتی چلی گئیں۔ کیا بات ہے اپنے پاکیزہ کے ٹائٹلو کی ہر بار اِک اچھوتا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر بڑی خوب صورتی سے زندگی کے اہم مسائل کو قلمبند کرتی نظر آئیں۔ انتہائی گمبھیر مسائل کو اجاگر کرتی ان کی یہ تحریر فہم و ادراک کے کئی در وا کرتی جارہی ہے۔ بے شک زندگی کا یہ سفر قدم بہ قدم نت نئے چیلنجز پر مشتمل ہے۔ عکس میں تمام سسپنس ختم ہوئے مگر اس کے باوجود عمیرہ احمد کی تحریر کی دلکشی اور کاملیت ناول کی ہر قسط (جو کہ کافی طویل ہوتی ہے) کو ایک نشست میں پورا کرواتی ہے اور ہر قسط کے اختتام سے اگلی قسط کا انتظار شروع ہوجاتا ہے۔ بے انت لحہ میں عقیلہ حق ایک تلخ حقیقت کے ساتھ آئیں اور دوہرے قانون جو اکثر گھروں میں رائج ہیں اور اکثر اوقات انسان کو بے بسی کا احساس دلاتے ہیں۔ خوشی کے رنگ میں رخ چوہدری نے خوش گفتاری سے کچھ اس انداز میں منظر نگاری کی گویا ہم بھی وہاں موجود ہوں۔ آج سے تقریباً بارہ تیرہ برس پہلے میں اور بے بی (میری بہن) اس بات پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے کہ ڈائجسٹ کے اس ناول کی اگر ڈرامائی تشکیل کی جائے تو کیسا رہے۔ اس ناول کے کرداروں کے لیے فلاں فلاں اداکاروں کو لیا جائے تو کیسا رہے گا اور اب جب وہ وقت آگیا ہے کہ ہر دوسرے چینل پر خواتین مصنفات خصوصاً ڈائجسٹ میں لکھنے والی رائٹرز کے ڈرامے دھڑا دھڑ دکھائے جارہے ہیں تو بے اختیار میرے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا جب ہم اس طرح سوچا کرتے تھے اور جلترنگ کی تو کیا ہی بات ہے۔ یہ وہ امرت ہے کہ جس کی طلب کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس پُرآشوب دور میں جب بچہ بچہ پریشان ہے آپ کے چند الفاظ خواہ چند گھڑیوں کے لیے ہی اگر کسی کو شانت کرتے یا کسی کے لبوں پر مسکان بکھیرتے ہیں تو اس سے بڑی کوئی اور بات نہیں۔ اللہ کرے آپ کا ڈراما اٹکھیلیاں یوں ہی ہنساتا رہے۔“ (تبصرے کا شکریہ)

☜ سدرہ خالد، دوکوٹہ سے۔ ”مئی کا سالگرہ نمبر دو پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ مجھے تو ہر ماہ رسالہ دیر سے ملتا ہے اس وجہ سے لیٹر پہنچنے میں دیر ہوجاتی ہے مگر مجھے پھر بھی بہت خوشی ہوتی ہے کہ آپ دیر سے آنے والوں کو بھی بہنوں کی محفل میں شامل کرتی ہیں۔ آنٹی مجھے تو پاکیزہ بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ مئی میں اپنی کوئی تحریر نہ پاکر افسوس تو ہوا مگر دوسری بہنوں کو جگمگاتا دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خدا ہمیشہ ہم سب کو خوش رکھے، آمین۔ آنٹی آپ سرورق کی ماڈل کا نام دیا کریں۔ سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے زبردست، ناول میں عمیرہ احمد کا عکس کا تو کیا کہنا۔ زندگی بھی اچھا ہے، مکمل ناول بھی زبردست تھے ناولٹ کانچ کی لڑکی آپ کا بہت ہی اچھے طریقے سے اختتام کو پہنچا۔ میری طرف سے آپ کو مبارک باد۔ دودھ کا جلا بھی اچھا تھا اور واقعی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ضرور سوچنا چاہیے۔ جیسا کہ عاشی نے جلد بازی میں فیصلہ کیا تھا واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ کچھ انسان بھی فرشتوں جیسے ہوتے ہیں جیسے کہ عاشی کی استانی جی تھی۔ افسانوں میں خواب سفر میں رہے۔ اصل زر اور اسیرانِ قفس زبردست تھے۔ اس کے بعد جلترنگ کا تو کیا کہنا اور باقی مستقل عنوانات بھی سارے زبردست تھے۔ خدا پاکیزہ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ پاکیزہ سے آپ بہت کچھ سکھاتی ہیں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

☜ یاسمین کنول راجپوت، پسرور سے۔ ”پھر کوئی خواب بنو زبردست اسٹوری رہی۔ عذرا بیگ کی کہانی اپنے خوب صورت اختتام کو پہنچی۔ اختتام بے حد اچھا لگا۔ عکس بہت اچھا جارہا ہے۔ اشعار بہترین رہے۔ سرورق جاذبِ نظر تھا۔ جلترنگ بڑا بھایا۔ بڑا مزہ آیا پڑھ کر۔ رفعت سراج کی خواب سفر میں رہے بڑی جاندار تحریر رہی۔ رخ چوہدری کی کہکشاں خیالوں کی بڑی اچھی لگی۔ اداریہ بڑے کمال کا تھا، اچھا لگا۔ آج واقعی ہمیں اشد ضرورت ہے بے یقینی کی فضا کو ختم

کرنے کی...... بہنوں کی محفل بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہمیشہ کی طرح کچھ وقت کے لیے کہیں کھو سے جاتے ہیں ہم۔ الغرض پاکیزہ کا سالگرہ نمبر دو بڑا اچھا لگا۔“ (شکریہ)

☜ تمثیلہ زاہد، کراچی سے۔ ”میں اور امی پاکیزہ کی پرانی خاموش قاری ہیں جولائی 2005ء میں شادی ہوئی اور لکھنا پڑھنا سب ہی کچھ خیر باد ہو چلا۔ اس سات سال کے عرصے میں ماہنامہ پاکیزہ میں خاصی مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں۔ جیسے فیشن کے صفحات غائب ہوگئے۔ کہانیوں میں مذہبی رجحان کی طرف گامزن ہوتی تحریریں، کئی مستقل سلسلے بھی نظر آئے جو مستقل رہنے چاہئیں جیسے سندیسے، فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ وغیرہ...... مجھے کچھ کہنا ہے۔ شروع سے ہی میرا پسندیدہ سلسلہ رہا ہے۔ جسے میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ آپ کی باتوں میں شگفتگی، اپنائیت ہے اور حساس و شفاف آئینے کی طرح صاف کسی طمع سے پاک جملے ہیں جو سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ دل میں بھی ان ہی لوگوں کے جملے اترتے ہیں جو آئینے کی طرح صاف ہوتے ہیں ورنہ بیشتر لوگ بہت کچھ پڑھتے ہیں لیکن ہوتے پتھر دل ہیں ریا سے لتھڑے ہوئے دل ہر احساس سے عاری ہوتے ہیں کبھی نہیں بدلتے...... کسی کے لیے نہیں بدلتے۔ آپ کے یہ جملے دل میں اتر گئے۔ خیال کا گھوڑا اسی وقت تیز دوڑ سکتا ہے جب وہ محنت کا عادی ہو اور کسی بھی فرد کا اعتماد...... اس کا سب سے بڑا ساتھی ہوتا ہے اور ہم سب کو اپنے اوپر یہ اعتماد کرنا ہوگا کہ ہم محنت سے اپنے حالات بدل سکتے ہیں۔ لیجیے میں اپنے خیالات بدلنے لگی ہوں...... ایک کوشش ہے جسے میرا یقین اپنی منزل تک ضرور پہنچائے گا۔ انشاء اللہ جسمانی چوٹ ہو تو زخم مقررہ وقت پر بھر جاتے ہیں۔ روح کے گھاؤ بھرتے نہیں پرورش پاتے ہیں۔ ہاں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ میرے زخموں کی مرہم پٹی میرے شوہر نے بے حد محبت سے کی اگر وہ نہ ہوتے تو میں اتنا کچھ لکھنے کی سعی کبھی نہیں کرپاتی۔ ان کی محبت ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ انجم آنٹی آپ کا محبت بھرا جب فون آیا تو پہلے کانوں کو یقین نہیں آیا کہ میں آپ سے بات کررہی ہوں۔ اظہارِ تشکر کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ آپ کا جواب پاکیزہ میں دیکھ کر میری امی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ آپ کے لیے اتنا ہی کہوں گی کہ آپ بہت اچھی ہیں۔“ (پیاری بہن ہم سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کا مرہم بھی ہیں۔ اس لیے آپ کا خط پڑھ کر مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے اسامہ میرا بھی بھائی ہو)۔

☜ بتول فاطمہ، منچن آباد سے۔ ”ٹائٹل سے نظریں چراتے ہوئے مجھے کچھ کہنا ہے پر آئے اداریے نے کافی متاثر کیا۔ تمام افسانے اور ناولٹ اے ون تھے۔ بعض تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ ہمارے ہی احساسات کو لفظوں میں بیان کردیتی ہیں سلسلے وار ناولز زبردست جارہے ہیں۔ عکس کی ہر قسط جاندار اور سنسنی خیز ہوتی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر بہت اچھا لکھ رہی ہیں یہ ناول کنواری لڑکیوں کے لیے ایک گفٹ ہے انہیں ضرور پڑھنا اور اس پر عمل کرنا چاہیے کانچ سی لڑکی کی آخری قسط قابلِ ستائش تھی اس کی ہر قسط اپنے اندر کئی سبق لیے ہوتی ہے اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ اس سے کیا سبق حاصل کرتا ہے۔ میں نے اس کہانی سے جو سبق حاصل کیا وہ ایک تو اللہ پر اعتقاد ہے اور دنیا مکافاتِ عمل ہے اگر کوئی ہمارے ساتھ برا کرتا ہے تو ہمیں بجائے اس سے بدلہ لینے کے اپنا فیصلہ اللہ پر چھوڑنا چاہیے بے شک اللہ سب سے بڑا منصف ہے۔ دوسرے یہ کہ موبائل کا جتنا فائدہ ہے اتنا نقصان بھی ہے۔“ (بالکل)

☜ جبیں ہاشمی، بھیرہ سرگودھا سے۔ ”آپ سے بہتر کوئی گائڈ کر ہی نہیں سکتا۔ آپ تو وہ جگنو ہیں جو بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ اگر ہم سب یہ عہد کرلیں کہ ہمارے جو پچیس سال گزر گئے ہم نے شکرانے کے نفل نہیں پڑھے اور آئندہ پچیس سال ہم نے پڑھنے ہیں تو ہم بھی ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی پچھلی صف میں کھڑے ہوسکتے ہیں۔ سعدیہ ہما شیخ صاحبہ آپ کہاں ہو؟ میں بھی زریں زبیر کی طرح آپ کی کمی فیل کررہی ہوں اور آپ کی بیٹیاں کیسی ہیں...... پلیز جلدی سے محفل میں آجاؤ۔ میمونہ خورشید کا مکمل ناول اے دلِ ناداں کا اینڈ اچھا، دلچسپ اور سبق آموز تھا۔ عکس، زندگی زبردست جارہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔عمیرہ احمد، ناہید سلطانہ اختر حقیقت پسندی اور محبت کی خوب صورتی کو بیان کررہی ہیں۔تمام رائٹرز اچھا لکھتی ہیں۔ ان کے قلم میں ایسا جادو ہے، ہر پڑھنے والا مسحور ہوکر رہ جاتا ہے۔خصوصی مضامین پڑھ کر بھی مزہ آیا۔شگفتہ ناز ملک اور نور افشاں شیخ سے بھی مل کر بہت خوشی ہوئی۔خدا ان کی ہر مراد پوری کرے' آمین' آپی جی آپ کا جلترنگ تو ہمیں چند لمحوں کے پریشانیوں اور مصروفیات کے چنگل سے نکال کر لطف اندوز ہونے پر مجبور کردیتا ہے۔عمیرہ احمد کا انٹرویو اگلے شمارے میں ہونا چاہیے۔''(عمیرہ تیار ہوجاؤ...... یہ تو ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ فسانہ نہیں حقیقت میں عمیرہ احمد اپنے بارے میں بتائیں)

انجم مشیر، کراچی سے۔''سب سے پہلے جو صفحہ کھلا وہ بہنوں کی محفل ہی کا تھا ساتھ اپنے خط کا جواب، انجم یقین کریں محفل میں بیٹھ کر لگتا ہے سب یہیں آس پاس ہیں اور ایک دوسرے سے پہلے اپنی بات آپ کو سنانا چاہتی ہیں۔عمیرہ احمد کا عکس اب مکافاتِ عمل کی جانب گامزن ہے جون کے شمارے میں کچھ اور اسرار بھی نکلتے ہیں عکس مراد علی سا بننا کبھی اپنا بھی خواب تھا اب بھی کچھ برا حال نہیں ہے۔عذرا رسول کی ڈائری سے انتخاب کئی باتیں تو بڑے کام کی لکھی ہیں کم خرچ میں صحت بناؤ۔ناہید سلطانہ اختر کی زندگی حجاب کے لیے ایک امتحان بن گئی زورِ قلم اور زیادہ، صائمہ حیدر کی گڑیا بچپن کی معصومیت اور دکھ اچھی تخلیق ہے۔اے دلِ ناداں کچھ دکھ اٹھا کر کچھ بڑوں سے تلخ کلامی کی سزا پا کر آخر افق گھر لوٹ آئیں۔نکہت یاسمین کا جدت تراش اب اس مہنگائی کے دور میں چار میٹر میں صرف قمیص ہی بن ہی پاتی ہے۔کانچ سی لڑکی میں آپ نے برے لوگوں کا انجام برا دکھا کر بالکل درست کیا خوب صورت اختتام، رخ چوہدری کی کہکشاں خیالوں کی رخ ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ اسداب اتنے بھی بھولے نہیں۔اسیرانِ قفس خواب نگر میں رہنے والوں کے لیے ایک سبق، دودھ کا جلا خوب صورت تحریر۔عذرا بیگ کی تحریر پھر کوئی خواب بنو کی دوسری قسط اچھی تھی۔رضوانہ پرنس کا فسانہ نہیں حقیقت اور کتاب کی رونمائی اگر پہلی تحریر نے آنکھوں میں آنسو بھرے تو دوسری تقریب کی تحریر یہ دعا لبوں پر لے آئی کہ یہ اندر سے دکھی لوگ ہنستے مسکراتے رہیں۔ماہ جون ہی میں تیرا پیاں جاناں ویل ڈن اقبال بانو بہت خوب صورت تحریر تھی۔''(شکریہ)

پروین افضل، بہاول نگر سے۔''اس بار مئی کا پاکیزہ سالگرہ نمبر دو میرے ہاتھوں میں ہے سرورق کی ماڈل سر پر اوڑھنی اوڑھے بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ناولٹ کانچ سی لڑکی کا آخری حصہ اور پھر کوئی خواب بنو کا بھی دوسرا اور آخری حصہ بہت اچھا اختتام کیا ہے اور اے دلِ ناداں، خواب سفر میں رہے' اصل زر' زندگی پھر گنگنائے، اسیرانِ قفس بھی اچھے لگے۔ عذرا باجی نے ڈائری سے انتخاب اچھا لکھا۔ہماری دعا ہے کہ نکہت عبدالغفار کے شوہر اور خالد محمود، انصار حسین صدیقی، سید خالد جیلانی، صلاح الدین بٹ کو اللہ تعالیٰ جنت میں جگہ دے آمین۔ہماری پیاری سی امینہ عندلیب بتا سکتی ہیں کہ انہیں کیا بیاری ہے کیونکہ وہ کئی سالوں سے بیمار چلی آرہی ہیں۔''(وہ بہت سی بیماریوں کا مقابلہ کررہی ہیں)

حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین سے۔''بہت عرصے کے بعد کوئی مسلسل ناول پڑھنا شروع کیا ہے، وجہ عمیرہ احمد ہیں۔عمیرہ میری فیورٹ رائٹرز کی فہرست میں آتی ہیں۔ناول پڑھتے ہوئے توجہ کسی اور طرف مبذول ہی نہیں ہوتی حتیٰ کہ بچے کو فیڈر دینے میں بھی تھوڑی تاخیر سے کام لیا جاتا ہے جو کہ اچھی بات نہیں مگر اس کی ذمے دار عمیرہ جی ہیں۔مستقل سلسلے خوب جارہے ہیں۔انشاءاللہ آئندہ ماہ رسالے پر تبصرہ ہوگا۔صائمہ الطاف پراچہ تم نے پاکیزہ میں انٹری دے دی ہے۔میں بھی حاضر ہوں کبھی منڈی چکر لگے تو تشریف لانا۔''(عمیرہ احمد، شکریہ کہتی ہیں)

ارسلا ارمین، پنجاب سے۔''آپی پاکیزہ میں کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں اس کی بہت سی رائٹرز ایسی ہیں جن کی تحریریں میں نے کبھی مس نہیں ہونے دیں۔گریجویشن میں اکنامکس اور انگلش لٹریچر جیسے مضامین کے باوجود پاکیزہ سے میری دوستی ہے۔آپی میں نے ایک اسٹوری لکھی ہے۔آپ پلیز اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں اور مجھے یہ بتادیں کہ

اسٹوری کس ایڈریس پر بھیجی جائے۔''(آپ اور دیگر بہنیں ہمارا ایڈریس نوٹ کرلیں۔مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ 63-جے فیز 11 ایکس ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی۔75500)

نسرین تابندہ، کراچی سے۔''میں ہر ماہ بہت سے میگزین پڑھتی ہوں اور روزانہ بہت سے اخبارات بھی مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی ہے کہ آئٹم گرل کسے کہتے ہیں۔اکثر فلموں کے حوالے سے آئٹم گرل اور آئٹم سانگ کا تذکرہ پڑھنے کو بہت ملتا ہے۔''(نسرین بہن اس محفل میں خوش آمدید۔یہ بیماری انڈیا کی فلموں میں ان دنوں عروج پر ہے۔ آئٹم گرل سے مراد ننگ دھڑنگ فنکارہ ہے۔جو ایسا ڈانس کرے کہ دورانِ ڈانس اپنے آپ کو توڑ مروڑ کر سب کے سامنے پھینک دے اور اس کا ''کو اسٹار'' کسی کتے کی طرح اسے سر سے پیر تک خوب سونگھے...... یہ ہے آئٹم گرل اور آئٹم سانگ کی حقیقت جس کو دیکھ کر استغفراللہ ضرور کہہ دینا چاہیے)

عنبر وسیم، گوجرانوالہ سے۔''میرا انٹرویو کیوں نہیں چھاپا؟(تصویر کے ساتھ دوبارہ بھیجو) آنٹی میرے بچے بہت ضد کررہے ہیں اور سارا دن اتنا تنگ کرتے ہیں کہ میں رونے والی ہوجاتی ہوں اکثر ان کی ٹھکائی بھی کردیتی ہوں جس کا پچھتاوا بعد میں ہوتا ہے پلیز کوئی علاج بتائیں کہ وہ نیک شریف بچے بن جائیں اور مجھے ان پر زیادہ غصہ بھی نہ آئے۔ میں نے مزید کہانیاں لکھنے کا سوچا ہے مگر عمیرہ احمد کی تحریر کے آگے مجھے اپنی تحریر بالکل بچگانہ لگی۔ان کا مضبوط اندازِ تحریر، ذہانت، الفاظ پر مضبوط گرفت اور حالات سے مکمل آگاہی، دل عش عش کر اٹھتا ہے۔بلاشبہ عمیرہ احمد از دی بیسٹ۔ان کے بعد باقی رائٹرز کا نام آتا ہے اور آپ کا مقابلہ تو کسی سے ہو ہی نہیں سکتا۔آپ میری پیاری سی کیوٹ سی انجو آنٹی ہیں۔ جنہوں نے تاریکیوں سے نکال کر پاکیزہ کی قارئین کو جگمگاہٹیں عطا کی ہیں۔آپ کی مثبت سوچ بلاشبہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔''(بلاشبہ عمیرہ احمد اور میری تمام مصنفات بہت خوب صورت طرزِ تحریر کی مالک ہیں اور ہم ان پر جتنا بھی فخر کریں وہ کم

ہے۔ان سب کی تحریریں پاکیزہ میں پاکیزگی کے ساتھ ساتھ آگاہی کی شمع بھی روشن کررہی ہیں)

☙ عذرا کنول، سمیرا کنول، اور عائشہ کنول، ڈیرہ غازی خان سے۔ ''سرورق انتہائی دیدہ زیب و دلکش تھا۔ خلافِ معمول دھڑکتے دل کے ساتھ بہنوں کی محفل میں جا پہنچے۔ جہاں اپنا خط موجود پاکر اتنی خوشی ہوئی کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اتنے بڑے ادارے کی اتنی بڑی مدیرہ نے ہمیں اس قابل سمجھا۔ انجم باجی واقعی تسی گریٹ ہو۔ آپ نے ہمارا خط شائع کرکے ہمیں پاکیزہ فیملی کا حصہ بنایا جس کے لیے ہم آپ کے تہہ دل سے مشکور وممنون ہیں۔ آپ کی محبت، اپنائیت اور خصوصی تعاون سے پاکیزہ سے ہمارا یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہوگا (انشاء اللہ) بقول ہماری فرینڈز تمہارا خط شائع نہیں ہوگا بلکہ ردی کی ٹوکری کی زینت بنے گا۔ ہمارا جواب ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ خط ایک ماہ پرانا ہونے کے بعد بھی اگلے ماہ انجم باجی خط ضرور شائع کرتی ہیں پھر ہمارا خط دیکھ کر تو وہ بھی آپ کی اعلیٰ ظرفی کی قائل ہوگئیں۔ انجم باجی! یہ آپ کی محبت ہے جو آپ نئی لڑکیوں کی بھرپور طریقے سے حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف تبصروں میں سدرہ خالدہ، قمر شمس الحق، عارفہ مسعود، نگینہ ضیا اور ڈاکٹر ممتاز کے تبصرے بہترین ہوتے ہیں۔ مجھے کچھ کہنا ہے، جلترنگ ہو یا آپ کی تحریریں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ بلاشبہ آپ ایک اچھی مدیرہ ہی نہیں بلکہ بہت اچھی رائٹر بھی ہیں۔ عمیرہ احمد عکس کو خوب صورتی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر کی کاوش زندگی ایک سبق آموز تحریر ہے۔ جس میں ہمیں حجاب کا کردار بہت پسند ہے۔ پلیز رائٹر سے گزارش ہے کہ حجاب کے ساتھ برا نہ کیجیے گا۔ میمونہ خورشید کا ناول اے دلِ ناداں کا آخری حصہ توقع کے عین مطابق تھا۔ ہمیں پہلے ہی سے شک تھا کہ حارث دوسری شادی ضرور کرے گا۔ ناولٹ دونوں اچھے تھے لیکن اقبال بانو کا تیرا یہاں جاناں سبقت لے گیا۔ افسانوں میں عطیہ عمر اور فرحانہ ناز کے افسانے بہترین تھے۔ خصوصی مضامین تینوں زبردست تھے البتہ ہمیں خوشی کے رنگ زیادہ اچھا لگا کیونکہ ہمیں کتابوں سے خاص شغف جو ہے۔ مجھ سے ملیے میں نور افشاں اور شگفتہ ناز ملک سے مل کر بہت اچھا لگا۔ انجم باجی! آپ کا ناول چاندنی کب اور کہاں شائع ہوا تھا۔ پلیز ضرور بتایئے گا۔'' (چاندنی ناول پاکیزہ میں سلسلے وار شائع ہوا تھا۔ آج سے بائیس سال پہلے۔ اس ناول کے دو تین ایڈیشن آچکے ہیں۔ یہ آپ کو لاہور اور دیگر بڑے شہروں کے اردو بازار میں مل جائے گا۔ ہاں تبصرے کے لیے ممنون ہیں)

☙ زاہدہ بیگم، مانسہرہ سے۔ ''ارے انجم باجی آپ تو بالکل پہچانی نہیں جا رہیں۔ میرا مطلب ہے اپریل کے شمارے میں آپ کی تصویر سے ہے۔ زبردست تقریب کا حال بھی عظمیٰ آفاق سعید نے کیا خوب لکھا ہے گڈ...... شادی میرے شہزادے کی۔ اس شمارے میں آپ نے میرا خط شامل کیا۔ بے حد شکریہ۔ نمرہ احمد کی تحریر ابلیس ایک بے حد سبق آموز اور بہترین کاوش تھی۔ کاش سارے مرد اقبال بانو کی تحریر پہلا قدم کی طرح سوچیں۔ مئی کے شمارے میں کانچ سی لڑکی ناولٹ کا اختتام ہوا۔ بے چاری نہاں کو کافی تکالیف کے بعد ریحان کا ملن نصیب ہوا۔ یہ ناولٹ میرے خیال سے ہر بندے کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ رشتے تو آسمان پر بنے بنائے ہوتے ہیں۔'' (بے شک)

پاکیزہ کا اگست کا شمارہ رمضان کے حوالے سے ہوگا اور ستمبر کا عید کے رنگوں سے مہکا ہوا۔ ان دونوں خصوصی شماروں کے لیے اپنی تحریریں، مراسلات، نظمیں، غزلیں جلد از جلد ارسال کریں۔ اور اب اجازت اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ارضی وسماوی آفات، تمام پریشانیوں، بیماریوں اور شیطانوں کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے' آمین ثم آمین۔

دعا گو آپ کی اپنی باجی۔
انجم انصار

پاکیزہ ڈائری
عظمیٰ آفاق سعید

حمد

طاقت نہیں زبان میں
حمد جو ہو بیان میں
لفظ وہ ملتے نہیں
کہہ سکوں جو شان میں
تیرا ہی کرم ہے یہ
جان ہے جو کہ جان میں
تسبیح اور قرآن شریف
یہی ہے میرے سامان میں
وقت ہی وہ وقت ہے
گزر جائے جو گیان میں
دیتا ہے رزق اس کو بھی
رہتا ہے جو بیابان میں

بیگم رفعت انور ہاشمی
مرسلہ: حمیرا قریشی، کراچی

نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

خدا نے الفت کا اِک خزانہ ہمارے دل میں بسا دیا ہے
نگہ کو عشقِ رسول ﷺ دے کر نظر کے ہر بت کو ڈھا دیا ہے
کسے بتاؤں کہ ان کی الفت میں ہم کو کیا کچھ عطا ہوا ہے
وہ نام جب بھی لبوں پر آیا تو اِک نیا حوصلہ دیا ہے
خدا کی رحمت کا حال دیکھو بنا کہ خود رحمتِ دو عالم
انہیں شفاعت کا اذن دے کر ہمیں بھی کچھ آسرا دیا ہے
ہر ایک پل زندگی کی راہوں میں خود کو پہنچانے کی خاطر
حضور ﷺ کی بے مثال سیرت کا مرمریں آئینہ دیا ہے
یہ ان کی شفقت کا حال دیکھو کرے کوئی جو سوال محسن
خدا کی رحمت سے جو بھی پایا وہی انہوں نے لٹا دیا ہے

شاعر: محسن علوی

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

علم کی دانائی

حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا۔ ''علم کیا ہے؟'' آپؓ نے فرمایا۔ ''علم یہ ہے کہ اگر کوئی تم پر ظلم کرے تو اسے معاف کردو۔ اگر تعلقات توڑے تو تم جوڑ دو۔ کوئی تمہیں محروم کردے تو اسے نواز دو۔ اگر طاقت کی قوت رکھتے ہو تو عفو و درگزر سے کام لو۔ خطا کار سامنے آجائے تو سوچو اس کی خطا بڑی ہے یا تمہارا رحم اور غصے میں کوئی ایسی بات نہ کرو کہ بعد میں تمہیں ندامت ہو۔''

مرسلہ: عروج ذکی آفندی، کراچی

مزاج

جب تم کسی انسان کا مزاج پرکھنا چاہو تو اس سے مشورہ لو تم اس سے اس کے مشورے سے، انصاف، ظلم، نیکی، بدی سب جان جاؤ گے۔

حضرت علیؓ

مرسلہ: قمر شمس الحق، جھنگ صدر

فوری عمل کرنے والی حدیث

جب تم کھانے پینے کے بعد خدا کا شکر ادا کرو اور ایک بار سورۂ اخلاص پڑھ لو تو تمہارے گھر میں رزق کی کشادگی ہوگی اور گھر میں کبھی فاقہ نہ ہوگا جب تک وہ کھانا تمہارے پیٹ میں موجود رہے گا اس کھانے کا ایک ایک دانہ خدا کا ذکر کرتا رہے گا جس کی برکت سے تمہارا چہرہ منور رہے گا۔

مرسلہ: سیدہ شفق عامر زیدی، کراچی

www.Paksociety.com

انٹرویو کارنر

میرا نام منیزہ نعیم ہے نک نیم یا پیار کا نام کہہ لیں پینزی ہے پھول سے تشبیہہ دے کر بڑی باجی نے رکھا تھا۔ بقول بڑی باجی کہ جو کہ کم از کم مجھ سے 25 سال بڑی ہیں کہ جب تم پیدا ہوئیں تو خوب صورت ترین تھیں۔ (آہم) پیدائش گجرات کی ہے، پل بڑھ کر جوان ہوئے کراچی جیسے روشنیوں کے شہر میں اور شادی ہوئی راول پنڈی میں۔ دو عدد بیٹیوں کی والدہ ماجدہ ہوں۔ عبداللہ کالج سے ایف اے تک پڑھا ہے پھر CTC کیا، بیوٹیشن کورسز گورنمنٹ کے اور مختلف اداروں سے کیے، اپنے کالج کی اور شہر کی ٹیم کو نمائندگی دے چکی ہوں ہاکی میں یعنی لائف کو بھرپور انجوائے کیا ہے۔ آج کل جو ہابیز چل رہی ہیں وہ سوشل ویلفیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے۔ بچوں پر بھرپور توجہ، دین اور دنیا کی تعلیمات کی تفصیلات بتانا کیونکہ میں نے جو پاکیزہ سے انجم انصار آپی سے اور عذرا آپی سے جو پایا ہے وہ بچیوں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ بقول میری بیٹیوں کے ماما آپ ہمیں ایک دم پرفیکٹ دیکھنا چاہتی ہیں، آج جمعہ ہے اور بچیوں کو میں نے مصلے پر بٹھا دیا ہے کہ درودِ ابراہیمی کی تسبیح کرو۔ دونوں بیٹیاں میٹرک کے امتحانات کی تیاریاں کررہی ہیں بلکہ دے رہی ہیں۔ آخر میں پاکیزہ کے تمام پڑھنے والوں کے لیے دعائیں۔ عذرا آپی، معراج بھیا، انجم آپی، عظمیٰ جانی کو ڈھیروں دعائیں اور اللہ تعالیٰ آپ کے میرے ملک پاکستان کا حافظ و ناصر (آمین)

مرسلہ: منیزہ نعیم، گجرات

غزل

چارسو ہے جو اجالا چھایا
کون یہ رشکِ قمرِ یار آیا
رنگ کتنے ہی فضا سے برسے
اس کا آنچل جو ذرا لہرایا

تجھ سے بچھڑے تو میری جاں ہم کو
یاد نے تیری بہت تڑپایا
کہتی آئی ہے جو دنیا مجھ سے
آپ نے مجھ سے وہی فرمایا
ایک دکھ روز بتا دیتا ہے
کتنا ظالم ہے میرا ہمسایہ
روگ بن جائے جو اس دل کے لیے
ایسی چاہت سے تو میں باز آیا
وہیں چھانے لگے مظہر بادل
اس نے بالوں کو جہاں سلجھایا

شاعر: مظہر احمد دانشمندی
مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

کمزور کون

ہاتھی کے بچے کو پیر میں زنجیر ڈال کر پالا جاتا ہے۔ وہ زنجیر توڑنے کی کافی دنوں تک کوشش کرتا رہتا ہے بالآخر ہمت ہار کر چھوڑ دیتا ہے۔ جب وہ بڑا اور طاقت ور ہو جاتا ہے تو وہی زنجیر پیروں میں ہوتی ہے جو اس کی ہلکی کوشش سے ٹوٹ سکتی ہے مگر ہاتھی کے دماغ میں یہی ہوتا ہے کہ زنجیر نہیں ٹوٹے گی اور وہ ساری زندگی غلام بن کر رہتا ہے۔

ہم انسانوں کو بہت سی باتیں جانوروں سے بھی سیکھنی چاہئیں۔

مرسلہ: صدف آصف، کراچی

اپنے محبوب شوہر کے نام

تو یاد نہ کر بیتے زمانے
نظر لگ گئی کس کی نہ جانے
نظر میں آج بھی وہ ہیں سموئے
کبھی دیکھے تھے جو سپنے سہانے
بھلانا چاہتی ہوں اُن کو میں تو
یہ یادیں آہی جاتی ہیں جلانے
جو میری آنکھ کھلتی ہے تو رفعت

یوں لگتا ہے وہ بیٹھے ہیں سرہانے
تیرے جانے سے اے جانِ تمنا
بڑے اداس ہیں سارے گھرانے
تجھے ہم یاد ہیں خلد بریں میں
مجھے معلوم ہیں تیرے ٹھکانے

شاعرہ: بیگم رفعت انور ہاشمی
مرسلہ: جمیرہ قریشی، کراچی

یہ تو ممکن نہیں

جا میں تجھ کو خوشی سے جدا کرتی ہوں
مجھ سے تو کیسا عہدِ وفا چاہتا ہے
تجھ سے بچھڑوں نہ آنسو پلک پر بہیں
یہ تو ممکن نہیں
ایسا ممکن نہیں......!

شاعرہ: ناہید عزمی
مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

محبت

محبت ایک گلاب ہے جو چاہتوں کی شبنم میں بہت کھلتا ہے، لہلہاتا ہے مگر جب اس پر بدگمانیاں اور نفرتوں کی دھوپ پڑتی ہے تو یہ مرجھا جاتا ہے اور ناامیدی کی تند و تیز ہوائیں اسے شاخ سے جدا کردیتی ہیں بس...... پھر محبت مرجاتی ہے پھر اس شاخ سے محبت کی کونپلیں کبھی نہیں پھوٹتیں، کبھی بھی نہیں۔ مردہ تن میں بھی جان پڑتی ہے کیا۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

نہ اب وہ پہلی سی عنایتیں ہیں
نہ ہی لہجے میں اب وہ محبتیں ہیں
اس مقام پر آگیا جلد تعلق اپنا
ایک دوسرے سے صرف اور صرف شکایتیں ہیں
سب کے سامنے ہوجاتا ہے لاتعلق سا
نہ جانے اس کی اپنی کیا مصلحتیں ہیں
لاکھ چھپاؤں غم کردیتی ہیں عیاں
آنکھوں میں جو اشکوں کی برساتیں ہیں
اس شہرِ خموشاں میں دل لگتا نہیں ہے
مقدر میں شاید اپنے ہجرتیں ہیں
قافلے کی رکھوالی ہو جب رہزن کے ہاتھ
کیسے محفوظ اب سب کی عزتیں ہیں
محبت بانٹتا ہے وہ خیرات کی طرح
عجب ہی اس شخص کی عادتیں ہیں
اس زیست کا سفر کیسے طے ہو پائے گا
بظاہر مسکراہٹ اور دلوں میں نفرتیں ہیں
اِک آنگن، معصوم قلقاریاں اور مخلص ساتھی
اپنی بھی شائلہ کیا کیا حسرتیں ہیں

شاعرہ: شائلہ سہیل جاوید
مرسلہ: کنول عاصم، لاہور

ساجن مسالا

ساجن کی یاد بھی کن لمحوں میں آتی ہے خاور
گوری آٹا گوندھ رہی تھی نمک ملانا بھول گئی

ذرا توجہ فرمائیں، گوری اگر ایک ہی چیز پر توجہ فرماتی تو اچھا تھا کم از کم آٹا تو صحیح گوندھ لیتی اور اگر آٹا گوندھنے کے ٹائم ساجن یاد آیا تو پھر پکانے کے ٹائم بھی اس نے ڈسٹرب کیا ہوگا ہوسکتا ہے کہ گوری سے روٹیاں بھی جل جائیں تو جلی بھنی روٹیوں کا کریڈٹ بھی ساجن کو ہی دیا جائے گا۔ لیکن آج کل کے حالات اس سے بالکل مختلف ہیں، اب جدید دور ہے اب ساجن اور گوری کے پاس ایک سے ایک ماڈل کے موبائل ہیں اس لیے ساجن آٹا گوندھتے وقت گوری کو کال کرسکتا ہے بلکہ دیکھ بھی سکتا ہے۔ وڈیو کال کرکے اور جب وہ کال ہی کرسکتا ہے تو تندور سے روٹیاں بھی لاسکتا ہے اس لیے گوری سے زیادہ ساجن ٹینشن میں ہے، ہے ناں......؟

از: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

www.paksociety.com

سلیقہ مند

''سیدھی سی ہے، بھولی بھی بہت ہے اور کچھ بے وقوف بھی......'' اماں کی یہ رائے فریدہ چاچی کے بارے میں تھی جو گاؤں سے بیاہ کر حیدر آباد آئی تھیں۔

''چاچی آپ کو حیدر آباد کیسا لگا؟''

''یہاں بجلی بہت جاتی ہے۔'' وہ تمسخر سے ہنس کر بولیں۔

''آپ جس گاؤں سے آئی ہیں وہاں تو بجلی بھی نہیں۔'' مجھے ان کی بات پر حیرت تھی۔

''وہاں لالٹین ہوتی ہے، گیس کی بڑی لائٹ ہوتی ہے۔ وہ تھوڑی ناں جاتی ہے۔''

''پھر گرمیوں میں بغیر پنکھوں کے گرمی تو لگتی ہے۔''

''دیکھا فریدہ کتنی سیدھی ہے!'' اماں ان کی باتیں سن کر انہیں سادگی کا سرٹیفکیٹ فوراً دے دیتیں کہ یوں بھی وہ ان کی لاڈلی بھابی تھیں۔

''ہوں گی...... سیدھی...... مگر مجھے تو نہیں لگتیں۔'' مجھے ان کا خوامخواہ کا اترانا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

حیدر آباد میں چاچا، چاچی...... چھوٹے سے گھر میں علیحدہ ہی رہتے تھے اور ہمارا کینٹ کے علاقے میں خوب بڑا سا گھر تھا۔ چاچا اور فریدہ چاچی ہر ہفتے ہمارے گھر آتی تھیں اور ہمیشہ مین میخ نکالنے والی باتیں کیا کرتیں۔

''ارے، اتنے چھوٹے گلاس ہیں تمہارے ہاں، ان میں پانی پیو تو پیاس ہی نہیں بجھتی ہے۔''

''ارے کسی نہیں پیتے تم لوگ...... جب ہی تو سب کے رنگ دبے ہوئے ہیں۔'' وہ اپنی گوری رنگت پر اتراتیں۔

''ارے، یہ ڈشز اور پلیٹیں تو ہمارے گاؤں میں بھی استعمال نہیں ہوتیں...... تم لوگ ابھی تک ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ میں تو جب کسی ڈیزائن سے اکتا جاتی ہوں تو از خود زمین پر گرا دیتی ہوں کہ جان چھوٹے۔''

وہ ہنس کر کہتیں اور ہم بہنیں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے۔

ایک اتفاقی چھٹی کے دن ہم سب لوگ بغیر بتائے فریدہ چاچی کے گھر چلے گئے۔ ہمیں دیکھ کر پہلے تو متوحش سی ہوئیں۔

''ارے، آپ لوگ کیسے آ گئے۔ مجھے فون کر دینا تھا۔ میں حاضر ہو جاتی۔''

''بڑے تھوڑی چل کر چھوٹوں کے پاس جاتے ہیں۔ چھوٹوں کو جانا چاہیے۔'' ان کی منطق بھی غلط نہیں تھی۔

''چاچی آپ ہماری تو بڑی ہیں۔ اس لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں اور بطورِ خاص آئے ہیں۔''

''اللہ جم جم آؤ۔ میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔''

صوفوں پر ایک کی جگہ چار کشن لگا کر ہمیں بٹھایا پھر وہ اپنی چھوٹی بہن سے چیخ کر بولیں۔ ''جا ذرا جلدی سے ہمسائی کے ہاں سے چھ بڑی پلیٹیں، چھ چھوٹی پلیٹیں اور چھ گلاس تو لے کر آ...... ان سے کہنا وہی کالے پھولوں والی پلیٹیں دینا جو انہوں نے اپنی بیٹی کے سسرال والوں کے سامنے رکھی تھیں اور ہاں چمچ نہیں ہوتے۔'' تھوڑی دیر بعد ان کی بہن منہ لٹکائے چلی آئی۔

''وہ کہہ رہی ہیں ہمارے برتن ٹوٹ گئے اور سامنے والوں کے چمچے سب کھو گئے ہیں۔''

''اللہ کس قدر جھوٹی ہیں یہ سب۔ مجھے پتا ہے کہ جان بوجھ کر نہیں دیے انہوں نے برتن۔ کس قدر جاہل ہیں یہ لوگ...... انہیں ہمسایوں کے حقوق بھی نہیں معلوم۔ کیسے صفا چٹ انکار کر دیا۔''

''کوئی بھلا ایسا کرتا ہے؟''

''قیامت قریب ہو تو ہمسائے بھی بدل جاتے ہیں انہیں اپنے فرائض کا بھی خیال نہیں رہتا۔''

''فریدہ ہم چلیں گے۔ بس ایسے ہی تمہارے گھر آ گئے تھے۔'' امی نے ان کی فضیحتیں سن کر ہم بہنوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ارے واہ، میں ایسے بھلا کیسے جانے دوں گی۔ آج میری خالہ میرے گھر آئی ہیں۔''

''چل شنو...... الماری سے چھ بڑی پلیٹیں اور چھ چھوٹی پلیٹیں نکال لے اور ہاں نئے والے چمچے بھی نکال لے۔''

''چلو تم لوگوں کے آنے پر میرے برتنوں کا بھی افتتاح ہو جائے گا۔ ورنہ جہیز کے ڈنر سیٹ میں سے برتن میں نے ابھی تک نکالے نہیں۔ شادی کو دس سال ہو گئے مگر یہ میرا سلیقہ ہے کہ وہ آج تک نئے کے نئے رکھے ہیں۔''

''ہاں چاچی...... آپ جیسا سلیقہ مند تو ہمارے خاندان میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' میں نے ہنس کر کہا اور وہ توفکی سے مسکرا دیں۔

معمولی بات

شازیہ اور رابعہ دو سگے بھائیوں سے بیاہی ہوئی تھیں۔ خالہ کہتی تھیں کہ اگر دو بہنوں کی ایک ساتھ شادی ہو اور دونوں ایک ہی گھر میں جائیں تو ایک خوش رہتی ہے اور دوسری ملول۔

مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں ہی بہت خوش تھیں اور دونوں کے شوہر اپنی اپنی بیویوں کے بہ رضا و رغبت جنگی قیدی سے تھے۔ جو وہ کہتیں سوائے ہامی بھرنے کے ان سے کوئی دوسرا کام ہرگز نہیں ہوتا تھا۔

دونوں ہی بہنیں خوب موٹی تھیں۔ سسرال والوں نے بارہا اشاروں کنائیوں میں انہیں خاصا سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ روزانہ آلو کھانا خود ان کی صحت کے لیے برا ہے مگر وہ ان خواتین میں سے تھیں جو سسرال والوں کی ہر بات کا منفی مطلب لیتی ہیں۔

دونوں کا باورچی خانہ ایک ہی تھا۔ آلو کے چپس، کٹلس، بھرتہ، پراٹھے وہ خوب شوق سے کھاتیں اور ہفتے بھر کے گوشت میں بھی آلو مختلف طریقوں سے ڈال کر پکاتیں...... اور اتوار کے دن دونوں بڑی ادا کے ساتھ اپنے اپنے میاؤں سے لاڈ بھرے لہجے میں پوچھا کرتیں۔ ''سنیے آج آپ بتائیں کہ گوشت میں کیا سبزی ڈلے گی؟''

تو وہ دونوں ہی گھگھیائے ہوئے انداز میں کہتے۔ ''آج آلو میں گوشت ڈال لو۔'' لہجہ ایسا ہوتا جیسے انہوں نے مدتوں سے آلوؤں کو دیکھا تک نہ ہو۔

جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ان کی پوری فیملی سے آلو کے بھبکے آیا کرتے تھے۔ ہر اندھ مارا سارا آلو گوشت جب وہ بغیر ہلدی کے پکاتیں تو اس کی بساند سے اُن کے دونوں پڑوسیوں کو متلی شروع ہو جاتی۔ پڑوس میں کرایے کے مکان کے بار بار خالی ہونے کا سبب بھی یہی آلو تھے مگر چونکہ مالک مکان آستین چڑھاؤ نہیں تھا اس لیے کبھی ان کے منہ نہیں لگا۔

خاندان کے وہ لوگ جو شوگر کے مریض تھے، جنہیں اپنے گھر میں آلو دور دور نظر نہیں آیا کرتے تھے، وہ ان کے ہاں بڑے شوق سے جاتے اور آلوؤں سے فیض یاب ہو کر جاتے۔ ان کے گھر کا واحد بڑا کمرا جس میں تالا لگا رہتا تھا۔ اس کمرے کی

چابی کبھی حل کرنہ دیتی جب ہنگامی طور پر اُن کے مہمان آجاتے۔ ہاں بتا کر آنے والے مہمانوں کے سامنے وہ دونوں ہمیشہ سرخرو رہتیں۔ ایسے میں ان کے صوفے بھی سب کو جاگتے ہوئے نظر آئے ورنہ وہ ہرے رنگ کی چادر لپیٹے ہمیشہ سوتے ہی رہتے تھے۔ پرانی گاڑی بھی پورچ میں بڑا سا لحاف کا استر اوڑھے سوتی سوتی سی نظر آتی اور گھر کے مرد اپنی اپنی پھٹ پھٹیوں پر پھٹ پھٹ کرتے آتے جاتے تھے۔

اطلاع دے کر آنے والے مہمان آلو کے آملیٹ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کھاتے...... دونوں بہنوں کا چمچماتا سا یہ کمرا مہمانوں کو بتاتا کہ گھر کے مکین یہاں قدم نہیں دھر سکتے اور بچے یہاں پر نہیں مار سکتے۔

وہ مہمان جنہیں اپنے گھر میں آلو نہ ملتے وہ یہاں آکر خوب آلو کھاتے مگر اپنے گھر جا کر اُن دونوں کا خوب مذاق اڑاتے۔

وہ مہمان جو اُن کے گھر آکر صرف خالی چائے پینے پر اکتفا کرتے وہ بھی خوب دھوم دھڑکے سے اُن دونوں بہنوں کا مذاق اڑاتے۔ ”آج آلو ہاؤس سے آلو کے سوپ جیسی چائے پی کر طبیعت بگڑی ہے۔“

تب وہ دونوں بہنیں اکثر سوچا کرتیں۔ ”ضرور ہمارے ملک میں بلکہ پوری دنیا میں کوئی ایسی اکیڈمی نہیں ہے جو مہمانوں کی تربیت کر سکے کسی نے بھی کوئی اکیڈمی بنانے کا نہیں سوچا اس لیے اب ڈاکو جیسے مہمانوں کو کوئی کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ یہ کوئی معمولی بات ہے بھلا کہ لیٹروں کی ایف آئی آر تک نہیں لکھوائی جاتی۔“

ظالم سیّاں

”بس میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب میں نے شاکر کے ساتھ نہیں رہنا۔“ صابرہ نے غصے سے کہا۔

”مگر کیوں نہیں رہنا، کوئی بات بھی ہو؟“ ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آپ ہاتھ دیکھ رہی ہیں میرا، کیسا زخمی سا ہوگیا۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اماں کے سامنے کیا۔

”اے ہے...... کیا اس نے تجھے مارا ہے؟“ ماں کو غصہ آگیا۔

”اتنی ہمت نہیں ہے اُن میں۔“

”پھر یقیناً یہ کارروائی تیری ساس کی ہوگی۔ شکل سے ہی تیز نظر آتی ہے۔“

”نہ اماں...... وہ بیٹے بہو کی لڑائیوں میں دلچسپی نہیں لیتیں۔“

”ارے، اتنی اکل کھری سی ہے وہ۔“

”ہاں بس ایسی ہی ہیں۔“

”پھر کیوں نہیں رہنا تو نے شاکر کے ساتھ، اصل بات تو بتا۔“

”اماں...... وہ بہت ظالم ہے۔ ایسا ظالم کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔“

”چل بتا دے اس کی ایک، ایک بات، ابھی نہ جا کر اس کا دماغ صحیح کیا تو میرا نام بدل دینا۔“ اماں نے برقع پہن کر غلط سلط بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔

”اماں آرام سے بیٹھیں، پہلے میری بات تو سن لیں۔“ اب صابرہ نے سسکی بھر کر رونے کا جیسے آغاز کیا۔

”ہاں بیٹی بتا ناں...... تجھے بھری بہار میں کس نے خزاں کا ملال دیا۔“

”اماں...... میں ہمیشہ شاکر کے کوٹ سے پیسے نکالا کرتی تھی...... جیسے آپ نے بتایا تھا کہ مرد کبھی گن کر پیسے نہیں رکھتے...... اگر تھوڑے بہت نکال لیے جائیں تو انہیں پتا بھی نہیں چلتا۔ میں عرصے سے ایسا ہی کر رہی تھی اور انہیں واقعی پتا بھی نہیں چلتا تھا مگر اب انہوں نے مجھے بغیر بتائے اپنے کوٹ کی جیب میں چوہے پکڑنے کا چھوٹا سا پنجرہ رکھ لیا۔ میں نے جیسے ہی انگلیاں اُن کی جیب میں ڈالیں پیسے تو ہاتھ نہیں آئے، یہ انگلیاں زخمی ہوگئیں۔ اب بھلا کوئی ایسے بھی کیا کرتا ہے۔ یہ ظلم نہیں ہے تو کیا ہے۔“ تب اماں حق دق سی بیٹی کو دیکھے جا رہی تھیں۔

ایسی یا ویسی

نہ ہی انہونی بات ہے اور نہ ہی نئی نکوری...... ایسا تو ہوتا ہے، ہر جگہ ہوتا ہے اور ہر گھر میں ہوتا ہے۔ جی ہاں پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہ تک کی برائیاں کر دیتے ہیں مگر منہ در منہ جھوٹ خاصی رغبت سے بولا جاتا ہے۔

ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن سے ہم روز ملتے ہیں جو ہمیں اچھے بھی نہیں لگتے مگر پھر بھی ہم ان سے ملنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو زیرلب نہ صرف صلواتیں پڑتی ہیں بلکہ کوسنے تک دیے جاتے ہیں۔

شکر ہے سائنس کی ترقی نے ابھی تک ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں کیا ہے جو زیرلب گفتگو ریکارڈ کر سکتا...... اگر خدانخواستہ ایسا کبھی ہو بھی گیا تو ہم اپنی دل پشوری کا ایک نادر موقع ہاتھ سے گنوا دیں گے۔ اب ذرا یہ زیرلب گفتگو بھی سن لیں۔ بیگم! ”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ...... آج بھی آپ آفس سے دیر آئیں گے۔ میں تو بور ہو جاؤں گی آپ کے بغیر“ (اچھا ہے وہیں مرے آفس میں، گھر میں آکر دماغ خراب کر دیتا ہے میرا، ٹی وی تک سکون سے نہیں دیکھنے دیتا منحوس)

باس: ”مس تانیہ! یہ اہم خطوط آج ہی ٹائپ کر کے روانہ کر دیں۔“

سیکریٹری: ”او کے باس۔“ (ہاں تمہارے باپ کی نوکر ہوں جو رات تک یہی کام کروں گی جیسے ہی تو اپنے گھر دفعان ہوگا میں بھی کھٹاک سے روانہ ہو جاؤں گی)

بھابی: ”میں تمہیں نند نہیں بلکہ چھوٹی بہن سمجھتی ہوں، اسی لیے میں تم سے کہہ رہی ہو یہ فواد اچھا لڑکا نہیں ہے، تم اس رشتے سے خود ہی انکار کردو۔“

نند: ”جی اچھا بھابی۔“ (ہاں...... جیسی تم میری

پاکیزہ کے نام

اے میرے گل چیدہ
اس نگار خانے میں
ایک تیرے آنے سے
لفظ گونجتے ہیں یوں
جیسے کوچۂ دل میں
بج اٹھی ہو شہنائی
آفتابی منظر میں
روشنی کے جھرمٹ میں
ایک چاند جیسا تو
اس خیالِ ہستی میں
کون تیرے جیسا ہے
اے میرے گل چیدہ

شاعرہ: سیدہ ہما شاہ، ہارون آباد

ڈر لگتا ہے

جانے کیوں اس کی
باتوں سے ڈر لگتا ہے
محبت کے سارے وعدے
وفا کی بھی قسمیں
ساتھ رہنے کی وہ باتیں
سن کر قرار نہیں آتا
جانے کیوں اس کی باتوں سے
ڈر لگتا ہے

شاعرہ: ریحانہ شہزاد، کراچی

www.paksociety.com

بہن ہو۔ وہ میں خوب جانتی ہوں ۔ادھر میں انکار کروں اور اُدھر تم فٹ اسے ہانک کر اپنی بہن کے لیے لے جاؤ......کیا میں سمجھتی نہیں ہوں)

ساس: ''دلہن کیا بتاؤں کہ تمہارے پیچھے میری طبیعت کتنی خراب رہی۔ بستر سے اٹھا تک نہیں جاتا تھا۔ مجھے تو لگتا تھا کہ بس میرا وقت آگیا ہے، جب ہی تو تمہیں بلوایا۔''

بہو: ''امی جان آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے...... انشاء اللہ آپ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گی۔'' (ہونہہ، تمہارا وقت اتنی جلدی کہاں آئے گا۔ تم تو ہم کو بھی مار کر نہیں مروگی، ہٹی کٹی تو ہو...... اور کیا پہلوان بنوگی...... دو دن کے لیے میں اپنی اماں کے پاس کیا چلی گئی کہ کم بخت نے بیماری کا بہانہ کر کے مجھے بلوالیا۔ خدا ہی تمہیں سمجھے...... ایک مفت کی نوکرانی میں ہی تو تمہیں ملی ہوں)

استاد: یہ اہم سوالات ضرور یاد کرلیجیے امتحان میں آسکتے ہیں۔''

شاگرد: ''یس سر۔'' (ارے باؤلے، یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے جوابات کے کارتوس ساتھ لے جائیں گے اور کاپی پر چھاپ دیں گے۔ یاد کر کے اپنے سر میں درد کرنا ہے)

ماں: ''میں نے اپنی بیٹی کو بڑے نازوں سے پالا ہے، بڑے نخرے اٹھائے ہیں اس کے ہر شوق کو پورا کیا ہے، بیٹے اس کا خیال رکھنا اور اب اس کے ناز نخرے اٹھانا تمہارا فرض بھی ہے، آخر اس کے شوہر ہو۔''

داماد: ''امی آپ بے فکر رہیں، انیقہ سے میں نے شادی کی ہے، پھولوں کی طرح رکھوں گا۔ بہت خوش رہے گی وہ۔'' (ہونہہ، مکار لوگوں کی عیار باتیں...... اپنے گھر کا سارا کام خود کرتی تھی، نوکری کرتی تھی، ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ میرے گھر میں کام کرنے سے اسے کیا موت آجائے گی۔ میں نے تو شادی ہی اس لیے کی ہے کہ اماں کو آرام دوں، نہ کہ تم کو آرام دوں گا؟ اس خوش فہمی میں رہنا بھی نہیں انیقہ)

ماں: ''بیٹے مٹھائی ختم ہوگئی ہے، تم یوں کرو مجھ سے پیسے لے لو اپنے کھانے کے لیے بھی کچھ بھی لے آؤ۔''

بچہ: ''مگر پاپا تو کہہ رہے تھے قلاقند کا ڈبا امی کے پاس رکھا ہے۔''

ماں: ''ارے کہہ تو دیا کہ اگر قلاقند کھانی ہے تو بازار سے لے کر کھالو۔'' (ارے بیٹے تجھے ہفتے بھر کی رکھی ہوئی باسی مٹھائی کیسے کھلادوں۔ ویسے بھی اتنی سخت گرمی میں کھویا سڑ کر خراب ہوجاتا ہے۔ میں تو ڈبا بھی پھینک دیتی کہ اچانک تمہاری پھپو کا فون آگیا کہ وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آرہی ہیں۔ میں نے سوچا چلوان کے شکم میں پھینک دوں گی)

میاں: ''آپا بس آنے والی ہیں تم نے چائے کا بندوبست کرلیا ہے ناں۔''

بیوی: ''آپ بے فکر رہیے...... قلاقند کا ڈبا بھرا رکھا ہے، ان کے لیے، میں نے وہ مٹھائی اپنے بچے تک کو نہیں دی کہ آپ کی بہن آرہی ہیں۔''

میاں: ''تم واقعی بہت اچھی ہو۔'' (حالانکہ اچھی تو کبھی نہیں تھیں)

بیوی: ''دیکھ لیجیے...... آپ کی بہن سے کتنی محبت کرتی ہوں کہ اپنی اولاد تک کو نظر انداز کردیتی ہوں جب کہ ہمارا صرف ایک ہی بیٹا ہے۔'' (خدا کرے تمہیں ہیضہ ہوجائے فرزانہ بیگم...... اور تم ہر ہفتے میرے گھر پر چڑھائی کرنے کے قابل نہ رہ سکو، خدا غارت کرے تمہیں)

میاں: ''ہاں بیگم، تم بہت سویٹ ہو۔'' (بے حد کڑوی ہو، حیرت ہے تمہارا وسیع القلبی پر...... ورنہ ایسی تو تم...... ہرگز نہیں ہو)

☆☆☆

میرا انتخاب

آمنہ حماد

محبت میں کبھی اتنی وحشت ہوتی ہے کہ محبت بھی سکون نہیں دیتی، اتنا طلاطم برپا ہوتا ہے کہ آنکھ سے لہو امنڈ آئے...... محبوب کا ساتھ ہی اس تلاطم کو ختم کرتا ہے...... سعدیہ ارشد نے لاہور سے کلامِ فیض کو منتخب کیا ہے۔

نظم

تم جو پل بھر کو ٹھہر جاؤ تو یہ لمحے بھی
آنے والے کئی لمحوں کی امانت ہوجائیں
تم جو ٹھہر جاؤ تو یہ رات، یہ مہتاب
یہ سبزہ، یہ گلاب اور ہم دونوں کے خواب
سب کے سب ایسے مبہم ہوں کہ حقیقت ہوجائیں
تم ٹھہر جاؤ کہ عنوان کی تفسیر ہو تم
تم سے تلخیٔ اوقات کا موسم بدلے
مہرباں ہو کے نہ ٹھہرو تو پھر یوں ٹھہرو
جیسے پل بھر کو کوئی خواب تمنا ٹھہرے
جیسے درویش مدح نوش کے پیالے میں کبھی
ایک دو پل کے لیے تلخیٔ دنیا ٹھہرے
ٹھہر جاؤ کہ مدارات کے میخانے سے
چلتے چلتے کوئی ایک آدھ سبو ہوجائے
اس سے پہلے کہ کوئی لمحۂ آئندہ کا تیر
اس طرح آئے کہ پیوستِ گلو ہوجائے!

زندگی میں جہاں محبت اور چاہت کی اہمیت ہے وہی اظہار کے بغیر محبت کا تصور ممکن نہیں...... بڑے بڑے شاعروں نے اظہار کی اہمیت کو اپنی شاعری میں باندھا ہے کچھ ایسا ہی احمد فراز کررہے ہیں۔ جس کا انتخاب نویدہ آفتاب نے تلہ گنگ سے کیا ہے۔

غزل

چلو عشق نہیں چاہنے کی عادت ہے
کیا کریں ہمیں دوسرے کی عادت ہے
تو اپنی شیشہ گری کا نہ کر ہنر ضائع
میں آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے
وصال میں بھی وہی فاصلے سراب کے ہیں
کہ اس کو نیند مجھے رت جگے کی عادت ہے
تیرا نصیب ہے اے دل سدا کی محرومی
نہ وہ سخی، نہ تجھے مانگنے کی عادت ہے
یہ خود اذیتی کب تک فراز تو بھی اسے
نہ کر یاد کہ جسے بھولنے کی عادت ہے

شاعری میں صرف محبت کی سرگوشیاں ہی نہیں ہوتیں...... ہجر و وصال کے نالے اور نغمے بھی ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی بہت سی باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں...... کلام خلیل اللہ فاروقی کو پسند کیا ہے تسنیم قریشی نے کوہاٹ سے۔

قلبِ منظر ٹھہر

قلبِ منظر ٹھہر لمحہ بھر کے لیے
اس کی رخصت کا ہنگام درپیش ہے

وصلِ شیریں سے گل رنگ ماحول میں
اِک کہانی کا انجام درپیش ہے
آخری بار جی بھر کے دیکھ لوں
کیا خبر پھر بہار ہو کہ نہ ہو
کس کو معلوم پھر گل کھلیں نہ کھلیں
وہ نہ ہوگا تو خوشبو ہی کام آئے گی
آخری بار سانسوں کو مہکا تو لوں
ہجر بھی آگ ہے وصل بھی آگ ہے
چلتے چلتے میں یہ آگ دہکا تو لوں
ایسی ساعت کہاں، ایسا منظر کہاں
رنگ ہی رنگ ہے، روپ ہی روپ ہے
چھاؤں آنچل کی لے لوں گھڑی دو گھڑی
پھر سفر در سفر دھوپ ہی دھوپ ہے
قلبِ مضطر تسلی کے دو حرف بس!
دیکھ چشمِ غزالاں چھلکنے لگی
حسن پر حزن کے سائے چھانے لگے
آگ فرقت کی دل میں دہکنے لگی

شاعری دل کا نغمہ ہے...... شاعر دلِ زندہ اور روشن دماغ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری ہجر و وصال کی شاعری سہی لیکن وہ زندگی اور روشنی کے پیغام سے خالی نہیں۔ حبیب جالب کے کلام کو زاہدہ خورشید علوی نے راول پنڈی سے منتخب کیا ہے۔

غزل

ہم کو ستم گروں سے بچاتا نہیں کوئی
اور اب تو آسماں سے بھی آتا نہیں کوئی
رُت آنسوؤں کی آنکھ سے ہوتی نہیں جدا
موسم نظر میں پھول کھلاتا نہیں کوئی
گم ہو کے رہ گیا ہوں میں بے درد شور میں
میٹھے سُروں میں گیت سناتا نہیں کوئی
بن بن کے پھر رہے ہیں ہمارے وہ چارہ گر
جن کا ہم اہلِ درد سے ناتا نہیں کوئی
جالب یہ بات طے ہے، بہت آزما چکے
کام اہلِ زر غریب کے آتا نہیں کوئی

محبت میں عجب بے اختیاری ہے اور یہ بے اختیاری بہت اثر رکھتی ہے...... ان گنت خاموش ساعتیں...... دل کے اندر کتنے ہی پردوں میں چھپی رہیں لیکن اس کا انعکاس ہو جاتا ہے...... کہیں کہیں یہ ایک یاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے...... محبت کی ایسی ہی یادوں میں عاطف سعید کھوئے نظر آ رہے ہیں۔ عاطف سعید کی نظم کو بینش رحمان نے راول پنڈی سے منتخب کیا ہے۔

نظم

عجب بے اختیاری ہے
اور اس بے اختیاری میں
مرے جذبے، میرے الفاظ مجھ سے روٹھ جاتے ہیں
میں کچھ بھی کہہ نہیں سکتا، میں کچھ بھی لکھ نہیں سکتا
اداسی اوڑھ لیتا ہوں
اور ان لمحوں کی مٹھی میں
تمہاری یاد کے جگنو کہیں جب جگمگاتے ہیں
یا بیتے وقت کے سائے
مری بے خواب آنکھوں میں کئی دیپک جلاتے ہیں
مجھے محسوس ہوتا ہے
مجھے تم کو بتانا ہے
مجھے تم کو بتانا ہے
کہ رُت بدلے تو پنچھی بھی گھروں کو لوٹ آتے ہیں
سنو جاناں......! چلے آؤ
تمہیں موسم بلاتے ہیں
مرے اندر بہت دن سے
کہ جیسے جنگ جاری ہے
عجب بے اختیاری ہے
میں نہ چاہوں مگر پھر بھی تمہاری سوچ رہتی ہے
ہر اِک موسم کی دستک سے تمہارا عکس بنتا ہے
کبھی بارش تمہارے شبنمی لہجے میں ڈھلتی ہے
کبھی سرما کی یہ راتیں
تمہارے سرد ہاتھوں کا دہکتا لمس لگتی ہیں
کبھی پت جھڑ
تمہارے پاؤں سے روندے ہوئے
پتوں کی آوازیں سناتا ہے
مجھے بے حد ستاتا ہے
کبھی موسم گلابوں کا
تمہاری مسکراہٹ کے سبھی منظر جگاتا ہے
مجھے بے حد ستاتا ہے
کبھی پلکیں تمہاری
دھوپ اوڑھے جسم و جاں پر شام کرتی ہے
کبھی آنکھیں مرے لکھے ہوئے مصرعوں کو
اپنے نام کرتی ہیں
میں خوش ہوں یا اداسی کے کسی موسم سے لپٹا ہوں
کوئی محفل ہو تنہائی میں یا محفل میں تنہا ہوں
یا پھر اپنی لگائی آگ میں بجھ بجھ کے جلتا ہوں
مجھے محسوس ہوتا ہے
مرے اندر بہت دن سے
کہ جیسے جنگ جاری ہے

دلہن کی باتیں

نئی دلہن نے شوہر سے کہا۔ ''آج رات جب میں کھانا میز پر سجاؤں تو کیا کہوں کہ کھانا نکال دیا ہے یا کھانا اتار دیا ہے؟''
شوہر نے جواب دیا۔ ''اگر کھانا کل جیسا ہو تو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ کھانا گرا دیا ہے۔''

از: سیدہ فرزانہ عرفان، حجرہ شاہ مقیم

ریکویسٹ

میں جانتی ہوں!
کہ زندگی ہمیشہ ایک جیسی
نہیں رہتی
وقت بدلتا رہتا ہے
موسم بھی تبدیل ہو جاتے ہیں
ٹہنیوں کے شگوفے سدا
ہرے نہیں رہتے
پھول بھی صبح کھل کر
سرِ شام ہی مرجھا جاتے ہیں
میں جانتی ہوں
ہر چیز میں تبدیلی
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آجاتی ہے
مگر میرے ہم نفس!
سنو تم کبھی نہ بدلنا

شاعرہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

www.paksociety.com

سندیسے

پاکیزہ بہنیں

رحم کر

وہ آج تلک نوازتا ہی جارہا ہے
اپنے لطف وکرم سے مجھے
بس اِک بار کہا تھا میں نے
یاالٰہی رحم کردے مصطفیٰ ﷺ کے واسطے

از: صبا نور، لیہ

نیکی

ایک قافلہ ایک اندھیرے گلی سے گزرا، ان کے پاؤں میں کنکریاں چبھیں، کچھ لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ کسی اور کو بھی چبھ سکتی ہیں، نیکی کی خاطر اٹھا کر جیب میں رکھ لیں کچھ نے زیادہ کچھ نے کم۔ جب اندھیرے سے باہر آکر دیکھا تو وہ ہیرے تھے۔ جن لوگوں نے کم اٹھائے وہ پچھتائے کہ کم کیوں اٹھائے، جن لوگوں نے نہ اٹھائے وہ پچھتائے۔ دنیا کی زندگی کی مثال اندھیرے کی ہے۔ نیکی کنکریوں کی طرح ہے جس نے اس زندگی میں کردی وہ آخرت میں ہیرے جیسی قیمتی ہوگی اور انسان ترسے گا کہ زیادہ نیکی کیوں نہ کی۔

از: عروج ذکی آفندی، کراچی

سعدیہ ہما شیخ کے نام

پیاری سسٹر مجھے آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں پر آپ کا کوئی رابطہ نمبر میرے پاس نہیں ہے۔ ہم ایک ہی شہر سرگودھا سے ہیں اور ایک دوسرے کو نہ جان پائیں یہ کہاں کا انصاف ہے۔ میرا سیل نمبر انجم آپی کے پاس ہے ان سے یاد سے لے لینا، بھولنا نہیں۔

از: جبیں ہاشمی، بھیرہ

ہری مرچیں

☆ایک آدمی روزانہ چینی کا ڈبا کھول کر چینی چیک کرتا پھر بند کردیتا تھا۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ ”تم ہر روز ایسا کیوں کرتے ہو؟“ پہلا آدمی بولا۔ ”مجھے ڈاکٹر نے بولا ہے کہ روز اپنی شوگر چیک کیا کرو۔“

☆ایک آدمی نجومی سے بولا۔ ”بابا میری شادی کیوں نہیں ہورہی؟“

نجومی نے جواب دیا۔ ”کیسے ہوگی کیونکہ تمہاری قسمت میں سکھ ہی سکھ ہے۔“

☆”مجھے شادی پر BMW ملی ہے۔“ ایک سردار نے اپنے دوست سے کہا۔

دوست نے کہا۔ ”لیکن میں تو تمہارے گھر BMW نہیں دیکھی۔“ سردار بولا۔ ”اوئے BMW کا مطلب ہے بہت موٹی بیوی وائف۔“

از پروین افضل شاہین۔ بہاول نگر

اپنی پیاری سہیلیوں کے نام

فصیحہ آصف۔ بہاروں کی ملکہ اے پھولوں

کی رانی تیرا مسکرانا غضب ہوگیا۔ سفید گلاب۔ نذرانہ لو۔

غزالہ جلیل راؤ۔ کانوں میں رس گھولنے والی چنچل شوخ حسینہ کیوں دل ہے میرا چھینا۔ زرد کلیاں تم پر بکھریں۔

سباس گل۔ چاند، ستارے، پھول اور تتلی کھٹی املی اور میٹھا پان اور رات کی رانی قبول ہو۔

فریدہ خانم۔ دیکھو مانے نہیں روٹھی حسینہ نہ جانے کیا بات ہے، پنک گلاب حاضر ہے۔

از: فریدہ فری، لاہور

کھلتی کلیاں

☆یہ پاکستان نہیں، چاند کا ٹکڑا ہے اور چاند پر نہ لائٹ ہوتی ہے نہ پانی، نہ گیس نہ ہوا تو پھر گلے شکوے کیوں۔

☆تیرا نام چاند پر لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر ایک تو میرا ہاتھ نہیں جاتا ہے اور دوسرے یہ خیال مجھے دوپہر کو آتا ہے۔

☆پوسٹ مین نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بچہ باہر آیا منہ میں سگریٹ اور ہاتھ میں بیئر تھی۔

پوسٹ مین۔ ”پاپا ہیں؟“

بچہ۔ ”انیا مینو ویکھ کے وی لگدا اے کہ ابا گھر ہوگا۔“

☆سردار سائیکل پر فقیر کے پاس سے گزرا۔

فقیر۔ ”اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔“

سردار۔ ”چل پیچھے بیٹھ تے نو چوٹے (جھولے) دیواں۔“

مصباح رضا سعید، فیصل آباد

☆☆☆

www.paksociety.com

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆رضوانہ سمیع......کراچی
روز آنے پر نہیں نسبتِ عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے
☆شازیہ خان......کراچی
وقت کی شاخ پر مرجھا گئے لمحات کے پھول
دل میں تازہ ہیں مگر تیری ملاقات کے پھول
☆سمیرا ضیا......حیدرآباد
تو وہ بت ہے کہ تخیل کے صنم خانوں میں
میرے احساس کے آذر نے تراشا ہے تجھے
☆فوزیہ مستقیم......کراچی
موت آگئی نہ ہو میرے ذوقِ امید کو
محرومیوں میں کیف سا پانے لگا ہوں میں
☆آصفہ شکیل......کراچی
شیشے کے گھر بھی اپنی جگہ خوشنما سہی
لیکن جو راحتیں مرے مٹی کے گھر میں ہیں
☆راحت امین......ملیر
امیدوں کا سایہ ہے نہ رستہ ہے نہ منزل
ہم کتنے اکیلے ہیں محبت کے سفر میں
☆مائرہ خان......کراچی
جدائی پر ہی قائم ہے نظامِ زندگانی بھی
بچھڑ جاتا ہے ساحل سے گلے مل مل کے پانی بھی
☆سائرہ امین......کراچی
اس عشق نے ہمیں ہی نہیں معتدل کیا
اس کی بھی خوش مزاجی کے چرچے ہیں ان دنوں

☆کائنات خان......کراچی
وفا کا نام کوئی بھول کر نہیں لیتا
ترے سلوک نے چونکا دیا زمانے کو
☆عالیہ زہرہ......جہلم
عذاب دھوپ کے کیسے ہیں بارشیں کیا ہیں
فصیل جسم گری جب تو ہوش آیا
☆عائزہ جاوید......کراچی
کوئی بتاؤ کہ اِک عمر کا بچھڑا محبوب
اتفاقاً کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں
☆صائمہ چوہدری......پشاور
ریگِ ساحل نہ کریدو کہ بھرا ہے پانی
زخم پر چوٹ لگے گی تو لہو آئے گا
☆یاسمین مغل......حیدرآباد
زبانِ غیر سے ہوتا تو اس کی فکر کیوں کرتے
لگا تھا زخم اپنوں سے ہمیں سینا نہیں آیا
☆فاطمہ خان......راولپنڈی
ہر اِک انسان کے ہمراہ اپنی قسمت ہے
مخالف لاکھ ہو دنیا محبت پھر محبت ہے

☆شمشاد جاوید......حیدرآباد
نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں ناصر
ہر اِک سانس میرا اب سفر میں رہتا ہے
☆ساجدہ یاسمین......حیدرآباد
باہر تو سجا رکھے ہیں خوش رنگ آئینے
اندر سے ان کا شیشہ مگر ٹوٹتا رہا
☆ماہین حنیف......کراچی
موسم کے ساتھ ساتھ بدلتے ہیں اس کے عہد
اس پہ یہ ضد کہ اس پہ کرو اعتبار بھی
☆شاہدہ خان......کراچی
اپنے دامن کو ذرا آپ بچا کر رکھنا
سرد آہوں سے بھی ہم آگ لگا دیتے ہیں
☆آمنہ خان، حیدرآباد
ہنسی کو اپنی سن کے اِک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا
☆رخشی......حیدرآباد
صندل سے مہکتی ہوئی پُر کیف ہوا کا
جھونکا کوئی ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
☆کاشفہ راحیل......کراچی
یادش بخیر آتی ہیں کیوں ہچکیاں مجھے
شاید کسی کو بھولے سے یاد آگیا ہوں میں
☆میمونہ رشید......کراچی
میں نے مانا کہ تقدیر کا لکھا ہے اٹل
میرا ایماں ہے دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
اس کو مانگوں گی خدا سے میں جنوں کی حد تک
عشق جب حد سے گزرتا ہے امر ہوتا ہے
☆آسیہ......سیالکوٹ
رات اس خوف سے آنکھوں میں گزر جاتی ہے
کوئی اس شہر کے جگنو نہ چرالے جائے
☆فرحانہ خان......اسلام آباد
موجیں ہوں حجر سکون تو گہرائیوں میں جھانک
طوفاں بدل کے آتے ہیں صورت کبھی کبھی
☆راضیہ جمیل......کراچی
پہنچا جو تیرے در پہ تو محسوس یہ ہوا
لمبی سی اِک قطار میں جیسے کھڑا ہوں میں
☆ماریہ خان......کراچی
کھاتے نہیں فریب کبھی دل شناس لوگ
رہتے ہیں آئینوں میں مقابل شناس لوگ
کتنا نظر فریب تھا موجوں کا سلسلہ
ساحل کو ڈھونڈتے رہے ساحل شناس لوگ
☆نورین مجید......حیدرآباد
وہ لاکھ دشمنِ جاں ہو مگر خدا نہ کرے
کہ اس کا حال بھی ہو ہو بہو ہماری طرح
☆فائزہ ضیا......کراچی
نہ جانے کون سی منزل پہ جا کے رک جائیں
نظر کے قافلے، دیوار و در سے گزرے ہیں
☆زرینہ فدا حسین......حیدرآباد
کیسے نامانوس لفظوں کی کہانی تھا وہ شخص
اس کو کتنی مشکلوں سے ترجمہ میں نے کیا
☆شائلہ عزیز......حیدرآباد
میں نے کوئی بیان صفائی نہیں دیا
بس چپ رہا تو خود ہی وضاحت سی ہو گئی
☆زاہدہ حسین......حیدرآباد
بے کیف سہی بے رنگ سہی اِک لہر تو اب بھی آتی ہے
دل لاکھ شکستہ ہو پھر بھی یادوں کا بھلانا مشکل ہے
☆آفرین بیگ......کراچی
جنہیں محسوس انسانوں کے رنج و غم نہیں ہوتے
وہ انساں بھی تو ہرگز پتھروں سے کم نہیں ہوتے
☆مائرہ فیصل......کراچی
کس کا خیال آئینہ انتظار تھا
ہر برگ گل کے پردے میں دل بے قرار تھا

☆☆☆

www.paksociety.com

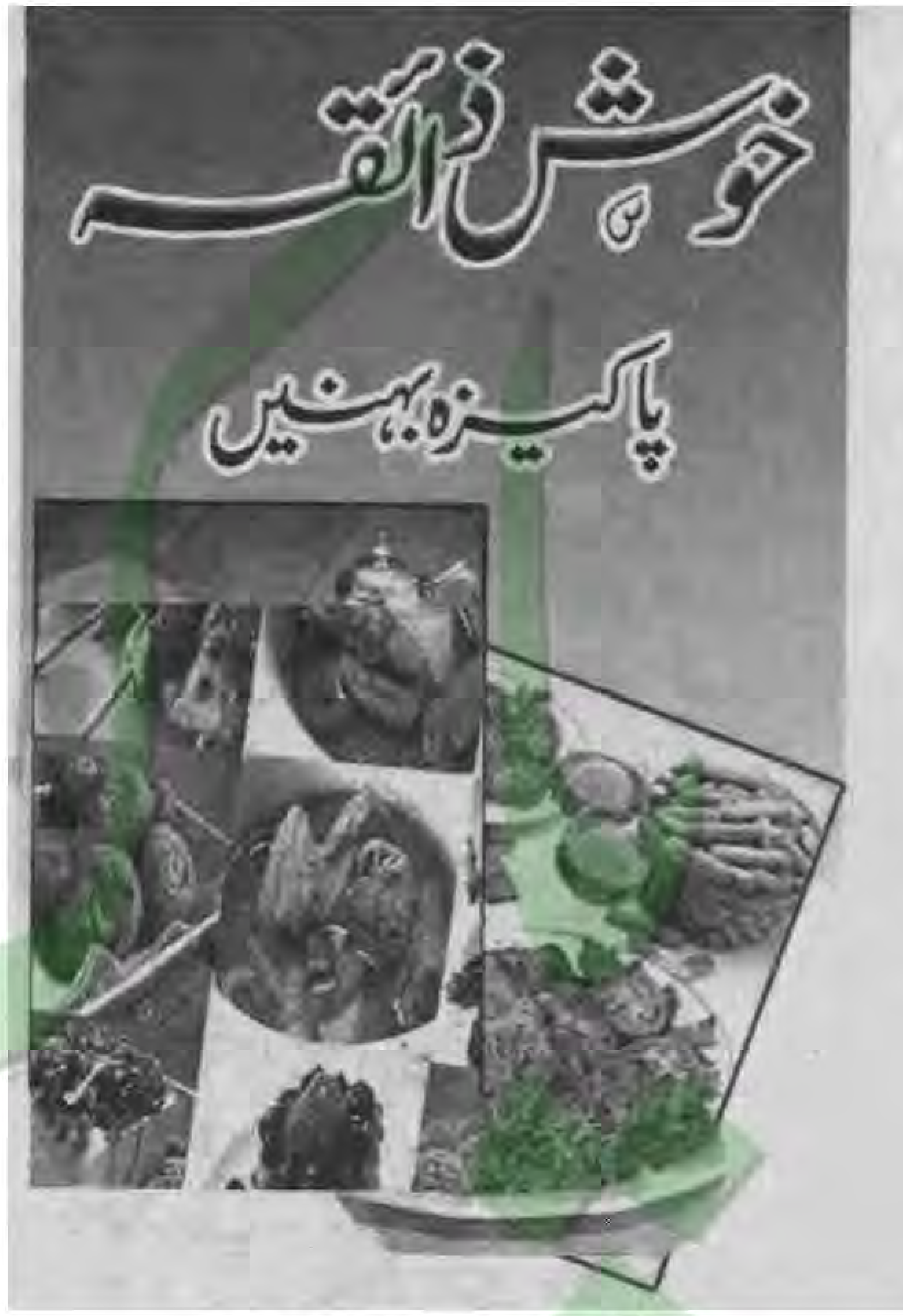

گلاوٹ کا قیمہ

اشیا﴾ قیمہ گائے کا، ایک کلو۔ پیاز، چار عدد درمیانی۔ لہسن۔ ادرک۔ ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ کچا پپیتا۔ پسا ہوا، چھ چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ لال مرچ پسی ہوئی، تین یا چار چمچ۔ پسا گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ بھنا پسا دھنیا، دو کھانے کے چمچ۔ تیل، دو پیالی۔ بیسن، چار کھانے کے چمچ۔

ترکیب﴾ قیمہ دھو کر کچھ دیر چھلنی میں رکھ دیں تاکہ پانی نکل جائے پھر بیسن، پیاز کے علاوہ تمام مسالا قیمے میں ملا کر تقریباً دو گھنٹے رکھ دیں۔ اتنے میں بیسن بھون لیں۔ تیل میں پیاز لال کر کے قیمہ ڈال کر بھونیں۔ جب قیمے کا پانی خشک ہونے لگے بالکل آخر میں بیسن ڈالیں تھوڑا بھون کر اتار لیں۔ پراٹھوں یا نان کے ساتھ پیش کریں۔

نائلہ خان، کراچی

سوجی کا حلوا

اشیا﴾ سوجی، ایک پاؤ۔ چینی، آدھا سیر۔ گھی، ایک پاؤ۔ سبز الائچی، تین یا چار عدد۔ کیوڑہ تھوڑا سا۔ بادام پستہ، حسبِ ضرورت۔

ترکیب﴾ ایک پتیلی میں گھی ڈال کر اس میں الائچی کڑکڑائیں پھر اس میں سوجی ڈال کر بھونیں۔ دوسری پتیلی میں آدھ سیر چینی اور تین پاؤ پانی ڈال کر چاشنی بنالیں۔ سوجی ہلکی آنچ پر بھن جائے تو اس میں چاشنی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ حلوا جب گاڑھا ہو جائے تو کیوڑہ ڈال کر بادام اور پستہ بھی چھڑک دیں۔ اس میں آپ تھوڑا سا زرد رنگ بھی ملا سکتی ہیں۔ مزے دار حلوا تیار ہے۔

پوریاں

اشیا﴾ سفید آٹا، ڈیڑھ کلو۔ میدہ، ڈیڑھ چمچ۔ اصلی گھی یا آئل، آدھا کپ۔ نمک، ایک چائے کا چمچ۔ کٹی اجوائن، آدھا چائے کا چمچ۔ کھانے کا سوڈا، چٹکی بھر۔ تیل ڈیپ فرائی کے لیے۔ پانی، حسبِ ضرورت۔

ترکیب﴾ سب سے پہلے خشک برتن میں سفید آٹا اور میدہ ملا کر چھان لیں۔ اس میں نمک، اجوائن، گھی یا تیل ڈال کر آہستہ آہستہ پانی ڈالیں اور آٹے کو گوندھ لیں۔ ذرا سخت آٹا گوندھ کر ڈیڑھ گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں ڈھک کر۔ مناسب سائز کے پیڑے بنالیں۔ ایک اسٹیل کے تھال میں تھوڑا گھی یا تیل لگا کر انگلیوں سے کنارے دبا دیں۔ بیلن سے باریک کرلیں اور گرم تیل میں ڈال کر چھننے سے اس کے اوپر آئل ڈالیں اور فوراً نکال لیں اگر گولڈن بنانی ہوں تو تھوڑی دیر سے نکالیں۔

آلو چھولے کی ترکاری

اشیا﴾ آلو، آدھا کلو۔ ابلے ہوئے چھولے، دو کپ۔ کلونجی، زیرہ، ایک ایک چائے کا چمچ۔ نمک ایک کھانے کا چمچ۔ ہلدی، آدھا چائے کا چمچ۔ ثابت گول لال مرچ، پانچ عدد۔ پیاز، ایک درمیانی۔ کٹی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ تیل، پانی حسبِ ضرورت۔

ترکیب﴾ آلو دھو کر چوکور کاٹ لیں۔ ایک پیالی چھولے گرینڈر میں پیس لیں۔ اب پتیلی میں پیاز لال کریں پھر ہلدی، کلونجی، زیرہ، ثابت لال مرچ ڈال کر چند سیکنڈ بھونیں۔ آلو، پسے ہوئے چھولے، ثابت چھولے، نمک، مرچ سب ڈال کر پانی ڈال لیں۔ خوب گل جانے پر اتار لیں۔ پوری کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

عائشہ اقبال، کراچی

گائے کے قیمے کے بھنے ہوئے کوفتے

اشیا﴾ گائے کا قیمہ (باریک پیس لیں) تین پاؤ۔ لیموں، ڈیڑھ عدد (رس نکال لیں۔ کم از کم تین کھانے کے چمچ) پانی، ایک کھانے کا چمچ۔ تازہ ڈبل روٹی کا چورا، ایک تہائی پیالی۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ مرچ، حسبِ ذائقہ۔ ٹماٹو کیچپ، ایک تہائی پیالی۔ پسی ہوئی رائی، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ لونگ، تین (باریک پیس لیں) سرکہ، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ لیموں، ایک عدد (گول شکل میں کاٹ لیں)

ترکیب﴾ اوون 450 فارن ہائیٹ پر گرم کریں۔ پسے ہوئے قیمے میں لیموں کا عرق، دو کھانے کے چمچ، پانی، ڈبل روٹی کا چورا، نمک اور سیاہ مرچ ملا دیں اور چھوٹے چھوٹے گولے یعنی کوفتے بنالیں اور بیکنگ ڈش میں رکھ دیں۔ انہیں پانچ منٹ تک پکائیں اور اس دوران میں کیچپ میں رائی، لونگ، سرکہ، ایک چمچ لیموں کا عرق اور ایک چوتھائی چمچ نمک اور سیاہ مرچ ملا لیں۔ اوون میں سے کوفتے نکال کر ان پر کیچپ کا آمیزہ ڈال دیں اور ہر کوفتے پر لیموں کا ٹکڑا رکھ کر دوبارہ اتنی دیر پکائیں کہ یہ بادامی رنگ کا ہو جائے۔ اوون میں سے نکال کر گرم گرم کھانے کے لیے پیش کریں۔ چھ افراد کے لیے کافی ہوں گے۔

مریم زہرہ......راولپنڈی

مٹن کنا

اشیا﴾ مٹن، ایک کلو۔ ادرک، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن کا پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ پیاز، دو عدد۔ ٹماٹر، تین عدد۔ دھنیا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ لال مرچ (پسی ہوئی) ایک چائے کا چمچ۔ آئل، آئل ایک کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ہلدی، ڈیڑھ چائے کا چمچ۔ ہری مرچ، دو یا تین عدد باریک کٹی ہوئی۔ سیاہ مرچ، ایک چائے کا چمچ (پسی ہوئی) آٹا، ڈیڑھ کپ۔

ترکیب﴾ مٹی کی ہنڈیا میں ایک کلو ران کا گوشت ڈال کر پھر اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ اور پیاز موٹی موٹی کاٹ کر ڈال دیں پھر ساتھ ہی کٹے ہوئے تین عدد ٹماٹر، کارن آئل، لال مرچ، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر اور نمک حسبِ ذائقہ ڈال کر اس میں تین یا چار کپ پانی ڈال دیں پھر جب گل جائے اور تمام مسالے یک جان ہو جائیں تو آدھا کپ آٹے کو ایک کپ پانی میں گھول کر اس سے پکے ہوئے گوشت میں ڈال دیں اور ذرا ہلکی آنچ پر پندرہ منٹ کے لیے ڈھانپ کر رکھ دیں اور تیار ہونے پر کالی مرچ، گرم مسالا اور دھنیا یا پودینہ چھڑک کر گرم گرم تندوری روٹیوں کے ہمراہ سرو کریں۔

فرزانہ مجید......حیدر آباد

www.paksociety.com

روحانی مشورے

ادارہ

رجب کے روزے

پیارے قارئین کرام: رجب کے روزے رکھنے کی بہت فضیلت ہے، اس ماہ آپ چند ہی سہی مگر روزے رکھنے کی سعادت ضرور حاصل کیجیے گا۔ اس ماہ کثرت سے درود شریف پڑھیں۔ استغفار کریں اور توبہ کے نفل پڑھیں۔ کوشش کریں کہ...... اس میں آپ صدقات زیادہ سے زیادہ دیں۔

شبِ برات

شعبان المعظم کی 15 ویں شب کو شبِ برات کہا جاتا ہے۔ برات کا مطلب ہے نجات کی رات، اس رات کی خصوصیت یہ ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اپنی خصوصی رحمت سے نوازتا ہے۔ اس رات ہرامر کا فیصلہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ مخلوق میں رزق تقسیم فرماتا ہے۔ پورے سال میں ان سے سرزد ہونے والے اعمال اور پیش آنے والے واقعات سے اپنے فرشتوں کو باخبر کرتا ہے۔ شیخ ابونصر نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا! عائشہ یہ کون سی رات ہے؟ میں نے عرض کیا! اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بخوبی واقف ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا! یہ نصف شعبان کی رات ہے۔ اس رات میں دنیا کے اعمال، بندوں کے اعمال اوپر اٹھائے جاتے ہیں۔ ان کی پیشی بارگاہ رب العزت میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس رات بنی کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد کے برابر لوگوں کو دوزخ سے رہا کرتا ہے...... تو کیا آج تم مجھے رات کی عبادت کی آزادی دیتی ہو؟

میں نے عرض کیا ضرور...... پھر آپ ﷺ نے نماز پڑھی، قیام میں تخفیف کی، سورۂ فاتحہ اور ایک چھوٹی سورہ پڑھی پھر آدھی رات تک آپ سجدے میں رہے۔ پھر کھڑے ہو کر دوسری رکعت پڑھی اور پہلی رکعت کی طرح اس میں قرات فرمائی (چھوٹی سورہ پڑھی) پھر آپ سجدے میں چلے گئے۔ یہ سجدہ فجر تک رہا۔ میں دیکھتی رہی۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی روحِ مبارک قبض فرمالی ہے پھر جب میرا انتظار طویل ہوا۔ (بہت دیر ہوگئی) تو میں آپ کے قریب پہنچی اور میں نے حضور ﷺ کے تلووں کو چھوا تو حضور ﷺ نے حرکت فرمائی۔ میں نے خود سنا کہ حضور ﷺ سجدے کی حالت میں یہ الفاظ ادا فرمارہے تھے۔

''یاالٰہی میں تیرے عذاب سے تیری عفو اور بخشش کی پناہ میں آتا ہوں، تیرے قہر سے تیری رضا کی پناہ میں آتا ہوں۔ تجھ سے ہی پناہ چاہتا ہوں۔ تیری ذات بزرگ و برتر ہے، میں تیری شایانِ شان ثنا بیان نہیں کرسکتا...... تو ہی آپ اپنی ثنا کرسکتا ہے اور کوئی نہیں۔''

صبح کو میں نے عرض کیا کہ آپ سجدے میں ایسے کلمات ادا فرما رہے تھے کہ ایسے کلمات میں نے آپ کو کہتے کبھی نہیں سنا۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا...... کیا تم نے یاد کرلیے ہیں؟

میں نے عرض کی۔ جی ہاں......

آپ ﷺ نے فرمایا خود بھی یاد کرلو...... اور دوسروں کو بھی سکھاؤ کیونکہ جبرئیلؑ نے مجھے سجدے میں ان کلمات کو ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔

نوافلِ شبِ برات

شبِ برات میں جو نماز پڑھی جاتی ہے اس کا نام صلوۃ الخیر ہے۔ اس میں سو رکعتیں ہیں۔ اس میں ایک بار سورہ فاتحہ: وردس بار سورۂ اخلاص یعنی قل ھو اللہ احد ہر رکعت میں پڑھی جائے گی۔ یوں سو رکعتوں میں سورۂ اخلاص ایک ہزار مرتبہ پڑھی جائے گی۔ سلف صالحین یہ نماز باجماعت پڑھا کرتے تھے۔ اس نماز کی بڑی فضیلت آئی ہے اور اس کا ثواب بھی بہت کثیر ہے۔ حسن بصری نے فرمایا کہ مجھ سے سرورِ کائنات ﷺ کے تیس صحابہ نے بیان کیا اس رات کو جو شخص یہ نماز پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف ستر بار دیکھتا ہے اور ہر بار کے دیکھنے میں اس کی ستر حاجتیں پوری کرتا ہے۔ جن میں سب سے ادنیٰ حاجت اس کے گناہوں کی مغفرت ہے۔ ہمیں یہ نماز ان قیمتی چودہ راتوں میں بھی پڑھنی چاہیے جن میں عبادت کرنا اور شب بیداری کرنا مستحب ہے۔ ان راتوں میں ماہ رجب کی راتیں بھی شامل ہیں ـــ یہ نماز پڑھنے والے کو عزت، فضیلت اور ثواب حاصل ہوتا ہے۔

قارئینِ کرام! شعبان کی پندرھویں شب کو ایک مرتبہ دعائے نصف شعبان المعظم بھی ضرور پڑھیں۔ (مجموعہ وظائف میں مل جائے گی)

نوٹ: ان قیمتی اور برکتوں والی راتوں میں عبادت کریں اور دعا مانگیں، اپنے لیے اپنے بچوں کے لیے، اپنے ملک، عالم اسلام کے لیے اور دونوں جہان میں خیر کے لیے۔ اپنی دعاؤں میں ہمیں بھی شامل کرلیں۔

ایک حرف رہ گیا

نوٹ: گزشتہ ماہ روحانی مشورے کے کالم میں سات سلام...... اردو تلفظ کے ساتھ لکھے گئے تھے۔ اس میں ساتویں سلام کا آخری لفظ (ر) شائع ہونے سے رہ گیا۔ آپ اس کو اس طرح پڑھیں۔ (ساتواں سلام) س لامن...... ہ ی...... حت تا مط ل عل فج ر۔

☆☆☆

دعا کو مقبول بنانے والی دعا

☆حضرت یونسؑ کی یہ دعا ہے اس کو ہمیشہ پڑھنا چاہیے۔ آنحضرت ﷺ وسلم نے فرمایا جو اس دعا کو پڑھے گا اس کی دعا قبول ہوگی۔ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین ٥

حاجات کو پورا کرنے والی دعا

حجاج بن یوسف نے ایک شخص کی گرفتاری کرنے کے لیے سپاہی بھیجے اور یہ قسم کھائی کہ اگر وہ ہاتھ آگیا تو اسے قتل کردوں گا۔ وہ گرفتار ہو کر آیا۔ سامنے لایا گیا تو اس نے کچھ کلمات پڑھے۔ دفعتاً حجاج بن یوسف نے اسے آزاد کردیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تو نے کیا پڑھا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ دعا پڑھی تھی۔

یاعزیزُ یا حمیدُ یا ذالعرشِ المجیدِ اصرف عنّی شرّ کلِّ جبّارٍ عنیدٍ ٥

اللہ تعالیٰ کے محبوب کلمے

☆حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دو کلمے ایسے ہیں جو زبان میں ہلکے ہیں ترازو میں بہت وزنی ہیں اور اللہ تعالیٰ کو (درج ذیل کلمات) بہت پیارے ہیں۔ (فضائل اعمال)

سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

شوابے ہومیو کلینک

from Nature for Health

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

ہیروئن کا نشہ

میرا خالہ زاد بھائی جو تقریباً ۸ سال سے منشیات کا مریض بن چکا ہے اور ہیروئن وغیرہ بھی پیتا ہے۔کافی علاج کروایا لیکن وقتی طور پر فرق پڑتا ہے پھر وہ دوبارہ نشہ شروع کردیتا ہے۔آپ برائے مہربانی میرے اس مسئلے کو ضرور ضرور حل کریں۔شکریہ۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اگست 2012

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ....

پتا: ....

....

....

محمد اعظم گلبرگ فیصل آباد

جواب: آپ کے خالہ زاد بھائی کے متعلق بورڈ کا مشورہ یہ ہے کہ انہیں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Avena Sativa Q دن میں تین مرتبہ پندرہ پندرہ قطرے پلائیں پانی میں ڈال کر اور اس کے ساتھ Mag.Phos 12x کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ پانی میں ڈال کر دیں ایک مہینے تک۔

سانس کی تکالیف

میری چھوٹی بہن جس کی عمر ۲۲ سال ہے پچھلے کئی سالوں سے سانس کی بیماری میں مبتلا ہے۔کئی ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں لیکن اسے وقتی افاقہ کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔کیونکہ جیسے ہی موسم تبدیل ہوتا ہے تو سانس کی تکلیف شروع ہوجاتی ہے جس سے اس کو کافی پریشانی ہوتی ہے۔ ہمارے خاندان میں کسی کو اس قسم کی بیماری نہیں ہے آپ سے التماس ہے کہ برائے مہربانی ایسی ادویات تجویز کریں کہ میری بہن کو اس مرض سے نجات مل جائے۔

(دلشاد احمد نارتھ کراچی)

جواب: پریشان نہ ہوں اچھی امید رکھیں انشاء اللہ جلد ٹھیک ہوجائے گی۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Dulcamara 200 کے 5,5 قطرے دن میں تین بار دیں اور صبح ۱۱ بجے Nat.Sulph 6x کے 5 قطرے استعمال کرائیں۔دورے کی حالت میں Arsenic Alb 200 کی ایک خوراک دیا کریں۔ مہینے بعد اپنے احوال سے آگاہ کریں۔

شب کوری

آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے مجھے رات کو اندھیرے میں بالکل نظر نہیں آتا۔اگر میں کسی چیز کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری آنکھیں درد کرنے لگتی ہیں اور نتیجے میں مجھے نقطے جسے عام زبان میں تارے کہتے ہیں نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے سڑک کراس کرنے اور ڈرائیونگ کرنے میں بھی پرابلم ہوتی ہے خاص کر جہاں گاڑیوں کا رش یا لوگوں کا ہجوم زیادہ ہو۔کیونکہ میں ایک وقت میں اپنے آگے اور پیچھے نظر نہیں رکھ سکتا۔جس کے نتیجے میں میرے چھوٹے موٹے کئی حادثے بھی ہوچکے ہیں۔امید ہے آپ ان تمام علامات کو دیکھتے ہوئے اس بیماری کو ختم کرنے کے لیے جو بھی دوا تجویز کریں گے وہ میرے حق میں بہتر ہوگی اس کے علاوہ ایک آدھ گھنٹا مطالعہ کے بعد میری آنکھیں درد کرنے لگتی ہیں اور سر بھاری ہوجاتا ہے۔

اکثر میں جب دوستوں کے علاوہ کاروباری لوگوں یا کسی اور نامعلوم افراد سے بات کروں تو مجھے چہرے پر بہت زیادہ پسینہ آتا ہے ”گرمیوں یا سردیوں کی قید نہیں“ حالانکہ میں کنفیوز بالکل نہیں ہوتا اور انہیں پورے اعتماد سے بات کا جواب دیتا ہوں۔

جواب: آپ نے جو علامات لکھی ہیں ان کے مطابق ہمارا مشورہ ہے کہ CarboVeg.200 کی ایک خوراک ہر ہفتے لے لیا کریں اور اس کے ساتھ Calc.Fluor 6x اور Kali Phos 6x کے 5، 5 قطرے دن میں چار مرتبہ استعمال کریں۔ایک مہینے کے استعمال کے بعد حالات سے مطلع فرمائیں اور کسی ماہر امراض چشم سے بھی رابطہ کریں اور اپنی آنکھیں ٹیسٹ کروائیں کیونکہ ہمیں آپ کی آنکھیں کمزور بھی لگتی ہیں۔

ڈپریشن کے بعد

چار سال قبل مجھے ڈپریشن کی شکایت ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے بڑے بھائی صاحب جن کی عمر تقریباً ۴۲ سال تھی اچانک ہی ہارٹ اٹیک کی وجہ سے فوت ہوگئے تھے۔ان کی حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ مجھے بھی ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے۔ مجھے اسپتال میں داخل کروادیا گیا لیکن میں دل کا مریض نہ ہونے کے باوجود ڈپریشن کا شکار ہوگیا۔تقریباً چار سال کے ... بڑے علاج کے بعد میں ڈپریشن سے آزاد ہوا۔ جب تک میں ڈپریشن کی دوائیاں کھاتا رہا مجھے کسی بھی دوسری جسمانی تکلیف کا احساس نہ ہوا لیکن یہ ساری دوائیاں بند کرنے کے بعد مجھے سارے جسم میں تکلیفیں شروع ہوگئی ہیں خاص طور بائیں کندھے کے نیچے اور بائیں طرف پسلیوں میں اور دمچی کی ہڈی میں زبردست تکلیف شروع ہوگئی جو تا حال جاری ہے اور میں بڑی شدید تکلیف میں مبتلا ہوں۔

اس کے علاوہ میرا بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا ہے اور عام طور پر ۱۵۰/۱۰۰ ہوجاتا ہے اس کے علاوہ مجھے بیٹھے بیٹھے ایک دم پسینہ آجاتا ہے اور دونوں بازو بالکل ٹھنڈے ہوجاتے ہیں۔ سر میں چکر آنا شروع نقاہت اتنی ہوجاتی ہے اپنی جگہ سے ہلنے کو دل نہیں

چاہتا۔ یہ کیفیت تقریباً ۱۵/۲۰ منٹ رہتی ہے پھر کچھ افاقہ ہوجاتا ہے، چیک کرانے پر اس وقت بلڈ پریشر ۱۵۰/۱۰۰ ہوتا ہے۔ انگریزی دوائیاں استعمال کرتا ہوں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوتا۔ طبیعت بے چین رہتی ہے خوف بھی آتا ہے گھبراہٹ بھی ہوتی ہے۔

یہاں پر ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کو دکھایا تھا انہوں نے مندرجہ ذیل دوائیاں وقتاً فوقتاً کھلائی تھیں لیکن افاقہ نہیں ہوا۔

(۱) آرسنک ۲۰۰ (۲) کاربوویج ٹیبلس ۲۰۰ (۳) نیٹرم میور (۴) دمچی کے درد کے لیے سلیشیا ۱۲ دی تھی لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا اور بھی کچھ دوائیں تھیں جن کے نام مجھے یاد نہیں بہر حال جسم میں بہت درد ہوتا ہے جیسا کہ بخار کی کیفیت میں جسم میں درد ہوتا ہے اور خصوصاً بائیں طرف زیادہ درد ہوتا ہے اور دمچی میں زیادہ درد ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ پریشانی یعنی نفسیاتی طور پر ہے۔ میری عمر تقریباً ۴۳ سال ہے سوچیں بہت آتی ہیں اور غالباً ایک ہی جگہ پر بیٹھے رہنے سے تکلیف میں اضافہ ہوتا ہے اور جب گھومنا پھرنا شروع کردوں یا دوستوں کے پاس چلا جاؤں تو قدرے ٹھیک ہوجاتی ہے (یہ میرا خیال ہے یقین نہیں) گھر میں بھی اور بچوں کے درمیان بھی طبیعت ست رہتی ہے کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا ہر وقت یہی سوچتا رہتا ہوں کہ میں بیمار ہوں۔ برائے مہربانی میرے لیے کوئی نسخہ تجویز کردیں۔

راولپنڈی
نام شائع نہ کریں

جواب: آپ کی تکلیف کی سب سے بڑی وجہ آپ کا کام نہ کرنا ہے حالانکہ آپ کی جو عمر ہے اس میں آپ کو کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ صبح سویرے اٹھیے نماز پڑھیے، ورزش کیجیے، ناشتے میں پھل اور دودھ کا استعمال ضرور کریں۔ گھر کے کاموں میں دلچسپی لیں، باغبانی کریں اس کے باوجود بھی وقت بچ جائے تو دیگر سماجی وفلاحی کاموں میں اپنا وقت صرف کریں۔ بچوں کو اور ایسے لوگوں کو جو قرآن مجید نہ پڑھے ہوں ان کو قرآن کی تعلیم دیں۔ ان کاموں سے نہ صرف یہ کہ دوسروں کا فائدہ ہوگا بلکہ آپ کا بھی زبردست دنیاوی واخروی فائدہ ہوگا۔

ان مشوروں کے ساتھ آپ مندرجہ ذیل ادویات بھی استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شواب جرمنی کی روزانہ رات کو Ignatia 200 کی ایک خوراک ایک ماہ تک، Laikan ایک گولی دن میں ۳ مرتبہ اور Valexan کی ایک گولی دن میں ۳ مرتبہ استعمال کریں، ان دواؤں کے استعمال کے ایک ماہ بعد اپنی کیفیات سے آگاہ کریں۔

گردے کی بیماریاں

گردے اور مثانہ

انسانی جسم میں دو گردے پائے جاتے ہیں۔ گردوں کا کام خون سے گندے مادوں کا اخراج ہے۔ ایک نالی تازہ خون لے کر گردے میں داخل ہوتی ہے اور ایک خون کی واپسی کے ساتھ دورانِ خون کے نظام کے ساتھ وابستہ کرتی ہے۔ گردے میں ایک نالی پیشاب کو جمع کرکے مثانے کی طرف لے جاتی ہے۔ گردے، ریڑھ کی ہڈی کے پاس یعنی پچھلی طرف ہوتے ہیں۔ ایک گردہ دائیں جانب ہوتا ہے اور دوسرا بائیں طرف۔ مثانہ پیٹ کے نچلے حصے میں پایا جاتا ہے۔ اور گردوں سے دو نالیاں مثانے میں کھلتی ہیں۔ مثانے میں پیشاب آکر جمع ہوتا رہتا ہے اور حسبِ خواہش باہر خارج کیا جاسکتا ہے۔ پیشاب کے اندر مختلف نمکیات ہوتے ہیں جن میں سوڈیم، فاسفیٹ اگزیلیٹ، یوریا اور امونیا گیس قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بعض خلیات اور خون کے سفید ذرات بھی بعض اوقات خارج ہوتے ہیں۔

گردوں میں مختلف بیماریاں ہوسکتی ہیں جن میں گردوں کا شدید اور پرانا ورم، گردوں کی ٹی بی، گردوں کی رسولی اور پتھری قابلِ ذکر ہیں۔ گردوں کے مرض میں ورم بھی ہوسکتا ہے۔ بعض اوقات گردوں میں پتھریاں بن جاتی ہیں جن سے گردوں میں شدید درد ہوتا ہے اس طرح مثانے کے اندر بھی پتھری بن سکتی ہے اکثر مثانے میں سوزش ہوجانے کے ساتھ پیشاب بار بار جلن سے آنے لگتا ہے۔ مرد بوڑھوں میں مثانے کے منہ پر پراسٹیٹ غدود کے بڑھ جانے سے پیشاب بند ہوجاتا ہے تو کیتھیٹر کے ذریعے نکالنا پڑتا ہے اور بعض اوقات آپریشن کروانا پڑتا ہے پراسٹیٹ غدود کا۔ بوڑھوں میں پراسٹیٹ گلینڈ کے بڑھ جانے سے پیشاب اکثر رکنے لگتا ہے اور گردوں پر پیشاب کا دباؤ بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے گردے بعض اوقات اپنا کام بند کردیتے ہیں یعنی گردے فیل ہوجاتے ہیں۔ اس بیماری میں پیشاب بننا بند ہوجاتا ہے اور خون میں گندے مادے خاص کر یوریا جمع ہوکر مختلف علامات پیدا کردیتا ہے، اس بیماری کو یوریمیا کہتے ہیں۔ اب مشہور بیماریوں کا الگ الگ بیان کیا جارہا ہے۔

حاد سوزشِ گردہ

شدید سوزشِ گردہ عام طور پر گلنے پکنے یا برونکائی ٹس کے بعد سردی لگ جانے کے باعث ہوسکتی ہے۔ بعض اوقات ٹائیفائڈ بخار یا نمونیا کے بعد یا کسی اور بیماری کے بعد بھی ہوتی دیکھی گئی ہے۔ یہ ایک خطرناک بیماری شمار کی گئی ہے کیونکہ اس بیماری میں بلڈ پریشر زیادہ ہوجاتا ہے، تمام جسم خاص طور پر چہرہ متورم ہوجاتا ہے، یہ بیماری عام طور پر پانچ سے چھ ہفتے رہتی ہے اس کے بعد یا تو بالکل ٹھیک ہوجاتی ہے یا پھر مزمن صورت اختیار کرلیتی ہے جس میں

SCHWABE

گردے سوج کر موٹے ہوجاتے ہیں اور چہرے اور سارے جسم کا ورم بہت بڑھ جاتا ہے اس کے ساتھ ہی خون کی کمی بھی واقع ہوجاتی ہے۔ شدید ورم کی صورت میں گردوں کے اندر کوئی جراثیم نہیں پائے جاتے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بیماری جراثیمی زہر کے ایک قسم کے ردِعمل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ جب بیماری شروع ہوتی ہے تو پیشاب کی مقدار کم ہوجاتی ہے بعض اوقات سارے دن میں دس سے بیس اونس سے زیادہ پیشاب خارج نہیں ہوتا۔ پیشاب میں البیومن وغیرہ بھی خارج ہوتے ہیں۔ مریض کا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے اور آنکھوں کے گرد ورم زیادہ نظر آتا ہے جو کہ صبح سویرے زیادہ دیکھا جاسکتا ہے۔ کم از کم تین چار دن تک معمولی بخار رہتا ہے اور پیشاب کی کمی کی وجہ سے بعض اوقات خون میں یوریا کی مقدار زیادہ ہوجاتی ہے جو کہ ۱۰۰ ملی گرام تک ہوسکتی ہے ایسی حالت میں مریض کو الٹیاں بھی آنے لگتی ہیں اور غنودگی بھی طاری رہنے لگتی ہے۔

مزمن سوزشِ گردہ

سوزشِ گردہ مزمن عام طور پر شدید سوزشِ گردہ کے بعد ہوجاتی ہے اگر مریض چھ سے آٹھ گھنٹے تک ٹھیک نہ ہو تو گردہ متورم ہوکر بڑا ہوجاتا ہے۔ پیشاب میں البیومن کی مقدار بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ بلڈ پریشر بھی زیادہ ہوجاتا ہے سارا جسم خاص کر چہرہ بہت زیادہ متورم ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی پیشاب میں خون بھی آسکتا ہے لیکن پیشاب میں کاسٹ بہت آتے ہیں۔ خون میں ہیموگلوبین کی بہت کمی ہوجاتی ہے۔ پیشاب کی مقدار بدستور کم رہتی ہے۔ عام طور پر ڈاکٹروں کے پاس علاج کروانے مریض اس حالت میں ہی آتے ہیں۔ بلڈ یوریا کا لیول بھی اس حالت

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or

send message at

0336-5557121

میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پیشاب میں یوریٹ بھی کافی مقدار میں خارج ہوتے ہیں۔ پیشاب کا وزن خاص اسی حالت میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔

یوریمیا یعنی سمیت بول

اکیوٹ یوریمیا میں تشنج کے دورے پڑنے لگتے ہیں، مریض بے ہوش یا مدہوش ہوجاتا ہے اور سانس پھولنے کے دورے بھی پڑسکتے ہیں۔ مریض اپنے گردوپیش سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ آخری حالتوں میں دل کی حرکت بے قاعدہ ہوجاتی ہے۔ پیشاب کے اخراج میں شدید کمی آجاتی ہے اور البیومن کافی موجود ہوتی ہے۔ موت عموماً حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوتی ہے۔

گردے کی پتھری

گردے میں پتھریاں عموماً کیلشیم اگزیلیٹ اور یورک ایسڈ وغیرہ سے بنتی ہیں۔ پیشاب میں اگر تیزابیت بہت زیادہ ہوتو کنکری اور ریت بننے میں مدد ملتی ہے اگر گردے میں انفیکشن کی وجہ سے سوزش ہو، پیشاب کھاری ہوتو فاسفیٹ کی پتھری بھی بن سکتی ہے۔ پیشاب کا زیادہ گاڑھا ہونا بھی کنکریاں اور ریت بنانے میں مدد دیتا ہے اگر غذا غیر متوازن ہوتو پتھریاں زیادہ بن سکتی ہیں یعنی غذا میں وٹامن کم ہوں تو پتھریاں زیادہ بنتی ہیں۔ گردوں کی سوزش بھی پتھریاں بنا سکتی ہے۔ کنکریاں بعض اوقات گردوں کی نالی کو بند کر کے گردوں کو خراب کرسکتی ہیں۔ پیشاب میں یورک ایسڈ کی زیادتی گوشت خوری کی زیادتی سے ہوسکتی ہے اور اگزیلیٹ کی زیادتی پالک کے ساگ اور چائے کی زیادتی سے ہوسکتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ ان چیزوں سے پتھریاں بنیں۔

یوریمیا یعنی سمیّت بول میں گردے فیل جاتے ہیں یعنی گردے کام کرنا بند کردیتے ہیں جس کی وجہ سے خون میں گندے مادّے خاص طور پر یوریا جمع ہونے لگتے ہیں جس کی وجہ سے کئی قسم کی علامات پیدا ہوتی ہیں۔ یوریمیا کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں۔

۱۔ گردے کی سوزش یعنی نیفرائی ٹس ۲۔ پرانے بخار ۳۔ بلڈ پریشر کی زیادتی ۴۔ گردے کی رسولی ۵۔ گردے کی پتھری ۶۔ شاک یعنی بلڈ پریشر کی بہت زیادہ کمی ۷۔ پراسٹیٹ گلینڈ کا بڑھ جانا ۸۔ دل کا فیل ہوجانا۔

علامات

۱۔ یوریمیا میں مریض نڈھال رہتا ہے ۲۔ جسم میں دردیں ہوتی ہیں ۳۔ ہچکیاں آتی ہیں۔ ۴۔ پٹھے پھڑکتے ہیں ۵۔ سر میں درد رہتا ہے۔ ۶۔ الٹیاں آتی ہیں ۷۔ کبھی کبھی دست آجاتے ہیں لیکن زیادہ تر قبض رہتا ہے ۸۔ پیشاب بہت کم آتا ہے اور پانی کی شدید کمی گردے میں کنکریاں بنانے میں مدد دیتی ہے۔

گردے کی پتھری کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

۱۔ انفیکشن ۲۔ سوزشِ گردہ ۳۔ غیر متوازن غذا
۴۔ پانی کے استعمال کی کمی ۵۔ گاڑھا پیشاب
۶۔ وٹامن کی کمی ۷۔ زیادہ گوشت خوری
۸۔ پیشاب میں تیزابیت ۹۔ ورزش کی کمی
۱۰۔ پراسٹیٹ گلینڈ کا بڑھ جانا۔

ہومیوپیتھی میں ان بیماریوں کا علامات کے مطابق کامیاب علاج موجود ہے۔

***

Dr. Willmar Schwabe , Germany.
SCHWABE
Available at All Leading Medical & Homoeopathic Stores

www.Paksociety.com